انشائیہ

جون ایلیا

راکھ یا دھواں

''ابھی کی بات ہے کہ میں آسمان کی نیلگونی میں کھویا ہوا تھا اور میں اور میرا خیال، دونوں شمالِ زمردیں کی طرف پرواز کر رہے تھے۔ ہم دھول اور دھوئیں کی نامہربانی سے بہت اوپر، بہت اوپر تیر رہے تھے۔''

''سچ مچ!''

''ہاں ہاں، سچ مچ۔ کیا میں تجھ سے جھوٹ بولوں گا اپنے آپ سے۔ اپنے اندر کے یار سے، اپنے اندر کے جوڑی دار سے؟ حد کر دی تو نے بھی۔''

''اچھا تو پھر ہوا کیا؟ تو اور تیرا خیال شمالِ زمردیں کی طرف پرواز کر رہے تھے تو پھر......؟''

''میں نے ایک آواز کو گنگناتے ہوئے سنا۔ نہ جانے وہ مغرب کی آواز تھی یا مشرق کی شمال کی تھی یا جنوب کی۔ وہ گنگنا رہی تھی۔

''ہم محبت میں سانس لیتے ہیں تو فضا میں خوشبو پھیل جاتی ہے۔ ہم محبت سے دیکھتے ہیں تو پیڑوں کے پیلے پتے ہرے ہو جاتے ہیں اور اپنی چونچ سے اپنے بال و پر کو کھجاتے ہوئے پرندے دھوپ جلی منڈیروں سے اڑتے ہیں اور گھنے پیڑوں کی ٹہنیوں پر جھول کر اور جھوم کر چہچہانے لگتے ہیں۔

''وہ آواز گنگنا رہی تھی۔ محبت موسم بدل دیتی ہے، لو چل رہی ہو تو کیا ہوتا ہے؟ یہ ہوتا ہے کہ احساس اور خیال کی جھلسی ہوئی سمتوں میں بھیگی ہوئی ہوا بہنے لگتی ہے۔''

''پر کیا ایسا ہوتا بھی ہے؟''

''تو اور کیا! ایسا ہی تو ہوتا ہے اور اسی کو بھلا دیا گیا ہے۔''

''کسے؟''

''محبت کو۔ محبت کو یکسر بھلا دیا گیا ہے۔ کیا نہیں بھلایا گیا ہے؟ دلوں میں کھوٹ ہے اور کیسی! کینے ہیں اور کتنے! میں کہتا ہوں کہ اگر ایسا ہی رہا تو سب کے سب یا راکھ ہو جائیں گے یا دھواں۔ میں، ہاں میں کہتا ہوں کہ تم سب راکھ ہو جاؤ گے یا دھواں۔ تم نیچے کا بھی گھاٹا ٹھہرو گے اور اوپر کا بھی۔

''تم کتنے بُرے بولنے والے اور کتنے بُرے سننے والے ہو۔ تم زہر بولتے ہو اور زہر سنتے ہو۔ تم سے تو زبان بھی پناہ مانگتی ہے اور کان بھی۔ تمہاری زبان دلداری سے اور تمہارے کان غم گساری سے محروم ہیں۔ تم تو اب بس وہی کچھ کہتے ہو جو کہنے کے لیے ہے ہی نہیں۔ سو اب تم بس وہی کچھ سنتے ہو جو سننے کے لیے ہے ہی نہیں۔ وائے ہو تم پر کہ تمہاری صبحیں اور دوپہریں بداندیشی کی ہوس میں جوتے چٹخاتی ہیں۔ تمہاری شامیں بے حسی کو آنکھ مارتی ہیں اور تمہاری راتیں بدانجامی کا پہلو گرم کرتی ہیں۔

''پھر ایسا آخر کب تک ہوتا رہے گا؟ ایسا آخر کب تک ہوتا رہے گا، تم آخر کب تک دلوں کی ویرانی اور خیالوں کی گراں جانی میں دن گزارتے رہو گے؟ کیا اس طرح دن گزار کے تمہاری الجھنیں دور ہو جائیں گی؟ کیا اس طرح زندگی بسر کر کے تمہیں سکون ملتا ہے، کیا تم چین سے ہو؟ ہاں، یہ سوال تو مجھے خوب سوجھا۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ، کیا تم سچ مچ چین سے ہو؟

''جھوٹ بولنے کی نہیں ٹھہری اور پھر اس کا کوئی حاصل بھی نہیں ہے۔ جھوٹ بول کر اور پھر خود اپنے آپ سے جھوٹ بول کر نہ اپنے حلق سے لقمے اتارے جا سکتے ہیں، نہ اچھو لگے بغیر پانی کے گھونٹ لیے جا سکتے ہیں اور نہ گہری نیند سویا جا سکتا ہے۔ سنو، جھینپو مت! میں تمہارے اندر سے بول رہا ہوں۔ مجھ سے جھینپو مت۔ میں، تم ہوں۔ میں تم سب کے اندر کا تم ہوں۔ تم چین سے نہیں ہو۔ میں چین سے نہیں ہوں۔ ہم چین سے نہیں ہیں۔''

محترم قارئین!

السلام علیکم!

ستمبر 2014ء کا دلچسپ شمارہ آپ کے زیرِ نظر ہے۔ اس ماہ کی 6 اور 7 تاریخ اپنے تاریخی واقعات کے حوالے سے بہت اہم ہیں۔ یومِ دفاع اور یومِ فضائیہ نہ تو کسی ایک ذات کا کارنامہ ہے اور نہ ہی کسی فردِ واحد سے وابستہ بلکہ اس کے پس منظر میں حب الوطنی کا جو جذبہ کارفرما تھا آج بھی ہر نسل کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت اپنے مقاصد اور نتائج کے حوالے سے ذہنوں میں محفوظ رکھنے کے لیے نسل در نسل ان یادوں کی منتقلی کی ذمے داری والدین کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی بھی ہے جو اپنے مثبت رویوں سے قومی یکجہتی، اتحاد و اتفاق کا درس دیتے ہیں اور جن کے ثمرات ایک دن میں نہیں ملتے بلکہ یہ ایک کارِ مسلسل ہے جس کے لیے ایک عمر درکار ہوتی ہے۔ ورنہ فلسطین کا نقشہ کسی بھی سرزمین پر کھینچا جا سکتا ہے گویا جنہیں اپنے ہی گھر میں سکون نہ ملے وہ دنیا میں کہیں بھی چلے جائیں بے چین ہی رہتے ہیں اور یہ سوال بھی ایک لمحۂ فکریہ ہے کہ وہ وقت کب آئے گا جب عوام اطمینان سے تعلیم حاصل کریں، بے روزگاری کا خاتمہ اور مہنگائی شرمندہ ہو جائے، اسپتالوں کا نظام اور ڈاکٹروں کا قبلہ درست ہو جائے، دواؤں سے ایک نمبر اور دو نمبر کا شمار ختم ہو جائے۔ ماؤں کی گود ویران نہ ہونے پائے۔ شہر کی گلیاں بے خوف و خطر بارونق رہیں۔ دہشت گردی، خوف و ہراس کا خاتمہ ہو جائے۔ کیا کبھی ایسا وقت بھی آئے گا...... کیا کوئی نسل آنے والی نسل کو بھی ماضی کے کچھ خوشگوار واقعات بھی سنائے گی...... کیا کسی ستمبر بے زور کا ذکر بھی ہوگا...... ان شاء اللہ ہمارے وطن میں ایسا وقت بھی آئے گا جب ہر زبان پر ہوگا کہ پاکستان امن کا گہوارہ ہے۔ اللہ رب العزت ہمارے وطن کو سلامت اور وطن میں رہنے والوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین...... اور ان کے ساتھ ہی ہم چلتے ہیں اپنی پُرخلوص محفل کی جانب جہاں پیار ہے، امن اور شانتی کے ترانے ہیں۔

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی،** حکیم ٹاؤن خانیوال سے محفل کی زینت بنے ہیں ''اگست 2014ء کا ٹائٹل عید کی مناسبت سے بہترین رہا۔ دوشیزہ تیار شیار ہو کے پیا جی کو عید مبارک کہتی نظر آئی۔ پس منظر میں ایک ناکام عاشق کھڑکی میں سے یہ منظر اُس اُلو کی طرح ملاحظہ کرتا نظر آیا۔ اداریہ بھی اگست کے حوالے سے زبردست رہا اور شمارہ میں آزادی کے حوالے سے صرف انشائیہ ہی شامل تھا۔ ایک آدھ کہانی بھی ہو جاتی تو مزہ آ جاتا۔ جون ایلیا کے خیال سے متفق ہونا پڑتا ہے کہ پاک و ہند ایک دوجے کے نہیں خود اپنے ہی دشمن ہیں۔ شمارے کی دلہن ''ستاروں پر کمند'' ٹھہری۔ قدیم روایت، جذباتیت، لگن اور ناممکن کا حصول تحریر کی خوبی و دلچسپی بڑھانے میں مددگار عناصر ٹھہرے۔ ملک صاحب کی ''اشکِ ندامت'' نے بے حد غمگین کیا۔ کاشف زبیر کی درآمد ''خاندان'' زبردست رہی۔ رشتوں کا تحفظ یقیناً شرطِ انسانیت ہے۔ ریگ ساحل بہتر اور تاریخی کہانی فقیر دوست بس ایوریج ثابت ہوئیں۔ ''لکیروں کے اسیر'' قدرے بہتر تھی۔ ضرورت اور مطلب کے وقت ہم دین کی آڑ لینا بہت بہتر طور پر جانتے ہیں۔ شعیب اور روبی نے بھی اپنی غلطیوں کو مذہب کے پردے میں چھپایا۔ احمد اور مصباح کے ملن کی خوشی ہوئی۔ شعیب احمد کے ساتھ ٹھیک ہی ہوا۔ شرعبان کی چال میں ڈرامائی صورتِ حال پیدا کر کے جبیر اللہ اور کیرن کے ملن کی راہ ہموار کر گئی۔ انجیلا اپنی بدفطرت کی وجہ سے برے انجام سے دوچار ہوئی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی ریگِ ساحل تمام دوسری سہولتوں کی عدم دستیابی کی طرح طبی سہولیات کی عدم فراہمی کے پس منظر میں لکھی گئی۔ اداس ترین تحریر تھی۔ اداریہ پاکستان کو درپیش ڈھیروں ڈھیر مسائل کا تذکرہ اور عید کی مبارک سے مزین تھا۔ کرسیٔ صدارت پر شکیل حیدر داصو مختصر، جامع تبصرے کے ساتھ براجمان تھے، مبارک باد قبول ہو۔ اشوک کمار! ہم بھی نوک جھونک کے زبردست حامی ہیں اور اس مہم میں آپ کے ساتھ ہیں کہ اس فیصلے میں ترمیم کی گنجائش پیدا کی جائے۔ مہرین ناز! آپ کی دعا پر لب بے ساختہ آمین کہہ اٹھے کہ واقعی آج کے دور میں یہ ایک جامع دعا ہے۔ جنید احمد! آپ خوش قسمت ہیں کہ شریک حیات نے ہمت بندھائی اور آپ محفل میں آ گئے۔ ہمارا تو ہر گزرتا دن سسپنس خریدنے پر پابندی کے مطالبے سے شروع ہوتا ہے۔ احسان سحر! آپ کی صحت یابی کے لیے دعاگو ہیں۔ بزرگ تبصرہ نگار حکیم رضا شاد کی واپسی بھی خوش کن رہی۔''

✠ **انعم ریاض،** نیوی کالونی ڈالمیاں، کراچی سے حاضر ہیں ''اس بار سسپنس کافی تاخیر سے ملا۔ اب تو گنتی بھی نہیں یاد جتنے چکر ہم نے دکان کے لگائے تھے۔ سسپنس ہاتھ آتے ہی سرورق کو بالکل نظر انداز کر کے ہم خطوط کی محفل میں جا پہنچے۔ سب سے پہلے تمام دوستوں کو ہمارا خلوص بھرا السلام علیکم...... بشریٰ افضل، اعجاز احمد راحیل، مظہر سلیم، مہرین ناز اور زویا اعجاز کا تبصرہ پسند آیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ماروی پڑھی۔ واقعی کہانی میں ڈاکٹر عدیلہ/عدیل کی انٹری کافی دلچسپ رہی۔ ایک دفعہ پھر کہانی کے ہیرو مراد کو موت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اب بے چینی سے اگلی قسط کے منتظر ہیں۔ ملک صفدر حیات کی اشکِ ندامت کوئی خاص دلچسپی نہیں لیے ہوئے تھی اور سب سے زیادہ پسند آنے والی کہانی ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تھی۔ کہانی کے اختتام تک ہمیں روبی پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ طاہر جاوید مغل کی ستاروں پہ کمند بے حد اچھی جا رہی ہے۔ طاہر جاوید کی کہانیوں کے تو ہم بہت فین ہیں اور محفلِ شعر و سخن تو ہمارا اوڑھنا بچھونا ہیں۔''

سید محی الدین اشتقاق، فتح پور، لیہ سے تبصرہ کررہے ہیں ’’جون ایلیا آزادی کا مفہوم اور معنی واضح کررہے تھے۔ مدیر اعلیٰ ایک حقیقی مسئلے کی طرف توجہ دلوا رہے تھے۔ ستاروں پر کمند لازوال مصنف کی لازوال تحریر طاہر جاوید مغل کے کہانی میں تانے بانے بننے کا انداز کمال ہے۔ عادل، سرسرمد، ہمایوں اور کرسٹل کے ساتھ برفانی دنیا میں لڑ رہا ہے۔ منظر نگاری کا کمال ہے۔ نواب انکل کا جادو ابھی تک نظر نہیں آیا، ماروی کا یادداشت بھول جانا بور کررہا ہے۔ ایک انار سو بیمار والی صورت حال ہے۔ کچھ تیزی پلیز۔ ضیا تسنیم بلگرامی جہانیاں جہاں گشت ولی کامل سے ملاقات کرواگئے۔ منظر امام پہلی بیوی کے ساتھ نظر آئے۔ نفیس کی حیرت انگیز صلاحیتوں نے متاثر کیا۔ پہلی محبت ہی پہلی بیوی ثابت ہوئی۔ محمد شکیل حیدر واصواجچھے تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ الہٰیکل صاحب آپ کو نوک جھونک سے کون روک سکتا ہے۔ احسان سحر اور کبیر عباسی کے ساتھ عمران غلی کا تبصرہ شاندار لگا۔‘‘

طلحہ رحمان، منڈیلیانوالی سے چلے آرہے ہیں ’’میں کافی عرصے سے سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ کا خاموش قاری ہوں لیکن اس دفعہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا چنانچہ میں نے بھی دوستوں کی محفل میں شرکت کرنے کی ٹھانی۔ یوں تو سرورق بہت خوب صورت تھا لیکن مجھے جو بات سب سے زیادہ اچھی لگی وہ دراصل ہمارے قومی پرچم کی شان یعنی چاند اور ستارہ کی موجودگی تھی۔ فہرست بھی دیدہ زیب تھی۔ جون ایلیا کے انشائیہ آزادی کو اس دفعہ نظر انداز کیا اور چپکے سے محفل آپ کے خط کے مین گیٹ یعنی اداریے پر دستک دی۔ اداریہ اس دفعہ بہترین سے بھی زیادہ اچھا تھا۔ ادارے کی طرف سے اس دفعہ تمام قارئین کو بھرپور طریقے سے عید کی مبارک باد دی گئی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اپنے پسندیدہ مصنف رومان کی دنیا کے بے تاج بادشاہ جناب طاہر جاوید مغل صاحب کی تازہ ترین سلسلے وار کہانی کا بڑی دلچسپی سے مطالعہ کیا۔ مغل انکل حقیقت میں ستاروں پر کمند ڈالنے والے ہیں۔ ابتدائی سوغات فقیر دوست زیادہ دلچسپ نہیں تھی۔ محبوب مصنف کاشف زبیر کی مغربی کہانی خاندان نے کچھ مزہ نہیں دیا۔ البتہ ملک صفدر حیات کی خوب صورت تفتیش نے کسی انڈین جاسوسی ڈرامے جیسا مزہ دیا۔ استفادہ ایکشن سے بھرپور دلچسپ کہانی تھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید نے ریگ ساحل کی صورت میں ایک مرتبہ ہمارے رونے کا انتظام کردیا۔ محفل شعر و سخن بھی بھرپور تھی۔ سلیم انور نے مانوس اجنبی کی صورت میں اچھی کہانی لکھی۔ دوسری سلسلے وار طویل کہانی ماروی پڑھی جو کہ اس مرتبہ خاصی تیز لگی۔ منظر امام نے اس دفعہ معمول سے خاصی ہٹ کے نسبتاً بڑی اور عمدہ کہانی پہلی بیوی کی صورت میں لکھی۔ آخری صفحات کی زینت ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی شاہکار کیروں کے اسیر بہت اچھی لگی۔ اگست میرے لیے بہت اہم مہینا ہے کیونکہ اس ماہ کی بیس تاریخ کو میں نے اپنی چودھویں سالگرہ منانی ہے۔‘‘ (ارے تو پھر عید کے ساتھ ساتھ سالگرہ کی بھی ڈھیروں مبارکباد)

شوکت شہریار، اوکاڑہ سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ’’موسم ہو برسات کا اور ساتھ میں افطاری کے پکوڑے سموسے اور سسپنس پڑھنے کا مزہ ہی اور ہے۔ سرورق کی حسینہ تو یوں لگتا ہے کہ جیسے کسی مہندی کی تقریب سے ہوکے آئی ہے۔ محفل میں حاضر ہونے سے پہلے کچھ کہنا چاہوں گا کہ جذبات میں کیے گئے کچھ فیصلے بہت نقصان دہ ہوتے ہیں لیکن ان کے لیے جن کا ضمیر زندہ ہو، وہی پچھتاتے ہیں اور میں نے اپنی ایک عزیز از جان ہستی کا دل دکھایا ہے اسے تکلیف دی ہے اور آج آپ سب قارئین اور تمام لوگوں کے سامنے اس سے معافی مانگ رہا ہوں، اسلام میں غصہ اسی لیے حرام ہے۔ میری سسپنس والوں سے گزارش ہے کہ یہ تحریر ضرور چھاپ دیں۔ (لیجیے جناب آپ کی خواہش پوری ہوئی) محفل میں داخل ہوئے۔ اشوک کمار کی درخواست سے اتفاق کرتا ہوں کہ محفل میں کچھ طنز و مزاح ہونا چاہیے لیکن ایک حد میں رہ کے۔ آپی مہرین ناز سب کو دعائیں دیتی نظر آئیں۔ حکیم رضا شاہ صاحب اللہ آپ کو صحت عطا فرمائے۔ احسان بھائی اللہ آپ کو دوبارہ اپنے گھروں میں آباد کرے۔ کبیر عباسی نے بہت خوب صورت الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا کہ نامناسب الفاظ کو ختم کرکے نوک جھونک دوبارہ بحال کی جائے۔ قدرت اللہ بھائی ابھی تو آغاز ہے، آپ دیکھنا کہ مغل صاحب اس دفعہ بھی اپنی ہیروئن کی شادی کسی کے ساتھ ضرور کروادیں گے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے فقیر دوست پڑھی۔ انتش واقعی ایک اچھا بادشاہ تھا۔ اللہ نے اتنی کامیابیاں عطا کیں، خاندان میں جمی اور رچ کے ملاپ نے کہانی کا لطف ہی دوبالا کردیا اور بارنی اپنے انجام کو پہنچا۔ ستاروں پر کمند کی اس قسط نے بے اختیار، بیوی کی یاد دلادی۔ رستم کے ساتھ بھی کچھ ایسے ہی واقعات پیش آئے تھے۔ استفادہ میں کیرول کے باڈی گارڈ نے اپنا فرض خوب نبھایا اور آخر میں اس کو اس کا صلہ بھی مل گیا۔ ملک صفدر حیات کی اشکِ ندامت اچھی تحریر تھی۔ کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ کیڈی کا ایک میچ قتل کا باعث بن جائے گا۔ مانوس اجنبی میں ڈورس اور آرلن رچرڈ کا ملاپ خوب رہا۔ پہلی بیوی ایک پراسرار علم پر مشتمل کہانی تھی، نفیس نے شاید اپنی زندگی میں کوئی ایسا کام کیا ہو جو اس کے لیے اتنا اچھا صلہ ملا ہے۔ خرم کی محبت بچھڑنے کا افسوس ہوا۔ آخری صفحات پہ لکیروں کے اسیر نے دل کو خون کے آنسو رلا دیا۔ روبی کی اسد سے خودغرضانہ محبت اور شعیب کی بے حسی افسردہ کرگئی۔ کترنیں اس دفعہ اچھی تھیں، تمام اشعار بھی پسند آئے۔‘‘

افتخار حسین اعوان، مظفرآباد، آزاد کشمیر سے حاضر ہوئے ہیں ’’ماہ اگست کا سسپنس 18 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل حسینہ کو کچھ انتظار پایا۔ ٹائٹل دلکش لگا۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے تاریخ کے جھروکوں سے ایک خوب صورت تحریر ہماری نذر کی، ذہانت کس طرح فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچاتی ہے۔ محکوم کو حاکم بناتی ہے۔ ماروی میں محی الدین صاحب کو جیسا ہم دیکھنا چاہ رہے تھے ویسا ہی دکھانا شروع کردیا ہے۔ ہماری مایوسی جو گزشتہ اقساط میں چھائی جارہی تھی، اب دلچسپی میں بدلتی جارہی ہے۔ طاہر جاوید مغل کے چاہنے والے کتنے ہیں اگر نام تحریر کیے جائیں تو سسپنس میں کہانیوں کی جگہ ایک ماہ صرف نام ہی پڑھنے کو ملیں گے۔ صفحات پھر بھی کم پڑ جائیں گے۔ ستاروں پر کمند کی تعریف یہ ہے کہ اس کی کوئی تعریف نہیں۔ ہمیشہ کی طرح مغلِ اعظم صاحب بہت سے دلوں پر راج کرگئے ہیں۔ مغل صاحب ہر دلعزیز لکھاری ہیں۔ ان کے لیے اتنا ہی

کہوں گا کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ سرمد صاحب کا کردار بہت پسند آیا۔ اس کہانی کی وجہ سے ہر ماہ اگلے شمارے کا بہت بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ لکیروں کے اسیر نے اس مرتبہ مایوس کیا ہے۔ محفل میں نوک جھونک ہی اس محفل کا خاصہ ہے۔ ہاں وہ تہذیب کے دائرے میں ہو۔ بعض قارئین/تبصرہ نگاروں نے آپ کے اس فیصلے کو سراہا بھی ہے۔ میں ان کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔''

✠ منظر سلیم، رحیم یار خان سے جولائی کے شمارے پر تبصرہ لے کر حاضر ہیں ''اس بار ہم نے سوچا کہ بس اب خط نہیں لکھا کریں گے پھر یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ نہیں لکھیں گے تو کیسے رہ پائیں گے؟ دل آدھی ملاقات سے محرومی پر سراپا احتجاج ہو گیا...... سو کاغذ قلم سنبھالا اور خط لکھنے بیٹھ گئے۔ (بس یہی آپ لوگوں کی محبت ہے) جولائی کا شمارہ اٹھارہ جون کو ملا۔ سرورق اس دفعہ اچھا نہیں لگا۔ جون ایلیا کے انشائیہ اور آپ کے اداریے کے ذیل میں ہم اتنا کہیں گے کہ ہمارے سیاستدانوں نے نظریات کے نام پر وہ ''مواد'' درآمد کیا جس نے پاکستان کی بنیاد کو دیمک لگا دی۔ خون کی رنگت بدلی۔ بے ضمیری جاگی قومی مفادات کو ذاتی ترجیحات پر قربان کیا گیا۔ ادب کے نام پر سرخ انقلاب کی اساس مہیا کی گئی۔ کوئی بھی طبقہ اس وقت تک زوال آشنا نہیں ہوتا جب تک اس میں ایک بھی زندہ احساس اور مثبت سوچ رکھنے والا ادیب موجود ہو۔ مسند نشین ہر سال بجٹ کے اعداد و شمار کی گرد اڑا کر آنکھوں کی بینائی معطل کر دیتے ہیں۔ اللہ پاک ان کو ہدایت دے۔ خطوط میں محمد خواجہ کا تبصرہ اعزازی قرار پایا، بہت بہت مبارک ہو جی۔ باقی تبصرہ نگاروں میں زویا اعجاز نے اچھا لکھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آخری صفحات کی کہانی ڈاکٹر ساجد امجد کی آب طلب پڑھی۔ محبت میں ناکامی پر ایسے رویے سامنے آتے ہیں۔ درخشاں کی خواہشات ماں کی جھوٹی انا اور دو غلے پن کی بھینٹ چڑھ گئیں، بہت اچھی کہانی تھی۔ ماروی میں ایک نئے کردار ڈاکٹر عدیلہ کی انٹری ہوئی۔ مجموعی طور پر کہانی بہت دلچسپ ہے تاہم بعض جگہوں پر کافی باتیں ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ منظر امام کی کہانی چل جھوٹی مختصر مگر اچھی کہانی تھی۔ راحیلہ اور اس کے شوہر کے درمیان آنے والا شخص نا بینا نہ ہوتا تو واقعات مختلف رخ اختیار کرتے۔ ڈاکٹر شیر شاہ کی تحریر کوکھ کا دکھ اس ماہ کی سب سے بہترین تحریر لگی۔ باقر کی بے وقت موت پہ ایک ماں بیٹے کی جدائی میں کرب و اذیت میں مبتلا تھی۔ کہانی کے واقعات نے آنکھوں کے گوشے نم کر دیے۔ الیاس سیتاپوری صاحب نے بے جا طوالت سے گریز کرتے ہوئے حسب روایت داستان کو منطقی انجام تک پہنچایا۔ بہت تاثر انگیز کہانی تھی۔ اب بات کرتے ہیں ڈائجسٹ میں شامل ہونے والی نئی قسط وار کہانی ''ستاروں پر کمند'' کی۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی کہانی میں ایسا سحر ہوتا ہے کہ ہم خود کو گویا محبت نگر کا باسی سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ہر موسم کے رنگ ہوتے ہیں، ان کی کہانیوں کے کردار مسکراتے ہیں تو ہم بھی ہنس پڑتے ہیں۔ کردار پریشان ہوں تو ہم بھی مضطرب ہو جاتے ہیں۔ مغل صاحب قاری کو اور کردار کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ستاروں پر کمند پہلی قسط سے ہی جداگانہ پہچان بنانے میں کامیاب رہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عادل شہزادی کے حصول کے لیے تایا کو دیا گیا چیلنج پورا کرتا ہے یا نہیں۔''

✠ محمد خواجہ، کورنگی، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ''اگست کا شمارہ 15 تاریخ کو ہی موصول ہو گیا۔ سرورق پر حسینہ کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک جو آج کل کسی چہرے پر نظر نہیں آتی، دور کھڑکی میں کسی کی جھلک، دیکھ کر حسینہ کے چہرے پر آئی ہے۔ جون ایلیا جب بھی ...... کیا خوب لکھتے ہیں۔ اس دفعہ آزادی پر ان کی تحریر ہمیشہ یاد رکھنے والی ہے۔ آخری ہیرے میں کیا دلسوز باتیں لکھی ہیں۔ واقعی ہم آزادی کی سزا بھگت رہے ہیں۔ خطوط کی محفل بہت عمدہ سجی ہے۔ ایڈیٹر صاحب نے نوک جھونک پر پابندی لگا کر اچھا کام کیا۔ لوگ حد سے تجاوز کرنے لگتے ہیں۔ شمارہ تو دو تین دن میں پڑھ ڈالا۔ خط لکھنے بیٹھوں تو بجلی غائب۔ اس پورے رمضان شریف میں اتنے فالٹ ہوئے کہ لوڈشیڈنگ کو ملا کر چند گھنٹے دن میں بجلی دستیاب رہی۔ مدیر اعلیٰ اور دیگر ادارے سے وابستہ حضرات کو اور تمام قارئین کو عید کی دلی مبارک باد قبول ہو۔ ستاروں پر کمند، طاہر جاوید مغل کے قلم نے ایک بار پھر اپنا جادو چلایا ہوا ہے۔ یہ کہانی ایک جستجو، جنون اور جذبے پر مبنی ہے۔ اس دفعہ کہانی کا قبل وقوع پاکستان ہے۔ ایک انتہائی معلوماتی اور دلچسپ شب و روز کی داستان جو ساری توجہ اپنی طرف کھینچے رکھتی ہے۔ فقیر دوست، ڈاکٹر ساجد ...... زرخیز تاریخی کہانیاں بڑی عرق ریزی سے جمع کرتے ہیں۔ آتش حاکم بدایوں کی بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ سازشوں، خونریزی اور جنگوں پر محیط ہے۔ شاید ہی کسی بادشاہ کو سکون کی زندگی میسر ہوئی ہو۔ خاندان، کاشف زبیر نے اس دفعہ ایک عمدہ اور متحیر خیز کہانی تحریر کی۔ جج نیلسن غلطی میں بری طرح پھنس گیا لیکن سوتیلے بھائی کے طلاپ سے آخر کار بچ گیا۔ استفادہ، مغرب کی مکر و فریبیاں، جگت بازیاں، دولت کی خاطر منصوبہ بندیاں لیکن مس کیرول کے منصوبے عجیب طرح سے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اشک ندامت، امک صفدر حیات ایک بڑا معرکہ سر کیا۔ ایک ایماندار اور فرض شناس تھانیدار جو ہمیشہ مثبت سمت میں تفتیش کرتا ہے اور کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔ ریگ ساحل، ڈاکٹر شیر شاہ، کتنی دردناک کہانیاں جو ہمارے مہذب کہلانے والے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ دو معصوم ماں باپ جن کی تیسری اولاد کو بھی بے پروا معاشرے نے قتل کر دیا۔ مانوس اجنبی، سلیم انور کی چھوٹی تحریر، ڈوریس دو اجنبیوں کے درمیان پھنس گئی۔ ایک قاتل دوسرا مسیحا۔ اپنا گھر، تنویر ریاض نے بدیسی کہانی کا چناؤ کیا۔ کہانی کچھ پھیکی پھیکی رہی۔ سونیا۔ ایک سراب کے ساتھ رہ رہی تھی۔ پہلی بیوی، کچھ پراسرار کچھ غیبی طاقتوں کے اثر میں آنے والی کہانی جس کا اسیر ایک شخص تھا۔ جادوئی داستان میں دلچسپی کا بہت سامان ہے۔ داستان کے آخر میں ایک حقیقی اور لطیف سچائی سامنے آئی۔ لکیروں کے اسیر، ایک عمدہ کہانی دل کو چھو لینے والی تحریر، ایک عورت کا عجیب کردار جس نے دل کی خاطر ایک ٹھکرا دینے والے شخص کو کتنی قربانی دے کر واپس پایا لیکن وہ پھر بھی جیت نہ سکی۔ وہ تو اپنی زندگی اور ادھوری جیت سے سمجھوتا کرتی رہی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی پاک و ہند کے اولیاؤں کے متعلق بہت معلوماتی اور روحانی تحریریں پڑھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ شمارہ ختم ہونے کا احساس بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ چلو پھر ایک ماہ کی جدائی لیکن انتظار کا اپنا مزہ ہے۔''

✠ ولید نت، امجد اقبال بھی، ساہیوال سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں" اگست کا پرچہ 20 جولائی کی صبح روشن کو نو بجے موصول ہوا۔ اس مرتبہ ٹائٹل بہت عمدہ طرز سے مزین کیا گیا ہے، جو دل کو لبھا رہا ہے۔ روشن خیال انسان جون ایلیا مرحوم کا انشائیہ آزادی پڑھا۔ اگست کے لیے یہ صفحہ سوغات خاص ہے۔ اپنے علاقے کے ان دیکھے شاعر اعجاز احمد راحیل کا خط جب بھی دیکھتا ہوں، دل میں مسرت کی لہری اٹھتی ہے۔ اس کے بعد محفل شعر و سخن میں پہنچے۔ محمد اعجاز، رشید سیال، زاہد چودھری، الطیلی اور بالخصوص جناب اعجاز راحیل کا ذوق تحسین طلب ہے۔ ستاروں پر کمند کی قسط کچھ عذاب جاں ضرور بنی لیکن اس کی ڈیفیشنسی دوسری قسط نے پوری کردی۔ ریگ ساحل شمارے کی بہترین کہانی ہے۔ ماں کے کردار نے غمزدہ کر دیا۔ ملک صفدر حیات کی اشکِ ندامت تجسس سے بھرپور سپر ہٹ کہانی ہے۔ آخری صفحات پر لکیروں کے اسیر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی عمدہ اور قابل تحسین کہانی ہے۔ ڈاکٹر بھٹی ہمیشہ جاذب نظر فقرات و مکالمات سے آراستہ کہانی پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی فقیر دوست تاریخی کہانی تھی، ماضی کے جنگ و امن کی شورشوں میں لے گئی۔ سب قارئین اور تمام اہلِ وطن کو دلی عید مبارک۔"

✠ احمد خان توحیدی، پاکستان اسٹیل، کراچی سے حاضر ہیں" انشائیہ جون ایلیا، آزادی، خدا نے بڑے بابرکت مبارک دن ہمیں آزادی کی نعمت سے مالا مال کیا۔ اف ہائے ہم خود کو تا حال آزاد نہ کر سکے۔ ادھر اسرائیل۔۔۔ مظلوم فلسطینیوں کے قتل و غارت میں مصروف ہے۔ بڑے شیطان کا مکمل سکوت جبکہ افغانستان اور عراق میں ایک لمحہ تاخیر نہ کی جو مسلمانوں کی نااتفاقی کا نتیجہ ہے۔ ادھر ظالم سفاک نے 10 سالہ معصوم بچے کو دونوں بازو سے محروم کر دیا۔ اف ریڑھی بان کے بچے نے پورے ملک میں میٹرک ٹاپ کیا تو سموسے فروخت کرنے والے بچے نے دوسری پوزیشن حاصل کی۔ وطن کی زرخیز مٹی کی رکھوالی کے مالی ناکارہ ہیں۔ ستاروں پر کمند ڈالنے کے لیے چھلانگ لگ گئی۔ عادل کا شہزادی سے شادی کے بجائے مغل صاحب کو پٹائی و دھینگا مشتی میں مصروف رہے اور جاسوسی والے بارونداجنکی کی یاد تازہ کر دی۔ میم کی گردش میں ماروی سے ملے...... مرد کی ظاہری شناخت چہرے پر ڈاڑھی مونچھ کے بال، کیا عدیل کے چہرے پہ بال نہیں ہیں؟ نواب صاحب ماروی کی شادی جلد کرا کرا سے ازدواجی زندگی سے لطف اندوز کر کے ماں کی ممتا کی تکمیل کریں۔ ملک صاحب اشکِ ندامت میں قاتل تک جا پہنچے۔ زندہ دلوں کا کام خامیاں دور کر کے آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ اپنا گھر، سونیا خونی رشتوں سے مل گئی۔ منظر صاحب کی پہلی بیوی اسٹوری تو اچھی ہے۔ ڈاکٹر ساجد اور الیاس سیتاپوری صاحب سے بچوں کی خواہش پر التجا ہے کہ دوری تاریخ کے بجائے قائداعظم محمد علی جناح، علامہ سر ڈاکٹر محمد اقبال، شہنشاہ خطابت مولانا عطاء اللہ شاہ صاحب، بخاری، مولانا حالی و دیگر برصغیر کے راہنماؤں کے حالات زندگی دوبارہ لائیں۔ لکیروں کے اسیر، طلاق کے بعد دوبارہ پہلے مرد سے شادی اتفاقیہ ہو سکتی ہے۔ دوسرا خاوند خود چھوڑ دے یا فوت ہو جائے۔ سب ساتھیوں کو عید مبارک قبول ہو۔ باقی کہانیاں باعثِ مصروفیت رمضان المبارک پڑھ نہ سکا۔"

✠ اعجاز احمد راحیل ماہی، ساہیوال سے محفل میں شریک ہیں" جب اداسیاں حد سے بڑھ جائیں اور تنہائیوں کے لامتناہی سلسلے ہوں تو ایسے ہی دل چاہتا ہے۔ کوئی اپنا ہو جس کے ساتھ کچھ پل سکون سے گزر جائیں تو اس پُرآشوب دور میں دور دور تک سسپنس کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔ سرورق پر ہونٹوں پر مسکان سجائے خوب صورت آنکھوں والی محبوبہ دلنواز بہت بھلی لگی۔ فہرست کی ترتیب کو سراہتے ہوئے جون ایلیا کی کڑوی باتوں کو قابلِ توجہ سمجھا۔ محترم آزادی کی قدر تو گمنام شہید جانتے ہیں جنھوں نے خاکِ وطن کو بوسہ دینے کے لیے اپنی جانیں تک نچھاور کر دیں۔ نشستِ خاص پہ اس دفعہ محمد شکیل حیدر داسو صاحب تھے۔ محبتوں کے سفیر کی پسندیدگی کا شکریہ مغل صاحب اور آپ سب کے لیے ڈھیروں دعائیں۔ محترم بھائی کبیر عباسی، منظہر سلیم اور قدرت اللہ نیازی صاحب نے بھی خوب لکھا۔ بہرحال محفل میں سید شکیل حسین کاظمی، تفسیر عباس بابر، آغا فرید احمد خان اور بابر عباس کی کمی محسوس ہوئی۔ عزیز از جان طاہر جاوید مغل صاحب کی ستاروں پر کمند تحریر و تجسس سے بھرپور رہی۔ ادھر کرنگاہ ٹھہری۔ سرِسرمد کے بارے میں پڑھ کر خاصی خوشی ہوئی کہ وہ بارونداجنکی جیسے لازوال کردار کے راہنما ہیں۔ منظر نگاری ایسی ہے کہ کیا کہنے ...... ویلڈن مغل اعظم صاحب۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب نے تو گویا حقِ قلم ادا کر دیا۔ دل اور دل والوں کی داستانِ الفت خوب تر رہی...... اسد کی محبت قابلِ رشک ہے۔ محی الدین نواب صاحب خدارا ماروی پہ توجہ دیں، بالکل مزہ نہیں دے رہی ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی فقیر دوست اکشن کے حالات و واقعات زندگی پڑھنے کو ملے، اللہ کے ولی کے منہ سے نکلے الفاظ ہمیشہ سچ ہی ثابت ہوتے ہیں۔ اکشن اپنی ذہانت سے غلام سے بادشاہ بنا اور کامیابی سے امورِ سلطنت کو سنبھالا...... کاشف زبیر کی خاندان منفرد اسٹوری ثابت ہوئی۔ بے شک اپنے اپنے ہی ہوتے ہیں جن کے بغیر انسان مکمل نہیں ہوتا۔ ریگِ ساحل پُرفکر تحریر ثابت ہوئی اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ملک میں ایسے اسپتال اور اتفاقیہ موجود ہیں۔ اشکِ ندامت میں ملک صفدر حیات ایک قتل کی گتھی حل کرتے نظر آئے۔ حیدر علی کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑا۔ پہلی بیوی بھی خوب رہی۔ قمر عباس کی چال میں یہ بات واضح ہوئی۔ انسان اپنی ذہانت سے بڑی سے بڑی مشکل سے نکل سکتا ہے...... ولیِ کامل جہانیاں جہاں گشت کی روداد حیات دلی سکون کا سبب بنی...... محفل شعر و سخن میں مہرین ناز کا انتخاب زبردست رہا۔"

✠ صوبیہ اقبال، راولپنڈی سے تشریف لائی ہیں" گرمیوں کا موسم اپنے عروج پر ہے اور رحمتوں بھرا ماہِ صیام اپنے آخری عشرے میں داخل ہو چکا ہے۔ ہم ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد پھر محفل میں حاضر ہو رہے ہیں۔ اگست کا شمارہ بروقت مل گیا۔ اگست تو ویسے بھی خوشیوں کا مہینا ہے اور ہمیں بھی یہ مہینا بہت پسند ہے کیونکہ ہمیں بھی کوئی خوشی اگست میں ہی ملی تھی۔ سرورق کی لڑکی کو مسکراتے نظرانداز کر کے انکل کی عید مبارک کا

جواب خیر مبارک سے دیا اور ایک نظر فہرست پر ڈال کر انشائیہ آزادی پڑھا۔ یقیناً ہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں یا پھر خود اپنے۔ کبیر عباسی بھائی اور قدرت بھائی کے تبصرے بیسٹ لگے۔ قیصر بھائی کو بہت مس کیا۔ سب سے پہلے ستاروں پر کمند پڑھی۔ سرمد صاحب سے عادل بہت کچھ سیکھ رہا ہے۔ اشکِ ندامت اس ماہ کی بیسٹ کہانی لگی اور کہانی کے ساتھ ساتھ ہماری آنکھیں بھی اشک بار رہیں۔ ماروی کی اس قسط میں ماروی کے چاہنے والے پہنچے کیا کم تھے جواب عدیل عرف عدیلہ کا اضافہ ہوگیا۔ منظر امام کی پہلی بیوی کی تو بات ہی الگ ہے۔ محبت کے موضوع پر کئی راز کھل کر سامنے آئے۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت پڑھ کر پتا چلا کہ اللہ تعالیٰ جن کو نوازتا ہے تو وہ پیدا ہوتے ہی ولی ہوتے ہیں۔ لکیروں کے فقیر ایک حساس موضوع پر لکھی گئی بہترین کہانی تھی۔ اسد کا کردار اچھا لگا۔ پہلی کہانی نقیر دوست میں التمش کے واقعات اور حضرت بختیار کاکیؒ کی وصیت پر التمش کی نیک سیرت دل میں گھر کر گئی۔ ریگ ساحل، استفادہ، مانوس اجنبی اور اپنا گھر بھی ٹھیک تھیں۔ مختصر کہانیوں میں کاشف زبیر کی چال بیسٹ رہی۔ اب کی بار چٹکلوں اور مراسلات نے خوب محظوظ کیا۔ محفل شعر و سخن میں الیلیٰ، ہادیہ ایمان، ماہا ایمان اور محمد اکبر بھائی کا انتخاب پسند آیا۔ سب سے بیسٹ قدرت بھائی کا انتخاب لگا۔ ہمارا مشورہ ہے کہ محفل میں ہلکی پھلکی نوک جھونک ضرور ہونی چاہیے۔ آخر میں سب کو عید کی ڈھیروں مبارک باد کے ساتھ صرف اتنا کہوں گی کہ ماہِ اگست کا شمارہ بہت پسند آیا۔'' (بہت شکریہ)

✠ ایم بنارس خان تھتھوی، اٹک سے چلے آرہے ہیں'' آپ کا تمام عملہ اگرچہ مجھ سے ناواقف ہے لیکن میں تقریباً چیدہ چیدہ اسٹاف کو جانتا ہوں۔ چاروں رسالے بڑے اچھے جا رہے ہیں۔ میں رسالے اور تاریخی کتب بہت پڑھتا ہوں لیکن لکھنے میں بہت ماٹھا ہوں۔ 1975ء سے جاسوسی اور سسپنس کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ تاریخی کتب جو بڑی بڑی لائبریریوں سے مل سکتی ہیں پڑھ لی ہیں۔ آپ سسپنس ڈائجسٹ میں پہلے صفحوں پر تاریخی واقعات لکھواتے ہیں اور سب ہی رائٹر اچھے لکھنے والے ہیں لیکن تمام، اکثر کسی تاریخی واقعے کو مکمل طور پر نہیں لکھتے، کیوں؟ اگر ایک ماہ میں واقعہ مکمل نہ ہو تو دوسرے ماہ میں مکمل کیا جاسکتا ہے۔ آخر میں اتنا عرض گزار ہوں کہ طبع زاد کہانیاں لکھوایا کریں۔ آپ کے رسالوں میں لکھنے والوں میں اول نمبر محی الدین نواب اور طاہر جاوید مغل کو دوں گا اس کے بعد کاشف زبیر اور مسز مریم کے خان۔ ان کے بعد ڈاکٹر ساجد امجد، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی اور اسما قادری کے نام آتے ہیں۔ کبھی کبھار ناصر ملک کا نام شامل ہوتا ہے۔ ان کی کہانیاں آخری اترن، جنت وغیرہ تو بہت اچھی تھیں مسافر قابل ذکر تھی۔''

✠ محمد صفدر معاویہ، خانیوال سے شریکِ محفل ہیں'' شمارہ کا سرورق بہت ہی دیدہ زیب ہے جہاں پر خوب صورت آنکھوں ستواں ناک خوب صورت بالوں کے ساتھ دیہاتی دوشیزہ اپنے ساجن کا انتظار کر رہی ہے کہ عید آنے کو ہے تو بھی گھر آجاتا۔ آگے بڑھے جون ایلیا کی آزادی پڑھی۔ جناب بالکل ٹھیک فرما رہے ہیں کہ آزادی ایسی نہیں ہوتی کہ ہم پڑوسیوں کے ساتھ ان کی جنگ ہی لڑتے رہیں۔ آج کے نوجوانوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ ہم کیسے حقیقی آزادی حاصل کریں جہاں امن وسکون سکھ شانتی نصیب ہو۔ آپ کا اداریہ پڑھا۔ آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں کہ میڈیا کو اپنا حق ادا کرنا چاہیے اور ہر صاحب ثروت کو چاہیے کہ وہ اپنے پاس غریب غربا کا خیال رکھیں۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ فضول رسموں پر لاکھوں خرچ ہوجاتے ہیں۔ اپنی محفل میں انٹری ماری تو محمد شکیل حیدر صدارت کی کرسی پر براجمان نظر آئے، مبارک ہو جی مختصر مگر اچھا تبصرہ تھا۔ تنولی صاحب اچھے لفظوں کا استعمال کرتے نظر آئے۔ اشوک کمار، الیلیٰ، بشریٰ افضل بھی مختصر مگر اچھا تبصرہ کرتے نظر آئے۔ بھائی اعجاز راحیل بھی اچھے مواد کے ساتھ موجود مگر پچھلی مرتبہ والے تبصرے پر خصوصی مبارکباد۔ لالہ مظہر ہم آپ کی بات سے سو فیصد متفق ہیں کوئی خطہ اس وقت تک زوال پذیر نہیں ہوتا جب تک ادیب موجود ہیں۔ ایک اور بات کہ سیاست کرنا کوئی بری بات نہیں حضرت سیدنا امیر معاویہ نے 19 سال تک حکومت کی اور دشمنانِ اسلام بھی آپ کی سیاست کو مانتے تھے۔ آج کے سیاستدان اپنے پیٹ کو آگے رکھتے ہیں وہ اللہ کا خوف دل میں رکھتے تھے۔ کہانیوں میں انٹری ماری۔ نقیر دوست ڈاکٹر ساجد امجد تاریخ کی ایک اچھی کاوش سامنے لائے۔ شمس الدین التمش نے کیا حکومت کی ہے اس کی تاریخ پڑھ کے مزہ آگیا۔ کاش ایک ایسا لیڈر امتِ مسلمہ کو اب مل جائے تو کیا کہنے۔ کاشف زبیر کی خاندان بھی اچھی اسٹوری تھی۔ رجّو بڑی دلیری کے ساتھ بارلی تک پہنچا۔ ستاروں پر کمند کیا کہنے جی، مزہ آگیا پڑھ کر۔ استفادہ بھی کافی اچھی اسٹوری تھی۔ ملک صاحب کی اشکِ ندامت ناصر کو قتل کروا کے بھی حیدر علی ریشم کو نہ پاسکا اور چودھری کو اپنی ورگت نے پھنسوا دیا اور پھر جیل کی ہوا کھانا پڑی۔ ریگ ساحل ٹھیک سی کر گئی۔ محفل شعر و سخن میں اس دفعہ گزارہ تھا۔ مانوس اجنبی اوکے تھی۔ ماروی اب تو دلچسپ سے دلچسپ تر ہوتی جارہی ہے۔ بیرونی تو تیں بھی شامل ہوگئیں۔ اپنا گھر بھی گزارہ کر گئی۔ پہلی بیوی بھی بہت اچھی اسٹوری تھی، بیچاری شاہ بانو۔ چال میں جیراللہ کی ذہانت اور دلیری کام کر گئی۔ لکیروں کے اسیر میں اسد نے بڑی قربانی دی۔ ویلڈن اس دفعہ شمارہ بہت بیسٹ تھا۔''

✠ الیلیٰ، کراچی سے محفل میں شرکت کر رہی ہیں'' انسان کی جبلت بھی عجیب شے ہے، نہ تین میں خوش نہ تیرہ میں۔ اگست کا شمارہ 15 جولائی کو موصول ہوا۔ سرورق نظروں کے رستے دل میں اتر گیا۔ جون ایلیا صاحب کی آزادی ایک المیہ آزادی ثابت ہوئی۔ اداریہ میں یوم آزادی اور عید سعید کے حوالے سے تسلی بخش باتیں پڑھنے کو ملیں۔ صاف گو ہونے کی وجہ سے بتا دوں کہ ہمیں یہ کوے کے مریضوں کی طرح پڑے ہوئے تبصرے بالکل اچھے نہیں لگے۔ حکیم سید رضا شاہ صاحب آپ نے کافی عرصے بعد محفل میں حاضری دی۔ جاوید صاحب اشوک کمار کے شوولا تیرا ابھی تک آپ کے دل میں کھبا ہوا ہے یا نکل گیا۔ نیازی صاحب محفل میں سب کا احتجاج پہنچانے کا شکریہ۔ اسٹوریز میں ڈاکٹر ساجد امجد کی نقیر دوست اوسط درجے کی رہی۔ التمش نے اپنی ذہانت اور بہادری سے یہ مقام حاصل کیا۔ سلسلے وار کہانیاں اپنی اپنی ڈگر پر جاری وساری

ہیں۔ ستاروں پر کمند ایک یادگار اسٹوری ثابت ہوگی۔ آخری صفحات پر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی لکیروں کے اسیر اچھی رہی۔ ہمارے معاشرے کا المیہ غصہ میں کیا گیا فیصلہ ساری زندگی کا روگ بن جاتا ہے۔ شعیب، روبی اور اسد کے کردار اپنی اپنی جگہ اچھے رہے۔ منظر امام صاحب کی پہلی بیوی بھی اچھی لگی۔ ملک صفدر حیات کی اشکِ ندامت اور ڈاکٹر شیر شاہ سید کی ریگ ساحل شاندار رہیں۔ مراسلے اس بار سارے اچھے تھے۔ محفل شعروسخن میں تمام اشعار بہترین انتخاب رہے۔"

✠ تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ سے تبصرہ کررہے ہیں "فلسطین میں یہودیت نے اہلِ غزہ پر ظلم وجبر کی انتہا کردی۔ اَن گنت معصوم اور نہتے لوگوں کو خاک وخون میں غلطاں کرکے رکھ دیا۔ یزید عہد رواں نے اس انداز بربریت کے ساتھ...... اہتمام کرب وبلا کیا کہ چشم افلاک بھی نم ناک ہوگئی۔ سوال یہ ہے کہ آخر امت مسلمہ ہی کیوں زوال وابتلا میں مبتلا ہے دیگر...... مسلم ممالک اور...... اقوام متحدہ کی طویل وتکلیف دہ خاموشی بے حسی کی شرمناک قابلِ صد افسوس اور...... لمحہ فکریہ ہے گویا...... یہ بھی ظالم کی حمایت کے مترادف ہے۔ جذبوں کا ترجمان...... سسپنس 16 اگست کو دستیاب ہوا۔ دوشیزۂ سرورق کے متبسم لب...... اور بے تاب ومنتظر نگاہوں میں فصل ہجر مسلسل کا کرب نارسا...... اس کے رنگ پر یاس کا زنگ لگ جائے تو عمریوں ہی اداس ورق کی اوٹ میں نہ آنے والوں کی راہیں تکتے تکتے بیت جاتی ہے۔ جون ایلیا نے تلخ لفظوں کا مجموعہ آزادی کا قرطاس اذہان وقلوب پر نوک خار سے رقم کیا اور احساس کے دامن کو لہولہو کردیا۔ تختِ طاؤس پر جھنگ کے محمد شکیل حیدر کا شاہانہ تاب وتمکنت کے ساتھ براجمان پایا۔ جھنگ بلا مبالغہ محبتوں اور وفاؤں کی سرزمین ہے اور اتفاق سے یہ ہمارے سسرال کا شہر بھی ہے۔ بہر حال تبصرہ قابل داد تھا لہٰذا تہ دل سے مبارکباد۔ کراچی سے محمد رضوان تنولی کے خوب صورت لفظوں کا مرکب بھی اچھا لگا۔ بہاولپور سے جنید نواز...... یاد رکھنے اور یاد کرنے کے لیے تہ دل سے ممنون نوازش۔ لاہور سے زویا اعجاز کا مفصل وبہترین تبصرہ بعد شوق ملاحظہ کیا۔ آخری صفحات پر بہترین مصنف کی منفرد اور محتاط وحساس تحریر، لکیروں کے اسیر دل کی آنکھوں سے پڑھی۔ شعیب کا کردار پسند نہیں کیا۔ روبی نے اسد کا جذباتی استحصال کیا اور ان کی معصوم محبت کو بارہا پامال کیا۔ اشکِ ندامت میں ملک صفدر حیات نے حق ادا کردیا۔ اس روداد قتل ومقتل نے کافی سے زیادہ مغموم افسردہ کیا۔ حسب روایت فقیر دوست نے معلومات میں بیش قیمت اضافہ کیا۔ مارد ہم نہیں پڑھتے لہٰذا اس پر تبصرہ وتنقید وتعریف سے معذرت۔ کہانیوں کی تاریخ کے مغلِ اعظم، طاہر جاوید مغل کی لازوال اور منفرد ومعتبر تحریر ستاروں پر کمند حتر ازل حوصلوں کو مہمیز کرتی ہے۔ اس کہانی اور کرداروں پر کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ بس طاہر جاوید مغل کا نام ہی کافی ہے۔ پسندیدہ مصنف کاشف زبیر کی پراثر تحریر خاندان نہایت دلچسپ اور سنسنی خیز ثابت ہوئی۔ خاندان سے صرف محبت ہی نہیں بلکہ اس کے تحفظ کے لیے محنت جدوجہد بھی کرنا پڑتی ہے۔ جج نے سچ مچ محبت محنت اور جدوجہد کی، ہارنی صدمے کی تاب نہ لاکر نفسیاتی مریض بن گیا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تلخ وسفاک تحریر ریگ ساحل نے پلکوں کو نم ناک کردیا۔ ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت کے احساسات وجذبات کو اسپتال کی ناقص انتظامیہ نے پامال کرکے رکھ دیا۔ تنویر ریاض کی اپنا گھر نے بھی بور نہیں کیا۔ نہایت مہارت ومحنت کے ساتھ بچھائی گئی جرم کی بساط کا انجام تھا۔ منظر امام نے اپنے مخصوص طرز تحریر سے ہٹ کر لکھا۔ پہلی بیوی کے سبق آموز انجام نے متاثر کیا۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی جہانیاں جہاں گشت ایک ولی کامل کی ایمان افروز سوانح حیات نے ایمان تازہ کیا۔ بزم شعروسخن میں قارئین کا عمدہ ومنفرد انتخاب بہترین ذوقِ مطالعہ کی دلیل ہے۔"

✠ ابرار وارث، سد لیانوالی سے محفل میں شریک ہیں "سرورق پر عید مبارک کا طرز خوب صورت تھا۔ سب سے پہلے جون ایلیا کی تحریر پڑھی اور یہی سوچتے رہ گئے کہ ہمارے بزرگوں نے انگریزی سامراج کی چھتر چھایا دھاندلی سے آخر فکر کیوں لی تھی؟ سب سے پہلے ستاروں پر کمند کی طرف بنا سوچ جھپ لگائی اور ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ واہ طاہر جاوید صاحب کیا خوب صورت قسط تھی۔ کہانی کی پہلی قسط نے ہی دل ودماغ پر قبضہ کرلیا تھا اور یہ قسط ہر لحاظ سے زبردست تھی۔ کہیں کہیں للکار کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ مارد کی قسط بھی زبردست تھی۔ مارد نے آخر دل خوش کر ہی دیا۔ اس اول جلول عدیلہ کو کمرے سے نکال کر۔ مراد غیر ملکی طاقتوں کی نظر میں آتو گیا لیکن ابھی تک تو ان کو مراد اور محبوب کی وجہ سے منہ کی کھانا پڑ رہی ہے۔ لکیروں کے اسیر شروع میں تو بہت زبردست لکھی لیکن آخر میں وہی کچھ ہوا جو آج کل ڈراموں میں ہوتا آیا تھا اور فلم "مجھے چاند چاہیے" میں ہوا تھا۔ اشکِ ندامت ملک صفدر حیات کی بہت اچھوتی تحریر تھی۔ ایک کے بعد ایک کردار نکلتا آیا مجھے جمیل پہ ہلکا سا شک ہوا تھا لیکن جمیل کہاں...... وہ تو دوسرے پنڈ کا کبڈی کا کھلاڑی قاتل جس نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ ریشم بے چارگی کے ہتھے کچھ لگا نہ اس کے منگیتر کے ہتھے کچھ آیا۔ سب سے بہتر کہانی پہلی بیوی، منظر امام کی تھی۔ شاہانو مرگئی پہلی محبت اور پہلی عورت کی طرح۔ ڈاکٹر شیر شاہ کی ریگ ساحل ہمیشہ کی طرح ملکی حالات کے رونے دھوتے مناظر اور غربت میں پستے غریبوں کی زندگی کی عکاس تھی۔ زمان اور صابرہ بے چارے بچے کو ترستے رہ گئے۔ نرس کی نیند اور آکسیجن کی کمی نے اس جوڑے سے ان کا منا چھین لیا۔ واہ رے قسمت غریب کی...... مجموعی طرز پر اس دفعہ کے رسالے میں ہر تحریر زبردست تھی جو ملکی کہانیاں تھیں خصوصاً ساری بہت پیاری تھیں۔ کاشف زبیر کی خاندان بلاوجہ اتنی طوالت اختیار کرگئی۔ ثمر عباس کی چال، جاوید مرتضیٰ کی استفادہ اور تنویر ریاض کی اپنا گھر بھی بہت زبردست تھیں۔"

✠ سید اکبر شاہ، اوگی، مانسہرہ سے تشریف لائے ہیں "ابتدائے ہم کلامی کے لیے پیش ہے سلامی...... تمام دل کے ساتھیوں کے لیے۔ رمضان المبارک کے بابرکت مہینے کی آمد سے برکت وعظمت کی برسات چار سو ہوئی ہے۔ مستفید ہونا شرط اول ہے۔ خود کے اندر جھانکا۔ بے شمار نقائص کی موجودگی دیکھی۔ یوں رب الکائنات سے مغفرت وبخشش کی دعا مانگی۔ سسپنس کی آمد خوشگوار ودل بہار، خلافِ معمول بلکہ پہلی بار 16 کو ہوئی۔ سرورق واقعی منفرد، قابلِ تعریف وتوصیف تھا۔ خوبرو حسینہ ایک خاص سی مسکان پیش کررہی تھی، باوجود اس کے کہ روزے کے سبب بھوک و پیاس

کا احساس ہو رہا تھا۔ انشائیہ میں جون ایلیا نے آزادی کے مفہوم پر نکتہ چینی کی۔ محفل خطوط، خاردار وراہ پُرخار ہی لگی۔ ایسی حالت میں کبیر عباسی کی آمد کا پڑھ کر تھوڑی تسکین ملی۔ ان کی ''نامناسب کمنٹس کو حذف کیا جاوے'' والی بات پر اتفاق ہے۔ محمد جاوید، قدرت اللہ، شوکت شہریار، مظہر سلیم نے بہت اچھا لکھا۔ بلیک لسٹ کی محفل میں اپنا نام مسلسل تیسری بار دیکھ کر جیسے رونا آ گیا مگر صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا کیونکہ سنا تھا کہ اس کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ بس اسی مٹھاس کی پیاس نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ تفسیر بھائی، شکیل بھائی اور صوبیہ آپی کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ اس بار تمام کہانیوں کا مطالعہ کیا جس میں ستاروں پہ کمند کی دوسری قسط سب سے پہلے پڑھی۔ سرمد صاحب کا راز بھیا نک اور انسانیت سوز واقعے کی نشاندہی کر رہا تھا۔ ساتھ یہ بھی پتا چلا کہ ان کا مقصد ہیرے و جواہرات کا حصول تھا۔ عادل کی ٹریننگ جاری رہی۔ چند غلطیاں مشکلات کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ مقصد کے حصول کے لیے تگ و دو کی ضرورت ہے۔ چھوٹی موٹی جھڑپیں دلچسپی میں اضافہ کرتی رہیں۔ اس بار ماروی عروج پر رہی۔ عدیل کا بھید ماروی پر کھلا، اچھا ہی ہوا۔ محبوب اور مراد کے لیے بھرپور خطرہ موجود رہا، بین الاقوامی تنظیموں سے۔ مراد کی رہائی اور حشمت جلالی کی بے بسی تسلی بخش ہے۔ اینڈ پُرتجسس اور سسپنس سے بھرپور و معمور تھا۔ ملک صفدر حیات کی اشکِ ندامت میں کبڈی کے ماہر کھلاڑی ناصر کی موت پر دلی دکھ ہوا۔ چودھری آفتاب اور حیدر علی کی انا پرستی اور سنگ دلی نے ایک قیمتی جان لی۔ ملک صاحب نے ماہرانہ صلاحیتوں سے قاتلوں کو بے نقاب کر دیا۔ الوداعی صفحات پر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی لکیروں کی اسیر کی سیر کی جہاں شعیب نے غصے میں آ کر روبی کو طلاق دی مگر بعد میں پچھتایا، یوں انہوں نے اسد کو قربانی کا بکرا بنایا۔ اختتام سحر زدہ اور دلچسپ تھا۔ ابتدائی صفحات کی تحریر فقیر دوست گزرے وقتوں کے چند دلچسپ واقعات کی عکاسی کر رہی تھی۔ جہاں تیر و تلوار سے ہولناک جنگیں دلچسپی اور تجسس کو بڑھاتی رہیں۔ وہیں سلطان التمش کے پس منظر پر حیرانی ہوئی۔ فقیر کی دعائے خیر نے حقیر غلام کو بادشاہی عطا کی۔ بہترین حکمت عملی اور ذہانت کے بل بوتے التمش نے کئی معرکہ آرائیوں میں کامیابی و کامرانی سمیٹی۔ ضیا تسنیم بلگرامی، جہانیاں جہاں گشت میں مخدوم جہانیاں (جلال الدین حسین) کی بزرگی و غیر معمولی صلاحیتوں کو بیان کر رہے تھے۔ کامل ولی اللہ کی روداد دل کو چھو گئی۔ مختصر فن پاروں کی طرف بڑھے۔ منظر امام کی پہلی بیوی ٹاپ رہی۔ نفیس کا تصوراتی طور پر درپیش حالات کو پہلے سے دیکھنا یا محسوس کرنا نہایت عجیب لگا۔ خرم کے حرم میں فروزاں کی آمد پہلی بیوی کے طور پر پڑھتے ہوئے دکھ ہوا تھا کہ اسے موت آئے گی۔ مگر نہ آئی کیونکہ خرم اور شاہ بانو پہلے سے ایک دوسرے کو ذہنی طور پر میاں بیوی قبول کر چکے تھے۔ دوسری پوزیشن حاصل کی کاشف زبیر کی خاندان نے۔ (زودار تالیاں)۔ زبردست تحریر تھی۔ باری نے انتقام لینے کی غرض سے کئی قتل کیے۔ پچ نکلیں نے اپنا خاندان باری کے غضب سے بچایا۔ تیسری پوزیشن جاوید مرتضیٰ کی استفادہ نے حاصل کی۔ مس کیرول کا رنگ و روپ بدلنا، خمیازہ بھگتنا پڑا مگر جیل جانا حق میں بہتر تھا۔ باڈی گارڈ اور ڈرائیور کا تعاقب طلسماں دلچسپ رہا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید نے حساس موضوع پر قلم کاری کی۔ ریگِ ساحل دکھ بھری کہانی تھی۔ مانوس اجنبی، اپنا گھر اور چال بھی تجربہ کار قلم کاروں کی گل بہار تحاریر تھیں۔ محفل شعر و سخن میں ہمارا اور دوسرا شعرا اعجاز راحیل کے زیر سایہ نظر آیا۔ ہارون رشید، حبیبہ ساجد اور فرحان شیخ کا انتخاب پسند آیا۔ مراسلات میں ریاض بٹ چھائے رہے۔ ویلڈن جناب۔ تمام اہلِ وطن کو یومِ آزادی مبارک ہو۔''

✠ بشریٰ افضل، بہاولپور سے جلوہ افروز ہیں ''ٹائٹل گرل چندا رے چندا! کچھ تو ہی بتا میرا افسانہ بے چین ہے کیوں یہ دل دیوانہ صنفِ نازک مسکراتے ہوئے گا رہی ہیں۔ بہت ہی خوش دکھائی دے رہی ہیں۔ کیوں نہ ہوں عید کی اپنی خوشی! چاند عید کا آب و تاب دکھلا رہا ہے۔ دروازے کی اوٹ سے جھانک رہی ہے۔ انشائیہ میں مرحوم جون ایلیا کی کھری کھری باتیں واقعی دل کو چھو لیتی ہیں۔ میرا اپنا دل کرتا ہے کہ ایک پرندہ ہوتی۔ دو غلی دنیا میں کیا رکھا ہے۔ دل میں کچھ باہر کچھ! اپنی محفل میں حاضری دی۔ انکل کی باتیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ خدا ہی ان کو ہدایت دے اگر عمل کریں تو جنت کے حق دار ہو جائیں شاید۔ کرسیِ صدارت محمد شکیل صاحب مبارکاں! انیلہ واقعی آپ کا اصل نام ہے، مہرین ناز کا تبصرہ پسند آیا۔ علی عمران، حجاب کنول، احسان سحر، اعجاز احمد، رضوان تنولی سب کا تبصرہ قابلِ تعریف تھا، پسند آیا۔ اپنا گھر میں کہانی میں یہ سبق ہے کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ جہانیاں جہاں گشت ولی کی واردات پڑھ کر بہت کچھ معلوم ہوا۔ ہمارے علم میں اضافہ ہوا۔ پارے چ مزے کے تھے۔ محفل شعر و سخن میں شعروں کا سلیکشن بہترین تھا۔ جبران احمد ملک پہلا نمبر مبارک ہو۔ شعر خوب صورت تھا۔''

✠ جنید احمد، کورنگی، کراچی سے شریکِ محفل ہیں ''اگست کا شمارہ 16 جولائی کو ملا۔ سرورق پر نگاہ پڑتے ہی بے اختیار منہ سے نکلا ویلڈن ذاکر صاحب۔ عید کا چاند اور محبوب دونوں کو دیکھ کر پری وش کی شرمگیں مسکراہٹ لاجواب ہے۔ انشائیہ میں جون ایلیا نے وہ کڑوا سچ بیان کیا جو جانے دونوں ممالک کے اربابِ اختیار کو کب سمجھ آئے گا۔ اداریے میں عید کی مبارک باد قبول کی اور دل کی گہرائیوں سے پاکستان کی سلامتی کی دعا پر آمین کہا۔ محفل دوستاں میں اپنا خط دیکھ کر دلی مسرت ہوئی۔ سسپنس جیسے معیاری ڈائجسٹ میں قابل تبصرہ نگاروں کے درمیان جگہ ملنا واقعی میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ شکریہ سسپنس۔ محمد شکیل حیدر واسو کو پہلا نمبر مبارک ہو۔ دیگر تبصروں میں رضوان تنولی کریڈی، زویا اعجاز اور عمران علی کے تبصرے پسند آئے۔ تمام قارئین کرام اور ادارے کو میری طرف سے عیدالفطر اور جشنِ آزادی مبارک ہو۔ فقیر دوست میں ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے عالم اسلام کے نامور اور مایا ناز فرزند اور ہمارے حکمرانوں کے لیے قابل تقلید بادشاہ سلطان التمش کے بارے میں لکھا جس کو پڑھ کر ذہن میں صرف ایک جملہ آیا کہ کاش ہمیں بھی ایسے حکمران مل جاتے۔ کہانیوں میں کاشف زبیر ایک بار پھر بہترین انتخاب لے کر آئے اور اس کے بعد ستاروں پر کمند پڑھی جس نے دوسری ہی قسط سے اپنے حصار میں لے لیا ہے۔ کیا زبردست اندازِ تحریر ہے۔ مغل صاحب اب اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ اشکِ ندامت میں ملک صاحب اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر ایک بار پھر سرخرو ہوئے۔ ریگِ ساحل میں ڈاکٹر شیر شاہ صاحب نے جیسے ہمیں کند چھری سے ذبح کر دیا۔ آنکھوں میں بے اختیاری تر آئی۔ محفل شعر و سخن میں ڈاکٹر ناہید شیخ اور محمد جاوید کا انتخاب پسند آیا۔ اپنا گھر اور مانوس اجنبی

گزارے لائق رہیں۔ کترنوں میں رضوان تنولی کریڈوی کی کترنیں مزہ دے گئیں۔ ضیا تسنیم بلگرامی نے تاریخ کے جھروکوں سے ایک دلی کامل کو ہم سے روشناس کروایا۔ لکیروں کے اسیر نے آخری صفحات کا حق ادا کر دیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی شروع سے آخر تک کہانی پر شاندار گرفت رہی۔ بلاشبہ اسٹوری آف دی منتھ رہی۔''

☩ مہرین ناز، حیدرآباد سے تشریف لا رہی ہیں ''سسپنس ڈائجسٹ 15 جولائی کو ہی مل گیا۔ سرورق عیدالفطر اور عید آزادی کا حسین امتزاج ہے۔ انشائیہ میں جون صاحب کی آزادی! کیا یہ وہی آزادی ہے جس کی ہم سزا بھگت رہے ہیں۔ اداریہ پڑھ کر دل کو بے حد تسکین و راحت ملی۔ واقعی ایک سچے مسلمان اور پکے پاکستانی کی ایسے ہی سوچ اور خیالات ہونے چاہئیں۔ اب چلتے ہیں اپنی پیاری محفل میں، جہاں صدارت محمد شکیل حیدر داسو کے حصے میں آئی مبارکباد۔ اشوک، الیلی، بشریٰ افضل اور اعجاز احمد راحیل اچھے تبصروں کے ساتھ موجود تھے۔ احسان سحر! اللہ تعالیٰ آپ کو شفائے کامل عطا کرے۔ جواب آپ کا تبصرہ پسند آیا۔ باقی حضرات کے تبصرے بھی قابلِ توجہ ہے۔ حسب معمول سب سے پہلے مغل صاحب کی ستاروں پر کمند پڑھی۔ یہ داستان بھی تحیر و تجسس سے بھرپور ہے۔ سسپنس ڈائجسٹ کی جان ہے۔ بار و ندا جنگی کو دوبارہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ساتھ ہی اس انکشاف نے حیرت زدہ کر دیا کہ سرمد صاحب جنگی کے استاد ہیں۔ ریگ ساحل میں ڈاکٹر شیر شاہ نے پاکستان میں اسپتالوں کی خستہ حالی اور اسٹاف کی بے حسی پر توجہ دلائی۔ ان والدین کے جذبات عیاں کیے جن کی اولاد نہیں ہوتی یا جنہیں اولاد کے حصول کے لیے کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ صابرہ اور زمان کے ساتھ ہوا۔ ملک صفدر حیات بھی حسد و رقابت پر مبنی واقعہ لے کر آئے۔ جواں سال ناصر کا بے دردی سے قتل، حیدر کی رقابت ریشماں اور چودھری آفتاب کا حسد کبڈی میں ہار تھا۔ ملک صاحب کا اندازِ بیاں دل کو بھاتا ہے۔ محی الدین نواب صاحب ماروی میں عدیل اور عدیلہ میں الجھے ہوئے ہیں اور ساتھ ہمیں بھی الجھا رہے ہیں۔ کہانی جان نہیں پکڑ رہی۔ تنویر ریاض کی اپنا گھر میں سونیا کو اپنی لائف کی ٹریجڈی کی حقیقت معلوم ہونے پر قیامت ٹوٹ پڑی مگر جلد ہی اس کے اپنوں نے آکر اس کو سمیٹ لیا۔ پسند آئی یہ اسٹوری۔ شمر عباس کی چال کچھ خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔ آخری صفحات پر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی لکیروں کے اسیر لے کر آئے۔ کہانی میں کافی جگہوں پر جھول تھا۔ اسد کا رول اچھا تھا۔''

☩ اعظم علی، رسولنگر، شیخوپورہ سے چلے آرہے ہیں۔ ''اس مرتبہ شمارہ 19 تاریخ کو میرے غریب خانے پر پہنچا مگر اپنی ازلی سستی کی وجہ سے میرے قابو رات گئے آیا کیونکہ بیگم اہل خانہ نے بھی ہمیشہ کی طرح ڈائجسٹ پر یکے بعد دیگرے ہلّا بول دیا۔ صد شکر کہ سالم حالت میں رسالے پر اپنی اجارہ داری قائم کی۔ خیر، عید مبارک کا انداز اچھا لگا۔ سب سے پہلے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنا کف اور اقوالِ زریں کا مطالعہ کیا۔ جون ایلیا پر بھی نظر دوڑائی، پڑھ کر مزہ آگیا مگر اس مرتبہ بھی کچھ خاص سمجھ نہ آئی۔ اس کے بعد ستاروں پر کمند ڈالنے کی کوشش کی جو کامیاب ثابت ہوئی کیونکہ کسی کے چھیننے سے قبل ایک ہی نشست میں مکمل کی۔ موصوف اپنے پہلے مشن میں ہی ساتھیوں کو مشکلات میں ڈالنے میں معروف نظر آئے۔ قسط مجموعی طور پر کافی زبردست رہی۔ باقی حسب معمول رسالہ آخر سے پڑھنا شروع کیا۔ لکیروں کے اسیر نے متاثر کیا۔ ریگ ساحل میں ڈاکٹر صاحب نے عوام کی توجہ واقعی ایک نہایت اہم مسئلے کی طرف دلائی ہے۔ مشینری کے ساتھ ساتھ اگر پیرا میڈیکس بھی بیرون ملک سے منگوائے جائیں تو شاید صورت حال بہتر ہو سکے۔ مانوس اجنبی کافی اچھی رہی۔ تاہم پہلی بیوی میں کہانی کے انجام نے زیادہ متاثر نہ کیا۔ ماروی بھی زبردست جا رہی ہے۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔''

☩ وسیم احمد خان، خانیوال سے جولائی کے شمارے پر تبصرہ لے کر حاضر ہیں ''جولائی کا شمارہ اس مرتبہ 18 کے بجائے 20 کو ملا۔ اس چلچلاتی گرمی میں خوب صورت رنگوں کا امتزاج لیے سرورق آنکھوں کو تراوٹ بخش گیا۔ بھائی صفدر معاویہ سنے دیکھم کیا تھینک یو۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ستاروں پر کمند پڑھی۔ پہلی قسط میں ہی اندازہ ہو گیا کہ عادل کو اس کی محبت ضرور ملے گی عادل اپنی منزل کو پالے گا۔ اس کے بعد ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کوکھ کا دکھ پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ ماں اپنی اولاد کے لیے کتنے دکھ اٹھاتی ہے جن کا ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ تنویر ریاض کی فرار، بابر نعیم کی لاوا اور منظر امام کی جل بھونی پڑھی۔ منظر امام کی تحریریں مسکراہٹ بکھیر دیتی ہیں اور آخری صفحات پر آب طلب پڑھی۔ ڈاکٹر ساجد امجد درخشاں کا اینڈ اچھا نہیں ہوا اور متین صاحب کی خودغرضی نے اکرام اور درخشاں کے بیچ روڑے اٹکائے۔ کہانی کا اینڈ پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ رضوان تنولی کی کترنیں اور سید اکبر شاہ کی کھلکھلاہٹیں مزہ دے گئیں۔ محفل شعر و سخن میں سوہا جی لاہور، رمضان پاشا کراچی، زاہد چودھری، السیٰی کراچی، اشفاق سیال کا انتخاب اچھا لگا۔ ایک مرتبہ میرا خط پھر شائع ہوتے ہوتے رہ گیا اور بلیک لسٹ میں بھی نام شامل نہیں تھا۔ اس مرتبہ پھر توی امید ہے کہ یہ خط شائع ہوگا۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

اطہر حسین، کراچی۔ ڈاکٹر نعیم عباس، لاہور۔ محمد زریان سلطان، اردو بازار کراچی۔ تبسم وقار، ملتان۔ اختر راحیل، سکھر۔ صائمہ سرفراز، داود۔ نوشین معین الدین، گولیمار، کراچی۔ انعم پرویز، مرجانی، کراچی۔ سمیرا شاہنواز، لاہور۔ اکرم خان، لاہور۔ ایوب مجید، خانیوال۔ مقصود حیات، بہاولپور۔ رقیہ خانم، بھکر۔ رخشندہ، نور، ڈیرہ غازی خان۔ امتیاز خان، ضلع اٹک۔ حفیظ الرحمن، کراچی۔ عامر ضیا، مرجانی، کراچی۔ الحاج علوی، مقام نامعلوم۔ انجم فاروق ساحلی، لاہور۔ ایم افضل کھرل، ننکانہ صاحب۔

بہ نوکِ خنجر

الیاس سیتاپوری

تاجداری اپنی جگہ خوش فہمی سہی لیکن... سرداری کانٹوں کا ایسا تاج ہے... جو کسی کے سر پر رکھا جاتا ہے تو وہ تمام عمر دربدری میں مبتلا رہتا ہے... اور درد بھی ایسا جس کی نبسیں ملکی نظم و نسق کی بنیادیں تک ہلا دیتی ہیں۔ بہرحال جو بھی ہو حقیقت فقط اتنی سی ہے کہ تاج و تخت نے ہمیشہ جسے اپنے حصار میں لیا گویا اس کی زندگی کو امتحان میں ڈال دیا... اور امتحان پر پورا اترنے کا طریقہ اگر کوئی اختیار کر لے تو سرفراز اور جو نہ کرے تو بے قرار ٹھہرے مگر یہ سب اس کی اپنی صوابدید پر منحصر ہوتا ہے... یہی وجہ ہے کہ آج بھی تاریخ کے تناظر میں کامیاب اور ناکام شہنشاہوں کی فہرست جدا ہے... ماضی کا یہ دور بھی مختلف قوموں کے اجتماع کا مظہر ہے جن کے الگ الگ نظریات اور طرزِ زندگی نے حالات کو مشکل ترین بنا دیا تھا لیکن... بہلول جیسے زیرک سردار کی فہم و فراست نے اختلافات کی شکار مختلف قوموں کو ایک نقطے پر ایسا مرکوز کر کے متحد کر دیا تھا کہ آج بھی اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ جو ہمیشہ مرنے مارنے پر آمادہ تھے، دھیرے دھیرے اتحاد و اتفاق کی جانب مائل ہوتے چلے گئے۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

جب سکندر تحفہ اور جسرت کھکھر نے بہلول کے چچا فیروز خان کو قید اور اس کے بیٹے شاہین خان کو باقاعدہ جنگ میں قتل کر کے سرہند پر قبضہ کر لیا تو دہلی کے بادشاہ محمد شاہ کو یہ خوش خبری بھیج دی گئی کہ شاہی افواج نے بادشاہ کے اقبال اور خدا کی مہربانی سے سرہند میں افغانوں کی قوت پارہ پارہ کر کے ملک بہلول لودھی کو خانماں برباد و آوارہ وطن کر دیا ہے۔ بادشاہ مارے خوشی کے اچھل پڑا اور سکندر تحفہ کو انعام میں سرہند کی حکومت بخش دی۔

بہلول لودھی نے جب ایک پہاڑ کی کھوہ میں یہ بری خبر سنی کہ اس کا چچا زاد بہادر بھائی شاہین قتل کر دیا گیا اور سرہند میں موجود افغانوں کو قید یا منتشر کر دیا گیا ہے تو وہ بہت پریشان ہوا۔ اس کو ابھی تک یہ نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ اس کے چچا فیروز خان کا کیا حشر ہوا؟ مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا سرسبز و شاداب کوہستانی سلسلہ اس کا ملجا و ماویٰ بنا ہوا تھا۔ اب اس کے پاس محض چند ہزار افغان رہ گئے تھے۔ وہ ان کی تعداد بڑھانے کی فکر میں تھا لیکن اب اس آوارہ وطن مفتوح اور مفرور کے پاس نہ تو حکومت تھی اور نہ مال و زر۔

اس کو اپنے چچا اسلام خان مرحوم کے بیٹے قطب خان پر بہت غصہ تھا جس کی وجہ سے وہ اور اس کے ہم قوم افغان یہ دورِ نکبت و افلاس دیکھ رہے تھے۔ وہ پہاڑ کی وسیع و عریض کھوہ میں بیٹھا مستقبل کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اس کے آدمی کھوہ کے باہر کوہستانی سلسلوں میں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور ان کا کام یہ تھا کہ جس کسی کو بھی متجسس اور متلاشی دیکھیں، بہلول لودھی کو فوراً خبر دیں۔ یہ آدمی اتنے مستعد اور چوکس تھے کہ بہلول لودھی کو ان پر فخر تھا۔

بہلول کا اپنا کنبہ بھی اسی کھوہ میں روپوش تھا۔ بہلول نے اپنے سربر آوردہ حمایتیوں اور دوستوں کو اپنے اردگرد کھڑا کیا اور موجودہ صورتِ حال پر مشورے طلب کرنے لگا۔ بہلول نے ان سے کہا۔

''اے میرے ہم قومو! دہلی کی سلطنت کسی شخص یا خاندان کی میراث نہیں ہے۔ اگر تم لوگ میرا ساتھ دو گے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے عوض میں تمہیں ہندوستان کا مالک و مختار بنا دوں گا۔''

کسی افغان نے کھڑے ہو کر سوال کیا۔ ''ہم تیری کیا مدد کریں؟ اور اس کا کیا ثبوت ہے کہ اگر دہلی کی حکومت تجھے مل گئی تو اس پر تو خود حکومت نہیں کرے گا اور اس پر اپنی قوم افغان کو حکمران بنا دے گا؟''

بہلول نے جواب دیا۔ ''تم سب مال و زر سے میری

مدد کرو کیونکہ فوج اکٹھی کرنے کے لیے مال وزر کا ہونا ضروری ہے۔ رہی یہ بات کہ میں دہلی کی حکومت حاصل کرنے کے بعد اپنے علاوہ کسی اور کو حکمران بنادوں گا تو یہ تیری خام خیالی ہے اور خوش فہمی ہے۔ حکومت میں خود کروں گا لیکن اس حکومت میں افغانوں کو شریک رکھا جائے گا۔‘‘

کئی افغانوں نے ایک ساتھ اعلان کیا۔ ’’ہم بہلول کی مدد کریں گے اور اس کی فوج کے لیے مال وزر مہیا کریں گے۔‘‘

ایک عمر رسیدہ افغان نے کھڑے ہو کر وعدہ کرنے والوں کو منع کیا۔ ’’لالچ نے تم سب کو اندھا کردیا ہے۔ ہم سب سرہند میں اچھے خاصے رہ رہے تھے لیکن خدا برباد کرے اس ملک بہلول کو جس نے دہلی کی حکومت کی طمع میں جو پاس تھا، اسے بھی کھودیا۔ بھائیو! ہم سے اگر کوئی شخص ہمارا گھوڑا چھیننا چاہے تو اس کے لیے ہم اپنی جان دے دیں گے مگر گھوڑا نہیں دیں گے پھر یہ خوش فہم اور کم عقل بہلول محمد شاہ سے دہلی کی حکومت کس طرح چھین لے گا؟‘‘

بہلول نے بڑے تحمل کا ثبوت دیا اور معترض عمر رسیدہ افغان سے پوچھا۔ ’’بابا! اگر ہم تیری بات مان لیں اور دہلی کی سلطنت کا خواب نہ دیکھیں تو زندہ رہنے کے لیے کون سا پیشہ اختیار کریں؟‘‘

معمر افغان نے جواب دیا۔ ’’تجارت..... تیرا دادا بھی تاجر ہی تھا۔‘‘

بہلول نے ہنس کر کہا۔ ’’لیکن میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میری قوم اگر تجارت بھی کرے گی تو اپنی حکومت میں، اس کی سرپرستی سے کرے گی۔ بابا! تُو بہت زیادہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ تیرے جوش اور ولولوں میں بھی تیری کھال ہی کی طرح جھریاں پڑ چکی ہیں۔ ہم جوانوں کو اپنے شایانِ شان کاموں میں لگا رہنے دے۔‘‘ پھر دوسروں کو مخاطب کیا۔ ’’میرے بھائیو! میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم میرا ساتھ دو، میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ تم مجھے کچھ دو گے، میں اس سے کئی گنا زیادہ واپس کروں گا۔‘‘

بوڑھے نے پھر مخالفت کی۔ ’’کئی گنا زیادہ کی طمع میں جو پاس ہے، اسے بھی گنوا دو گے۔ تجارت کرو، تجارت کرکے اپنے مال وزر میں اضافہ کرو۔ حکومت کی خواہش میں اپنی اصلی پونجی بھی برباد کردو گے۔‘‘

بہلول نے بوڑھے کو سختی سے منع کیا۔ ’’بابا! تو اپنی دقیانوسی سڑی گلی باتوں سے میرے جفاکش اور سلطنتوں پر کمندیں پھینکنے والے نوجوانوں اور بہادروں کو پست حوصلہ نہ کر۔‘‘ پھر اپنے ساتھیوں سے کہا۔

’’میرے دوستو! جن کے پاؤں قبر میں لٹکے ہوئے ہیں میں ان سے تو مخاطب بھی نہیں۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ اب تک ہم سب جن نااہلوں اور نالائقوں کے دربار میں دست بستہ کھڑے ہوتے رہے ہیں انہیں اب اس طرح مؤدب اور دست بستہ ہمارے روبرو کھڑا... ہونا پڑے گا۔‘‘

کئی پُرجوش نوجوانوں نے کھڑے ہو کر اعلان کردیا۔ ’’ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے بوڑھوں کو کابل بھیج دیں کیونکہ وہاں ان کا آبائی قبرستان بڑی بے چینی سے ان کا انتظار کر رہا ہے۔‘‘

ایک نوجوان تیزی سے اٹھا اور حاضرین کے سروں اور کاندھوں کو پھلانگتا ہوا عمر رسیدہ افغان کے پاس پہنچ کر اس کو سونگھنے لگا۔ سر، منہ، پشت اور پیٹ، جسم کے کئی حصوں پر ناک رکھ رکھ کر زور زور سے سانس کھینچتا رہا پھر اچانک اس بوڑھے کو دونوں شانوں سے پکڑ کر اس کا چہرہ اپنے روبرو کرلیا اور ہنستے ہوئے کہا۔

’’بابا! تمہارے جسم سے تو کفن اور کافور کی بو آرہی ہے۔‘‘ پھر بہلول سے کہا۔ ’’ملک بہلول! تو اپنا کام کر، بھلا مُردوں کا زندوں میں کیا کام۔ یہ تو قبر کی امانت ہے، آج نہیں تو کل اس کے حوالے کردی جائے گی۔‘‘

بوڑھے کو غصہ آگیا۔ اس نے نوجوان کی گدی پکڑ لی اور کئی زوردار جھٹکے دیتے ہوئے کہا۔ ’’میں اب بھی تیرا کام تمام کرسکتا ہوں۔‘‘

بہلول نے مداخلت کرکے دونوں کو الگ کردیا اور کہا۔ ’’بھائیو! ایسی کوئی بات نہ کرو جس سے ہم نفاق کا شکار ہو جائیں۔ اس بزرگ کی سمجھ میں جو بات آج نہیں آرہی ہے کل ضرور آجائے گی۔ ہم اس کی بات پر افسوس تو کرسکتے ہیں لیکن مایوس نہیں ہوں گے۔‘‘

اب بوڑھے کی حمایت میں بھی کئی افغان کھڑے ہو چکے تھے۔ بوڑھا بھاگ کر ان میں جا کھڑا ہوا اور اعلان کیا۔ ’’میرے ہم قبیلہ افغانو! ادھر میرے پاس آجاؤ۔ ہم سب دہلی چل کے قطب خان کے پاس رہیں گے۔ آج سے قطب خان ہمارا سردار ہے۔ یہ بہلول الو بنا رہا ہے۔ یہ دہلی اس لیے پہنچنا چاہتا ہے کہ وہاں اس کی محبوبہ سنار کی بیٹی زیبا اس کا انتظار کر رہی ہے اور ایک دیوانے نے اس کو تیرہ سو تنکوں کے عوض دہلی کی حکومت دے رکھی ہے۔ یہ خود تو ڈوبے گا ہی مگر اپنے ساتھ اپنی قوم کو بھی برباد کردے گا۔‘‘

کئی دوسرے بوڑھوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ یہ مختلف قبیلوں کے بوڑھے تھے، ان سب نے اپنے اپنے ہم

قبیلہ لوگوں کو بہلول سے الگ کرلیا۔ بہلول نے کھیل بگڑتے دیکھا تو پریشان ہوگیا۔ اس نے بڑے پُرعزم لہجے میں کہا۔

''میرے افغان بھائیو! اگر تم سب میرا ساتھ چھوڑ دو گے تو میں اپنا کام پھر بھی جاری رکھوں گا۔ دہلی سلطنت کی شاندار عمارت اپنے دیمک زدہ ستونوں پر اب مزید کھڑی نہیں رہ سکتی۔ اس عمارت کو افغان ستون درکار ہیں اور میں نے تہیہ کرلیا ہے کہ میں اپنی قوم کو ستون بنا کر اس عمارت کو اپنی تحویل میں لے لوں گا پھر اس عمارت کے سائے میں وہ افغان بھائی بھی بیٹھ سکیں گے جو آج مجھ سے ناراض ہوکر الگ ہوئے جارہے ہیں۔ میرے ناراض بزرگ اور بھائی مجھے یہ دھمکیاں دے رہے ہیں کہ وہ میرے مقابلے میں قطب خان کو اپنا سردار بنالیں گے لیکن میں ان سے یہ پوچھتا ہوں کہ قطب خان سردار کہاں رہا؟ وہ سردار نہیں غدار ہے جو دہلی کی فوجیں اپنے افغان بھائیو پر چڑھا لایا اور ہمیں بے گھر، بے در اور بے نشان کردیا۔''

پُرجوش نوجوانوں نے ناراض بوڑھوں اور ان کے حامی ہم قبیلہ لوگوں پر حملہ کردیا اور مار پیٹ شروع ہوگئی۔ بہلول اور اس کے ساتھیوں نے بیچ بچاؤ کروانے کی کوشش کی۔ مرحوم اسلام خان کی بیٹی اور بہلول کی بیوی عورتوں میں سے نکل کر مردوں میں آگئی اور چیخ چیخ کر جھگڑنے والوں کو مخاطب کیا۔

''بھائیو! دیکھو میں اسلام خان کی بیٹی اور قطب خان کی بہن تمہارے سامنے کھڑی ہوں۔ دہلی پر افغان حکومت کریں، یہ صرف میرے شوہر بہلول ہی کی خواہش نہیں ہے۔ یہ میرے مرحوم باپ اسلام خان کی بھی سب سے بڑی تمنا تھی۔ اس نے اپنے بھتیجے بہلول میں جب اپنے ہی جیسا حوصلہ اور اپنی ہی جیسی خواہش دیکھی تو اس سے میری شادی کردی اور اپنا جانشین قرار دیا۔ خدا کے لیے باہمی جنگ وجدل سے باز آجاؤ اور میرے شوہر بہلول کا ساتھ دے کر سلطنت دہلی پر قبضہ کرلو۔ میرا بھائی قطب خان سردار نہیں غدار ہے۔ اگر تم نے اس کو اپنا سردار بنالیا تو میں تمہیں بھی غدار ہی سمجھوں گی۔''

اتنے میں چند دیدبان افغان بھاگتے ہوئے آئے اور سب کو مطلع کیا۔ ''بھائیو ہوشیار! ہم نے اپنی پہاڑیوں میں بہت سارے گھوڑوں کے سرپٹ دوڑنے کی آوازیں سنی ہیں۔ شاید دہلی کی تعاقب کرنے والی فوجیں ہماری تلاش میں یہاں تک پہنچ چکی ہیں۔''

بہلول نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ ''جو افغان آپس میں برسرِ پیکار ہیں، انہیں یہیں چھوڑ دو۔ جو میرے ساتھ ہیں، میرے ساتھ رہیں۔ میں اپنے دشمنوں کا مقابلہ کروں گا۔'' آپس میں گتھم گتھا افغان نرم پڑ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے لڑائی بند ہوگئی۔

بہلول نے اپنی بیوی کو عورتوں میں بھیج دیا اور خود ایک جمعیت کے ساتھ مقابلے کے لیے چل پڑا۔ اب گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بہلول بھی سن رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''سواروں کی تعداد زیادہ نہیں ہے اس لیے یہ ہمارے دشمن نہیں ہوسکتے۔''

بہلول اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک تنگ درّے کے منہ پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت دی کہ آنے والوں پر اس وقت تک حملہ نہ کیا جائے جب تک ان کے بارے میں یہ یقین نہ ہوجائے کہ وہ سلطنت دہلی کے آدمی ہیں۔

درے میں داخل ہوتے ہوئے آنے والوں کے گھوڑوں کی رفتار سست پڑ گئی تھی۔ چٹانوں کی آڑ سے بہلول نے بیس پچیس سواروں کو انتہائی یاس اور افسردگی کے عالم میں آتے ہوئے دیکھا۔ سب سے آگے جو شخص تھا، وہ ایک چھوٹی سی گٹھری اپنے آگے رکھے اپنے چہرے کو بڑے رومال میں چھپائے گھوڑے کو دلکی چال میں بھگا رہا تھا۔ ان سواروں کے لباس اور وضع قطع میں افغانیت محسوس ہورہی تھی۔ بہلول اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک دم نمودار ہوکر چیخا۔

''خبردار! جو آگے بڑھے۔ یہیں رک جاؤ، تم کون ہو؟''

آنے والوں نے اپنی اپنی تلواریں نیام سے باہر کرلیں اور بہلول کی طرف مڑے لیکن ان کے سردار نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں منع کیا کہ حملہ نہ کیا جائے۔ اس کے بعد وہ گھوڑا بھگاتا ہوا بہلول کے پاس پہنچ گیا اور اپنے گھوڑے کو اس کے مقابل روک کر بولا۔

''تو ہم سے پوچھتا ہے کہ ہم کون ہیں؟'' اس کے بعد اس نے اپنے چہرے سے رومال کھینچ کر ہوا میں لہرا دیا۔ ''دیکھ اور پہچان کہ میں کون ہوں۔''

بہلول کے منہ سے چیخ سی نکل گئی۔ ''چچا فیروز آپ۔''

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''ہاں، میں تیرا چچا فیروز ہوں۔'' پھر اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ میرے ساتھی سب تیرے ہی بھائی بند ہیں۔''

بہلول نے محسوس کیا چچا فیروز کی آواز گلے میں پھنس رہی ہے، پوچھا۔ ''عم محترم! سچ بتائیں، آخر بات کیا ہے؟ رہی یہ بات کہ آپ کو شکست ہوگئی تو رزمگاہوں میں ہمیشہ یہی ہوتا چلا آیا ہے کہ ایک جیتتا ہے تو دوسرا ہار جاتا ہے۔

اس میں دل برداشتہ ہونے کی کیا بات ہے؟''

فیروز نے پوچھا۔''اور سب کہاں ہیں؟''

بہلول نے جواب دیا۔''یہیں، کوہستانی سلسلوں میں روپوش ہیں۔''

فیروز نے کہا۔''پھر وہیں اپنے لوگوں میں چلو۔ مجھے اپنوں سے کچھ شکایتیں کرنا ہیں۔''

بہلول اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چچا فیروز اور ان کے ہمراہیوں کو لیے ہوئے اپنے افغانوں میں واپس آگیا۔ وہاں ہر کوئی روپوش ہو چکا تھا۔ بہلول نے بہ آوازِ بلند انہیں مطلع کیا۔

''میرے ہم قوم لوگو! باہر آجاؤ۔ چچا فیروز اپنے ساتھیوں کو لے کر ہم میں واپس آگئے ہیں۔''

بہلول کی آواز چٹانوں سے ٹکرا کر واپس آگئی اور اس کے ساتھ ہی پہاڑی کھوہ، چٹانوں اور پتھروں کی آڑ سے افغان مرد اور عورتیں نمودار ہونے لگے لیکن بچوں کو اب بھی روپوش ہی رکھا گیا تھا۔ افغانوں نے فیروز اور اس کے ساتھیوں کی آمد کی خوشی میں ناچنا تھرکنا شروع کردیا۔

بہلول نے دیکھا چچا فیروز کے ہاتھ میں جو پوٹلی تھی، اب وہ ان کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ فیروز آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک پہاڑی چٹان سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ اب اس کی پشت چٹان سے ٹک گئی تھی اور اس کا منہ اپنے افغان بھائیوں کی طرف تھا۔ اس نے بہلول کو آواز دی۔

''بہلول! اپنی بیوی اور اس کے بھائیوں کو لے کر میرے پاس آجا۔''

بہلول نے چچا کے حکم کی تعمیل کی اور اپنی بیوی اور سالوں کو لے کر ان کے پاس چلا گیا۔

اس وقت ہزاروں افغان فیروز کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ ان میں وہ بوڑھے اور ان کے حمایتی سب سے آگے تھے جو کچھ دیر پہلے بہلول سے ناراض ہو کر دست بہ گریباں ہوگئے تھے۔ انہیں فیروز اور اس کے ساتھیوں کی آمد سے یہ امید پیدا ہوگئی تھی کہ شاید اب افغانوں کی سرداری بہلول کے ہاتھ سے نکل کر اسلام خان مرحوم کے بھائی فیروز خان کے ہاتھوں میں چلی جائے گی۔ ان کے چہروں سے خوشی اور بہلول کے حق میں طنز و استہزا کی کیفیت ہویدا تھی۔

فیروز نے اپنے افغان بھائیوں سے کہا۔''میرے بزرگوار دوستو! مجھے یہ بتاؤ کہ میں نے اپنے بھتیجوں اور بھتیجیوں کو کبھی کوئی تکلیف پہنچائی؟''

بہت سی آوازوں میں بہلول کی آواز سب سے نمایاں تھی۔ اس نے کہا۔''نہیں، میں اس کا گواہ ہوں کہ آپ کی ذات سے ہمیں کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔''

فیروز خان نے رقت زدہ آواز میں کہا۔''پھر یہ میرے بھائی اسلام خان مرحوم کے بیٹے قطب خان نے ہمارے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟ وہ ہمارے دشمنوں سے مل کر ہم پر فوج چڑھا لایا اور میرے کلیجے کو چھلنی اور دل کو مسل کر پھینک دیا۔ میں اپنی بھتیجی اور بہلول کی بیوی سے یہ پوچھتا ہوں کہ اس کے بھائی قطب خان نے میرے ساتھ یہ زیادتی کیوں کی؟''

بہلول نے اپنی بیوی کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے چچا فیروز خان سے پوچھا۔''کیا میں عمِ محترم سے ان کے اس اجمالی سوال کی تفصیل معلوم کرسکتا ہوں؟''

فیروز خان نے اپنے سینے سے لگی پوٹلی کو کپکپاتے لرزتے ہاتھوں سے کھول کر اپنے بیٹے شاہین خان کا سر سب کے سامنے رکھ دیا اور کہا۔''یہ میرے بیٹے شاہین خان کا سر ہے جو قطب خان کی غداری کی نذر ہوگیا۔''

اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور ہونٹ کپکپانے لگے۔ دونوں آنکھیں بند ہو چکی تھیں اور ان سے اندرونی طوفان کا اندازہ لگانا مشکل ہوگیا تھا۔

افغانوں نے ایک دوسرے کو دھکیل کر اور اپنے آگے کھڑے ہوئے افغان بھائیوں کے کاندھوں پر سے جھانک جھانک کر شاہین خان کے سر کا مشاہدہ کیا اور اپنے دلوں پر چوٹ لگتی محسوس کی۔ بہلول اور اس کی بیوی کے دل زیادہ غم زدہ تھے۔ فیروز خان نے کسی سوال کے بغیر خود ہی ساری تفصیل بتادی اور کہا۔

''میں کبھی یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ میرا اپنا خون اور میرے سب سے زیادہ لائق مرحوم بھائی اسلام خان کا فرزند ایسی حرکت کرے گا۔''

لیکن قطب خان کی بہن، بہلول کی بیوی اپنے بھائی کے کرتوتوں پر ذرا بھی نہ شرمائی۔ اس نے شیرنی کی طرح گرج کر کہا۔''عمِ محترم اور میرے افغان بزرگوار اور بھائیو! ذرا یہ تو بتانا کہ کل قیامت کے دن ہمیں اپنے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے یا دوسروں کے اعمال کا بھی ہمیں جواب دہ ... ہونا پڑے گا؟''

بہلول نے جواب دیا۔''میری بیوی کے سوال کا جواب ہے کہ ہمیں مرنے کے بعد اپنے اپنے اعمال کا جواب دینا پڑے گا۔ دوسروں کے اچھے برے اعمال نہ ہمیں

نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع۔''

بہلول کی بیوی نے کہا۔''پھر میرے بھائی قطب خان کی غداریوں کا ذمے دار ہمیں کیوں ٹھہرایا جائے؟ اس پر ہمیں کیوں شرمندہ کیا جائے؟ میں اپنے بھائی کے گناہوں کا بوجھ اٹھانے کو تیار نہیں۔''

بہلول نے مضبوط لب ولہجے میں کہا۔''میری بیوی نے جو کچھ کہا، اس میں بال برابر بھی جھوٹ نہیں۔ اب میں اپنے ان بزرگوار اور ان کے حمایتی افغانوں سے یہ پوچھوں گا کہ کیا تم لوگ اب بھی میرے برادرِ نسبتی اور غدار قطب خان کے پاس جانا چاہو گے؟''

بہلول نے اپنے ساتھیوں کو اپنے قریب بلالیا اور ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔''افغان بھائیو! میرے چند بزرگ اور ان کے حمایتی ابھی ذرا دیر پہلے ہم میں انتشار پھیلا رہے تھے۔ آپ بتائیں کیا میں انہیں یہاں اپنے پاس بلوالوں یا اپنے پاس سے جدا کردوں؟''

وہ بزرگ، لوگوں کو دھکیلتا ہوا فیروز خان کے پاس پہنچ گیا جس کو تھوڑی دیر پہلے طنز و مذاق کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس نے فیروز خان سے کہا۔

''فیروز خان! میں اور میرے ساتھی بہلول کی سرداری سے بیزار ہو چکے ہیں۔ اب تم ہم میں آچکے ہو اس لیے تم ہی سرداری کا جوا اپنی گردن میں ڈال لو۔ اسی طرح ہم میں اتحاد اور اتفاق برقرار رہے گا ورنہ ہم ان گنت ٹکڑیوں میں بٹ جائیں گے۔''

فیروز خان نے ان کو جھڑک دیا۔''یہ تم لوگ کیا بک رہے ہو؟ مرحوم بھائی اسلام خان نے بہلول کو امیر نامزد کردیا تھا۔ اس لیے یہ ہمارا فرض ہے کہ اسلام خان کے حکم کی تعمیل کریں۔''

بہلول نے بیزاری سے کہا۔''افغان بھائیو! میں اسلام خان کا بھتیجا اور داماد ہوں۔ مجھے عہدے مناصب کی کوئی پروا نہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہم میں اختلاف اور نفاق کا پودا نہیں پلنا چاہیے۔ اگر میری سرداری سے میری قوم کو نقصان پہنچ جانے کا احتمال ہے تو میں سرداری سے دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔''

بہت سارے افغانوں نے بیک آواز کہا۔''بہلول! تجھے اسلام خان نے اپنا جانشین نامزد کردیا تھا اس لیے تو اپنی مرضی سے یہ منصب نہیں چھوڑ سکتا۔''

بہلول نے گلوگرفتہ آواز میں کہا۔''سرداری کانٹوں کا تاج ہے۔ جب یہ کسی کے سر پر رکھا جاتا ہے تو وہ زندگی بھر دردِ سری میں مبتلا رہتا ہے۔ میرے افغان بھائیو! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم نے ہمارا ساتھ دے دیا تو میں اس کے عوض تمہیں ہندوستان کے تخت و تاج کا مالک بنادوں گا۔''

مخالفوں کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ لاجواب ہو کر چپ ہو گئے۔

بہلول نے شاہین کا سر دونوں ہاتھوں میں لے کر بڑے غور سے دیکھنا شروع کیا پھر کٹے ہوئے سر سے باتیں کرنے لگا۔

''شاہین میرے بھائی، میرے دوست! تو نے بہادری میں اپنا نام روشن کردیا۔ دشمنوں نے تیری تعریف کردی۔ تو ہم میں موجود نہیں لیکن تیرا شان دار چرچا ہمیشہ ... موجود رہے گا۔''

چچا فیروز نے کہا۔''میرے افغان بھائیو! میں نے سکندر تحفہ اور جسرت کھکھر سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اس جنگ میں بہلول نہیں تھا مگر جب وہ اس تباہ کاری کی داستان کو لوگوں سے سنے گا تو اپنا سر پیٹ کر رہ جائے گا اور ناممکن ہے جو وہ اس کا بدلہ نہ لے۔'' پھر بہلول سے کہا۔''بہلول! اب یہ تیرا کام ہے کہ تو میرے قول کی سچائی میرے دشمنوں پر ثابت کردے۔''

بہلول نے جواب دیا۔''عم محترم! شاہین کا بدلہ ضرور لیا جائے گا اور دہلی کی حکومت کو ہمیشہ کے لیے ہسترد کردیا جائے گا۔ میں محمد شاہ کی حکومت کو نہیں مانتا۔ تم سب میرے لیے مال و زر فراہم کرو۔ میں اس کے عوض تمہیں ہندوستان کی حکومت دوں گا۔''

افغان بہلول کے نعرے سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کے پاس جو کچھ بھی تھا، رو رو کر بہلول کے قدموں میں ڈالنے لگے۔ عورتوں نے اپنے زیورات تک اس کے حوالے کردیے لیکن افغانوں میں وہ چھوٹی سی ٹکڑی جو چند بزرگوں اور ان کے حمایتیوں پر مشتمل تھی اور جس کے دل میں بہلول کی مخالفت اور قطب خان کی سرداری کا نشہ چھایا ہوا تھا، اب بھی سب سے الگ تھلگ تھی۔ وہ اپنے سامان کو باندھنے، سمیٹنے لگے۔ جب بہلول کو یہ سب بتایا گیا تو اس نے جواب دیا۔

''میں انہیں نہ سمجھاؤں گا نہ روکوں گا کیونکہ یہ اپنے بھائی بند ہیں۔ آج نہیں تو کل ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ میں ان کا دشمن نہیں دوست ہوں۔'' لیکن فیروز خان لال بھبوکا ہو گیا۔ وہ اپنے بیس پچیس ساتھیوں کو لے کر ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''میں پوچھتا ہوں کہ تم لوگوں نے کیا فیصلہ کیا؟''

ایک بزرگ افغان نے فیروز خان کو غصے کی نظروں سے دیکھ کر سوال کیا۔ ''تو کیا تم لوگ میرا راستہ روکنے آئے ہو؟''

فیروز خان نے جواب دیا۔ ''ابھی تک تو میں نے یہ نہیں سوچا تھا لیکن اگر ضرورت پڑی تو یہ افسوس ناک فرض بھی انجام دینا پڑے گا۔ فی الحال تو میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟''

بزرگ افغان نے جواب دیا۔ ''ہم سب نے فیصلہ کیا ہے کہ ملک گیری کی ہوس دلوں سے نکال دیں اور اپنے آبائی پیشے تجارت سے دوبارہ ناتا جوڑ لیں۔'' پھر انتہائی خوف ناک لب و لہجے میں کہا۔ ''رہی یہ بات کہ تم میرا راستہ روک لو گے تو اس خیالِ خام کو اپنے دل سے نکال دو۔ راستہ روکنے والوں کو میں اس طرح اپنی راہ سے ہٹا دوں گا جس طرح قافلے اپنی راہ کے پتھروں اور جنگلوں کو ہٹا دیا کرتے ہیں۔''

فیروز خان غصے میں کانپنے لگا۔ ''میں تمہاری بات نہیں مان سکتا۔ تم لوگ اپنے آبائی پیشے تجارت کو اپنانے نہیں جا رہے ہو۔ تم سب قطب خان کے پاس جا رہے ہو لیکن میں تمہیں وہاں نہیں جانے دوں گا۔ قطب خان نے تو یہ ستم ڈھایا کہ ہمارا قتل عام کروا دیا۔ میرے بیٹے شاہین کا سر اتروا دیا۔ اب اگر تم لوگ بھی اس کے پاس پہنچ گئے تو تمہیں معلوم نہیں کیسی بربادیوں اور تباہیوں سے دوچار ہونا پڑے۔''

بزرگ افغان کی طرف سے اس کا ایک حمایتی پُرجوش نوجوان افغان فیروز خان کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا، بولا۔ ''فیروز خان! تو مجھ سے بات کر۔ ہاں ہاں، میں قطب خان کے پاس جا رہا ہوں۔ تو اگر روک سکے تو روک لے۔''

اس کشیدگی کا علم دوسروں کو بھی ہو گیا۔ کسی نے یہ خبر بہلول کو بھی پہنچا دی کہ افغانوں کے دو گروہ ایک دوسرے کے مقابل تلواریں تانے کھڑے ہیں اور آپس میں ایک بڑے خون خرابے کا آغاز ہونے والا ہے۔ بہلول بھاگا ہوا ان کے پاس پہنچا اور دونوں فریقوں کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ اس نے پہلے اپنے چچا کو مخاطب کیا۔

''عم محترم! اگر کچھ لوگ ہم سے متفق نہیں ہیں تو انہیں ان کے حال اور مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔ اگر انہیں جبراً اپنا ہم خیال بنا بھی لیا جائے تو اس سے کسی فائدے کے بجائے نقصان پہنچ جانے کا احتمال رہے گا۔'' پھر اپنے مخالف گروہ کو سمجھایا۔ ''افغان بھائیو! میں تم سے ایک ہی درخواست کروں گا۔ اگر تم ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے تو ہمیں امید ہے کہ نقصان بھی نہیں پہنچاؤ گے۔'' دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ بہلول اپنے چچا کو لے کر واپس چلا گیا۔

شاہین کے سر کو نہایت عزت و احترام سے پہاڑی پتھروں میں دفنا دیا گیا۔ افغانوں نے اس عزم میں غیر معمولی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا اور بہلول نے اس جگہ کھڑے ہو کر بڑی رقت سے اعلان کیا۔

''شاہین خان! میں تجھ سے عہد کرتا ہوں کہ تیرے سر کے عوض تیرے دشمنوں کے لاتعداد سر ان کے جسموں سے جدا کر دیے جائیں گے اور وہ سر جنہوں نے بادشاہ کو اس جنگ کا مشورہ دیا تھا، بادشاہ ہی کے حکم سے قلم کروا دیے جائیں گے۔''

☆☆☆

بہلول نے اپنے پرچم تلے دس بارہ ہزار آدمی جمع کر لیے۔ اب اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس لشکر کی مدد سے سرہند اور اس کے آس پاس کا علاقہ زبردستی چھین لے گا۔ وہ پہاڑوں کے اندر سے خونخوار شیر کی طرح نمودار ہوا۔ اب اس کے لشکر میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ بہلول نے قسم کھائی تھی کہ اب اس کا مرنا جینا اپنے افغان بھائیوں کے ساتھ ہو گا۔

وہ جب پہاڑوں کے اندر سے نکل کر میدانی علاقے میں داخل ہوا تو چاروں طرف کھیت ہی کھیت لہلہاتے دکھائی دیے۔ بہلول نے ازراہِ مذاق کہا۔

''یہ سارے کھیت ہمارے ہیں۔ بس اب وہ دن دور نہیں جب میں ہندوستان کے تاج و تخت کو اپنے قبضے میں لے چکا ہوں گا۔''

جنوب کی میدانی آبادیوں سے جب وہ گزرا تو وہ افغانوں کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر سہم گئیں۔ انہوں نے اپنے دروازے اندر سے بند کر لیے اور چھتوں، دیواروں اور درختوں پر سے یہ تماشا دیکھنے لگے۔ افغانوں کی چمچماتی تلواریں، تیروں سے بھرے پشت پر پڑے ترکشوں اور کمانوں کا منظر قابلِ دید تھا۔ بہلول کے آدمی بستیوں اور آبادیوں میں بہ آوازِ بلند کہتے پھر رہے تھے۔

''اس بستی میں جو افغان بھی آباد ہو، وہ ہم میں آ سکتا ہے۔''

وہ سرہند میں بڑی آسانی سے داخل ہو گیا۔ سکندر تحفہ نے معمولی سے مقابلے کے بعد پسپائی اختیار کر لی اور سرہند پر بہلول کا قبضہ دوبارہ ہو چکا تھا۔ جب یہ خبر دہلی پہنچی تو وہاں کہرام برپا ہو گیا اور بادشاہ اپنے دانش مندوں کو جمع کر کے منصوبے بنانے لگا۔ ان میں حسام خان نامی امیر نے بادشاہ کو دوٹوک مشورہ دیا کہ بہلول کا فتنہ ابھی زیادہ طاقت نہیں پکڑ سکا ہے اس لیے اگر آپ اس فتنے کو یہیں کچل دیں گے تو آئندہ دوسروں کی ہمت بھی نہیں پڑے گی۔

بادشاہ نے حسام خان کو حکم دیا۔ ''تب پھر ہم یہ مہم آپ ہی کے سپرد کرتے ہیں۔''

حسام خان نے تین بار ڈنڈوت کی اور بادشاہ کو سلام کر کے واپس چلا گیا۔ اب وہ بہلول سے مقابلے کی تیاری کر رہا تھا۔ دوسری طرف بہلول کی یہ کوشش تھی کہ یہ مقابلہ سرہند سے دور دہلی کے مضافات میں سے کسی جگہ ہو۔ بہلول ہر روز علی الصباح اٹھ کر سپاہیوں کو کسرت اور قواعد کرواتا رہتا۔ اس نے سرہند کے آس پاس کی چراگاہوں میں گڈریوں اور چرواہوں کو چھوڑ رکھا تھا کہ جیسے ہی کوئی نئی بات نظر آئے، وہ بہلول کو اس سے آگاہ کر دیں۔

کئی ہفتوں بعد اس کے آدمیوں نے خبر دی کہ چند نفری لشکر سرہند کی طرف آتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ بہلول ایک دستے کو لے کر چند نفری لشکر کی تلاش میں نکل گیا۔ دوپہر کو اس نے ان لوگوں کو ایک باغ میں پکڑ لیا۔ بہلول کو یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ یہ لوگ قطب خان اور اس کے ساتھی تھے۔ بہلول یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ قطب خان پراگندہ اور بے سروسامانی کی حالت میں کیوں آیا؟ وہ قطب خان کو غدار سمجھتا تھا۔

قطب خان نے بہلول کو دیکھ کر پہچان تو لیا لیکن نظریں نہیں ملائیں۔ وہ شرمندہ تھا اور نظریں ملاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ بہلول کے ساتھی بھی اپنے سردار کے بیٹے کو پہچان چکے تھے اور بہلول کے حکم کے منتظر تھے۔

بہلول نے قطب خان سے پوچھا۔ ''قطب خان! کیا بات ہے، یہاں تو کیا لینے آیا ہے؟''

قطب خان نے جواب دیا۔ ''بھائی بہلول! اب میں تیری سرداری کو تہ دل سے قبول کرتا ہوں۔''

بہلول ہکا بکا رہ گیا، پوچھا۔ ''یعنی تم میری قیادت تسلیم کرتے ہو؟''

قطب خان نے جواب دیا۔ ''ہاں جو کچھ ہوا، میں اس پر بے حد شرمندہ ہوں اور میں نے جو کچھ کیا، اس کی معافی چاہتا ہوں۔''

بہلول نے کہا۔ ''ہمارے چچا فیروز خان کا شیر دل بیٹا شاہین خان تمہاری غداری کی بھینٹ چڑھ گیا اور اب تم شرمندہ ہونے اور معافی مانگنے چلے آئے۔ کم از کم میری سمجھ میں تو کوئی بات آنہیں رہی؟''

قطب خان نے نظریں ملائے بغیر جواب دیا۔ ''بھائی بہلول! مجھ کو میرے حسد نے خوار کر دیا۔ معلوم نہیں کیوں میں تیری سرداری سے خوش نہیں تھا جبکہ تو نے خود سے سرداری کا اعلان نہیں کیا تھا۔ میرے باپ نے تجھے سردار مقرر کیا تھا۔ میں نے نادانی اور جہالت میں تیری سرداری کو ماننے سے انکار کر دیا اور خود سردار بننے کی خواہش میں دہلی کے بادشاہ کے پاس چلا گیا۔ بادشاہ نے میری خواہش پر تیرے خلاف لشکر کشی کی اور سرہند سے بے دخل کر دیا۔ میرا خیال تھا، سرہند کی حکومت میرے حوالے کر دی جائے گی لیکن وہ سکندر تحفہ کو دے دی گئی۔ میں بادشاہ کی افواج میں بے زبان قیدی کی طرح تھا۔ میں بادشاہ سے یہ بھی نہیں کہہ سکا کہ سرہند کی حکومت میرا حق ہے۔''

بہلول نے کہا۔ ''بھائی قطب خان! یہ اپنی اپنی سمجھ کا پھیر ہے۔ میں تمہارا بھائی ہوں اور تم میری بیوی کے بھی بھائی ہو۔ ذرا سوچو تو سہی تم پر کس طرح حکومت کرتا۔ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ منگولوں کے بوڑھے اپنے بچھڑنے والوں سے کہا کرتے تھے کہ جو تیر کمان سے نکل گیا وہ اونچی اونچی گھاس میں کہیں گم ہو جائے گا۔ بھائی قطب خان! اگر تم اپنے پیارے افغان بھائیوں سے بچھڑ گئے تو کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح انسانوں کے جنگل میں کہیں گم ہو جاؤ گے۔''

قطب خان نے ندامت سے جواب دیا۔ ''بے شک، میں نے جو کچھ کیا ہے اس پر بے حد شرمندہ ہوں۔''

بہلول نے پوچھا۔ ''اب کیا ارادے ہیں؟''

قطب خان نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ ''میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں تیرے ارادوں کا تابع ہو گیا ہوں۔ میں اور میرے ساتھی اب تیری تابع داری کریں گے۔''

بہلول نے قطب خان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا لیا اور سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''بھائی قطب خان! میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ اگر میں اس ملک کا بادشاہ بھی بن گیا تب بھی تم لوگ میرے تابع دار یا رعایا نہیں کہلاؤ گے۔ تم لوگ میرے دست و بازو بنو گے۔ تم تو میرے بھائی ہو۔ میں افغان قوم کے کسی معمولی فرد کو بھی اپنے سے کم نہیں سمجھتا۔''

قطب خان بہلول کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ بہلول اس کی پشت پر کبھی تو ہاتھ پھیرتا اور کبھی تھپتھپانے لگتا۔ وہ قطب خان کو ہر طرح تسلیاں دے رہا تھا پھر دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ دونوں کے ساتھیوں نے بھی گھل مل کر باتیں شروع کر دیں۔

قطب خان نے کہا۔ ''بہلول! میں سب سے زیادہ اپنے چچا فیروز خان سے شرمندہ ہوں۔ ان کے

سامنے جانے کی ہمت نہیں پڑ رہی۔ اس لیے میں اس باغ میں رک گیا تھا۔''

بہلول نے رنجیدہ آواز میں کہا۔''ہاں یہ بات تو ہے مگر غلطیاں انسان ہی سے ہوتی ہیں۔''

قطب خان ایک دم خاموش ہو گیا اور پھر کچھ دیر سوچتا رہا۔ بہلول نے کھڑے ہوتے ہوئے قطب خان کا بازو پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی اور کہا۔''بھائی قطب خان! بس اٹھو اور چلو۔ زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

قطب خان نے کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔ ''بہلول! میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تُو میرے دونوں ہاتھ باندھ دے اور میری پگڑی سے میری گردن پھانس کر گھسیٹتا ہوا چچا فیروز کے پاس لے چل۔ اس طرح میں یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو جاؤں گا کہ میں اپنی قوم اور چچا فیروز خان کا خطاکار ہوں۔ وہ چاہیں تو معاف کردیں نہ چاہیں تو جو سزا مناسب سمجھیں دے دیں۔ میں بھگتنے کو تیار ہوں۔''

بہلول نے کہا۔''میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں۔ میں چچا فیروز اور اپنی قوم کو سمجھا دوں گا۔ وہ لوگ بہ آسانی معاف کردیں گے کیونکہ وہ تمہاری واپسی سے بہت خوش ہوں گے۔''

قطب خان نے اصرار کیا۔''جو میں کہہ رہا ہوں وہ کر۔ اس میں لیت و لعل اور حیل و حجت سے کام نہ لے۔ میری یہ خواہش پوری کردے۔''

بہلول نے قطب خان کے کان میں کہا۔''ایسا کرنے میں یوں تو کوئی حرج نہیں لیکن تمہارے آدمیوں کے دل پر اس کا کوئی اچھا اثر نہیں پڑے گا۔''

قطب خان نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔''میں نے ان تمام پہلوؤں پر غور کرلیا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں اپنے ضمیر کی چبھن سے کس طرح نجات حاصل کروں؟ اس کی بس یہی ایک ترکیب ہے۔''

بہلول نے کھڑے ہو کر اعلان کیا۔''بھائیو! اب ہم اپنے گھروں کو روانہ ہو رہے ہیں۔ اپنے اپنے سامان کو سمیٹ لو۔''

افغانوں میں معمولی سی ہلچل پیدا ہوئی اور ہر کوئی اپنے اپنے سامان کی طرف چل دیا۔

قطب خان نے اپنی پگڑی بہلول کے حوالے کردی۔ بہلول نے اپنے رومال سے پہلے تو قطب خان کے دونوں ہاتھ باندھ دیے۔ اس کے بعد قطب خان کی پگڑی کا پھندا بنا کے اس کی گردن میں پھنسا دیا اور دوسرا سرا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ قطب خان کے ساتھی اور بہلول کے سپاہی یہ عجیب و غریب منظر سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔ قطب خان کے ساتھی کچھ اور ہی سمجھے۔ ایک تلوار کو نیام سے کھینچ کر بہلول کی طرف لپکا اور حکم دیا۔

''بہلول! تو نے میرے سردار کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ اب خیریت اسی میں ہے کہ اس کو چھوڑ دے ورنہ تیرا پیٹ چاک کردوں گا۔''

اس پُرجوش نوجوان کی دیکھا دیکھی قطب خان کے دوسرے ساتھی بھی اپنی اپنی تلواریں سنبھال کر بہلول کی طرف دوڑے۔ بہلول کے آدمیوں نے اپنے سردار کو خطرے میں جو دیکھا تو وہ بھی اپنی اپنی تلواریں نیام سے کھینچ کر قطب خان کے آدمیوں پر جھپٹے۔

قطب خان اور بہلول نے معاملے کو بگڑتے جو دیکھا تو فوری طور پر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کیا جائے مگر قطب خان کی حاضر دماغی اپنا کام کر گئی۔ اس نے اپنے آدمیوں کو منع کیا۔

''دوستو! یہ تم کیا کر رہے ہو۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی مرضی سے بندھوائے ہیں اور اپنے گلے میں پھندا ڈالنے کے لیے میں نے اپنی پگڑی بہلول کو خود ہی دی تھی تاکہ اس طرح میں اپنے چچا فیروز خان کے دل میں اپنے لیے جذبۂ رحم پیدا کردوں۔''

اٹھے ہوئے ہاتھ نیچے ہو گئے اور بڑھتے ہوئے قدم ایک دم رک گئے۔ پہلے بہلول اپنے گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس کے بعد قطب خان۔ قطب خان کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے اس لیے گھوڑے کی پشت تک جانے کے لیے اس نے اپنے ایک ساتھی کا سہارا لیا۔

یہ ایک پُراسرار منظر تھا کہ بہلول کا گھوڑا سب سے آگے تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گھوڑے کی لگام تھی اور دوسرے میں قطب خان کی پگڑی کا سرا۔ اس کے پیچھے قطب خان کا گھوڑا تھا۔ دونوں بندھے ہاتھوں اور پگڑی کے ایک سرے میں پھنسی ہوئی گردن میں قطب خان کچھ عجیب ہی لگ رہا تھا۔ اس نے سر جھکا لیا تھا اور ایسا لگتا تھا گویا خجالت اور ندامت کے بوجھ نے اس کو اس لائق ہی نہیں رکھا کہ وہ گردن تان کر اور سینہ پھلا کر اپنے لوگوں کے سامنے جاسکے۔

آناً فاناً تمام افغانوں کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ قطب خان ایک قیدی کی طرح آ گیا ہے۔ فیروز خان اپنے گھر

سے نکل کر بہلول کے پاس چلا گیا۔ بہلول کی بیوی اپنے بھائی کو رومال اور پگڑی میں بندھا دیکھ کر آبدیدہ ہوگئی۔ اس نے ایک بڑی بی کو بہلول کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ قطب خان کو آزاد کردو، ورنہ میں ننگے سر باہر آجاؤں گی۔

بہلول نے جواب میں کہلا دیا۔ ”ننگے سر باہر آنے کی ضرورت نہیں۔ قطب خان اپنی مرضی سے قیدی بنا ہے۔“ لیکن اس کی بیوی اپنے شوہر کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی۔

فیروز خان، قطب خان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ حیرت سے پوچھا۔ ”بہلول! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟“

بہلول نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ ”عم محترم! آپ وہی دیکھ رہے ہیں جو ہم سب دیکھ رہے ہیں۔“

فیروز خان کے سینے میں آگ سی جل اٹھی تھی۔ جلے بھنے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا یہ قطب خان ہے؟“

بہلول نے جواب دیا۔ ”ہاں یہ قطب خان ہے۔ اپنے کیے پر نادم ہے اور شرمسار۔ عم محترم! بھائی قطب خان نے جس ندامت اور خجالت سے اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہے، اسے خدا بھی معاف کر دیتا۔ میں نے اس کو آپ کی طرف سے معاف کر دیا ہے۔“

فیروز خان نے آنکھوں کے گوشوں سے بہہ نکلنے والے آنسوؤں کو کرتے کے دامن سے پونچھتے ہوئے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میں نے بھی اس کو معاف کر دیا۔“

اس وقت بہلول کی بیوی کی طرف سے دوسرا پیغام موصول ہوا۔ ”آخر کیا بات ہے جو میرے بھائی کو ابھی تک آزاد نہیں کیا گیا؟“

بہلول نے پیغام لانے لے جانے والی بڑی بی کو ڈانٹ دیا۔ ”جا، اس سے کہہ دے کہ زیادہ بک بک نہ کرے۔ میں اپنے معاملات میں عورت کی دخل اندازی برداشت نہیں کرسکتا۔“ پھر بڑی بی کو بطورِ خاص مخاطب کیا۔ ”اور تو بار بار اندر باہر کے چکر کیوں لگا رہی ہے؟ اگر پھر آئی تو تیری ٹانگیں توڑ دوں گا۔“ بڑی بی خوف زدہ ہو کر بھاگ گئیں۔

قطب خان کو چاروں طرف سے افغانوں نے گھیر رکھا تھا۔ ان میں وہ لوگ بھی موجود تھے جو بہلول کا ساتھ چھوڑ کر قطب خان کے پاس جانے والے تھے۔ انہیں بہلول کی باتوں اور اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

فیروز خان نے بہلول کے کان میں کہا۔ ”بہلول! بہت ہوچکا، اب اس کو آزاد کردے۔“

بہلول نے جواب دیا۔ ”لیکن میں نے تو قطب خان کو قیدی نہیں بنایا، یہ تو خود بنا ہے قیدی۔“

بہلول کے مخالف افغانوں میں سے کسی نے آواز بلند کی۔ ”فیروز خان! اب اس تماشے کو ختم کردے ورنہ اب جو فساد ہوگا اس میں افغان تباہ و برباد ہوجائیں گے۔“

بہلول نے بھی سختی سے جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں کہ افغانوں میں چند مفسد موجود ہیں اور وہ موقع کی تلاش میں تھے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ انہیں قطب خان کی ماتحتی میں جانے کا بڑا شوق ہے۔ اب قطب خان آگیا ہے، وہ لوگ یہ شوق اس کی ماتحتی میں جاسکتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

فیروز خان نے بہلول کے کان سے منہ لگا کر پوچھا۔ ”کیا قطب خان کو آزاد کردوں؟“

بہلول نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ ”ابھی نہیں۔“

اس کے بعد بہلول قطب خان کے پاس جا کر کھڑا ہوا اور اس سے آہستہ آہستہ کہا۔ ”بھائی قطب خان! تم جس جگہ سے نادم اور خجل واپس آگئے ہو، افغانوں کی ایک جماعت وہاں پہنچنے کے لیے بے چین ہے۔ یہ لوگ تمہیں اپنا سردار بنانا چاہتے ہیں۔ میں ان سے کیا کہوں اور کیسا سلوک کروں؟“

قطب خان نے بڑی بے باکی سے اپنے حمایتی سرکشوں کی طرف دیکھا اور انہیں مخاطب کیا۔ ”ہاں تو اے میرے ہمدرد اور حمایتی بھائیو! آخر تم چاہتے کیا ہو؟“

سب سے زیادہ شری بوڑھے افغان نے قطب خان کے قریب جا کر اس کو غیرت دلائی۔ ”قطب خان! تیری غیرت کہاں چلی گئی ہے۔ یہ تجھ کو ہو کیا گیا ہے؟ تو نے خود کو قید و بند میں کیوں ڈال لیا؟“

قطب خان نے گویا اس بوڑھے کی کوئی بات سنی ہی نہ تھی۔ ایک بار پھر پوچھا۔ ”میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟“

شری بوڑھے نے جواب دیا۔ ”تیرا باپ اسلام خان مرحوم سرہند کا حاکم تھا۔ اب ہماری آنکھیں سرہند پر تجھ کو حکمران دیکھنا چاہتی ہیں۔“

قطب خان نے پوچھا۔ ”لیکن بھائی بہلول کیا برے ہیں؟“

بوڑھے نے جواب دیا۔ ”اس کی یہی برائی کیا کم ہے کہ تیرا حق غصب کر کے بیٹھ گیا۔ کیا ہمیشہ سے یہ ہوتا نہیں

چلا آیا ہے کہ باپ کے بعد بیٹا جانشینی کرے؟''

قطب خان نے کہا۔''لیکن میرے باپ نے اپنی زندگی ہی میں بھائی بہلول کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ اس فیصلے کو میں یا کوئی اور کس طرح بدل سکتا ہے۔''

بوڑھے نے جواب دیا۔''تیرا باپ اسلام خان اس دنیا سے جا چکا۔ جب تیرا باپ ہی نہ رہا اس دنیا میں تو اس کے عہد و پیمان اور وعدے کتنے دن جئیں گے۔ سمجھ لے اسلام خان کے ساتھ اس کی ہر بات مر گئی۔ اسلام خان کی جانشینی کا مسئلہ ہم لوگ حل کریں گے۔''

قطب خان نے بڑے میاں کو ڈانٹا۔''خدا کے لیے تُو اپنی خباثت سے اپنے ہی بھائیوں اور ان کی اولاد کو نقصان پہنچانے کی کوششیں نہ کر۔ تیری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ خود میں نے بھی بہلول کو اپنا سردار تسلیم کر لیا ہے۔''

بوڑھے نے منہ بنا کر پوچھا۔''کیا یہ سچ ہے؟ یہ تو کہہ رہا ہے یا تجھ سے کہلایا جا رہا ہے؟''

قطب خان نے جواب دیا۔''یہاں ہے کوئی ایسا جو مجھ سے میری مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی کہلا سکے؟''

بوڑھے کی جماعت کا ایک نوجوان تیز تیز قدم اٹھاتا قطب خان کے بالکل قریب چلا گیا۔''قطب خان میرے مرحوم سردار کے بیٹے! ہم سب تیری مرضی جاننا چاہتے ہیں۔ تیرے ایک اشارے پر ہزاروں تلواریں نیام سے باہر آ جائیں گی۔''

قطب خان نے انہیں سمجھایا۔''میرے دوستو! یہ آپ لوگ شر اور فساد پر کیوں مائل ہو رہے ہیں؟ میں تم سب کو بانگ دہل یہ یقین دلا رہا ہوں کہ میں نے بہلول کی سرداری تسلیم کر لی ہے۔ آج سے بہلول ہمارا بادشاہ ہے اور ہم سب اس کی رعایا۔''

بہلول بھی بڑا جذباتی ہو رہا تھا۔ وہ بار بار اپنی اہانت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے قطب خان سے کہا۔''بھائی قطب خان! یہ ہماری کوئی بات بھی نہیں مانیں گے۔ اس لیے ہم انہیں ان کی مرضی پر چھوڑ دیں گے۔''

بہلول کی بیوی کا ایک پیغام اور موصول ہوا۔ اس بار ایک نو دس سالہ بچہ یہ پیغام لے کر آیا تھا۔ بہلول کی بیوی نے کہلایا تھا کہ میرے شوہر سے جا کر کہہ دو کہ اگر اس نے پانچ سات ثانیوں کے اندر میرے بھائی کو آزاد نہ کیا تو میں باہر نکل کر اس کو زبردستی آزاد کر دوں گی۔

بہلول نے بھی بڑا سخت جواب دیا۔''جا، اپنی مالکہ سے صاف صاف کہہ دے کہ اگر اس نے ایسی کوئی غلطی کی تو میں زندگی بھر تیری شکل بھی نہ دیکھوں گا۔ کسی عورت کا شوہر کی مرضی اور اجازت کے بغیر باہر آ جانا کوئی معمولی بات تو نہیں۔''

قطب خان کو اپنی بہن پر رحم آ گیا، بولا۔''بھائی بہلول! میں نے اپنے لیے تجھ سے کوئی رعایت نہیں چاہی لیکن میں اپنی بہن کے لیے تجھ سے نرمی اور محبت کا تقاضا کروں گا۔''

بہلول نے ہنس کر جواب دیا۔''بھائی قطب خان! یہ تو ایک دھمکی تھی، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''

فیروز خان نے قطب خان سے کہا۔''آزادی کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟''

قطب خان نے جواب دیا۔''میں ہمیشہ ہی آزاد رہا ہوں اور یہ اسی آزادی کا نتیجہ ہے کہ میں نے بہلول کی اطاعت تک نہیں قبول کی تھی۔''

شری بوڑھے نے ایک بار پھر بہ آوازِ بلند دریافت کیا۔''ہاں تو قطب خان! تو نے ہماری بابت کیا فیصلہ کیا؟''

قطب خان نے جواب دیا۔''تمہاری بابت کوئی اور کیا فیصلہ کرے گا۔ میں نے تھک ہار کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ بہلول کو اپنا حکمران مان لوں جبکہ تم نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھ کو اپنا سردار بنا لو۔ اب میں تمہارے سردار کی حیثیت سے تمہیں یہ حکم دے رہا ہوں کہ میرے ہمراہ تم بھی بہلول کو اپنا سردار بنا لو۔'' ایسا لگا جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

قطب خان نے بہلول کے کان میں کہا۔''اب تُو مجھے آزاد کر دے کیونکہ ان شریوں اور مفسدوں کو میں ہی ٹھیک کر سکتا ہوں۔''

قطب خان کو بہلول نے اپنے ہاتھوں سے آزاد کیا۔

قطب خان کے حمایتیوں نے خوشی میں نعرے لگائے اور سب سے پہلے چچا فیروز خان نے اسے سینے سے لگایا، بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔''قطب خان! اب تو شاہین خان کی جگہ ہے۔ میں نے تجھ کو اپنا بیٹا مان لیا ہے۔''

بہلول کے بعد دوسرے سربرآوردہ افغانوں کی باری تھی۔ ان سب نے قطب خان کو اپنے سینے سے لگایا اور حسب توفیق کلمات ادا کیے۔ ان میں قطب خان کا حمایتی شری بوڑھا بھی شامل تھا اور اس کے ہم نوا بھی۔

بوڑھے نے بے دلی سے کہا۔''خیر تم کہتے ہو تو میں ملک کالا کے بیٹے کی تابع داری کر لوں گا ورنہ میرا دل اس پر آمادہ نہیں۔''

مردوں سے فرصت پا کر قطب خان اپنی بہن کے

پاس چلا گیا۔ بہن نے اس کے سر پر دوپٹے کا پلو ڈال دیا اور اس کے پیچھے کھڑے ہو کر آنسو بہانے لگی، بولی۔ ''بھائی! جب میں نے تجھ کو بندھے ہوئے دیکھا تو تیرے بہنوئی کے پاس بار بار پیغام بھیجا کہ وہ تجھے فوراً رہا کردے۔ میں نے تو یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر بہلول نے میری بات نہ مانی تو میں اس سے طلاق لے کر علیحدگی اختیار کرلوں گی۔''

قطب خان نے جواب دیا۔ ''خبردار بہن جو آئندہ اس طرح سوچا بھی۔ تیرا شوہر افغان قوم کا عظیم نوجوان ہے۔ تو نے اگر اس کو کھو دیا تو گویا اپنا سب کچھ کھو دے گی۔ اور پھر یہ بھی طے ہے کہ بہلول کے دل میں آج بھی زیبا سناری کی محبت رچی بسی ہے۔ یہ جب بھی تیری محبت سے گلوخلاصی حاصل کرے گا، اپنی محبوبہ زیبا کے پاس چلا جائے گا۔''

قطب خان کی بہن لرز گئی۔ ''اچھا اگر تو کہتا ہے تو میں اس کی عزت کروں گی۔''

وہ رات ایک یادگار رات تھی۔ قطب خان اپنے آدمیوں میں گھرا ہوا بڑی دلچسپ باتیں کرتا رہا۔ بہلول بھی اس محفل میں موجود تھا۔ بہلول کو بس ایک ہی فکر تھی۔ ایک ہی طلب اور ایک ہی جستجو تھی۔ بہلول یہ جاننا چاہتا تھا کہ محمد شاہ کا اصل دماغ کون ہے؟ وہ کس کے دماغ سے سوچتا اور کس کے دماغ سے فیصلے کرتا ہے؟

قطب خان نے جواب دیا۔ ''بھائی بہلول ادہلی میں اس وقت جو دماغ ہیں، ان میں دو نہایت اہم ہیں۔ ایک حسام خان کا دماغ ہے اور دوسرا حمید خان کا دماغ لیکن فی الحال بادشاہ کے دل و دماغ پر حسام خان کی حکومت ہے۔ بادشاہ حسام خان ہی کے دماغ سے سوچتا، فیصلے کرتا اور حکومت کرتا ہے۔ اگر بادشاہ کے پاس سے حسام خان کو ہٹا دیا جائے تو وہ کچھ بھی نہیں رہے گا۔''

بہلول نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اور حسام خان کو میں ہٹا دوں گا اپنی راہ سے۔ اور دیکھو قطب خان! مجھے ایک بات اور بتاؤ۔''

قطب خان نے پوچھا۔ ''کون سی بات؟''

بہلول نے پوچھا۔ ''سرہند پر حملہ کس نے کروایا تھا؟ یہ لشکر کشی کس کے مشورے سے ہوئی تھی؟''

قطب خان نے جواب دیا۔ ''حسام خان کے مشورے پر، بادشاہ کے دل و دماغ پر حسام خان ہی کی حکومت ہے۔''

بہلول کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''اب حسام خان اپنے بادشاہ ہی کے حکم پر مارا جائے گا۔ میں نے یہ عہد کر رکھا ہے کہ جن جن لوگوں نے افغان دشمنی میں بادشاہ کو افغانوں کے خلاف استعمال کیا ہے، میں ان سب کو ان کے بادشاہ کے حکم ہی سے قتل کرواؤں گا۔ یہ میرا عہد ہے جو ضرور پورا ہوگا، انشاءاللہ۔''

بہلول بادشاہ کی طرف سے غافل نہیں تھا جبکہ اس کو یہ بات بھی معلوم ہو چکی تھی کہ حسام خان سرہند پر لشکر کشی کی تیاریاں کر رہا ہے۔

بہلول نے اسی شب یہ ہنگامی اعلان کردیا کہ افغان بادشاہ کی فوجوں سے اپنی مرضی کے محاذوں پر جنگ کریں گے۔

یہ ایک طرح کا طبلِ جنگ تھا جو بہلول نے بجا دیا تھا۔ افغانوں نے اسی وقت سے جنگ کی خوف ناک تیاریاں شروع کردیں۔

☆☆☆

وزیر الممالک حسام خان اپنا لشکر لے کر انبالہ کے جنوب میں تقریباً چھبیس میل دور مدھورا اور خضرآباد نامی قصبوں کے درمیان کڑہ نامی مقام تک پہنچ گیا کیونکہ بہلول کی فوج حسام خان کا راستہ روک کر دیوار کی طرح کھڑی ہوگئی تھی۔ رات کو دونوں طرف آگ روشن کردی گئی تاکہ کوئی کسی پر شب خون نہ مار سکے۔ بہلول، قطب خان اور چچا فیروز خان کو اپنے ساتھ لیے پھر رہا تھا۔ بہلول اپنے جنگجوؤں کے پاس جاتا تو پہلے تو ان کی پشت تھپتھپاتا اور ان کی بہادری کا بڑی عزت سے ذکر کرتا۔ وہ ہر ایک سے ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔

''حکومت کسی کے باپ کی میراث نہیں ہے، جو اس کا اہل ہوگا، نااہل سے چھین لے گا۔ محمد شاہ نااہل ہے افغان اہل ہیں۔ اس لیے یہ حکومت بہرحال افغانوں کا حق ہے۔''

بہلول کی پراسرار اور تکرار آمیز باتوں نے افغان جیالوں میں ساحرانہ جوش و خروش پیدا کردیا اور انہیں اپنی کامیابی کا پورا پورا یقین ہوگیا۔

حسام خان بہت فکرمند تھا۔ معلوم نہیں کیوں اس کو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بہلول سے شکست کھا جائے گا۔

صبح طلوعِ آفتاب سے پہلے ہی حسام خان نے جب اپنی فوج کو صف آرا کیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بہلول اس سے پہلے ہی اپنی فوجیں میدانِ جنگ میں کھڑی کرچکا ہے۔

حسام خان اپنی شجاعت اور لیاقت کا نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لیے اپنی فوج سے جدا ہو کر بہلول کی صف آرا فوج کے قریب پہنچ گیا اور آواز دے کر بہلول کو طلب کیا۔

بہلول گھوڑا دوڑاتا ہوا حسام خان کے مقابل پہنچ گیا۔

حسام خان نے بہلول کو اوپر سے نیچے تک دیکھ کر کہا۔ ''تو یہ ہے ملک بہلول، اسلام خان کا بھتیجا اور داماد۔''

بہلول نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حسام خان نے پوچھا۔ ''ملک بہلول! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس جنگ سے تیرا مقصد کیا ہے؟''

بہلول نے جواب دیا۔ ''صرف یہ کہ نااہل کو اس کی جگہ سے ہٹا کر اہل کو بٹھا دوں۔''

حسام خان نے پوچھا۔ ''یہ نااہل کون ہے اور اہل کون؟''

بہلول نے جواب دیا۔ ''تو نااہل ہے، تیرا بادشاہ... نااہل ہے، تیرے سارے ہی امرا نااہل ہیں۔''

حسام خان کو طیش آ گیا، بولا۔ ''کل کے چھوکرے، زبان سنبھال کر بات کر۔ شاید تو نہیں جانتا کہ اس وقت تیرے سامنے اس ملک کا وزیر الممالک کھڑا ہے۔''

بہلول نے جواب دیا۔ ''کون کیا ہے؟ کون بہادر ہے اور کون بزدل، میدانِ جنگ میں دونوں فریق اپنی اپنی صلاحیتوں کو واضح اور ثابت کر دیں گے۔''

حسام خان نے گھوڑے کو تھوڑا اور دوڑانا شروع کر دیا۔ وہ اپنی فوج میں واپس چلا گیا اور چیخ کر کہا۔ ''میرے دوستو اور ساتھیو! افسوس کہ میں نے بڑی کوشش کی کہ یہ جنگ ٹل جائے اور ملک بہلول اپنے دل و دماغ سے بادشاہت کا خیال نکال دے۔''

کئی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے نامور ساتھی کہہ رہے تھے۔ ''سردار! صلح کی کوئی ضرورت نہیں، ہم انہیں میدانِ جنگ میں شکست دے دیں گے۔''

بہلول نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ''میرے افغان بھائیو! اب جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں نے حسام خان کی دعوتِ مبارزت قبول کر لی ہے۔''

قطب خان نے تشویش سے پوچھا۔ ''بھائی بہلول! کیا تم نے واقعی حسام خان کی دعوتِ مبارزت قبول کر لی ہے؟''

بہلول نے جواب دیا۔ ''بھائی! تم کیسی بات کر رہے ہو؟ میں جنگِ مبارزت ہر اس جنگ کو کہتا ہوں جو للکار کر مردانہ وار لڑی جائے۔''

فیروز خان اپنی فوج کے میمنہ پر کھڑا ہو گیا۔ قطب خان نے میسرہ سنبھال لیا۔ بہلول فوج کے قلب میں کھڑا ہوا تھا۔ سرکش گھوڑے کسی ایک جگہ کھڑے ہی نہیں رہ رہے تھے۔ وہ اپنی دموں سے مور چھل کا کام لے رہے تھے۔ اپنے اگلے پیروں کو بار بار پٹک کر اپنی بے زبانی کا اعلان کر رہے تھے۔

حسام خان کی طرف سے طبلِ جنگ بجا اور دونوں فوجیں ہاتھیوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف بڑھیں اور پھر تلواریں، تلواروں سے یوں ٹکرائیں کہ ان سے شعلے نکلنے لگے۔ حسام خان ہر طرف بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔ وہ اپنے بادشاہ کے اقبال اور اقتدار کو بچانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ اس کے سپاہی بادشاہ کے اجرت یافتہ تھے۔ دوسری طرف بہلول اپنے افغان بھائیوں کے حوصلے بڑھا رہا تھا۔

حسام خان نے سوچا کہ جب تک افغانوں میں بہلول موجود ہے، ان کے حوصلے بلند رہیں گے۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے بہلول کا کام تمام کر دیا جائے۔ اس کے بعد ایک فیصلہ کن حملہ کر کے افغانوں کے عزائم خاک میں ملا دیے جائیں۔

بہلول کا بھی یہی حال تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے اگر حسام خان کو قتل یا گرفتار کر لیا جائے تو سارا کھیل ختم ہو جائے گا۔ بہلول، حسام خان پر کاری ضرب لگانے کی خاطر قلب سے باہر آ گیا۔ دوسری طرف سے حسام خان بھی بہلول کی طرف بڑھا۔ دونوں کی تلواریں ایک دوسرے کے سر پر چمک کر غائب ہو گئیں۔ بالکل کوندے کی طرح۔

حسام خان نے چیخ کر کہا۔ ''بہلول! تو نے یہ اچھا نہیں کیا۔ تجھ کو بادشاہ کے خدمت گار کی طرح رہنا چاہیے تھا۔''

بہلول نے جواب دیا۔ ''حسام خان! تو نے کون سے اچھے کام کیے ہیں۔ بادشاہ کو میرے اور میری قوم کے خلاف اکسانے والے تم ہو اور اب تم مجھے نصیحتیں کر رہے ہو۔ حسام خان! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، میں افغان ہوں جو اپنے دشمنوں سے بدلے لے کر رہتا ہے۔ میں بھی تجھ سے انتقام لوں گا۔ میرے دار انتقام جو احاطۂ خیال میں نہیں آ سکتا۔''

اس کے بعد دونوں آپس میں برسرِپیکار ہو گئے۔ آخر کافی دیر بعد بہلول، حسام خان کو زخمی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ حسام خان کی چیخ نکل گئی اور وہ بھاگ نکلا۔ بہلول نے اس کا پیچھا کیا لیکن وہ ہاتھ نہیں لگا۔ حسام خان کے جاتے ہی شاہی فوج بددل ہو گئی اور بھاگ کھڑی ہوئی۔ بہلول اور اس کے افغان بھائیوں نے ان کا دور تک پیچھا کیا۔ قطب خان اور فیروز خان بے حد خوش تھے اور عام افغانوں نے تو یہ تاثر لیا کہ انہوں نے دہلی کے بادشاہ کو فیصلہ کن شکست دے دی ہے اور اب کسی بھی دن بہلول دہلی کا بادشاہ ہو جائے گا اور قوم افغان بڑے بڑے سرکاری عہدوں اور منصبوں پر فائز ہو جائے گی۔

اس دن بہلول ذرا سی دیر کے لیے بھی نہیں سستایا۔ اس کا جسمانی محنت کا کام ختم ہو چکا تھا۔ اب دماغی محنت ہو رہی تھی۔ وہ ایک خیمے میں گھس کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ فیروز خان اور قطب خان اس کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ کسی افغان نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ اس خیمے میں بہلول سویا ہوا ہوگا کیونکہ اس کو اندر جاتے تو دیکھا گیا تھا مگر نکلتے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔

قطب خان اور فیروز خان جب خیمے میں داخل ہوئے تو انہوں نے مزے دار منظر دیکھا۔ بہلول ایک چارپائی کے سہارے گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ فیروز خان نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلا دیا۔

''ملک بہلول! تو یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے؟ ہم لوگ تو تجھے معلوم نہیں کہاں کہاں تلاش کر آئے۔''

بہلول نے جواب دیا۔ ''میں بہت تھک چکا ہوں، اک ذرا دم لینے دیں۔ اللہ نے چاہا تو میں حسام خان کی اس شکست کو اس کی آخری شکست میں بدل دوں گا اور شاید اب وہ میرے مقابلے پر کبھی بھی نہ آ سکے۔''

قطب خان نے پوچھا۔ ''وہ کس طرح؟''

بہلول نے جواب دیا۔ ''اک ذرا تجھ کو ہمت کرنی ہوگی۔''

فیروز خان، بہلول کے پاس جا کھڑا ہوا، بولا۔ ''کچھ مجھے بھی تو بتا آخر وہ کون سی ترکیب ہے جس سے تو حسام خان کی اس شکست کو اس کی زندگی کی آخری شکست بنا دے گا؟''

بہلول نے کہا۔ ''قطب خان! اب تو مجھے ایک بات صاف صاف بتا دے۔''

قطب خان نے جواب دیا۔ ''تُو مجھ سے جو چاہے پوچھ، میں تیری ہر بات کا جچا تلا جواب دوں گا۔''

بہلول نے کہا۔ ''بھائی قطب خان! تُو تو بادشاہ کے قریب رہ چکا ہے، اس کی عادات اور اطوار کے بارے میں کچھ بتا۔''

قطب خان نے جواب دیا۔ ''محمد شاہ حماقت کی حد تک سادہ لوح اور کمزور شخص ہے۔''

بہلول نے پوچھا۔ ''وہ عقلی اعتبار سے کیسا شخص ہے؟''

قطب خان نے جواب دیا۔ ''بہت معمولی۔ اتنا معمولی کہ چھوٹے چھوٹے درباری تک بعض اوقات بادشاہ کو سنا دیتے ہیں اور بادشاہ ہنسی ہنسی میں سب کچھ برداشت کر جاتا ہے۔''

بہلول نے پوچھا۔ ''بھائی قطب خان! اگر میں تجھ کو بادشاہ کے پاس روانہ کر دوں تو کیا تُو چلا جائے گا؟''

قطب خان نے جواب دیا۔ ''بہلول! میں تیری خاطر تیرے حکم پر جہنم تک جا سکتا ہوں، بادشاہ کیا چیز ہے۔''

بہلول نے کہا۔ ''بس تو تیاری کر لے کیونکہ معاملہ گرم گرم ہے، جلدی بن جائے گا۔''

کئی دن تک فتح کا جشن منایا جاتا رہا۔ بہلول افغانوں کا سب سے لائق آدمی ثابت ہو چکا تھا۔ اس کے برعکس دہلی میں کہرام برپا تھا۔ بادشاہ محمد شاہ، بہلول کی فتح اور حسام خان کی شکست سے دل برداشتہ تھا۔ وہ حسام خان سے بہت ناراض تھا اور حسام خان، بادشاہ کو یہ باور کروانے کی کوشش میں تھا۔ ''اس شکست سے کچھ نہیں ہوتا، دوسری بار کی لشکر کشی سے میں بہلول اور افغانوں کا زور بالکل توڑ دوں گا۔''

حسام خان بادشاہ کی مایوسی دور نہیں کر سکا۔ اب بادشاہ بہلول کو سیاست اور چالبازی سے مات دینے کی فکر میں تھا۔ اس کے دربار میں اب بھی افغان امراء موجود تھے۔ وہ انہیں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس نے چند افغان امراء سے کہا۔

''مجھے افسوس ہے کہ افغانوں کے خلاف لشکر کشی کی گئی اور میں نے بہلول کو خوامخواہ ناراض کر دیا۔''

ایک افغان امیر نے دبے لفظوں میں کہا۔ ''حضورِ والا! اگر افغان دشمنی برقرار رہی تو اندیشہ ہے کہ تمام افغان دہلی چھوڑ کر اپنے وطن واپس چلے جائیں۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں افغانوں کے اعتماد کو بہر حال برقرار رکھوں گا۔''

ایک دوسرے امیر نے کہا۔ ''حضورِ والا! بہلول نے قطب خان کو آپ کے پاس کسی خاص پیغام کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر اجازت ہو تو حضور کے روبرو پیش کر دیا جائے؟''

بادشاہ نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔ ''قطب خان کہاں ہے، اس کو مجھ سے ملایا کیوں نہیں گیا؟''

افغان امیر نے جواب دیا۔ ''قطب خان یہ اطمینان چاہتا ہے کہ اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔''

بادشاہ نے کچھ سوچتے ہوئے افغان امیر کو مشورہ دیا۔ ''اچھا تو اس وقت تک قطب خان کو دور رکھ جب تک کہ میں حسام خان کو دہلی سے باہر نہ بھیج دوں۔''

بادشاہ نے اسی دن حسام خان کو طلب کر لیا اور نہایت نرمی اور انکساری سے کہا۔ ''حسام خان! میں نے تیرے مشورے پر خوب غور کیا اور بالآخر اس کی افادیت اور اس

کے دوررس اثرات کا قائل ہوگیا۔"

حسام خان نے حیرت سے پوچھا۔" اس ناچیز نے حضور والا کو وہ کون سا مشورہ دیا تھا کہ میں خود بھول گیا اور حضور نے اس کو یاد رکھا؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔" یہ کہ ہمیں اپنی اس شکست سے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ دوسرے بڑے اور فیصلہ کن معرکے کی تیاری کرنا چاہیے۔"

حسام خان کے چہرے پر لمحوں کے لیے مسکراہٹ آئی اور کافور ہوگئی، بولا۔" مشورہ اگر خلوصِ قلب اور نیک نیتی سے دیا جائے تو دل پر ضرور اثر کرتا ہے۔"

بادشاہ نے جواب دیا۔" اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تو کل ہی دہلی کے مضافات سے آدمیوں کو اکٹھا کرنا شروع کر۔ میں اس وقت ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس مہم کو جاری رکھوں گا۔"

حسام خان نے حیرت سے پوچھا۔" کل ہی سے؟ کیا میں کل ہی دہلی کے مضافات سے آدمیوں کو اکٹھا کرنا شروع کردوں؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔" ہاں کل ہی سے...... مگر تجھ کو حیرت کیوں ہورہی ہے؟"

حسام خان نے آہستہ سے کہا۔" مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہورہی۔ حسب الحکم میں کل ہی سے اپنا کام شروع کردوں گا۔"

حسام خان، بادشاہ کے پاس سے چلا آیا مگر وہ چوکنا ہوگیا تھا۔ وہ بادشاہ کی غیر ضروری اور غیر فطری نرمی اور خوش اخلاقی سے ڈر گیا تھا۔ اس نے بادشاہ کے مکالموں میں فریب کی بو محسوس کی۔ اس نے ایک شاہی پہرے دار کو رشوت میں دس اشرفیاں دیں اور اس سے پوچھا۔

" میں ان اشرفیوں کے عوض تجھ سے کوئی بڑا اور خطرناک کام نہیں لوں گا۔ میں تو بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مجھ سے پہلے بادشاہ سے کون ملا تھا؟"

شاہی پہرے دار پہلے تو گھبرایا مگر آخر کار دس اشرفیوں نے اس کو بے بس اور مجبور کردیا، بولا۔" جنابِ والا! میں جو کچھ آپ کو بتاؤں گا، آپ اس کو راز ہی میں رکھیں گے۔"

حسام خان نے پانچ اشرفیاں اور نذر کردیں۔ پہرے دار تو خوشی سے پاگل ہوگیا، بولا۔" جناب! کئی دن سے افغان امراء بادشاہ کی خلوتوں میں آجارہے ہیں۔"

حسام خان دہل گیا اور اس نے فوراً ہی یہ فیصلہ کرلیا کہ دوسرے دن اس کو دہلی بالکل نہیں چھوڑنا۔ بادشاہ کے ہرکاروں نے حسام خان کو تنگ کردیا۔ وہ بار بار بادشاہ کا ایک ہی پیغام لے کر آرہے تھے۔

" بادشاہ سلامت تساہل نہیں پسند کرتے۔ آپ کو جو کام سونپا گیا ہے اس کو فی الفور انجام دیجیے۔"

حسام خان نے جملہ ہرکاروں کو ایک ہی جواب دیا۔" میں نے بادشاہ کے کام کے لیے اپنے آدمی دہلی کے مضافات میں بھیج دیے ہیں اور اللہ نے چاہا تو بہت جلد ایک لشکرِ جرار فراہم ہوجائے گا۔"

بادشاہ نے حسام خان کو ایک سخت حکم روانہ کیا۔

" حسام خان! تیری اتنی ہمت کہ شاہی حکم کو پس پشت ڈال کر اپنی مرضی استعمال کرے۔ میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو دہلی کے مضافات میں بہ نفسِ نفیس جا اور فوج کے لیے آدمی اکٹھا کر۔"

حسام خان کو بھی غصہ آگیا۔ اس نے بادشاہ کو مطلع کیا۔

" حضور کا فرمان سر آنکھوں پر، بندہ ابھی اسی وقت روانہ ہوجاتا ہے لیکن جاتے جاتے میں ایک گزارش کروں گا کہ اگر حضور مجھ سے کبیدہ خاطر ہیں تو یہ خاکسار کبیدہ خاطری کا سبب جاننا چاہے گا۔ میں اپنے اس شبہے کو زیادہ دن تک راز میں نہیں رکھ سکتا کہ ان دنوں حضور کی مجلس میں جو لوگ رہتے ہیں، وہ کچھ بھی ہوں لیکن میرے دوست ہرگز نہیں ہیں۔ میں اپنے بارے میں بہت فکرمند اور خوف زدہ ہوں۔ حضور والا مختارِ کل ہیں۔ ہماری زندگیاں آپ کے چشم و ابرو کی ہلکی سی جنبش پر قربان بھی ہوسکتی ہیں اور برقرار بھی رہ سکتی ہیں۔"

بادشاہ نے حسام خان کے پاس ایک دستہ بھیج دیا اور اس کو حکم دیا کہ حسام خان کو جس حال میں بھی ہو گرفتار کرکے میرے پاس لے آیا جائے لیکن اس دستے کو حسام خان نہیں ملا۔ وہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی روپوش ہوچکا تھا لیکن گھر والوں نے یہی بتایا کہ حسام خان نئی اور بڑی فوج کے لیے آدمیوں کا بندوبست کرنے دہلی کے مضافات میں جاچکا ہے۔

بادشاہ نے اپنے ہرکارے سے پوچھا۔" سچ سچ بتا، کیا حسام واقعی دہلی سے باہر چلا گیا ہے؟"

ہرکارے نے جواب دیا۔" حضور والا! محسوس تو یہی ہوتا ہے۔"

بادشاہ کو شاید اب بھی یقین نہیں تھا کہ حسام خان دہلی میں موجود نہیں ہے۔ وہ بڑی دیر تک اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ وہ حسام خان کے بارے میں کیا قدم اٹھائے؟ قطب خان کو بلوائے یا نہ بلوائے؟ وہ ایک طرف تو حسام خان اور

ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
خصوصی دلہن نمبر کی
دلآویز سجاوٹ لیے ستمبر 2014ء
کا پاکیزہ حاضر ہے
رفعت سراج کے ناول امانت کا حیران کن اختتام
نگہت سیما کے نئے قسط وار ناول اعتبار وفا کا دلفریب آغاز
نایاب جیلانی کی ترکِ وفا سبک خرامی سے انجام کی طرف گامزن
زاھدہ پروین نے اپنے زورِ قلم سے کھلایا جنگل کا حسین پھول منی ناول کی صورت
شمیم فضل خالق
بنیں ہماری بزم کی
مہمانِ خصوصی
ان کے علاوہ
دلشاد نسیم، غزالہ رشید، نگہت اعظمی اور
شیریں حیدر کی چشم کشا تحریروں کے ساتھ ساتھ پڑھیے ہالہ احمد،
ثریا انجم، فاطمہ خان و دیگر رائٹرز کے دلکش افسانے
عظمیٰ آفاق سعید کے سفرنامہ ملائشیا کا بھرپور اختتامی حصہ
بے حد حسین، دلربا اور متنوع مستقل سلسلوں کا متاثر کن امتزاج صرف آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے

اس کی شرارتوں سے خوف زدہ تھا اور دوسری طرف بہلول کی سر اٹھاتی طاقت پریشان کر رہی تھی۔

گھنٹوں کی سوچ بچار کے بعد بادشاہ نے افغان امراء کو اجازت دے دی کہ وہ قطب خان کو بادشاہ کے پاس لے آئیں۔

بادشاہ نے قطب خان کے آنے سے پہلے خوش گلو گانے والیوں اور باکمال ناچنے والیوں کو بلوالیا۔ شراب کے مٹکے اور دوسرے آلاتِ مے کشی بھی وہیں فراہم کر دیے گئے۔ بادشاہ نے قطب خان کا انتظار کیے بغیر ہی مے نوشی شروع کر دی اور مغنیاؤں اور رقاصاؤں کو حکم دیا کہ رقص و سرود سے بادشاہ کا دل بہلایا جائے۔

نازک اندام، خوب صورت اور پری پیکر لڑکیوں اور عورتوں نے جب رقص و موسیقی کا مظاہرہ شروع کیا تو بادشاہ اپنے آپ میں نہیں رہا۔ اس نے چلا چلا کر حکم دیا۔

''کہاں ہے قطب خان؟ اس کو ابھی تک حاضر کیوں نہیں کیا گیا؟ میں حسام خان سے بالکل نہیں ڈرتا۔ قطب خان کو فوراً حاضر کیا جائے۔''

خدمت گار اور محافظ ادھر ادھر بھاگنے دوڑنے لگے۔ افغان امراء کو مطلع کیا گیا کہ وہ قطب خان کو پیش کر دیں۔

قطب خان دہلی کے باہر ایک معروف افغان کا دو دن مہمان رہا اور جب اس کو بادشاہ کی طرف سے اذنِ باریابی موصول ہوا تو وہ کسی نامعلوم خوف سے کانپ گیا۔ وہ بادشاہ سے زیادہ حسام خان کی شرارتوں سے خوف زدہ تھا۔ اس نے افغان امراء سے کہا۔

''افغان بھائیوں میں بادشاہ کے پاس جا تو رہا ہوں لیکن تم سب کو میری زندگی کا ضامن بننا چاہیے اگر بادشاہ کی نیت خراب ہو اور وہ مجھے قتل کروا دینا چاہے تو اس وقت تم سب کا یہ فرض ہوگا کہ بادشاہ کو اس کے برے ارادوں سے باز رکھو اور میری جان بچاؤ۔''

ایک افغان امیر نے جواب دیا۔'' قطب خان! ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بادشاہ ملک بہلول سے خوف زدہ ہے اور خوب جانتا ہے کہ اگر تیرے ساتھ ناانصافی یا غلط سلوک ہوا تو بادشاہ ایک طرف تو اپنے افغان امراء کا اعتماد کھو دے گا اور دوسری طرف ملک بہلول کے انتقامی حملوں کا نشانہ بن جائے گا۔ کیا بادشاہ میں اتنی ہمت ہے کہ وہ ان بدترین خطرات کو مول لے؟''

قطب خان کو کچھ کچھ اطمینان ہوا اور وہ افغان امراء کی معیت میں ہی محل کے سامنے پہنچ گیا۔ محل کے دروازے کے دونوں طرف برجیوں میں شہنائی نواز شہنائی بجا رہے تھے۔ دروازے کے آس پاس پہرے دار تلواریں نیام سے باہر کیے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ افغان امراء جب ان پہرے داروں کے پاس پہنچے تو ان کے افسر نے پوچھا۔ ''تم میں قطب خان کون ہے؟ اس کو ہمارے پاس بلاؤ؟''

قطب خان سینہ تانے ہوئے پہرے داروں کے سردار کے پاس جا کھڑا ہوا۔

پہرے دار افسر نے قطب خان کو بہت غور سے دیکھا اور پوچھا۔'' حاکم سرہند اسلام خان مرحوم کا بیٹا قطب خان تو ہی ہے؟''

قطب خان تیز لہجے میں بولا۔ ''کیا تجھے شبہ ہے؟''

پہرے داروں کے سردار نے کہا۔'' نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں پھر بھی ہمیں اطمینان تو کرنا ہی پڑتا ہے۔'' اس کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔'' اس کی تلاشی لے کر اندر پہنچا دیا جائے۔''

قطب خان کی تلوار اور خنجر اس سے لے لیے گئے۔ اب وہ بالکل نہتا ہو چکا تھا۔ اس نے شاکی نظروں سے اپنے افغان بھائیوں کی طرف دیکھا۔ ایک افغان امیر نے تسلی دی۔

''قطب خان! پریشان مت ہو۔ یہاں کا یہی دستور ہے کہ اگر کوئی محل سرا میں جانا چاہے تو اس کے ہتھیار دروازے ہی پر رکھوا لیے جاتے ہیں۔''

قطب خان نے افغان امراء کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو۔'' بھائیو! کیا یہ افغان امیر سچ کہہ رہا ہے؟''

ایک دوسرے افغان امیر نے کہا۔'' قطب خان! مرد بن، ہم جو تیرے ساتھ ہیں۔''

پہرے داروں نے قطب خان کو اپنے نرغے میں لے لیا اور اس کو محل سرا میں لے جانے لگے۔ قطب خان نے افغان امراء کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔'' کیا یہ لوگ اندر نہیں جائیں گے؟''

پہرے داروں نے جواب دیا۔'' نہیں۔''

اس پر افغان امراء بگڑ گئے۔ ایک نے کہا۔'' لیکن ہمیں تو بادشاہ سلامت نے اس لیے طلب کیا تھا کہ قطب خان اور بادشاہ کی بات چیت کے دوران اس کی مدد کے لیے پاس ہی موجود رہیں۔''

پہرے دار نے بے مروتی سے کہا۔'' ممکن ہے آپ لوگوں سے یہی کہا گیا ہو لیکن ہمیں یہی حکم ملا ہے کہ بادشاہ کے حضور قطب خان کو تنہا پیش کیا جائے۔''

اب قطب خان اندر تھا اور افغان امراء باہر۔ قطب

خان اور افغان امراء کو بیک وقت یہ شبہ گزرا کہ شاید ان کے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔ قطب خان نے باہر نکلنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ شاہی محل کے پہرے داروں نے اس کو پکڑ کر بادشاہ کے پاس پہنچا دیا۔ اس وقت بادشاہ ترنگ میں تھا۔ حسن و شباب کے شہ پارے اس کے زانوؤں پر بیٹھے اپنی مسکراہٹوں اور دمت درازیوں سے بادشاہ کو شراب کے نشے سے زیادہ بدمست کیے دے رہے تھے۔ اس نے اس عالم میں جب یہ سنا کہ قطب خان اذن باریابی کا طالب ہے تو اس کو بہت گراں گزرا۔ اس نے نشے میں بہکی بہکی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"لوگو! یہ کیسی بدمذاقی ہے کہ اس کیف اور وقت میں قطب خان کو بلا لائے۔"

ایک خدمت گار اور محافظ نے عرض کیا۔ "حضورِ والا! گستاخی معاف۔ قطب خان کو آپ ہی نے طلب فرمایا تھا ورنہ وہ کیوں پیش کیا جاتا۔"

بادشاہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "اس نے میرا مزہ کرکرا کر دیا۔ قطب خان کو پیش کیا جائے۔"

دو طاقت ور اور گرانڈیل خاتون پہرے دارنیوں نے قطب خان کو بازوؤں سے پکڑ لیا اور اس عالم میں تقریباً کھینچتی ہوئی بادشاہ کے پاس تک لے چلی گئیں۔ بادشاہ پھر بہک گیا۔ وہ آنکھیں مل مل کر قطب خان کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتا رہا پھر پوچھا۔

"تو کون ہے؟ یہاں کیوں آیا ہے؟"

قطب خان نے عرض کیا۔ "حضورِ والا! آپ مجھ کو پہچان نہیں رہے ہیں۔ حاکم سرہند اسلام خان مرحوم کا بیٹا قطب خان ہوں اور اپنے بھائی ملک بہلول کا ایک خاص پیغام لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔"

"ملک بہلول کا بھائی، اسلام خان کا بیٹا..... تُو تو بس ایک ہی نظر آرہا ہے مجھے..... دوسرا کہاں ہے؟"

قطب خان نے عرض کیا۔ "میری درخواست ہے کہ حضور میری ملاقات کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھیں، اس وقت میں وہ بات نہیں کروں گا جس کے لیے میں بطورِ خاص بھیجا گیا ہوں۔"

بادشاہ نے کہا۔ "دیکھ بھائی! ملک بہلول سے کہہ دے وہ مجھ پر ظلم نہ کرے۔ اب میں برداشت نہیں کرسکتا۔ اس سے کہہ کہ اگر لڑکیاں درکار ہیں تو میں ہزاروں کی تعداد میں پیش کرسکتا ہوں۔ اگر حکومت کے لیے ملک درکار ہے تو اس سلسلے میں بھی میری خدمات حاضر ہیں۔ میں ملک بہلول کے ساتھ بنگال فتح کر کے اس کے حوالے کر دوں گا۔ اس طرح وہ حکومت کرنے کی خواہش پوری کر لے گا۔"

قطب خان نے عرض کیا۔ "حضورِ والا! میرے بھائی ملک بہلول کو حکومت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس نے شاہی افواج سے مقابلہ بدرجہ مجبوری کیا۔ وہ اس حرکت پر اتنا نادم اور شرمسار ہے کہ اس کی بھوک پیاس اڑ گئی۔"

بادشاہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس کے حلق سے آواز اس طرح نکلنے لگی جس طرح کسی برتن سے انڈیلے جانے والے پانی کی آواز آتی ہے۔ بادشاہ نے کہا۔ "یقیناً ملک بہلول کو میرا جلال پریشان کر رہا ہوگا۔ قطب خان! میں اس کو معاف نہیں کرسکتا۔ میں اس کو اس کے کیے کی سزا دوں گا۔"

قطب خان نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "میں خود بھی حضور کے پاس یہی کہنے آیا ہوں کہ ملک بہلول میرا بھائی ہی سہی مگر اس کو اس کی گستاخیوں اور چیرہ دستیوں کی سزا ضرور ملنا چاہیے۔"

بادشاہ نے نشے میں ادھ کھلی آنکھوں سے جھک کر قطب خان کو دیکھا، بولا۔ "تو زیادہ سمجھ دار معلوم ہوتا ہے۔ تو آدمی سچا اور کھرا معلوم ہوتا ہے۔ کیا تیرا بھائی بہلول تجھ پر اعتماد کرتا ہے؟"

قطب خان نے جواب دیا۔ "نہیں، وہ مجھ پر ذرا بھی اعتبار نہیں کرتا۔ اس نے مجھ سے جیسے ہی یہ کہا کہ میں اس کا ایک پیغام آپ تک پہنچا دوں، میں فوراً تیار ہوگیا کیونکہ اس طرح مجھ کو اس ماحول سے فرار ہوجانے کا موقع مل گیا تھا۔"

بادشاہ نے کہا۔ "چالاک آدمی، اب تو میرا مہمان ہے۔ میں تجھ سے پھر کسی وقت بات کروں گا اس وقت تو میں بہت مصروف ہوں اور تو بھی تھکا تھکا نظر آتا ہے۔ تو آرام کر، میں کام کروں گا۔" اس کے بعد فرمان جاری کر دیا۔

"قطب خان کو شاہی مہمان خانے میں ٹھہرا دیا جائے۔"

حکم کی دیر تھی کہ قطب خان کو شاہی مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا۔ قطب خان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ بادشاہ اتنا بہادر کہاں سے ہوگیا۔ وہ ملک بہلول کا نام حقارت سے کیوں لے رہا تھا؟ اس نے یہ بھی سوچا کہ اگر یہاں کے حالات اور معاملات برعکس نکلے تو اس کو گلوخلاصی کس طرح ملے گی۔ وہ یہاں سے نکلے گا کس طرح؟ وہ معلوم نہیں کیا کیا سوچ رہا تھا۔ اس کی بھوک پیاس، نیند اور اطمینان سب کچھ چھن چکا تھا۔ بھائی بہلول نے اس کو کس مصیبت میں پھنسا دیا تھا؟

شاہی مہمان خانے میں نصف شب کے بعد قطب خان کو اس کے نگراں نے مطلع کیا کہ وزیر الممالک حسام خان اس سے ملنا چاہتا ہے۔

قطب خان سمجھا شاید اس کو بادشاہ نے بھیجا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ ”وزیر الممالک حسام خان کو مجھ سے ملنے کے لیے اجازت لینے کی کیا ضرورت؟“

کچھ دیر بعد حسام خان چوروں کی طرح اندر داخل ہوا۔ اس نے آتے ہی دروازے اندر سے بند کرلیے اور قطب خان کو سرگوشی میں مخاطب کیا۔ ”قطب خان! تو یہاں کیا پیغام لے کر آیا ہے؟“

قطب خان نے جواب دیا۔ ”میں کوئی پیغام لے کر نہیں آیا۔ میں اپنے بھائی ملک بہلول سے ناراض ہوکر چلا آیا ہوں کیونکہ میں حقیقت پسند ہوں اور اس پر یقین رکھتا ہوں کہ ہم لوگ بادشاہ سے ٹکرلے کر کہیں کے بھی نہیں رہیں گے۔“

حسام خان کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہوگئی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی، بولا۔ ”قطب خان! میرا خیال ہے اپنے بھائی ملک بہلول کی صحبت نے تجھے بھی خراب کردیا ہے لیکن تو بلاشبہ اسلام خان کا فرزند ہے۔ اس کی طرح زیرک اور دانا۔“

قطب خان نے کہا۔ ”گوکہ آپ کی شکست اور بہلول کی فتح سے بہلول اور افغانوں میں بڑی ہمت پیدا ہوگئی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ عارضی فتح اور وقتی خوشی بالآخر ان کی بربادیوں پر ختم ہوجائے گی۔“

حسام خان، قطب خان کی پشت تھپتھپانے لگا، بولا۔ ”بے شک خدا نے تجھے بڑی بصیرت دی ہے۔ بادشاہ نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ میں دہلی کے مضافات سے فوج جمع کروں اور اس لشکرِ جرار سے بہلول اور افغانوں کا زور ہمیشہ کے لیے توڑ دوں۔ مجھے اس وقت یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا اور بادشاہ کی اطلاع کے مطابق اس وقت میں دہلی کے مضافات میں سپاہیوں کی تلاش میں مشغول ہوں لیکن یہاں چوروں کی طرح تیرے پاس بیٹھا باتیں کررہا ہوں۔ میری اس ملاقات کا ذکر بادشاہ سے ہرگز نہ کرنا۔“

قطب خان نے جواب دیا۔ ”ذکر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تو ملازمت کے لیے یہاں آیا ہوں۔“

حسام خان نے کہا۔ ”تقریباً ایک ہفتے بعد میں یہیں دہلی میں ہوں گا اور اس وقت میں تجھے کسی اچھے سے منصب پر فائز کردوں گا۔“

قطب خان نے حسام خان کو ستانے کے لیے ایک شوشہ چھوڑا۔ ”حسام خان! بہلول کی ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ وہ آدمی خودسر اور بلا کا خود اعتماد ہے۔ وہ کسی کو بھی اپنے برابر کا نہیں سمجھتا۔ بس اس کی اس بات سے تمہیں ہوشیار رہنا چاہیے۔ باقی کوئی خطرے کی بات نہیں۔“

حسام خان نے انگوٹھے اور درمیانی انگلی سے چٹکی بجائی اور خوش ہوکر کہا۔ ”میں اس کی کسی بات سے بھی نہیں ڈرتا۔ میں اس کو وہ سبق دوں گا کہ اگر اس کے بعد زندہ رہا تو زندگی بھر یاد رکھے گا۔“

حسام خان جس طرح آیا تھا، اسی طرح چلا گیا اور قطب خان کی نیند بالکل ہی اڑ گئی۔ یہاں کی تو فضا ہی کچھ اور تھی اور وہ کیا سمجھ کر آیا تھا۔

☆☆☆

قطب خان ابھی سوکر بھی نہیں اٹھا تھا کہ شاہی خدمت گار خاتون نے اس کو بیدار کردیا اور بتایا۔ ”بادشاہ تجھے فوراً ہی طلب کررہا ہے۔“

قطب خان جس حال میں تھا، اسی میں بادشاہ کے دربار میں پہنچ گیا۔ اس وقت بادشاہ اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ اس نے اپنی جگہ پر کھڑے ہوکر قطب خان کی پذیرائی کی اور کہا۔ ”قطب خان! میں تجھے اپنا معتمد خاص بنالوں گا کیونکہ میں نے تجھ میں جو اوصاف دیکھے اور محسوس کیے ہیں کہیں اور نہیں ملتے۔“

قطب خان سے کچھ اور باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد بادشاہ نے تالی بجا کر تخلیے کا حکم دیا۔ کچھ دیر بعد بادشاہ اور قطب خان کے علاوہ تیسرا کوئی شخص نہیں نظر آیا۔ جب بادشاہ کو اچھی طرح یہ یقین ہوگیا کہ ان دونوں کے درمیان تیسرا کوئی شخص بھی وہاں موجود نہیں ہے تو بادشاہ نے قطب خان سے آہستہ سے پوچھا۔

”قطب خان! میں نے کل تجھ سے جو باتیں کی تھیں ان پر سنجیدگی سے کچھ بھی نہ سوچنا، وہ ساری فضول باتیں تھیں۔ اصل باتیں تو آج اور اس وقت ہوں گی۔“

بادشاہ نے ادھر ادھر شک کی نظروں سے دیکھ کر قطب خان سے پوچھا۔ ”میرا فرزند ملک بہلول کیسا ہے؟“

قطب خان نے شک و شبہے سے جواب دیا۔ ”اچھا ہے، حضور کو سلام کہلوایا ہے۔“

بادشاہ نے جواباً وعلیکم السلام کہا اور بے اختیار بہلول کو دعائیں دینے لگا۔

”قطب خان! میں تجھ سے سچ کہہ رہا ہوں کہ میں ملک بہلول سے بہت زیادہ متاثر ہوں۔ اگر بہلول جیسے

لوگ میرے آس پاس آجائیں تو اس ملک میں قومِ افغان کا کوئی جواب نہ ہوگا اور ہر اونیٰ اور اعلیٰ منصب پر تم ہی لوگ نظر آؤ گے۔"

قطب خان نے عرض کیا۔"بجا فرمایا حضورِ والا نے لیکن اس سے پہلے اعتماد کی فضا پیدا کی جانی چاہیے۔ میری قوم اس غلط فہمی کا شکار ہوگئی ہے کہ بادشاہ ان کا دشمن ہے۔"

بادشاہ نے جواب دیا۔"ملک قطب خان! تیری قوم اور بہلول کے ساتھ میری طرف سے جو کچھ بھی ہوا اس کا ذمے دار حسام خان ہے۔ اس نمک حرام نے مجھے تیری قوم اور بہلول کی نظر میں خوار کردیا ہے لیکن اب میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

قطب خان چکر میں تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ بادشاہ کی باتیں کل کے مقابلے میں متضاد تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ معلوم نہیں کل کی باتیں درست تھیں یا آج کی، بولا۔"حضورِ والا! جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا تھا کہ قومِ افغان اور آپ کے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں، پہلے انہیں دور ہونا چاہیے، اس کے بعد کچھ اور ہو جانا چاہیے۔"

بادشاہ نے پوچھا۔"دیکھ قطب خان! میری کل والی باتوں کو تو بھلا دے۔ وہ فضول باتیں تھیں لیکن آج ہم دونوں میں جو باتیں ہورہی ہیں، یہ درست اور قابلِ اعتبار ہیں۔" پھر کچھ دیر چپ رہ کر پوچھا۔"اچھا ایک بات تو بتا، تیرا تیرے اپنے بھائی ملک بہلول پر کتنا اثر ہے؟"

قطب خان نے جواب دیا۔"بہلول میری بڑی عزت کرتا ہے اور یہاں تک کہ وہ کسی حد تک میری ناجائز اور غلط باتیں تک مان لیتا ہے۔"

بادشاہ نے کہا۔"اگر یہ بات ہے تو میں تجھ سے ایک کام لوں گا۔"

قطب خان، بادشاہ کی صورت دیکھنا چاہتا تھا لیکن ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ آہستہ سے کہا۔"حضورِ والا! ایک ہی کام کیا موقوف، آپ مجھ سے دس کام لے سکتے ہیں۔"

بادشاہ نے کہا۔"میں چاہتا ہوں کہ میں بہلول سے طاقت آزمائی بند کرکے مفاہمت کرلوں لیکن یہ ہو تو کس طرح؟"

قطب خان نے دبی زبان میں عرض کیا۔"حضورِ والا! ناچیز کی سمجھ میں آپ کی باتیں بالکل نہیں آرہی ہیں۔ ایک تو اپنے وزیر الممالک حسام خان کو دہلی کے مضافات میں اس کے لیے روانہ فرما دیتے ہیں کہ وہاں سے ایک لشکرِ جرار مہیا کرکے افغان پر فیصلہ کن چڑھائی کردی جائے اور ملک بہلول کی قوت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پارہ پارہ کردی جائے۔"

بادشاہ ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔"تجھ کو یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی کہ میں نے حسام کو دہلی کے مضافات میں فوج اکٹھا کرنے کے لیے بھیجا ہے؟"

قطب خان نے جواب دیا۔"حضور! اس سوال کو آخر میں کرلیجیے گا۔ ابھی تو آپ میری قوم کو یہ یقین دلائیں کہ آپ دشمن نہیں ہیں۔"

بادشاہ نے کہا۔"میں نے افغان امراء سے جیسے ہی یہ خبر سنی کہ تو ملک بہلول کا کوئی خاص پیغام لے کر میرے پاس آیا ہے تو میں نے حسام خان کو فوج اکٹھا کرنے کے بہانے دہلی کے باہر بھیج دیا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ حسام خان یہ نہیں چاہتا کہ میں تیری قوم اور بہلول کی طرف مفاہمت اور دوستی کا ہاتھ بڑھاؤں۔"

قطب خان کی سمجھ میں اب چند باتیں یقینی طور پر آگئی تھیں۔ رات حسام خان جس انداز میں اس سے ملا تھا اور پھر یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ بہلول کا کیا پیغام لے کر آیا ہے۔ یہ ساری باتیں زیادہ بادشاہ کو سچا قرار دے رہی تھیں۔ قطب خان نے عرض کیا۔

"میرا بھائی بہلول، حسام خان سے نفرت کرتا ہے۔ وہ اس کو نالائق اور نااہل سمجھتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ جب تک وہ آپ کے پاس رہے گا، بہلول اور قومِ افغان حضور پر اعتماد نہیں کرسکتی۔"

بادشاہ نے عاجزی سے کہا۔"لیکن میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ میں بہلول اور اس کی قوم کا اعتماد بہرحال اور بہر قیمت حاصل کرکے رہوں گا۔"

قطب خان نے نہایت محتاط لہجے میں رک رک کر کہا۔"میرا بھائی ملک بہلول اور میری قوم بادشاہ سے مفاہمت کے خواہش مند ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ اپنی زندگیاں بادشاہ کی خدمت اور قربت میں گزار دیں گے مگر جب وہ یہ سوچتے ہیں کہ ایسا ہونا تقریباً ناممکن ہے تو بہت مایوس اور افسردہ ہو جاتے ہیں۔"

بادشاہ کے چہرے پر بشاشت اور تازگی پیدا ہوگئی۔ مضطربانہ کہا۔"اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے اگر تیرے بھائی بہلول اور تیری قوم کے لوگوں کی یہ خواہش ہے کہ میرے قریب رہیں اور میں ان سے کام لوں تو یہ ایسی مشکل اور ناممکن خواہش تو نہیں۔ میں انہیں ہر وقت خوش آمدید کہنے کو تیار ہوں۔"

قطب خان نے رک رک کر عرض کیا۔"لیکن میرے بھائی بہلول کا خیال ہے کہ جب تک حضور کے پاس حسام

خان موجود ہے ایسا نہیں ہو سکتا۔"

بادشاہ نے فوراً تجویز پیش کی۔"ملک بہلول اور تیری قوم کی دوستی حاصل کرنے کے لیے میں حسام خان کو وزیر المالک کے منصب سے علیحدہ کر سکتا ہوں۔"

قطب خان نے پس وپیش سے کہا۔"ملک بہلول اس سے زیادہ کچھ چاہتا ہے کیونکہ وہ کہتا ہے کہ حسام خان وزیر المالک رہے یا نہ رہے، اس کے اثرات ضرور رہیں گے اور یہ اثرات بھی بھی حضور اور ملک بہلول کے درمیان کشیدگی کا باعث بن جائیں گے۔"

بادشاہ نے ذرا تیز آواز میں کہا۔"قطب خان! جب میں یہ کہتا ہوں کہ مجھے بہلول اور تیری قوم کی دوستی ہر شے سے بڑھ کر عزیز ہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ میں اپنے اس مقصد کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہوں۔"

قطب خان نے عرض کیا۔"حضور والا! یہ میری خواہش نہیں ہے، میں تو اپنے بھائی بہلول کا قاصد ہوں۔ اس نے مجھ کو جو پیغام دیا ہے میں اس کو نہایت دیانت داری سے کم سے کم لفظوں میں سادگی کے ساتھ حضور کے گوش گزار کر دینا چاہتا ہوں۔"

بادشاہ نے بے چینی سے کہا۔"قطب خان! تو بلاوجہ بات کو طول دے رہا ہے۔ جو کچھ کہنا چاہتا ہے فوراً کہہ دے۔ میرے صبر اور برداشت کا امتحان تو نہ لے۔"

قطب خان نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور عرض کیا۔

"ملک بہلول کہتا ہے کہ اگر حضور حسام خان کو قتل کر دیں اور اس کی جگہ حمید خان کو وزیر المالک بنا دیں تو وہ حضور کے دربار سے وابستگی کو اپنی عزت افزائی سمجھے گا اور اس کے ساتھ میری قوم بھی یہیں چلی آئے گی۔"

بادشاہ سوچ میں پڑ گیا۔ قطب خان کن انکھیوں سے بادشاہ کے چہرے اور حرکات وسکنات سے یہ اندازہ لگانے لگا کہ اس کی بات کا ردعمل کیا ہوا؟

کچھ دیر بعد بادشاہ نے اپنا سر جھکا لیا اور آہستہ سے کہا۔"قطب خان! جا اور ملک بہلول کو یہ خوش خبری سنا دے کہ بادشاہ اس قیمت پر بھی ان کی دوستی خریدنے کو تیار ہے۔"

قطب خان نے سرد مہری سے عرض کیا۔"ظل اللہ! آپ کو میرے بھائی ملک بہلول کی طبیعت کا علم نہیں ہے۔ اس نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں جب حضور کے پاس سے واپس جاؤں تو میری جھولی میں بادشاہ کا محض وعدہ پڑا ہوا نہ ہو۔ اس نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ قطب خان! اگر تیری جھولی میں حسام خان کا سر گیا تو میں یہ سمجھ لوں گا کہ میں بادشاہ کی صحبت اور قربت میں رہنے کا اہل قرار دے دیا گیا ہوں ورنہ میں مایوس ہو جاؤں گا۔"

بادشاہ پھر چپ ہو گیا اور بڑی دیر تک سوچتا رہا، آخر بولا۔"اچھا بقیہ باتیں کل ہوں گی۔ میں تجھ کو کل پھر طلب کروں گا اور امید ہے کل میں اپنا وعدہ پورا کر دوں گا اور تیری جھولی میں وہ شے ڈال دی جائے گی جو تیرے ضدی بھائی ملک بہلول کو درکار ہے۔" قطب خان شاہی مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا۔

دوسرے دن بادشاہ نے فجر کی نماز کے بعد ہی قطب خان کو طلب کر لیا۔ بادشاہ نے جس وسیع وعریض کمرے میں قطب خان کو بلایا تھا، وہاں ابھی تک اندھیرا تھا اور چھت گیر بڑے فانوس کی روشنی میں رات کا سماں طاری تھا۔ بادشاہ کے سر میں پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس کے لیٹنے کے انداز سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ سر کے درد میں مبتلا ہے۔ دو خوب صورت کنیزیں اس کا سر دبا رہی تھیں اور دو پاؤں دبانے میں مشغول تھیں۔ چار دائیں بائیں کھڑی بادشاہ کے حکم کی منتظر تھیں۔ بادشاہ کراہ رہا تھا۔ قطب خان یہ سماں دیکھ کر ڈر گیا۔ اس نے سوچا کہیں بادشاہ اس سے برہم تو نہیں ہے۔

بادشاہ نے قطب خان کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ قطب خان اس کے اتنا قریب پہنچ گیا کہ دونوں کے درمیان بس پانچ چھ قدم کا فاصلہ حائل تھا۔

بادشاہ نے خفگی سے کہا۔"تو اتنی دور کیوں کھڑا ہو گیا..... میرے قریب کیوں نہیں آتا؟"

قطب خان دو قدم چل کر بادشاہ کے اور قریب ہو گیا۔

بادشاہ نے کہا۔"کچھ اور قریب۔"

قطب خان دو قدم اور بڑھ گیا۔ بادشاہ نے پھر کہا۔

"قطب خان! میری مسہری کے پاس تک آ جا۔ آخر اتنی دور کیوں رکا جا رہا ہے؟"

قطب خان بادشاہ کی مسہری سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ نے کنیزوں کو حکم دیا کہ باہر چلی جائیں اس کو تخلیہ درکار ہے۔

کنیزیں دوسری طرف چلی گئیں۔ بادشاہ نے کچھ دم لے کر کہنا شروع کیا۔"قطب خان! رات میں بڑی دیر تک تیرے بھائی ملک بہلول کی شرطِ دوستی پر غور کرتا رہا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا فیصلہ کروں۔''

قطب خان نے عرض کیا۔''ظل اللہ! گستاخی معاف، قطع کلامی پر معذرت خواہ ہوں۔ کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کرسکتا ہوں کہ آپ میرے بھائی بہلول کی کس شرط دوستی پر رات بھر غور فرماتے رہے؟''

بادشاہ نے چیں بہ جبیں ہوکر کہا۔''ارے قطب خان! یہ تجھے ہوکیا گیا ہے؟ کیا تو نے کل مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ ملک بہلول میرے وعدے کی جگہ تیری جھولی میں حسام خان کا سر دیکھنا چاہتا ہے؟''

قطب خان نے جواب دیا۔''بے شک میں نے یہ کہا تھا لیکن اس وقت مجھ سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ میرے بھائی ملک بہلول کی شرط پوری کردی جائے گی اور یہ کہ آپ بہلول اور میری قوم کی دوستی ہر قیمت پر خریدنا چاہتے ہیں اور جب ہماری ایک بات طے پاگئی تو پھر حضور رات بھر کس مسئلے پر غور فرماتے رہے اور اس کا ابھی تک کوئی فیصلہ بھی نہیں ہوسکا اور حضور کے سر میں درد پیدا ہوگیا۔''

بادشاہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''واقعی یہ مسئلہ تو کل ہی طے پاچکا پھر میں نے تجھ کو آج کیوں بلایا تھا؟ تجھے آج کس سلسلے میں ملاقات کا وقت دیا گیا تھا؟''

قطب خان نے جواب دیا۔''یہ بات تو حضور ہی کو معلوم ہونا چاہیے۔ میں حضور سے کل ہی پوچھ سکتا تھا کہ مجھے دوبارہ کیوں طلب کیا جارہا ہے لیکن یہ سوچ کر چپ ہورہا کہ بادشاہ سے سوال جواب کرنا گستاخی میں داخل ہے۔''

بادشاہ ہنسنے لگا۔''قطب خان! تو اپنے باپ اسلام خان جیسی باتیں کرتا ہے، خیر، اب مجھ کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ تیرے بھائی ملک بہلول کی مطلوبہ اور مشروط شے کب تک تیری جھولی میں ڈال دی جائے اور تو واپس جاکر اس شے کے عوض ملک بہلول اور اپنی قوم کو لے کر میرے پاس چلا آئے۔''

قطب خان نے عرض کیا۔''جی بندہ پرور، اب میں ایفائے عہد کا منتظر ہوں۔''

بادشاہ نے پوچھا۔''وزیر المالک حسام خان کے منصب پر فائز کس کو کیا جائے گا؟''

قطب خان نے جواب دیا۔''میرے بھائی بہلول نے اس سلسلے میں حمید خان کا نام لیا تھا۔''

بادشاہ نے متذبذب لہجے میں کہا۔''ہاں حمید خان بھی اچھا آدمی ہے۔ زیرک وفہیم، دانا وبینا۔ وہ برا آدمی نہیں ہے۔'' پھر پوچھا۔''قطب خان! میں تجھ سے مشورہ لیتا ہوں۔ یہ بتا کہ حسام کو قتل کرنے کا جواز کیا پیش کیا جائے؟''

قطب خان نے جواب دیا۔''یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے، اس کا جواز میں فراہم کردوں گا۔''

بادشاہ نے بے چینی سے کہا۔''تو بتا، دیر کیوں؟ فوراً بتا۔''

قطب خان نے پوچھا۔''ان دنوں حسام خان ہے کہاں؟ کیا اس کو بلوایا جاسکتا ہے؟''

بادشاہ نے جواب دیا۔''وہ تو میں تجھ کو پہلے ہی بتاچکا ہوں کہ تیری آمد اور ملاقات کی وجہ سے حسام خان کو دور رکھنے کی غرض سے میں نے اس کو فوجیوں کی فراہمی کے بہانے دہلی کے مضافات میں روانہ کردیا تھا۔''

قطب خان نے پوچھا۔''اگر بادشاہ کے ملازمین میں ایسا بھی ہو جو بادشاہ کا حکم نہ مانے اور حکم عدولی کرے تو حضور اس کو کیا سزا دیں گے؟''

بادشاہ نے جواب دیا۔''وہ باغی اور غدار سمجھا جائے گا اور واجب القتل ٹھہرے گا۔''

قطب خان نے عرض کیا۔''تو حضور حسام خان بھی باغی اور غدار ہے۔ اس نے بادشاہ کا حکم نہیں مانا ہے۔ اس نے حکم عدولی کی ہے۔''

بادشاہ نے پوچھا۔''اس کا ثبوت؟''

قطب خان نے جواب دیا۔''حسام خان اس وقت بھی دہلی ہی میں ہے۔ وہ دہلی کے باہر ایک دن کے لیے بھی نہیں گیا۔ میں اس کا ناقابل تردید ثبوت پیش کرسکتا ہوں۔''

بادشاہ نے کہا۔''قطب خان! اگر تو سچا ہے تو گویا تو نے میری مشکل آسان کردی۔ بخدا تو، تو اس لائق ہے کہ حسام خان کی جگہ تجھ کو وزیر المالک بنادیا جائے۔''

قطب خان نے جواب دیا۔''بندہ پرور، میں اپنے بھائی بہلول سے زیادہ لائق نہیں ہوں۔ اس کی موجودگی میں، میں کیسے وزیر المالک بن سکتا ہوں اور پھر کسی مقتول کی قائم مقامی میں اپنے لیے ناپسند کرتا ہوں۔''

اس کے بعد قطب خان نے حسام خان کی شاہی مہمان خانے میں خفیہ آمد، ملاقات، باتیں اور دوسری تفاصیل بادشاہ کے گوش گزار کردیں۔ بادشاہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس نے پیشانی پر بندھی ہوئی پٹی اتار کر پھینک دی اور خوش ہوکر کہا۔

''قطب خان! اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کل میں تجھے پھر زحمت دوں گا۔ میں تجھ کو اور شاہی مہمان خانے کے نگراں کو یہیں کہیں چھپادوں گا اور حسام خان کو بلوا کر باتیں شروع کردوں گا۔ میں اس سے پوچھوں گا کہ اس نے اتنے دنوں تک کیا کیا۔ ظاہر ہے وہ غلط بیانی سے کام لے گا۔

جب وہ اپنی کہہ چلے گا تو میں تالی بجا کر تم دونوں کو طلب کرلوں گا۔ اس وقت حسام خان کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ مکافاتِ عمل کا شکار ہو چکا ہے اور میں اسی وقت اس کو قتل کردوں گا۔''

بادشاہ ترنگ میں تھا۔ اس نے قطب خان کی موجودگی کی پروا کیے بغیر کنیزوں کو طلب کرلیا اور حکم دیا۔ ''قطب خان کو رقص و سرود سے خوش کیا جائے کیونکہ اس وقت یہ سب سے زیادہ معزز مہمان ہے۔''

بادشاہ کے حکم پر شاہی دربار سے وابستہ نامور مغنیاؤں اور رقاصاؤں کو طلب کرلیا گیا۔ بادشاہ کا انگ انگ خوش تھا۔ قطب خان کو میرِ محفل بنا کے ایک مخصوص جگہ پر بٹھا دیا گیا۔ وہ گاؤ تکیوں کے سہارے اس طرح بیٹھ گیا جس طرح کوئی خودمختار حکمران بیٹھ سکتا ہے۔ بادشاہ اپنی جگہ لیٹا رہا۔ رقص و سرود کا طائفہ قطب خان کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگا۔ بادشاہ اس سے لاتعلق رہا گویا اس کا اس محفل سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ قطب خان کو اپنی اور اپنی قوم کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ بادشاہ کی پروا کیے بغیر ناچ گانے سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس نے رقص میں مشغول رقاصہ کو اپنے پاس آتے دیکھا تو اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی مگر ہر بار رقاصہ وحشی ہرنی کی طرح پھرتی سے پیچھے ہٹ کر خود کو بچا لیتی۔

بادشاہ کے اردگرد موجود کنیزیں قطب خان کو رشک وحسد سے دیکھ رہی تھیں۔ انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ جلد یا بدیر اس افغان نوجوان کو بادشاہ کی طرف سے کوئی بڑا منصب ملنے والا ہے۔

☆☆☆

خلوت کی بات جلوت میں پہنچ گئی اور قطب خان کا ذکر شاہی محل کے باہر بھی ہونے لگا۔ یہ خبریں اپنے گھر میں روپوش حسام خان کے کانوں تک بھی پہنچ گئیں۔ وہ فکرمند تو تھا ہی، ان خبروں نے اس کو خوف زدہ اور پریشان بھی کردیا۔ وہ اسی وقت بادشاہ کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن ڈرتا بھی تھا۔

شام کو جبکہ فضاؤں میں پرندے بسیرے کے لیے جھنڈوں کی شکل میں محوِ پرواز تھے۔ حسام خان اندر سے نکل کر صحن میں آ گیا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے پرندوں پر رشک آ رہا تھا جو کسی کے ملازم نہیں تھے۔ جو کسی کے حکم کے تابع نہیں تھے اور جنہیں کسی بادشاہ کا خوف نہیں تھا۔ کھلی فضاؤں میں مرضی کے مطابق محوِ پرواز رہنا کتنی خوش قسمتی کی بات تھی۔

اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ مغرب کی اذان نے اس کو چونکا دیا۔ عصر کے وضو سے مغرب کی نماز ادا کی اور ایک بار پھر مغربی افق پر رنگ برنگی شفق کا نظارہ کرنے لگا۔ کہیں دور سے بسیرا لینے والی چڑیوں کی چہچہاہٹ کا شور سنائی دے رہا تھا۔ اس عالم میں حسام خان کے خدمت گار نے اس کو مطلع کیا کہ بادشاہ کے ہرکارے بادشاہ کا یہ پیغام لے کر آئے ہیں کہ اگر حسام خان واپس آ گیا ہے تو فوراً بادشاہ سے ملاقات کرے کیونکہ بادشاہ کو کسی اہم معاملے میں اس سے مشورہ لینا ہے۔

ایک لمحے کے لیے اس کے جی میں آیا کہ جانے سے انکار کردے اور شاہی ہرکاروں سے کہلوا دے کہ حسام خان ابھی واپس نہیں آیا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ ممکن ہے یہ معاملہ قطب خان ہی سے تعلق رکھتا ہو اور بادشاہ اس کو ٹھکانے لگانے کی فکر میں ہو، اس نے بادشاہ سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے خدمت گار سے کہہ دیا۔ ''شاہی ہرکاروں سے کہہ دو کہ میں واپس آ گیا ہوں اور اسی وقت بادشاہ کی زیارت کو حاضر ہوتا ہوں۔''

شاہی ہرکارے اس وقت تک حسام خان کے در پر موجود رہے جب تک حسام خان دربار جانے کے لیے تیار نہیں ہوگیا۔ حسام خان درباری لباس پہن کر باہر نکلا۔ خدمت گار گھوڑا لیے پہلے ہی سے کھڑا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر شاہی ہرکاروں کے ساتھ بادشاہ کے پاس روانہ ہوگیا۔

شاہی محل کے ایک گوشے میں بادشاہ نے اس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ ایسا پُرجوش اور پُرتپاک کہ اس سے پہلے کبھی نہیں کیا گیا تھا۔ بادشاہ نے آگے بڑھ کر حسام خان کو گلے سے لگا لیا، بولا۔ ''بخدا حسام خان! تیری عدم موجودگی میں، میں خود کو تنہا تنہا محسوس کر رہا تھا اور کئی بار میرے جی میں آیا کہ تجھ کو واپس بلواؤں لیکن وہ کام بھی ضروری تھا بس اس لیے برداشت سے کام لیتا رہا۔''

حسام خان نے پوچھا۔ ''حضور کو میری یاد اتنی شدت سے کیوں آ رہی تھی؟ اس کی کوئی خاص وجہ؟''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''ہاں، اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ تجھ کو شاید نہیں معلوم کہ ان دنوں باغی بہلول کا بھائی قطب خان اپنے بھائی کی سفارت پر آیا ہوا ہے۔ بہلول نے یہ پیغام بھیجا ہے کہ سرہند کی حدودِ حکومت، پانی پت سے لاہور کی سرحدوں تک تسلیم کی جائے۔ اگر بادشاہ نے اس کی یہ بات نہ مانی تو جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ میدانِ جنگ

میں آخر کار اس کا فیصلہ ہو جائے گا کہ بہلول اپنے مطالبے میں حق بجانب ہے یا جھوٹا۔''

حسام خان نے پوچھا۔''تو حضور نے اس کا کیا جواب دیا؟''

بادشاہ نے جواب دیا۔''قطب خان کو جواب میں نہیں تُو دے گا۔ میں تو تیری کوششوں کے نتیجے کے انتظار میں تھا۔ میں نے قطب خان پر ضرورت سے زیادہ نوازشیں کریں اور اس کو شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا اور شاندار ضیافتیں دیں تاکہ وہ خوش فہمی میں تیرے آنے تک رکا رہے۔''

حسام خان نے خوش ہو کر کہا۔''تو اب میں آچکا ہوں، حضور کیا فرماتے ہیں؟''

بادشاہ نے کہا۔''اب تو مجھ کو یہ بتا کہ تجھ کو اپنے مقصد میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی ہے؟''

حسام خان نے جواب دیا۔''میں نے دہلی کے مضافات میں دور دور تک آدمی چھوڑ رکھے ہیں اور خود بھی خاصے فوجی جمع کر چکا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو بہلول کی قوت کو پارہ پارہ کر دیا جائے گا۔''

بادشاہ نے خوشی کا اظہار کیا، بولا۔''حسام خان! مجھ کو تجھ سے یہی امید تھی۔ اب تو یہ بتا کہ ہم بہلول پر کب تک لشکر کشی کر سکیں گے؟''

حسام خان نے جواب دیا۔''بس دو تین ماہ بعد۔''

بادشاہ نے منہ بنا کر کہا۔''دو تین ماہ زیادہ ہیں۔''

حسام خان نے عرض کیا۔''وہ تو میں نے اندازے سے مدت بتائی ہے ورنہ شاید ماہ ڈیڑھ ماہ میں ہی ہم اس لائق ہو جائیں گے کہ بہلول اور افغان قوم کو کچل کر رکھ دیں۔''

بادشاہ نے پھر منہ بنایا، کہا۔''ماہ ڈیڑھ ماہ بھی زیادہ ہے۔''

حسام خان نے اور اصلاح کی۔''اگر حضور کو اتنی ہی جلدی ہے تو میں پندرہ دن کے اندر اندر سرہند پر حملہ کرنے کے لائق ہو جاؤں گا۔''

بادشاہ نے منہ بنایا۔''حسام خان! پندرہ دن بھی بہت ہیں۔''

حسام خان نے مجبوری ظاہر کی۔''جہاں پناہ! پندرہ دن کی قلیل مدت میں کمی کرنا ناممکن ہے۔ اگر حضور یہ سمجھتے ہیں کہ دہلی میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جو پندرہ دن سے کم کی مدت میں بھی کچھ کر سکتا ہے تو میں حضور کو مشورہ دوں گا کہ اس سے کام لینے میں مضائقہ نہیں۔ میں یوں بھی بہت تھک چکا ہوں اور آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

بادشاہ زور زور سے ہنستے ہوئے بولا۔''تو نے سچی بات کہہ دی۔ میں بہت خوش ہوں۔ اب تو آرام کرنا چاہتا ہے کیونکہ بہت تھک چکا ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ تو بہت تھک چکا ہے۔ اب تجھ کو واقعی آرام ہی کرنا چاہیے۔ ایسا آرام کہ اس کے بعد کوئی تیرے آرام میں مخل نہ ہو سکے۔ میں نے تیری جگہ حمید خان کا انتخاب کیا ہے۔''

حسام خان یہ سن کر پریشان ہو گیا۔ بادشاہ کی باتوں میں چھل فریب اور مکر کی بو آرہی تھی۔ ابھی وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا کہ بادشاہ نے تالی بجائی۔ تالی کی آواز پر ایک ملحقہ کمرے کا پردہ اٹھا اور پردے کے پیچھے سے تین آدمی بیک وقت نمودار ہوئے۔ حمید خان، قطب خان اور شاہی مہمان سرا کا نگراں۔ حسام خان تینوں کو ایک ساتھ نمودار ہوتے دیکھ کر ساری بات سمجھ گیا۔ التجا کرتے ہوئے کہا۔''جہاں پناہ! مجھے معاف کر دیجیے، میں شرمندہ ہوں۔''

بادشاہ نے پوچھا۔''حسام خان! تو کس بات پر شرمندہ ہے، مجھے تو بتا؟''

حمید خان جھک کر کورنش بجا لایا، بادشاہ نے کہا۔''میرے پاس آجا حمید خان! حسام خان کی سفارش پر آج سے تو وزیر الممالک ہے سلطنتِ دہلی کا۔ حسام خان کے پاس جا کر اس کا شکریہ ادا کر کیونکہ اب تو جو کچھ بھی بنے گا، اس میں بنیادی آدمی حسام خان ہے۔''

حسام خان نے جواب دیا۔''بادشاہ سلامت! میری بابت اگر کوئی فیصلہ کر لیا گیا ہے تو مجھ کو اس سے مطلع کیا جائے تاکہ میں اپنی اصلاح کر سکوں۔''

بادشاہ نے یک بیک غصے سے کہا۔''او جھوٹے، اب تو اپنے عہدے پر کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔ تو نے اپنا اعتبار کھو دیا ہے۔ کیا تو قطب خان اور شاہی مہمان خانے کے نگراں کو جھٹلا سکتا ہے؟''

حسام خان نے عرض کیا۔''نہیں، ہرگز نہیں جہاں پناہ!''

بادشاہ نے کہا۔''کیا یہ غلط ہے کہ تو ایک دن کے لیے باہر نہیں گیا اور تو نے جو کچھ بھی مجھ سے کہا ہے اس میں جھوٹ ہی جھوٹ ہے۔''

حسام خان کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ بادشاہ نے حمید خان سے کہا۔''حمید خان! آج تو وزیر الممالک ہے اور یہ منصب تجھ کو ملک بہلول کی سفارش پر عطا کیا جا رہا ہے۔ اگر کبھی موقع ملے تو بہلول کا شکریہ ضرور ادا کر لینا۔''

حمید خان نے عرض کیا۔''حضور والا کی ہدایتوں پر قطعی عمل کیا جائے گا۔''

حسام خان بادشاہ کے قدموں میں گر گیا، بولا۔

''بادشاہ سلامت رحم۔ مجھے معاف کر دیجیے۔''

بادشاہ نے جواب دیا۔''اب بھی میں نے تیری خواہش پر تجھے تیرے منصب سے سبکدوش کر دیا اور اب میں تیری دوسری خواہش بھی پوری کر دوں گا یعنی یہ کہ تجھ کو آرام کرنے دیا جائے۔''

حسام خان اچانک تن کر کھڑا ہو گیا، بولا۔''میں جانتا ہوں کہ یہ سب کس کے ایما اور کس کی خوشی پوری کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔''اس کے بعد اس نے قطب خان کی طرف دیکھا۔''تو یہ تو ہے، جو بادشاہ کو ایک مخلص، وفادار اور نمک خوار سے محروم کر رہا ہے۔'' پھر بادشاہ سے کہا۔''میں جانتا ہوں کہ آپ نے جو فیصلہ کیا ہے اس کو بدلا نہیں جا سکتا لیکن میں بادشاہ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس نے اپنے ایک جان نثار، مخلص اور شریف النفس خادم کے عوض جن لوگوں کی دوستی حاصل کی ہے، وہ بالآخر سراب ثابت ہو گی۔ بادشاہ نے اپنی سلطنت قطب خان کے بھائی بہلول کو دے دی کیونکہ میں ہی وہ شخص ہوں جس کے بارے میں بہلول کی یہ رائے رہی ہے کہ جب تک حسام خان وزیر الملک ہے، بادشاہ محمد شاہ اور اس کی حکومت برقرار ہے۔''

بادشاہ نے ایک بار پھر تالی بجائی۔ پردے کے پیچھے سے دو خونخوار افراد نکل آئے۔ بادشاہ نے انہیں اشارہ کیا۔ دونوں کی تلواریں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ ایک کی تلوار حسام خان کی گردن کے پار ہو گئی اور دوسری تلوار دھڑ کاٹ گئی۔ دونوں کے وار اتنے یکساں اور ایک ساتھ ہوئے کہ سر اور دھڑ ایک ساتھ زمین پر گر گئے۔

ماحول ایک دم پُرسکون ہو گیا۔ اس کے بعد بادشاہ حسام خان پر جھک گیا، بولا۔''تو نے حکم عدولی کی، میں نے اس کی سزا دے دی۔ حساب کتاب برابر ہو گیا۔'' اس کے بعد سر اٹھا کر قطب خان کے پاس گیا، بولا۔''لے، یہ تحفہ اپنے بھائی ملک بہلول کے لیے لیتا جا اور اس سے کہہ دے کہ میں نے اس کی شرط پوری کر دی۔ اب وہ بھی سابقہ رنجشیں اور کدورتیں اپنے دل سے دور کر دے۔ وہ اپنی قوم کے ساتھ میرے پاس آ جائے، میں خوش آمدید کہوں گا۔''

قطب خان نے حسام خان کا سر بادشاہ کے ہاتھوں سے لے لیا اور عاجزی سے عرض کیا۔''میں اپنے بھائی بہلول کی طرف سے بادشاہ کا شکر گزار ہوں کہ ہماری بات رکھ لی گئی۔ اب ملک بہلول میری قوم کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو جائے گا۔ میں اس کی ذمے داری قبول کرتا ہوں۔''

حسام خان کے قتل نے بادشاہ کی طبیعت میں تکدر پیدا کر دیا۔ اس نے اسی وقت ہر ایک کو رخصت کر دیا اور خود کنیزوں میں چلا گیا۔ اس کی طبیعت گرنے لگی اور وہ خود کو بیمار محسوس کرنے لگا۔

☆☆☆

قطب خان دربار کے افغان امراء سے رخصت ہو کر سرہند روانہ ہو گیا۔ اس کے سامان میں انتہائی قیمتی شے حسام خان کا سر بندھا ہوا تھا جس کی وہ بڑی حفاظت کر رہا تھا۔ وہ اس پر بے حد خوش تھا کہ اپنے بھائی بہلول کے منصوبے پر نہایت ہوشیاری اور عقل مندی سے عمل کیا تھا۔

کئی دن بعد وہ سرہند میں داخل ہو گیا۔ یہ خبر آناً فاناً افغانوں میں مشہور ہو گئی کہ قطب خان دلی دربار سے صحیح سلامت واپس آ گیا ہے۔ بہلول اور چچا فیروز خان بے تابی سے قطب خان کے استقبال کو دوڑے۔ قطب خان اپنے تھکے ہارے اور بھوکے پیاسے گھوڑے کو چرہی پر لے گیا اور اس کو پانی پلانے لگا۔ اس نے اپنے آس پاس لوگوں کے باتیں کرنے اور قدموں کی آہٹیں سنیں تو نظریں اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس نے اپنے سامنے ملک بہلول اور چچا فیروز کو آتے دیکھا تو اتراتا گھوڑے سے اتر پڑا۔ بہلول نے اس کو اترنے سے روکنا چاہا لیکن وہ منع کرنے سے پہلے ہی اتر چکا تھا۔

قطب خان اپنی کامیابی پر اتنا خوش تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بہلول آنسوؤں سے یہ سمجھا کہ قطب خان کسی مصیبت سے بچ نکلا ہے اور یہ اسی غم اور خوشی میں آنسو بہا رہا ہے۔ اس نے اپنے بھائی سے کوئی سوال کیے بغیر سینے سے لگا لیا اور بھینچتے ہوئے کہا۔''قطب خان! میرے لیے یہی کافی ہے کہ تو صحیح سلامت واپس آ گیا۔ میں تجھ کو اپنے سامنے دیکھ کر بڑی خوشی محسوس کر رہا ہوں۔''

چچا فیروز خان نے بھی اسے گلے لگا لیا، بولا۔''قطب خان! کیا میرے سینے میں لگی ہوئی آگ یوں ہی بھڑکتی رہے گی؟ تو بے نیل و مرام کیوں واپس آیا؟''

بہلول نے چچا کو جھڑک دیا۔''چچا، ایسی باتیں نہ کرو۔ میں تو قطب خان کی زندہ واپسی سے بھی بے حد خوش ہوں۔''

قطب خان نے دونوں سے کہا۔''بھائی بہلول اور چچا فیروز خان! آپ کو یہ شبہ کیوں ہے کہ میں ناکام آیا ہوں۔ میں اگر ناکام رہتا تو واپس ہی نہ آتا۔''

دونوں خوشی سے حیران رہ گئے۔ بہلول اور چچا فیروز خان نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ بہلول

نے پوچھا۔ ”قطب خان! کیا حسام خان مارا گیا؟ اس کا سر کہاں ہے؟“

چچا فیروز خان نے کہا۔ ”اگر حسام خان کا سر تیرے پاس ہے تو وہ مجھے ملنا چاہیے۔ جلدی نکال، وہ کہاں ہے؟ تو، تو بڑے کام کا آدمی نکلا۔“

قطب خان نے ایک پوٹلی کھولی اور اس میں سے حسام خان کا سر نکال کر چچا فیروز خان کے قدموں میں ڈال دیا۔ فیروز خان نے سر کو فوراً اٹھالیا اور اس کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا کہ یہ سر واقعی حسام خان کا ہے کسی اور کا تو نہیں۔ حسام خان کی ادھ کھلی آنکھیں فیروز خان پر جمی ہوئی تھیں۔

فیروز خان نے سر کو روبرو کر کے کہا۔ ”حسام خان! تو ہی وہ شخص تھا جس نے ایما اور منصوبہ بندی سے ہم پر حملہ کیا گیا اور اس میں میرا بیٹا شاہین خان مارا گیا۔ آج شاہین خان کا بدلہ لیا جا چکا ہے۔ میں اس سر کو اپنے بیٹے شاہین خان کے سر کے مدفن پر رکھ کر کہہ دوں گا کہ بیٹے! میں نے تیرا بدلہ لے لیا، اب تو خوش ہو جا۔“

بہلول نے چچا فیروز خان سے حسام خان کا سر لے لیا اور بولا۔ ”حسام خان! تو ہی وہ شخص تھا جو میری راہ میں حائل تھا لیکن اب میدان صاف ہو چکا ہے اور اب بادشاہ مجھ سے نہیں بچ سکے گا۔ تو اپنے انجام کو پہنچا، اس وقت میں بہت خوش ہوں۔“

بہلول اور چچا فیروز کے حکم پر قطب خان اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور یہ لوگ گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں جو جو ملتا گیا ان تینوں کے ساتھ ہو لیا۔ یہاں تک کہ جب یہ لوگ گھر میں داخل ہوئے تو ان کے ساتھ ایک ہجوم تھا۔ قطب خان کی بہن نے اپنے بھائی کو سینے سے لگالیا اور پیشانی چومنے لگی۔

رات کو بہلول اس کا چچا فیروز خان اور چند دوسرے افغانوں نے قطب خان کو اپنے درمیان بٹھایا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اپنے سفر کی دلچسپ روداد سب کے سامنے بیان کرے۔

قطب خان کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس نے اپنی داستان بڑے دلنشین انداز میں سنانی شروع کر دی۔ بہلول، بادشاہ کی حماقت اور سادہ لوحی کی داستان بڑے غور سے سنتا رہا۔ آخر میں بولا۔

”بادشاہ کا تخت و تاج میری وجہ سے سخت خطرے میں تھا اور میں اسے حاصل کر کے ہی دم لوں گا۔ اس سے کم کسی چیز پر میں راضی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔“

چچا فیروز نے کہا۔ ”اب میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ اب دہلی چلو اور رہی سہی کسر بھی پوری کر دو۔ ہمیں خوشی ہے کہ بہلول جیسا مدبر اور عقل مند شخص ہم میں موجود ہے اور اسلام خان نے اس کو ہمارا امیر نامزد کر دیا تھا۔“

بہلول نے بادشاہ کے پاس جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس نے اپنی قوم میں سے فیروز خان اور قطب خان کے علاوہ پچیس افراد کا مزید انتخاب کیا۔ کسی افغان بوڑھے نے بہلول کو مشورہ دیا۔

”بہلول! تو خود بھی بہادر اور دور اندیش ہے۔ میرے اپنے ذہن میں چند اندیشے ہیں، کیا میں ان کا اظہار کر دوں؟“

بہلول نے جواب دیا۔ ”کوئی حرج نہیں، مشورہ کبھی بے کار نہیں ہوتا۔ اس سے کبھی نہ کبھی فائدہ ضرور پہنچتا ہے۔“

عمر رسیدہ افغان نے کہا۔ ”میں سردار سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بادشاہ پر بہت زیادہ اعتماد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

بہلول قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ ”تم بہت زیادہ اعتماد کی بات کر رہے ہو جبکہ میں تھوڑے بہت اعتماد کا بھی قائل نہیں ہوں۔“

بوڑھے افغان نے مسکرا کر کہا۔ ”سردار خود بھی بہت عقل مند ہے، اس کو کوئی بھی بے وقوف نہیں بنا سکتا۔“

بادشاہ کو دہلی خبر بھیج دی گئی کہ بہلول اپنے ہم قوم بڑے آدمیوں کے ساتھ سرہند سے روانہ ہو چکا ہے۔

بادشاہ نے نئے وزیر الممالک حمید خان کو بہلول کے استقبال کے لیے روانہ کر دیا۔ حمید خان خود بھی استقبال کے لیے جانا چاہتا تھا۔ بادشاہ بہلول سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔

جمعے کے دن نماز ظہر کے بعد حمید خان مسجد سے باہر نکلا تو کسی نے اطلاع دی کہ بہلول دہلی میں داخل ہو چکا ہے۔ وہ بھاگا بھاگا اس راستے پر چل نکلا جو دہلی سے سرہند جاتا تھا۔ یہاں پڑاؤ پر قافلہ ٹھہرا ہوا تھا اور دہلی رک جانے والے لوگ قافلے سے جدا ہونے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ بہلول ابھی تک پڑاؤ پر ہی موجود تھا۔ اب اس کو جو چیز سب سے زیادہ یاد آ رہی تھی، وہ سنار کی بیٹی زیبا تھی جو سرہند چھوڑ کر دہلی چلی آئی تھی۔ وہ زیبا کا پتا تک نہ جانتا تھا لیکن اس کے لیے پتا لگانا مشکل بھی نہ تھا۔

حمید خان، بہلول کو دیکھتے ہی گلے سے لگ گیا اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ بہلول نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ وہ حمید خان کو اپنے طفیلی سے زیادہ حیثیت دینے کو تیار نہ تھا۔ اس نے حمید خان سے پوچھا۔ ”بادشاہ کیسا ہے؟ وہ تیرے ساتھ کس طرح پیش آ رہا ہے؟“

حمید خان نے جواب دیا۔ ”بادشاہ کو حسام خان کے قتل کا صدمہ ہے لیکن اس بات کی خوشی بھی ہے کہ حسام خان کے سر کے عوض بادشاہ کو بہلول اور اس کی قوم کی دوستی اور حمایت حاصل ہوگئی ہے۔ رہا یہ کہ وہ میرے ساتھ کیسا ہے تو ابھی ہم دونوں ایک دوسرے سے زیادہ قریب نہیں ہوئے۔“

بہلول نے کہا۔ ”حمید خان! میں نے تیرا ساتھ دیا ہے اور آئندہ بھی دیتا رہوں گا۔ بادشاہ کے پاس اور دہلی میں میری عدم موجودگی میں میرے حقوق کی نگرانی اور ان کا تحفظ تیرے ذمے رہے گا۔“

حمید خان کو بہلول کا طرز تخاطب ناگوار گزرا لیکن وہ یہ سوچ کر برداشت کر گیا کہ بہلول کی ناپسندیدگی اور ناراضی وزیرالمالک کا سر لے کر ہی دور ہوتی ہے۔

حمید خان، بہلول اور اس کے رفقا کو لے کر شاہی محل پہنچا اور بادشاہ کو ان کی آمد کی خوش خبری سنائی۔ بادشاہ مارے خوشی کے اتنا از خود رفتہ ہوا کہ شاہی آداب اور تکلفات کا خیال کیے بغیر انہیں طلب کیا۔ اس وسیع و عریض کمرے میں جہاں حسام خان کو قتل کیا گیا تھا، شاہی خدام افغان امراء کو مذکورہ کمرے میں پہنچا کر مؤدب کھڑے ہوگئے۔ قطب خان اور حمید خان کی نظریں فرش کے اس حصے پر لگی ہوئی تھیں جہاں حسام خان کی گردن ماری گئی تھی اور اس پر خون کے سیاہ دھبے اس وقت بھی موجود تھے۔

قطب خان نے ان دھبوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہی وہ جگہ ہے جہاں حسام خان کو قتل کیا گیا تھا۔“

فیروز خان اٹھ کر اس جگہ گیا اور کچھ دیر کھڑے رہ کر کسی خیال میں گم ہوگیا پھر بہلول کے کان میں سرگوشی میں کہا۔ ”بہلول! اس کمرے میں ہمیں بٹھانا بڑا معنی خیز ہے۔ کیا ہمیں بادشاہ پر اعتبار کرنا چاہیے؟“

بہلول نے جواب دیا۔ ”چچا! بادشاہ پر اعتبار کرنا چاہیے یا نہیں کرنا چاہیے، اس کا وقت گزر چکا۔ اعتبار اور بے اعتباری کا فیصلہ سرہند اور اس کے بعد شاہی محل میں داخل ہونے سے پہلے ہی کرنا تھا۔ ہمیں اس جگہ تو پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ رہنا چاہیے۔ اس وقت ہم بادشاہ کے مہمان ہیں اور بادشاہ میں اتنی ہمت ہی نہیں کہ وہ ہم جیسے معزز اور خطرناک افغانوں کے خلاف کچھ سوچ کر قدم اٹھائے۔“

قطب خان نے بہلول کی تائید کی۔ ”چچا فیروز! بادشاہ ہماری محبت اور حمایت کا بھوکا ہے، آپ مطمئن رہیں۔“

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ باادب باملاحظہ ہوشیار کی آوازیں سنائی دیں۔ قطب خان خاموش ہوگیا اور سبھی بادشاہ کے احترام میں کھڑے ہوگئے۔

کمرے کے عقبی دروازے سے بادشاہ نمودار ہوا۔ حاضرین نے قدرے جھک کر تعظیم دی۔ بادشاہ مسکرا رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے حمید خان سے پوچھا۔ ”ان میں بہلول کون ہے؟“

بہلول اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر بادشاہ کے پاس چلا گیا، پوچھا۔ ”کیا اس ناچیز میں کوئی ایسی بات نہیں محسوس ہوئی جو مجھ کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہو؟“

حمید خان نے جلدی جلدی کہا۔ ”بندہ پرور! یہی بہلول ہے، جس کی حمایت اور دوستی کا حضور کو بڑا خیال رہتا ہے۔“

بادشاہ نے اپنا داہنا ہاتھ بہلول کی طرف بڑھا دیا۔ بہلول نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ہونٹوں سے لگالیا۔ بادشاہ بہلول کی باتوں سے خاصا متاثر ہوا، بولا۔ ”بہلول! میرے تصورات میں تیرا جو خاکہ تھا تو اس سے زیادہ پُراثر نکلا۔ تیری جرأت، بے باکی اور بے خوفی تجھے دوسروں سے ممتاز کر دیتی ہے۔“

بہلول نے بادشاہ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وعدہ کیا۔ ”میں اپنی اور اپنی قوم کی طرف سے بادشاہ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں کہ اس نے حسام خان جیسے شریر اور مفسد سے پیچھا چھڑا لیا۔ جب تک وہ بادشاہ کے دربار میں موجود رہتا، میں اور میری قوم اس کی سفاکیوں کو یاد کر کے خواہ مخواہ بادشاہ کے خلاف سوچا کرتے۔ اب ہمیں ایسا لگ رہا ہے جیسے بادشاہ ہماری ناز برداریاں کر رہا ہے۔ اس لطف اور فرحت کے احساس کی جو قیمت ہم ادا کر سکیں گے اس کا فی الحال ذکر یا دعویٰ کرنا فضول ہے۔ وقت آنے پر عملاً دکھا دیا جائے گا۔“

بادشاہ بھی بہت خوش تھا۔ اس نے بہلول سے پوچھا۔ ”تیرے بارے میں یہ مشہور ہے کہ تو اپنی مرحوم ماں کے پیٹ سے بہ نوک خنجر نکالا گیا تھا، کیا درست ہے؟“

فیروز خان نے جواب دیا۔ ”بادشاہ نے جو کچھ سنا درست ہے۔ میں بہلول کا چچا اس کا گواہ ہوں۔“

بہلول نے کہا۔ ”اس لیے میری نظر میں خنجر کی بڑی اہمیت ہے۔ میں خنجر کو اپنے حق میں بقا اور اقبال مندی کی علامت سمجھتا ہوں۔“

فیروز خان اور قطب خان بہلول کے اشارے کو سمجھ گئے اور انہیں ڈر لگا کہ کہیں بادشاہ بھی ان باتوں کا اصل مفہوم نہ پالے اور یہ سب مصیبت میں مبتلا ہو جائیں لیکن بادشاہ کچھ بھی نہ سمجھا اور بہلول کی باتوں پر خوب خوب ہنسا۔

بادشاہ نے انہیں تین دن تک شاہی مہمان خانے میں

روکے رکھا اور ان کی خاطر مدارات کرتا رہا۔ کسی کسی وقت بہلول اپنے چچا فیروز خان اور بھائی قطب خان سے ازراہِ مذاق کہتا۔

''محمد شاہ بادشاہ تو ہے ہی نہیں، اس کو تو میرا مصاحب ہونا چاہیے تھا۔''

چوتھے دن بہلول نے اپنے چچا اور قطب خان، دونوں کو شاہی مہمان خانے میں چھوڑا اور خود زیبا کی تلاش میں نکل گیا۔ وہ سنار کے بازار میں گیا اور ان سے زیبا کے باپ کی بابت معلوم کیا۔ ساروں نے پتا بتا دیا۔ بہلول زیبا کے گھر چل دیا۔ ساروں کا محلہ الگ تھا۔ اس میں ہندو اور مسلمان سنار ملے جلے رہتے تھے۔ وہاں ایک جگہ بہت سارے بچے کھیل رہے تھے۔ بہلول نے اپنا گھوڑا ان کے قریب لے جا کر روک دیا اور زیبا کے باپ کا نام لے کر لڑکوں سے پتا پوچھا۔ ان میں سے ایک لڑکا الگ ہو گیا اور سہم کر پوچھا۔

''کیا تمہیں بادشاہ نے بھیجا ہے؟''

بہلول سمجھ گیا کہ اس لڑکے کا زیبا کے خاندان سے کسی قسم کا تعلق ضرور ہے، جواب دیا۔ ''گھبراؤ مت... مجھے مشتاق سنار کا گھر بتا دے۔ اس کی ایک لڑکی بھی تھی، زیبا۔''

لڑکے نے جواب دیا۔ ''میں مشتاق سنار کا بیٹا ہوں اور زیبا میری بڑی بہن کا نام ہے۔''

بہلول کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے لڑکے کے دل سے خوف نکالنے کے لیے کہا۔ ''میں سرہند سے آیا ہوں جو تیرا آبائی وطن ہے۔ آج کل میں بادشاہ کا مہمان ہوں۔''

لڑکا بہلول کو اپنے گھر لیے چلا گیا اور بھاگ کر اندر سبھی سے کہہ دیا۔ ''ایک خطرناک آدمی باپ کا پتا پوچھتا ہوا میرے ساتھ دروازے تک آ گیا ہے۔''

ماں نے کہا۔ ''اس کا نام پوچھو، کیا نام ہے اس کا؟''

یہ سوال بہلول کے کانوں تک پہنچ گیا۔ زور سے جواب دیا۔ ''میں اسلام خان مرحوم کا بھتیجا اور داماد ہوں، سرہند سے آیا ہوں۔''

لڑکے کی ماں بے اختیار بہلول کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور کہا۔ ''بہت دنوں بعد آئے۔''

بہلول نے پوچھا۔ ''تمہارا شوہر کہاں چلا گیا؟''

زیبا کی ماں نے جواب دیا۔ ''وہ اپنے کاروباری سلسلے میں دوسرے شہروں کا بھی سفر کرتے رہتے ہیں۔ وہ ایک دن میں آنے ہی والے ہیں۔''

بہلول نظروں ہی نظروں میں زیبا کو تلاش کرنے لگا۔ ماں سمجھ گئی کہ وہ کسے تلاش کر رہا ہے۔ چبھتا ہوا سوال کیا۔ ''تم نے شادی کر لی؟''

بہلول نے جواب دیا۔ ''ہاں کر لی، چچا اسلام خان کی بیٹی بچپن ہی سے منسوب تھی۔ کیا کرتا مجبور ہو گیا۔ تم لوگوں نے مجھے بھلا ہی دیا تھا۔''

زیبا کی ماں نے کہا۔ ''یہ بات نہیں بہلول۔ تیری چچی نے مجھے نیچ اور کمین کہہ دیا تھا پھر میں کس طرح تم لوگوں کو یاد رکھتی۔''

بہلول نے رک رک کر پوچھ ہی لیا۔ ''زیبا کہاں ہے؟''

ماں نے خشک لہجے میں پوچھا۔ ''اس سے تیرا کام؟ اس کو کیوں پوچھ رہا ہے؟''

بہلول نے جواب دیا۔ ''اس کو میں نے بچپن میں دیکھا تھا۔ بڑی اچھی لڑکی تھی۔ اب تو وہ خاصی بڑی ہو گئی ہو گی؟'' پھر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''کیا اس کی شادی ہو گئی؟''

زیبا کی ماں نے جل کر کہا۔ ''بہلول! مجھ کو معلوم ہے کہ اب تو کوئی معمولی آدمی نہیں ہے، غیر معمولی انسان ہے۔ بادشاہ تجھ سے ڈرتا ہے اور تو سرہند سے لاہور تک حکومت کرتا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تیری چچی مر گئی اور افغان قوم میں آج تجھ سے بڑا کوئی بھی نہیں لیکن مجھ کو دکھ یہ ہے کہ تو نے ہمیں بھلا دیا۔''

بہلول نے جواب دیا۔ ''یہ غلط ہے، بادشاہ اور اس کا وزیر المالک حسام خان دونوں ہی مجھ سے ناراض تھے پھر میں دہلی کس طرح آتا۔ اب حسام خان کے قتل کے بعد بادشاہ مجھ پر مہربان ہو چکا ہے اور میں دہلی میں داخل ہوتے ہی تم لوگوں کو تلاش کرنے نکل گیا۔''

زیبا کا بھائی اپنی ماں اور بہلول کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔

زیبا کی ماں نے کہا۔ ''میں نے اور میرے شوہر نے تجھے ہمیشہ یاد کیا اور تیرے لیے دعائیں کرتے رہے۔ اب تو بہت بڑا آدمی بن چکا ہے اور میں حیران ہوں کہ اتنے بڑے آدمی کو ہماری یاد کیونکر آ گئی۔''

اس کے بعد زیبا کی ماں نے بہلول کو اندر بلا لیا اور مسہری پر صاف بستر بچھا کر بہلول کو اس پر بٹھا دیا۔ پھر وہ کسی کام سے چلی گئی جب واپس آئی تو حسن و شباب کا شہ پارہ اس کے ساتھ تھا۔ لڑکی نے بہلول کو نہایت ادب سے سلام کیا اور اس کے سامنے ایک مونڈھے پر سر جھکا کر بیٹھ

گئی۔ بہلول نے اس جوان لڑکی میں ننھی منی زیبا کو تلاش کیا جو نہیں ملی۔ یہ قیامت تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے زیبا کی ماں کی طرف دیکھا اور ہچکچا کر پوچھا۔ ''شاید زیبا...... کیا میں پہچاننے میں غلطی کر رہا ہوں؟''

ماں نے جواب دیا۔ ''ہاں یہ زیبا ہے۔ یہ بھی تجھ کو بہت یاد کرتی رہی مگر افسوس کہ تو نے اپنے چچا کی بیٹی سے پیمانِ وفا باندھ لیا۔''

بہلول نے کہا۔ ''یہ غلط ہے، میں نے کسی سے بھی پیمانِ وفا نہیں باندھا۔ ہاں اگر میں کسی سے پیمانِ وفا باندھوں گا تو وہ بس ایک ہی لڑکی ہے جس کا نام زیبا ہے۔ میں نے تجھ سے زیبا کا رشتہ مانگ لیا۔''

ماں نے جواب دیا۔ ''بہلول! تو نے میری لڑکی کا رشتہ میرے سامنے ہی مانگ لیا۔ اب تو بڑا آدمی ہو گیا ہے۔ تو یہ سمجھنے لگا ہے کہ کوئی تیری بات ٹال ہی نہیں سکتا حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔ ہم چاہیں تو بالکل انکار کر دیں۔''

بہلول اس کا عادی ہی نہیں تھا کہ وہ کسی سے کسی چیز کی خواہش کرے اور دوسری طرف سے انکار کر دیا جائے، بولا۔ ''میں تجھ سے چند باتیں کھل کر کرنا چاہتا ہوں، جو زیبا کے سامنے نہیں کی جاسکتیں۔''

ماں نے جواب دیا۔ ''بس اب اس موضوع پر اس سے زیادہ باتیں نہیں ہوں گی۔ زیبا کا باپ زندہ ہے، وہ چاہے تو حامی بھر لے، نہ چاہے تو انکار کر دے۔ اس کے ہوتے ہوئے میں کچھ بھی نہیں۔''

بہلول نے ماں سے کہا۔ ''اچھا پانی تو پلا، میں بہت پیاسا ہوں۔''

ماں جیسے ہی پانی لینے گئی، بہلول نے زیبا سے کہا۔ ''زیبا! میں تجھ سے محبت کرتا ہوں اور جب میں اس ملک کا بادشاہ بن جاؤں گا تو، تو اس ملک کی ملکہ ہو گی۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میرے بعد تیری اولاد اس ملک پر حکومت کرے گی۔''

زیبا نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ جب ماں پانی لے کر آئی تو زیبا کو وہاں نہ دیکھ کر خوش ہوئی کہ اس کی شرمیلی لڑکی نے بہلول کا رعب قبول نہیں کیا تھا۔

بہلول زیبا کے گھر بار بار جاتا رہا۔ زیبا کا باپ مشتاق ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اس نے دو تین بار زیبا سے باتیں بھی کیں مگر یہ باتیں بس اس حد تک رہیں کہ بہلول تو سب کچھ کہہ دیتا مگر زیبا کی طرف سے اس کا جواب، ہاں یا نہیں میں مل جاتا۔

بہلول نے اپنے چچا فیروز اور قطب خان کو ابھی تک یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اب دہلی میں کیوں رکا ہوا ہے۔ قطب خان اصرار کر رہا تھا کہ سرہند واپس چلو۔

چچا فیروز خان اس پر زور دے رہے تھے کہ شاہی مہمان خانے میں کسی جواز کے بغیر رہنا اچھا نہیں ہے لیکن بہلول پر کسی کی بات کا کوئی اثر ہی نہ ہوتا۔

چچا فیروز خان نے قطب خان سے کہا۔ ''قطب خان! کچھ دال میں کالا ضرور ہے کیونکہ بہلول دہلی میں کسی سبب کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہمیں اس کی جستجو کرنی چاہیے۔''

قطب خان نے ناگواری سے کہا۔ ''چچا فیروز خان! میں جانتا ہوں کہ بہلول کہاں چلا جاتا ہے۔''

فیروز خان نے کہا۔ ''بھلا بتا تو سہی کہ ہر روز بہلول کہاں چلا جاتا ہے اور اس دہلی میں وہ کون سی دلکشی ہے جس نے اس کے پاؤں پکڑ رکھے ہیں؟''

قطب خان نے جواب دیا۔ ''جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، میں جانتا ہوں بہلول دہلی میں کیوں رکا ہوا ہے۔ وہ یہاں سنار کی بیٹی زیبا سے ملنے جایا کرتا ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔''

قطب خان جب یہ کہہ رہا تھا تو اس کے لہجے میں غم و غصے کا عنصر پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے مزید کہا۔ ''اور میں خود یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ میری بہن کی موجودگی میں بہلول سنار کی بیٹی زیبا سے شادی کر لے۔''

فیروز خان نے اس کو سمجھایا۔ ''قطب خان! تو بالکل خاموش رہ۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری گھریلو رنجشیں سب کے علم میں آجائیں۔ اگر یہ باتیں عام ہو گئیں تو بادشاہ اور اس کے امراء کے دلوں سے ہمارا رعب اور دبدبہ رخصت ہو جائے گا۔''

قطب خان نے غصے میں کہا۔ ''چچا فیروز! آپ خوب جانتے ہیں کہ میں کتنا جذباتی ہوں۔ آج کل میں سو نہیں رہا ہوں۔ میں اپنی بہن کی موجودگی میں بہلول کو مزید شادی کی اجازت نہیں دوں گا۔ اگر بہلول نے ضد یا سختی سے کام لیا تو میں اس کا مقابلہ کروں گا۔''

زیبا کا باپ مشتاق واپس آ گیا اور وہ بہلول سے بہت تپاک سے ملا۔ اس کی بیوی سارے معاملات اپنے شوہر کو پہلے ہی سمجھا چکی تھی۔ مشتاق کو اسی دن کا انتظار تھا اس نے بہلول کی بات مان لی لیکن شرط لگا دی کہ شادی اس وقت ہو گی جب بہلول دہلی میں رہائش اختیار کر لے اور یہ

کہ زیبا کو پہلی بیوی سے الگ رکھا جائے۔

بہلول نے زیبا کے باپ کی پہلی بات نہیں مانی، بولا۔ ”یہ بات میں اس لیے نہیں مانوں گا کہ میں دہلی کی مستقل رہائش کس طرح اختیار کرسکتا ہوں۔ میں سرہند کا حاکم ہوں۔ سرہند چھوڑنے کا یہ مطلب ہے کہ میں وہاں کی حکومت کسی اور کے حوالے کردوں۔“

زیبا کے باپ مشتاق نے پوچھا۔ ”اور دوسری بات؟“

بہلول نے جواب دیا۔ ”دوسری بات مان لوں گا اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ زیبا کو اپنی پہلی بیوی سے الگ رکھوں گا۔“

زیبا کی ماں نے کہا۔ ”اور یہ وعدہ بھی کرنا ہوگا کہ اگر تجھے اس ملک کی حکومت مل گئی تو تیرے بعد اس ملک کی حکومت زیبا کے حصے میں آئے گی۔“

بہلول نے حیرت سے زیبا کی ماں کو دیکھا، پوچھا۔ ”یہ شرط تیری نہیں ہوسکتی، کیا اس سلسلے میں زیبا نے تجھ سے کوئی بات کی ہے؟“

زیبا کی ماں نے کہا۔ ”وہ ایسی بات کس طرح کرسکتی ہے؟“

بہلول نے جواب دیا۔ ”تو نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں نے زیبا سے پہلے ہی یہ وعدہ کرلیا ہے کہ میرے بعد اس ملک کی حکومت اس کی اولاد کے حصے میں آئے گی۔“

زیبا کے باپ نے کہا۔ ”اب تو جب چاہے، زیبا کو بیاہ کرلے جا۔“

بہلول نے جواب دیا۔ ”میں چاہتا ہوں، زیبا کا نکاح کل ہی کردیا جائے اور اس کی رخصتی بعد میں ہو۔ اس وقت تو میں سرہند واپس چلا جاؤں گا لیکن دو ہفتے بعد واپس آجاؤں گا۔ اس وقت میں زیبا کو نہایت تزک احتشام سے اپنے گھر لے جاؤں گا۔“

زیبا کے باپ نے پوچھا۔ ”اس تقریب میں شریک کون کون ہوگا؟“

بہلول نے جواب دیا۔ ”میرا چچا فیروز خان، میرا برادرِ نسبتی قطب خان اور میرے ہم قوم پچیس افغان، وزیر الممالک حمید خان اور چند دوسرے افراد۔“

جب ساری باتیں طے پا گئیں تو بہلول واپس آگیا۔ اس نے یہ باتیں اپنے چچا فیروز خان اور بھائی قطب خان کو بتادیں۔ قطب خان نے سخت مخالفت کی اور صاف صاف کہہ دیا۔

”بہلول یہاں شادی کرنے نہیں آیا تھا۔ پہلے وہ سرہند واپس چلے اور اس مسئلے پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کرے۔“

بہلول نے قطب خان کا چہرہ اپنی ہتھیلیوں میں لے کر اٹھایا۔ ”بھائی قطب خان! یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے جس پر غور و خوض کرکے فضول وقت ضائع کیا جائے۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ میں تیری بہن سے ناانصافی نہیں کروں گا۔“

قطب خان اپنے جذبات کو چھپانے کی کوشش کررہا تھا پھر بھی اس کی آواز بھرا گئی۔ ”بھائی بہلول! میں تیری بیوی کا بھائی ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میں ایک بار پھر تجھ سے دل برداشتہ ہوکر کوئی الگ راہ اختیار کروں۔ اگر اس بار میں اپنی قوم سے جدا ہوا تو پھر کبھی واپس نہ آؤں گا۔“

بہلول نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”قطب خان! بچوں جیسی باتیں نہ کر۔“ پھر چچا فیروز سے کہا۔ ”چچا! آپ اسے سمجھائیں۔ جذباتی لوگ ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں۔“

فیروز خان نے بہلول سے کہا۔ ”بہلول! میں بھی یہی کہوں گا کہ یہ موقع شادی کرنے کا نہیں تھا اور پھر یہ کہ تو نے پہلے کبھی اس کا ذکر بھی نہیں کیا۔“

بہلول نے جواب دیا۔ ”چچا! میں نے کہہ جو دیا کہ یہ معاملہ اتنا بڑا اور اہم نہیں تھا جس کا چرچا کیا جائے اور اس کے لیے وقت ضائع کیا جائے۔ بہرحال یہ میرا قطعی فیصلہ ہے کہ میں زیبا سے شادی ضرور کروں گا۔“

فیروز خان بہلول کے مضبوط ارادے سے ڈر گیا۔ اب قطب خان کو سمجھانے لگا۔ ”قطب خان! یہ بھی صحیح ہے کہ یہ اتنا اہم معاملہ نہیں تھا جس پر فضول وقت ضائع کیا جائے اور پھر یہ کہ اگر بہلول دوسری شادی کررہا ہے تو اس میں حیرت یا دکھ کی کیا بات ہے کیا ہمارے آباؤ اجداد نے ایسا نہیں کیا۔ اس حمام میں سبھی ننگے ہیں۔ ہمیں اس معمولی وجہ سے بہلول کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہیے۔“

لیکن قطب خان کسی طرح مطمئن نہ ہوا اور اس طرح زور زور سے بحث مباحثہ کرنے لگا، گویا کوئی جنگ چھڑی ہوئی ہو۔

بہلول تنگ آکر باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی فیروز خان نے کہا۔ ”قطب خان! کیا تو پاگل ہوگیا ہے۔ بہلول ایک طاقت، ایک قوت اور ایک اجتماعی حرکت کا نام ہے۔ ہم اس کو نظرانداز نہیں کرسکتے۔ اگر اس کو نظرانداز کریں گے تو گویا ہم خود نظرانداز کردیے جائیں گے کیونکہ کسی ایک شخص کے نظرانداز کردینے سے ہر کوئی بہلول کو نظرانداز نہیں کردے گا۔ ہاں اگر بہلول نے کسی کو نظرانداز کردیا تو وہ واقعی نظرانداز کردیا جائے گا۔“

قطب خان بھی فیروز خان کی دلیلوں سے عاجز آگیا

اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس نے باہر بہلول کو ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ بہلول نے اپنے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ رکھے تھے اور بڑی بے چینی سے ایک مخصوص اور محدود حصے پر چل پھر رہا تھا۔ قطب خان آہستہ آہستہ اس کے پاس گیا اور کہا۔

''بھائی بہلول! تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کرلو۔ میں اپنی قوم کے عظیم تر مفاد میں اس زہر کو پی لوں گا لیکن میرا دل تم سے اس معاملے میں کبھی بھی متفق نہیں ہوگا۔''

بہلول نے جواب دیا۔ ''میں ابھی تو تیری نہ مذمت کروں گا اور نہ اصرار کروں گا کہ تو مجھ سے متفق ہو جا مگر میں جانتا ہوں کہ تو بھی کئی شادیاں کرے گا۔ جب تو ایسا کرے گا تو اس وقت تیرے دل کی کدورت دور ہو جائے گی اور تو ایک بار پھر میرا دل سے ساتھ دینے لگے گا۔''

قطب خان، بہلول کے پاس سے چلا گیا۔ بہلول اس کو اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظر آتا رہا۔

☆☆☆

مشتاق سنار کے گھر ایک سادہ سی تقریب میں اس عہد کے نامی گرامی لوگ جمع ہو گئے۔ ملک بہلول کو دولہا بنایا گیا۔ اس کا چچا فیروز خان اس کی سرپرستی کر رہا تھا۔ قطب خان غائب تھا۔ گھر کے سامنے میدان میں ایک شامیانہ نصب تھا جس کے نیچے فرش فروش بچھا دیے گئے تھے اور اس پر جگہ جگہ گاؤ تکیے رکھ دیے گئے تھے۔ ملک بہلول میرِ مجلس بنا بیٹھا تھا۔ اس کے پاس داہنی طرف فیروز خان اور بائیں طرف وہ افغان تھے جو سرہند سے بہلول کے ساتھ آئے تھے۔ ملک بہلول کے داہنی طرف فیروز خان کے بعد وزیر المالک حمید خان اور دوسرے امراء بیٹھے تھے۔

قاضی نے خطبہ شروع کیا تو مجلس میں ایک ہلکا سا اضطراب پیدا ہو گیا۔ زیبا کا باپ مشتاق، قطب خان کے ساتھ شامیانے میں داخل ہوا۔ قطب خان نے مشتاق کا گریبان پکڑ رکھا تھا۔ چچا فیروز خان نے جو دیکھا تو اس کے ہوش و حواس اڑ گئے۔ وہ اٹھ کر ان دونوں کی طرف بھاگا۔

ملک بہلول نے بھی یہ منظر دیکھ لیا مگر اس پر کوئی توجہ نہ دی اور آنکھیں پھیر کر حمید خان سے باتیں کرنے لگا۔ قاضی خطبہ پڑھنے میں مشغول رہا۔

فیروز خان، قطب خان اور مشتاق کو کھینچتا ہوا شامیانے سے دور لے گیا۔ خفگی سے کہا۔ ''قطب خان! یہ تجھ کو کیا ہو گیا ہے؟ میں تجھ کو بارہا یقین دلاؤں گا کہ تو بہلول کی مخالفت کر کے اپنی پوری قوم کو ناراض کر دے گا۔ کیا تو نے بہلول کے بائیں طرف بیٹھے ہوئے اپنے افغان بھائیوں کو نہیں دیکھا جو سرہند سے ہمارے ساتھ آئے ہیں اور وہ سب کے سب خوش ہیں۔''

قطب خان نے پرجوش آواز میں جواب دیا۔ ''میں بھی اس شادی کی مخالفت نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو اس کم ظرف سنار سے یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ یقین دلائے کہ اس کی بیٹی کی اولاد کا بہلول کی حکومت سے کوئی واسطہ نہیں رہے گا لیکن یہ چالاک انسان کوئی وعدہ نہیں کر رہا۔''

فیروز خان نے کہا۔ ''قطب خان! اس وقت تو اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ اس قسم کے وعدے یہ کس طرح کر سکتا ہے۔ اس کی بیٹی کی اولاد بہلول کی اولاد ہو گی اور یہ وعدہ کرے یا نہ کرے بہلول کرے۔''

قطب خان نے مشتاق سنار کا گریبان چھوڑ دیا اور شامیانے کے باہر ایک بانس پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ رو رہا تھا۔

فیروز خان بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور اس کو سمجھانے لگا۔ ''قطب خان! اس کو مشیتِ ایزدی سمجھ کر قبول کر لے۔ تیرا بھائی بہلول ناانصاف نہیں ہے۔ مجھ کو تو پورا یقین ہے کہ وہ تیری بہن کے ساتھ ناانصافی نہیں کرے گا اور اس کی اولاد کو سنار کی اولاد پر ترجیح دے گا۔''

قطب خان نے جھنجلا کر جواب دیا۔ ''چچا! تم کیسی فضول باتیں کر رہے ہو۔ بہلول نے میری بہن پر سنار کی بیٹی کو ترجیح دے دی۔ اب تم خود اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ لو گے کہ سنار کی بیٹی کی اولاد حکومت کرے گی اور میری بہن کی اولاد اس کی چاکری کرے گی۔''

فیروز خان اس کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا مگر قطب خان اپنی بات پر اڑا رہا۔ یہاں تک کہ شامیانے کے اندر سے لوگ نمودار ہونے لگے۔ انہی میں بہلول بھی شامل تھا۔ اس کے دائیں بائیں حمید خان اور دوسرے امراء تھے اور وہ بہلول سے دو قدم پیچھے چل رہے تھے۔ بہلول کی نظریں قطب خان پر پڑیں تو وہ تیزی سے اس کے پاس پہنچ گیا اور نہایت محبت سے اٹھا کر اپنے گلے لگا لیا، بولا۔ ''قطب خان! میں تو تجھ کو تلاش ہی کرتا رہ گیا۔ آ میرے ساتھ چل تاکہ میں تجھے مطمئن کر سکوں۔''

قطب خان کھڑا ہو گیا اور بہلول کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

بہلول اس کو دلہن کے کمرے میں لیے چلا گیا۔

یہاں زیبا دلہن بنی سمٹی سکڑی بیٹھی تھی۔ جو خواتین اس کے پاس تھیں، بہلول کے داخل ہوتے ہی باہر چلی گئیں۔ بہلول نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا اور قطب خان سے

کہا۔ ''قطب خان! تُو میرے حقیقی بھائی سے بھی بڑھ کر ہے۔ تونہیں جانتا کہ میں تجھ کو کس قدر چاہتا ہوں۔ میں تجھ کو ناراض کر کے کوئی کام کر ہی نہیں سکتا۔''

وہ قطب خان کا ہاتھ پکڑ کر زیبا کے قریب چلا گیا اور قطب خان کو زیبا کے سامنے بٹھا دیا، بولا۔ ''قطب خان! یہ دلہن تو میری ہے لیکن اس کا گھونگٹ تو اٹھائے گا۔ اپنی بھابی کا چہرہ دیکھ، کیسا نور ٹپک رہا ہے اس کے چہرے سے۔''

قطب خان سٹپٹا گیا بولا۔ ''اس کا گھونگٹ میں اٹھاؤں؟ میں تیرا مطلب نہیں سمجھا۔''

بہلول نے جواب دیا۔ ''اس کے سوا میرا کوئی مطلب نہیں کہ اگر تو گھونگٹ اٹھا کر مجھ سے بھی پہلے زیبا کا چہرہ دیکھ لے گا تو میں اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔''

قطب خان نے لرزتے کانپتے ہاتھوں سے زیبا کا گھونگٹ اٹھا دیا اور کسی سوچ میں پڑ گیا۔ زیبا کی نظریں جھکی ہوئی تھیں، وہ خود قطب خان کو نہیں دیکھ سکی۔

بہلول نے کہا۔ ''قطب خان! یہ میرا وعدہ ہے کہ اگر مجھ کو اس ملک کی حکومت مل گئی تو اس پر میرے بعد تیری بہن کی اولاد حکومت کرے گی۔''

زیبا نے چونک کر قطب خان کی طرف دیکھا، اس کے بعد بہلول کو دیکھنے لگی۔

اب قطب خان کے اندر لاوے اگلتا، ابلتا جوالا مکھی دب چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آ گئے لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ اس نے بے اختیار بہلول کو سینے سے لگا لیا اور گلوگیر آواز میں کہا۔ ''میرے بھائی! تو بہت عظیم ہے۔ عظیم ہی نہیں عظیم الشان بھی۔ اب میں تجھے تخلیے میں رہنے کا موقع دوں گا۔ میں باہر جا رہا ہوں۔'' قطب خان ہنستا مسکراتا باہر نکل گیا۔

بہلول نے پہلے تو دروازے کو اندر سے بند کیا۔ اس کے بعد زیبا کے پاس بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھ کر اس نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ خود زیبا کیا کہتی ہے؟

جب دیر تک زیبا خاموش رہی تو بہلول نے اس کا گھونگٹ اٹھانا چاہا مگر زیبا نے ہاتھ پکڑ کر ہٹا دیا۔ بہلول نے دوبارہ پھر گھونگٹ اٹھانے کی کوشش کی تو اس بار پھر زیبا نے اس کے ہاتھوں کو جھٹک کر ہٹا دیا۔

بہلول نے پوچھا۔ ''زیبا! کیا بات ہے؟ کیا میں تیری شکل نہیں دیکھ سکتا؟''

زیبا نے خلافِ توقع نفرت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ ''نہیں، میں تجھ کو اپنی شکل نہیں دیکھنے دوں گی۔ تو نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔ تو نے مجھے دھوکا دیا ہے۔''

بہلول حیران پریشان ہو کر زیبا پر نظریں گاڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں نے تیرے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا۔ مجھ کو جھوٹ اور دھوکے سے نفرت ہے۔''

زیبا نے کہا۔ ''کیا تو نے مجھ سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ اگر اس ملک کی حکومت تجھ کو مل گئی تو میں ملکہ بنا دی جاؤں گی اور تیرے بعد میری اولاد اس ملک پر حکومت کرے گی۔''

بہلول نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے تجھ سے یہ وعدہ کیا تھا اور اپنے اس وعدے پر اب بھی قائم ہوں اور ہمیشہ قائم رہوں گا۔''

زیبا نے گھونگٹ الٹ دیا، بولی۔ ''ابھی ابھی تو نے اپنے بھائی قطب خان سے کیا وعدہ کیا تھا؟ ذرا یاد تو کر......''

بہلول کچھ سوچ کر ایک دم قہقہہ مار کر ہنس دیا اور قہقہے لگاتے ہوئے کہا۔ ''زیبا! میری روح، میری کائنات، محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ قطب خان سے پرفریب وعدہ کر کے میں نے ایک بڑے فتنے کو کچل ڈالا ہے۔ یہ میرا تجھ سے وعدہ ہے کہ اس ملک پر حکومت تیری ہی اولاد کرے گی۔''

زیبا نے مسکرا کر بہلول کو دیکھا اور شریر لہجے میں بولی۔ ''خبردار! جو تو نے مجھ سے اس قسم کا وعدہ کیا۔''

بہلول اس کو اپنی آغوش میں سمیٹ کر دنیا و مافیہا سے غافل ہو گیا۔ زیبا یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہی تھی کہ ہندوستان کے مستقبل کا بادشاہ اس کو اپنی آغوش میں لیے وہ پیار دے رہا تھا جو بہت کم عورتوں کو میسر آتا ہوگا اور انہی کیف آور اور پُرمسرت لمحات میں اس نے عالمِ تصور میں نظارہ کیا، جہاں وہ ملکہ بنی بیٹھی تھی اور اس کی کوکھ سے جنم لینے والی اولاد ہندوستان پر حکومت کر رہی تھی۔ اس کے بیٹوں کے سروں پر چھترِ شاہی سایہ فگن تھا اور اس کے روبرو بوڑھا قطب خان اور اس کی جوان اولاد ہاتھ باندھے خدام کی طرح کھڑی تھی۔ اس تصور میں ایک نشہ سا تھا جس نے زیبا کو کسی اور ہی دنیا میں پہنچا دیا۔ کیف و سرور کی دنیا میں جہاں آسودگی ہی آسودگی تھی۔ جہاں طمانیت ہی طمانیت تھی اور جہاں اس سے اور اس کی اولاد سے بڑا کوئی بھی نہ تھا۔

ماخذات
تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ۔ طبقات اکبری، نظام الدین احمد۔ طبقات ناصری، قاضی منہاج سراج (ترجمہ)۔ تاریخ سندھ، اعجاز الحق قدوسی۔

قاتل محبت

کاشف زبیر

محبت بھی عجب شے ہے۔ کبھی دوسروں کی بھینٹ لیتی ہے اور کبھی اپنی موت آپ مر جاتی ہے لیکن... اس کا انحصار دلی جذبات پر ہوتا ہے جس میں جتنی شدت ہوتی ہے اتنا ہی اظہار بھی ہوتا ہے... ان کی محبت بھی انہیں دھیرے دھیرے خطرات سے کھیلنے پر اکسا رہی تھی بالآخر کھیلتے کھیلتے انہیں بھی قاتل وار کو سہنا اور ان سے بچنا آگیا۔ بس یہی بات کسی کو منظور نہ تھی پھر کیسے وہ ڈوبتے دریا میں تیر جاتے۔

پل پل موت سے قریب ہونے والی بے ترتیب دھڑکنوں کا احوال

وہ نوجوان لڑکی ننگے پاؤں نائٹ سوٹ میں ملبوس اس تاریک اور ویران جنگل میں بھاگ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پیروں پر خراشوں کے نشانات تھے۔ لباس بھی جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ اس کے بالوں میں پتے اور تنکے الجھے ہوئے تھے جیسے وہ گھنی جھاڑیوں سے گزرتی آرہی ہو یا پھر بار بار نیچے گری ہو۔ وہ بار بار پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ بھاگتے بھاگتے وہ ایک ندی کے کنارے پہنچی جس میں پانی بہت تیز تھا اور کچھ ہی دور اوپر سے آبشار گر رہی تھی۔ لڑکی نے

ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ وہ بے خیالی میں ہاتھ میں موجود چاندی جیسی چمک دار دھات کا چھلا گھما رہی تھی۔ یہاں جگہ کھلی تھی اس لیے نصف چاند کی روشنی میں سب دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ نہیں جان سکی کہ اس کا پیچھا کرنے والا کب اس تک آ گیا اور اچانک اس کے منہ پر ایک ہاتھ جم گیا اور اس کی چیخ ہاتھ تلے گھٹ کر رہ گئی۔

☆☆☆

امریکی ریاست وائیومنگ شمال میں ہے، اس کا بیشتر حصہ اونچے نیچے پہاڑوں اور گھنے جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے جہاں دریا اور جھیلیں ہیں۔ موسم خوشگوار اور سرد ہوتا ہے۔ آبادی کم ہے مگر ترقی کے لحاظ سے یہ امریکا کی باقی ریاستوں سے پیچھے نہیں ہے۔ سلور اسٹون ریاست مونٹانا کی سرحد کے پاس ایک چھوٹا سا مگر جدید قصبہ تھا۔ جنگ عظیم کے بعد ریاست نے یہاں ایک جدید ووڈ انڈسٹریل پارک قائم کیا جس میں لکڑی سے متعلق صنعتیں لگائی گئیں اور ان صنعتوں میں کام کرنے والے لوگوں کے لیے یہ قصبہ بسایا گیا۔ ساٹھ سال میں یہ ترقی کر کے ایک چھوٹے شہر کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ یہاں شہر کے مرکز میں کچھ اونچی عمارتیں بھی تھیں لیکن بیشتر قصبہ دو تین منزلہ گھروں پر مشتمل تھا۔ جگہ جگہ پارک اور قدرتی جنگل تھے اور یہاں سے کچھ ہی دور ایک خوب صورت آبشار تھی جسے سلور اسٹون کہا جاتا تھا قصبے کا نام اسی آبشار کے نام پر رکھا گیا تھا۔ قصبے اور آبشار کے درمیان گھنا جنگل تھا۔

رینا لاک کھول کر اندر آئی تو اسے لگا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے لیکن پھر اسے شین اور مارش کے بیڈ روم سے دبی دبی ہنسی کی آواز آئی۔ وہ ایک لمحے کو رکی پھر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی۔ اس نے جان بوجھ کر سیڑھیوں پر زور سے قدم رکھے تھے تاکہ ان دونوں کو اس کی آمد کی خبر ہو جائے۔ کمرے میں آ کر اس نے اسکول بیگ ایک طرف پھینکا اور بستر پر لیٹ گئی۔ اسے شدت سے غصہ آ رہا تھا مگر یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے غصہ کس بات پر آ رہا ہے۔ شاید اسکول کی ان لڑکیوں پر جو گروپ بنا کر اس کے پیچھے پڑ گئی تھیں۔ صرف اس لیے کہ وہ بے سہارا تھی۔ اس کا باپ اس کے بچپن میں مر گیا تھا اور اس کی ماں اسے چھوڑ کر فرار ہو گئی تھی۔ یہ دو سال پہلے کی بات تھی۔ کیتی اچھی ماں نہیں تھی۔ اس کا زیادہ وقت اپنے بناؤ سنگار میں گزرتا تھا اور نو سال کی عمر سے رینا اپنے لیے خود کھانا بنا رہی تھی۔ کیتی ایک بار میں ویٹرس کے طور پر کام کرتی تھی اور اسے گھر داری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ سارا دن پڑ کر سوتی اور شام کے وقت تیار ہو کر جاب پر چلی جاتی جہاں سے اس کی واپسی صبح چار بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔ اس کے دوست ہمیشہ مرد ہوتے تھے اور ہر دوسرے تیسرے مہینے دوست بدل جاتے تھے۔

رینا نے بہت کم اپنی ماں سے جاگتے میں ملاقات کی۔ وہ صبح اسکول جاتی تب کیتی سو رہی ہوتی تھی اور وہ اسکول سے آتی تب بھی وہ سو رہی ہوتی تھی۔ پھر جاگ کر جانے کی تیاری کر رہی ہوتی تھی۔ کیتی اچھا تو کماتی تھی مگر بیٹی پر خرچ نہیں کرتی تھی۔ بلکہ رینا کو جو سرکاری وظیفہ ملتا تھا اس کا بیشتر حصہ بھی وہی ہضم کر جاتی تھی۔ پھر ایک دن رینا اسکول سے آئی تو کیتی خلاف معمول گھر میں نہیں تھی۔ اس کا سامان بھی غائب تھا، البتہ ڈریسنگ کے شیشے پر ایک چٹ لگی تھی کیتی نے اس پر لکھا تھا۔ ”ڈیئر میں ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں تم اب بڑی ہو رہی ہو۔ مسز شیلٹن تمہاری دیکھ بھال کر لے گی اور کچھ عرصے بعد تمہیں دیکھ بھال کی ضرورت نہیں رہے گی کیتی۔“

ماں کے رویے نے اسے نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ وہ الگ تھلگ رہنے لگی تھی۔ اسے لگتا کہ اس کے اوپر مستقل کوئی بوجھ آ گیا ہے اور وہ اس سے آزاد نہیں ہو پا رہی... گھر میں کئی بار اسے غائب دماغی کے دورے پڑے لیکن کیتی کو پتا ہی نہیں چلا۔ پھر ایک بار اسے اسکول میں پتا چلا تب اسے اسپتال لے جایا گیا۔ اس وقت وہ پندرہ سال کی تھی۔ ڈاکٹر پیٹرسن نے اس کا علاج کیا تھا۔ کئی سیشنز کے بعد اسے دورے پڑنا بند ہوئے تھے مگر اس کی دوائیں اب بھی جاری تھیں۔ اسے روز ایک گولی کھانی پڑتی تھی، یہ اعصاب کے سکون کے لیے تھی اور دورہ پڑنے کی صورت میں اسے انجکشن دیا جاتا تاکہ وہ نروس بریک ڈاؤن سے بچ سکے مگر گزشتہ ڈھائی سال سے اسے دورہ نہیں پڑا تھا۔

کمیونٹی سروس کی آفیسر مسز شیلٹن رینا سے رابطے میں رہتی تھی اور وہ مہینے میں ایک بار اس سے ملنے آتی تھی۔ یہ واحد دن ہوتا تھا جب کیتی ڈھنگ کے حلیے میں ایک محبت کرنے والی ماں کا روپ دھار لیتی تھی، دوسری صورت میں کمیونٹی سروس رینا کو اپنی تحویل میں لے سکتی تھی۔ اسے رینا سے تو دلچسپی نہیں تھی لیکن اسے ملنے والے وظیفے سے بہت دلچسپی تھی۔ اس دن وہ رینا کو بھی خاص طور سے تیار کراتی تھی۔ رینا کے باپ کے بعد اس نے دوسری شادی نہیں کی۔ وہ پہلی شادی کو ہی زندگی کی سب سے بڑی غلطی قرار دیتی تھی۔ رینا کو نہیں معلوم کہ وہ کس کے ساتھ گھر اور سلور اسٹون چھوڑ گئی تھی یا اکیلے ہی کہیں چلی گئی تھی۔ اس نے

آفیسر مسز شیلٹن کو کال کی اور اسے بتایا کہ اس کی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ وہ فوراً اس کے پاس پہنچ گئی تھی۔ مکان کرائے کا تھا اور بیشتر سامان بھی مالک کا تھا۔ شاید اسی لیے کیتھی آرام سے سب چھوڑ گئی تھی۔ رینا چند دن کیمونٹی سینٹر میں رہی جہاں اس جیسے بہت سے بے سہارا بچے تھے۔ ان کا دنیا میں کوئی نہیں تھا اور نہ ہی کوئی اپنانے کے لیے تیار تھا۔

مگر رینا کو زیادہ دن یہاں نہیں رہنا پڑا۔ شیئن وارڈ اور مارش وارڈ اسے اپنے گھر لے آئے تھے۔ شیئن اور کیتھی کلاس فیلو تھے، اگرچہ ان کے درمیان کبھی دوستی نہیں رہی مگر شیئن اسے جانتی ضرور تھی۔ شاید یہی وجہ تھی اس نے رینا کو اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ رینا کے پاس اختیار نہیں تھا کہ وہ اس فیصلے کو رد کرتی۔ مسز شیلٹن نے اسے بتا دیا تھا کہ اگر اس کے بارے میں کوئی فیصلہ ہوا تو اسے قبول کرنا پڑے گا۔ کیمونٹی سروس کے پاس فنڈز کم تھے اور ان کی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ بچے اڈاپٹ کر لیے جائیں یا اچھے خاندان انہیں... اپنالیں مگر اس سلسلے میں بڑی سخت چھان بین کے بعد لڑکا یا لڑکی کسی خاندان کے حوالے کی جاتی تھی۔ شیئن اور مارش کی ساکھ بہت اچھی تھی۔ ان دونوں کی ملاقات کالج میں ہوئی تھی اور پھر انہوں نے شادی کر لی۔ اس بات کو پندرہ سال ہو چکے تھے۔ ان کا کوئی بچہ نہیں تھا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کی ازدواجی زندگی بہت خوشگوار تھی۔ اس لیے جب شیئن نے رینا کو رکھنے کی پیشکش کی تو سروس کیمونٹی حکام نے ان کی پیشکش منظور کر لی۔ یوں رینا ان کی تحویل میں دے دی گئی۔

رینا کو یوں کھلونے کی طرح خود کو کسی کے حوالے کر دینا اچھا نہیں لگا تھا۔ اس وقت وہ سولہ سال کی تھی اور اب وہ اٹھارہ کی ہونے والی تھی۔ دو مہینے بعد ہائی اسکول کا آخری امتحان پاس کر کے وہ کالج چلی جاتی اور اس کے ساتھ ہی وہ خود مختار ہو جاتی۔ دو سال اس نے بہت اچھے نہیں گزارے تھے اور نہ بُرے گزارے تھے۔ اچھے ان معنوں میں کہ شیئن اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ مارش کا رویہ دوستانہ ہوتا تھا مگر وہ اس سے ایک حد سے زیادہ بے تکلف نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس سے لیے دیے رہتا تھا۔ اس کے مقابلے میں شیئن اس کا بہت خیال رکھتی تھی اور کبھی کبھی اس کے لیے پریشان ہو جاتی تھی۔ اس کے باوجود رینا کو یہاں رہنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کا دم گھٹتا تھا۔ اس کے مقابلے میں اسے کیمونٹی سینٹر میں رہنا اچھا لگا تھا مگر اٹھارہ سال کی عمر تک اس کے پاس فیصلے کا اختیار نہیں تھا۔ اسے دل پر جبر کر کے یہیں رہنا تھا۔

سارہ اور اس کی ساتھی لڑکیاں اسے چھیڑتی تھیں۔ رینا ان کو جواب دے سکتی تھی لیکن ان کے ساتھ بدمعاش قسم کے لڑکے بھی ہوتے تھے، رینا کو ان سے ڈر لگتا تھا۔ پورے اسکول میں اگر رینا کی کسی سے دوستی تھی تو وہ اینڈرسن تھا۔ چھوٹے قد، ہلکے جسم اور موٹے فریم کی بھاری عینک والا اینڈرسن کلاس کا سب سے ذہین طالب علم تھا۔ رینا اس سے بھی بے تکلف نہیں تھی مگر وہ اس سے بات کر لیتی تھی اور کبھی کبھی دونوں ایک ساتھ کینٹین چلے جاتے تھے۔ اسکول سے باہر وہ کبھی کسی سے نہیں ملی تھی۔ اس کی کوئی دوست نہیں تھی اور نہ ہی وہ کسی تفریح گاہ میں جاتی تھی۔ وہ بستر پر لیٹی اینڈرسن کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ ڈاکٹر پیٹرسن کا بیٹا تھا۔ ان کا اسکول جنگل کے پاس تھا اور ڈاکٹر پیٹرسن کا شاندار ولا نما مکان بھی وہیں تھا۔ اسکول سے واپسی پر وہ اس گلی کے نیچے سے گزرتی تھی جس پر یہ مکان تھا۔

وہ شیئن اور مارش پر بوجھ نہیں تھی۔ اسے ہر مہینے معقول وظیفہ ملتا تھا۔ ابھی تو یہ شیئن اور مارش کے پاس آتا تھا مگر شیئن نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ اس میں سے کچھ نہیں لیتے۔ انہوں نے اسے خود رکھا تھا اور وظیفے کی رقم اس کے اکاؤنٹ میں جمع ہو رہی تھی۔ یہ اس وقت اس کے کام آتی جب وہ کالج جاتی۔ مارش سول انجینئر تھا اور اس کی اپنی فرم تھی جو سلور اسٹون اور اس کے آس پاس تعمیرات کا کام کرتی تھی۔ مالی لحاظ سے وہ آسودہ حال تھا۔ ان کے پاس خوب صورت ڈچ ولا اور دو شاندار گاڑیاں تھیں۔ رینا کو بھی انہوں نے تمام سہولتیں دی تھیں۔ اس کے پاس کئی خوب صورت لباس اور ذاتی استعمال کی اشیا تھیں۔ شیئن نے اسے کار دلانے کی پیشکش کی لیکن وہ اس نے مسترد کر دی تھی۔ اسے اچھا نہیں لگا تھا، وہ پہلے ہی خود کو ان پر بوجھ سمجھتی تھی۔ اس کے آنے کے کچھ دیر بعد شیئن نے اس کے کمرے میں جھانکا۔

"لنچ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں نے اسکول میں کھا لیا تھا اب مجھے بھوک نہیں ہے۔" رینا نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"اوکے۔" شیئن بولی۔ "آج شام ہم باہر جائیں گے اگر تم نے کہیں جانا ہو تو سورج ڈوبنے تک گھر آ جانا۔"

رینا نے کچھ نہیں کہا تو شیئن اندر آئی۔ اس نے رینا کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔" رینا بولی۔

شیئن اور مارش کی طرف سے اس کے کہیں آنے جانے پر پابندی نہیں تھی البتہ دیر تک باہر رہنے کی صورت میں اسے بتانا پڑتا تھا اور جب وہ خود کہیں گئے ہوتے تو رینا

کو گھر پر رہنا پڑتا تھا۔ وہ شام کے وقت سائیکل پر گھر سے نکلی، اس کا رخ سلور اسٹون کے اوپری حصے کی طرف تھا جہاں سے جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ جنگل کو انسانی دست برد اور کچرے سے بچانے کے لیے اس میں درخت اور لکڑی کاٹنے پر پابندی تھی۔ وہاں راستے نہیں بنائے گئے تھے تاکہ لوگ کم سے کم جنگل کا رخ کریں۔ اینڈرسن کے گھر کے پاس سے گزرتے ہوئے رینا نے دیکھا کہ ڈاکٹر پیٹرسن اپنے خوب صورت باغ کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ وہ گنجے سر اور سفید فرنچ کٹ ڈاڑھی والا شخص تھا۔ اس نے رینا کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور دوبارہ اپنے کام میں لگ گیا۔ رینا جنگل کے سرے تک آئی، اس نے سائیکل ایک جگہ چھوڑ دی اور پیدل اندر داخل ہوئی۔ آبشار تک جانے کا راستہ اس کے دائیں طرف سے گزرتا تھا۔

جنگل میں ہر طرف نباتاتی کچرا تھا۔ پتے، شاخیں، ٹہنیاں اور گر جانے والے درختوں کے سال خوردہ تنے۔ یہاں کہیں مٹی دکھائی نہیں دے رہی تھی اور وہاں سیلن اور میتھین کی بو بسی ہوئی تھی۔ گل سڑ جانے والا کچرا میتھین گیس پیدا کرتا ہے لیکن یہ مقدار میں اتنی زیادہ نہیں ہوتی کہ اس سے آگ لگ جائے۔ رینا کسی قدر وقت کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس کا رخ آبشار کی طرف تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ آبشار کے سامنے تھی۔ وہ پہلی بار اس خوب صورت جگہ آئی تھی اور اسے دیکھ کر مبہوت رہ گئی تھی۔ اسے افسوس ہوا کہ وہ پہلے یہاں کیوں نہیں آئی۔ ندی کے کنارے بیٹھ کر اس نے ہاتھ میں پانی لے کر چکھا اور اسے خوشگوار پا کر اس نے پانی پیا۔ اس کا ذائقہ منفرد تھا، نباتات اور معدنیات کی خوشبو اور ذائقہ لیے ہوئے۔ رینا پانی پی کر وہیں بیٹھ گئی۔ وہ بہت دنوں سے یہاں آنے کا سوچ رہی تھی مگر سوچ کر رہ جاتی تھی۔ بالآخر آج وہ نکل ہی آئی۔

ندی کنارے بہت خوب صورت سبز رنگ کی گھاس تھی۔ اس میں چھوٹے چھوٹے پھولوں والے پودے بھی تھے۔ وہ ان پھولوں کو چن رہی تھی کہ گھاس میں کوئی چیز چمکی۔ رینا نے گھاس ہٹا کر اسے نکالا۔ یہ چیز کیچڑ سے سیاہ ہو رہی تھی۔ اس نے کیچڑ صاف کیا تو ایک چھلا نمایاں ہوا۔ یہ چاندی یا اس جیسی کسی دھات کا بنا ہوا تھا اور اس کے سامنے والے حصے پر تین بالز آپس میں جڑی ہوئی تھیں۔ اس نے پانی سے اسے دھویا تو اس کا سیاہ رنگ بڑی مشکل سے اترا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے چھلا بہت عرصے سے یہاں پڑا ہوا ہو۔ صاف کر کے رینا نے اسے اپنے الٹے ہاتھ کی چوتھی انگلی میں پہنا تو وہ اسے پوری طرح فٹ آیا۔ چھلا اس کے نرم و نازک ہاتھ پر سج گیا تھا۔ وہ وہیں لیٹ گئی پھر چونکی کیونکہ سورج مغرب کی طرف جھک گیا تھا اور کچھ دیر میں غروب ہو جاتا۔ ابھی اسے جنگل سے گزر کر واپس بھی جانا تھا۔ وہ واپسی کے لیے چل پڑی۔ جب وہ جنگل سے نکلی تو سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ اس نے سائیکل اٹھائی اور واپس چل پڑی۔ اب اسے بھوک لگ رہی تھی اور ڈنر سات بجے ہوتا۔ اس نے ایک شاپ سے چاکلیٹ بار لی اور اسے کھاتے ہوئے آگے بڑھی تھی کہ سامنے سے اینڈرسن نمودار ہوا۔ وہ اسے دیکھ کر رک گئی۔

"ہائے..."

"ہائے... تم جنگل سے آ رہی ہو؟"

رینا حیران ہوئی۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے تمہیں جاتے دیکھا تھا لیکن تم نے واپسی میں بہت دیر لگائی۔ میں فکرمند ہو گیا تھا۔"

"میں آبشار تک گئی تھی۔ وہاں بہت خوب صورت منظر تھا۔"

اینڈرسن اس کے ساتھ چلنے لگا۔ "میں کئی بار وہاں جا چکا ہوں، تم نے ٹھیک کہا۔ وہ جگہ بہت خوب صورت ہے۔" اینڈرسن کہتے ہوئے ہچکچایا۔ "رینا! تمہیں پتا ہے پندرہ دن بعد اسکول میں الوداعی پارٹی ہے جس میں سب لڑکے لڑکیاں جوڑے بنا کر شرکت کرتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

اینڈرسن ہچکچایا۔ "کیا تم نے کسی کا انتخاب کیا ہے؟"

"نہیں۔"

"تب تم میری پارٹنر بن جاؤ۔" اینڈرسن نے تجویز دی۔ رینا نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر سر ہلا دیا۔ اینڈرسن خوش ہو گیا۔ "میں تمہیں لینے آؤں گا۔ مسٹر اور مسز وارڈ کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"نہیں۔" رینا نے جواب دیا۔ "وہ میرے ذاتی معاملے میں دخل نہیں دیتے۔"

رینا گھر آئی تو شین اور مارش جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ شین نے رینا کو بتایا کہ اس کا ڈنر تیار کر کے فریج میں رکھ دیا ہے بس اسے گرم کرنا ہوگا۔ تاریکی چھاتے ہی وہ گھر سے نکل گئے تھے۔ چاکلیٹ کھا کر رینا کی بھوک مر گئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آئی اور بیڈ پر گر کر ہاتھ میں موجود چھلے کا معائنہ کرنے لگی۔ بے خیالی میں اسے گھماتے ہوئے اس نے

اتارنے کی کوشش کی تو وہ نہیں اترا۔ اسے حیرت ہوئی کیونکہ چھلا تنگ نہیں تھا وہ آرام سے گھوم رہا تھا مگر اس کی انگلی سے بھی نہیں اتر رہا تھا۔ اس نے اپنی انگلی کے درمیانی جوڑ کا معائنہ کیا۔ وہ موٹا نہیں تھا۔ اسے یاد تھا جب اس نے چھلا پہنا تو وہ بہت آرام سے اس کی انگلی میں آ گیا تھا۔ مگر اب وہ پھنس رہا تھا۔ رینا کو بے چینی ہونے لگی۔ وہ اٹھ کر واش روم میں آئی اور اس نے انگلی پر صابن لگا کر چھلا اتارنے کی کوشش کی۔ ایک ناکامی کے بعد اس نے اچھی طرح صابن لگا کر جھاگ بنایا اور پھر چھلا اتارنے کے لیے زور لگایا تو وہ اتر گیا۔ رینا نے اسے ایک طرف رکھتے ہوئے نل کھولا اور ہاتھ پر لگا جھاگ دھونے لگی۔ جھاگ ہٹا تو وہ اچھل پڑی۔ چھلا پھر اس کی انگلی میں نظر آ رہا تھا اس نے بے ساختہ بیسن کی سائڈ پر دیکھا جہاں اس نے چھلا رکھا تھا مگر وہاں چھلا نہیں تھا۔ ہوتا بھی کیسے وہ تو اس کی انگلی میں تھا۔

''کیا میرا دماغ چل گیا ہے؟'' اس نے سوچا۔ ''میں نے چھلا رکھنے کے بجائے دوبارہ پہن لیا۔''

اس نے غور سے چھلا دیکھا، وہ اس کی انگلی میں اچھا لگ رہا تھا۔ اسے خیال آیا کہ وہ بلا وجہ اسے اتارنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس نے ارادہ ترک کر دیا مگر واش روم سے باہر آنے پر بھی اس کا شک برقرار رہا کہ اس نے چھلا اتارا تھا یا نہیں۔ اسے اچھی طرح یاد تھا اس نے چھلا اتار دیا تھا البتہ یہ یاد نہیں تھا کہ اس نے اسے سائڈ پر رکھا تھا یا دوبارہ پہن لیا تھا۔ وہ سوچتی اور الجھتی رہی۔ اچانک بادل زور سے گرجے تو وہ چونک اٹھی۔ کھلی کھڑکی سے تیز ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر کھڑکی کا پٹ نیچے گرایا اور پردہ برابر کرنے جا رہی تھی کہ اس کی نظر گھر کے سامنے سڑک پار کھڑی لڑکی پر گئی۔ وہ اس کا حلیہ دیکھ کر چونکی اس نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا جو مشکل سے اس کے گھٹنوں تک آ رہا تھا۔ لباس اور جسم میلا کچیلا ہو رہا تھا۔ وہ کئی جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور اس کے پاؤں ننگے تھے۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ رینا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے پردہ برابر کر دیا۔

وہ نیچے آئی۔ اوون میں کھانا گرم کیا اور کھانا کھا کر اس نے برتن دھو کر رکھے۔ یہ واحد کام تھا جو وہ اس گھر میں کرتی تھی۔ ورنہ تمام ذمے داریاں شمین ادا کرتی تھی۔ اس بڑے سے دو منزلہ گھر کے تمام کام وہ خود کرتی تھی۔ شمین اس کے کپڑے تک استری کر کے اس کے کمرے میں پہنچا دیتی تھی۔ دیکھا جائے تو اسے یہاں ذرا بھی تکلیف نہیں تھی مگر نہ جانے کیا بات تھی اس کے باوجود اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد اٹھارہ سال کی ہو جائے اور یہاں سے چلی جائے۔ رینا نے سوچا تھا کہ وہ یہاں نہیں رہے گی۔ وہ کسی بڑے شہر میں جا کر رہنا چاہتی تھی جہاں اسے جاننے والا کوئی نہ ہو اور کوئی اسے اس کی ماں کا یا اس کے نفسیاتی مریض ہونے کا طعنہ نہ دے۔

اگلے دن وہ کلاس روم میں بے دھیانی سے بیٹھی انگلی میں چھلا گھما رہی تھی۔ ٹیچر لیکچر دے رہی تھی مگر رینا کا دھیان اس کی طرف نہیں تھا۔ رینا کے برابر والی کرسی خالی تھی۔ مگر جب اس نے چھلا گھماتے ہوئے اس طرف دیکھا تو اسے وہی لڑکی بیٹھی دکھائی دی جو کل رات گھر کے سامنے نظر آئی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ سفید، ہونٹ خشک اور آنکھیں ویران تھیں۔ رینا ہڑبڑا کر پیچھے ہوئی۔ وہ اتنی بری طرح چونکی تھی کہ ٹیچر اس کی طرف متوجہ ہو گئی اس نے پکار کر کہا۔ ''اینی پرابلم رینا؟''

رینا نے اس کی طرف دیکھا اور دوبارہ کرسی کی طرف متوجہ ہوئی تو وہ خالی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس نے ایک لمحے پہلے اس لڑکی کو یہاں دیکھا تھا اور وہ اتنی جلدی اٹھ کر یہاں سے نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا ساری کلاس اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ سارہ اور اس کی ساتھی لڑکیوں کے چہروں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ رینا نے آہستہ سے کہا۔ ''نو ٹیچر۔''

''بعض لوگوں کو وہ نظر آتا ہے جو دوسروں کو نظر نہیں آتا۔'' سارہ نے بلند آواز سے کہا تو ٹیچر نے اسے گھورا اور دوبارہ لیکچر دینے لگی۔ رینا نے ڈرتے ڈرتے برابر والی کرسی کی طرف دیکھا اور اسے خالی پا کر اطمینان کا سانس لیا۔ اسے وہم ہوا تھا۔ ان سے کچھ دور بیٹھا ہوا اینڈرسن اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد گھنٹی بجی تو سب باہر کی طرف لپکے۔ رینا اپنی چیزیں سمیٹ کر باہر نکل آئی۔

''اینڈرسن اس کے پیچھے آیا۔'' کوئی مسئلہ ہے؟''

''نہیں تو۔''

''تم لیکچر نہیں سن رہی تھیں۔''

''نہیں تو، میں سن رہی تھی۔'' اس نے تردید کی۔

وہ کینٹین میں آ گئے۔ دونوں ایک خالی جگہ آ کر بیٹھ گئے۔ یہاں بڑی میزیں تھیں جن کے گرد چھ اور آٹھ افراد بیٹھ سکتے تھے۔ اینڈرسن نے اسے کھانے کی ٹرے لانے کی پیشکش کی اور چلا گیا۔ سامنے والی میز پر سارہ کا گروپ تھا۔ اس وقت بھی وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ سارہ نے بلند آواز سے کہا۔ ''سلور اسٹون کی روایت ہے یہاں ہر دس سال بعد کوئی نفسیاتی مریض لڑکی پراسرار طور پر غائب ہو جاتی ہے۔''

"اب کس کی باری ہے؟" جولی بولی۔

"ممکنہ طور پر کسی ایسی نفسیاتی مریضہ کی جسے اجنبی چیزیں نظر آتی ہوں۔" سارہ نے بے رحمی سے کہا۔ سب نے مشترکہ قہقہہ لگایا... رینا سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس نے ان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ کچھ دیر میں اینڈرسن دو ٹرے لے آیا۔ ایک کپ میں اسپا گیٹی تھی۔ ساتھ میں دو عدد پیسٹریاں اور ایک گلاس دودھ تھا۔ یہ آج کا مینیو تھا۔ اینڈرسن نے ٹرے اس کے سامنے رکھی اور بولا۔

"ان کی باتوں پر توجہ مت دو، یہ بکواس کر رہی ہیں۔"

رینا نے ٹرے کی طرف دیکھا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہیں، ہر دس سال بعد یہاں کوئی لڑکی غائب کر دی جاتی ہے؟"

اینڈرسن نے سر ہلایا۔ "اتفاق کی بات ہے ایسا ہی ہو رہا ہے۔ بیس سال پہلے ایک ہائی اسکول کی طالبہ غائب ہوئی تھی اور دس سال پہلے پھر ایسا ہی واقعہ دہرایا گیا اس بار بھی نشانہ ہائی اسکول کی طالبہ تھی۔"

"ہمارے اسکول کی؟"

"ہاں پہلی کے بارے میں زیادہ نہیں معلوم لیکن دوسری جیسمین نامی لڑکی تھی۔ وہ اپنے گھر سے غائب ہوئی تھی۔ پولیس کا خیال ہے دونوں لڑکیوں کو قتل کر دیا گیا تھا اور ان کی لاشیں غائب کر دی گئیں۔"

"ممکن ہے وہ گھر سے بھاگ گئی ہوں؟"

"کم سے کم جیسمین نہیں بھاگی تھی، کچھ شواہد ملے جن سے پتا چلا تھا کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔"

رینا کانپ اٹھی۔ "قاتل کا پتا چلا؟"

"وہ پکڑا گیا تھا مگر اس کا کہنا تھا کہ وہ بے گناہ ہے اس نے قتل نہیں کیا۔" اینڈرسن نے کہا اور اس کی نظر رینا کی انگلی پر گئی۔ "خوب صورت رنگ ہے۔"

"ہاں مجھے ندی کے کنارے سے ملی تھی، ایسا لگ رہا تھا وہاں بہت عرصے سے پڑی ہو۔" رینا نے ہاتھ آگے کیا۔

"تمہارے ہاتھ میں اچھی لگ رہی ہے۔"

رینا ہاتھ پیچھے کر رہی تھی کہ اس نے اینڈرسن کے عقب میں کیفے ٹیریا کے داخلی دروازے کے پاس اسی لڑکی کو دیکھا۔ وہ چونک اٹھی۔ اینڈرسن نے محسوس کر لیا۔ "کیا ہوا؟"

رینا نے جلدی سے سر نیچے کر لیا اور آہستہ سے بولی۔ "کچھ نہیں۔"

اینڈرسن کھانے میں مصروف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد رینا نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھایا اور لڑکی کو وہاں نہ پا کر سکون کا سانس لیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اتنے عجیب حلیے والی لڑکی کو وہاں پا کر کسی نے نوٹس ہی نہیں لیا تھا، سب معمول کے مطابق تھا۔ کیا سارہ کی بات درست تھی؟ وہ صرف اسے ہی نظر آ رہی تھی؟ چھٹی کے بعد وہ دونوں ساتھ نکلے تھے۔ اینڈرسن نے اس سے کہا۔ "تم میرے ساتھ چلو گی آبشار تک؟"

وہ ہچکچائی۔ "آج؟"

"ہاں تین بجے تک۔ ہم تاریکی سے پہلے واپس آ جائیں گے۔"

"میں آ جاؤں گی۔" وہ مان گئی۔

البتہ اس نے گھر میں نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ جیسے ہی شین بیڈروم میں گئی، رینا سائیکل اٹھا کر گھر سے نکل گئی۔ اسے عجیب سی سنسنی کا احساس ہو رہا تھا اور ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ پہلی بار کسی لڑکے کے ساتھ کہیں جا رہی تھی اور اس کے لیے وہ اینڈرسن کی شکرگزار تھی۔ اس سے پہلے کسی لڑکے نے اس کے پاس آنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی وجہ رینا کا پس منظر تھا پھر وہ کسی سے گھلتی ملتی نہیں تھی۔ اگرچہ وہ شکل صورت کے لحاظ سے بہت دلکش تھی۔ اینڈرسن کے گھر آ کر اس نے دیکھا اور اسے باہر موجود نہ پا کر اس نے اوپر تکونی چھت والے واحد کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھا اور پھر ایک پتھر اٹھا کر اس کے شیشے پر مارا۔ پہلے پتھر کا کوئی ردعمل نہیں ہوا تو وہ دوسرا پتھر اچھالنے جا رہی تھی کہ اچانک سامنے سے ڈاکٹر پیٹرسن نمودار ہوا۔

"رینا۔" اس نے خوشگوار لہجے میں کہا مگر اس کی آنکھیں سرد تھیں۔

وہ نروس ہو گئی۔ "ہیلو... ڈاکٹر..."

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" ڈاکٹر پیٹرسن کا انداز یک دم سنجیدہ ہو گیا۔ "اگر تم اینڈی سے ملنے آئی ہو تو وہ اس وقت کسی سے نہیں مل سکتا۔"

"سوری ڈاکٹر..."

"آئندہ تم میرے گھر پر پتھر نہیں برساؤ گی۔"

"سوری ڈاکٹر..." وہ پھر اتنا ہی کہہ سکی۔

"اور نہ ہی آئندہ تم میرے ڈرائیو وے میں نظر آؤ گی۔ میں نہیں چاہتا کہ اینڈی کسی مشکل میں پڑے۔" ڈاکٹر پیٹر نے کہا اور مڑ کر واپس چلا گیا۔ رینا مایوسی کے عالم میں واپس پلٹ رہی تھی کہ اس کی نظر اوپر کھڑکی پر گئی۔ اینڈرسن اسے اشارے سے کچھ کہہ رہا تھا۔ رینا نے سر ہلایا اور جنگل کی طرف روانہ ہو گئی۔ دس منٹ بعد اینڈرسن بھی وہاں آ گیا۔ اس نے آتے ہی معذرت کی۔

”سوری، ڈیڈی نے آج پابندی لگا دی، مجھے چھپ کر آنا پڑا۔“

”کیا تم اپنی مرضی سے باہر نہیں جاسکتے؟“

”جاسکتا ہوں مگر پچھلے ٹیسٹ میں میرے نمبر کم آئے تھے تو ڈیڈی نے پابندی لگا دی ہے کہ میں اب ہفتے میں تین بار ہی باہر جاسکتا ہوں۔“ اینڈرسن مسکرایا۔ ”خیر چھوڑو میں ڈیڈی کو ہینڈل کرسکتا ہوں۔ وہ ساری دنیا کی نفسیات سے کھیلتے ہیں اور میں ان کی نفسیات سے کھیلتا ہوں۔“

رینا نے اپنی سائیکل جنگل کے باہر چھوڑ دی اور وہ پیدل روانہ ہو گئے۔ رینا کسی قدر نروس تھی مگر اینڈرسن کا رویہ ویسا ہی رہا۔ رینا کا خیال تھا کہ تنہائی میں وہ اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرے گا مگر اینڈرسن نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ اس سے نارمل انداز میں بات کر رہا تھا۔ اس وجہ سے رینا بھی نارمل ہو گئی۔ معاً رینا کو خیال آیا اور اس نے جیسمین کے بارے میں پوچھا۔ ”اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

”اس کا گھر بھی جنگل کے پاس ہے اسکول سے دوسری گلی میں۔ ایک رات وہ شب خوابی کے لباس میں گھر سے غائب ہو گئی اور پھر کبھی نہیں ملی۔ البتہ کچھ ایسی نشانیاں ملیں جن سے پتا چلتا تھا کہ اسے قتل کر دیا گیا ہے۔“

”قاتل کیسے پکڑا گیا؟“

”قاتل اسٹیو آرین کی جنگل کے ساتھ ہی سلور اسٹون میں ووڈ ورکشاپ تھی اور ورکشاپ کے ایک اوزار پر خون لگا پایا گیا جو بعد میں جیسمین کا ثابت ہوا تھا۔ پولیس نے گرفتار کیا تو اس کی ورکشاپ سے جیسمین کے لباس کے بعض ٹکڑے بھی ملے تھے۔“

”اس پر مقدمہ چلا؟“

”لازمی بات ہے۔“

”اسے سزا ہوئی؟“

”یہ بھی یقینی ہے کیونکہ پولیس نے کیس کی تحقیقات روک دی تھیں۔“ اینڈرسن نے شانے ہلائے۔ ”دوسری صورت میں پولیس تحقیقات جاری رکھتی۔“

”سارہ کہہ رہی تھی کہ اب پھر کسی لڑکی کی باری ہے۔“

”وہ بکواس کرتی ہے۔“ اینڈرسن نے تیز لہجے میں کہا۔ ”تم اس کی پروا مت کیا کرو۔“

”میں پروا نہیں کرتی ہوں لیکن نہ جانے وہ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔“

اینڈرسن نے ایک جھاڑی پر کھلے ہوئے سرخ پھول توڑ کر اسے پیش کیے۔ ”یہ لو اور سب بھول جاؤ... ہم یہاں تفریح کے لیے آئے ہیں۔“

رینا مسکرانے لگی۔ اسے اینڈرسن کا ساتھ اچھا لگ رہا تھا۔ وہ چاہ رہی تھی کہ بس اسی طرح اینڈرسن کے ساتھ چلتی رہے۔ مگر اس کی خواہش پوری نہیں ہوئی کیونکہ وہ کچھ دیر میں آبشار تک پہنچ گئے۔ اسے حیرت ہوئی۔ ”آج جلدی پہنچ گئے... کل میں پورے آدھے گھنٹے میں پہنچی تھی۔“

”مجھے یہاں تک آنے کا آسان راستہ پتا ہے ہم وہیں سے آئے ہیں۔“ اینڈرسن نے کہا۔ ”میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میں اکثر یہاں آتا رہتا ہوں۔“

اوپر سے آبشار کا پانی کسی دھوئیں کی طرح نیچے ایک چاندی جیسی چمکتی چٹان پر گر رہا تھا اور اسی چٹان کی وجہ سے اس جگہ کو سلور اسٹون کہا جاتا تھا۔ رینا نے گزشتہ روز بھی دیکھا تھا مگر آج یہ منظر اسے زیادہ اچھا لگا۔ اینڈرسن نے پانی میں ہاتھ ڈالا اور واپس کھینچ لیا۔ ”آج پانی بہت سرد ہے۔“

”تم نے اس میں تیراکی کی ہے؟“

”کئی بار مگر آج پانی زیادہ ہی ٹھنڈا ہے۔“

رینا نے پانی میں ہاتھ ڈالا۔ ”اتنا ٹھنڈا نہیں ہے۔“

اینڈرسن نے اس کی طرف دیکھا۔ ”پھر کیا خیال ہے؟“

وہ شرمائی۔ ”اگلی بار سہی۔“

یہاں آبشار کے شور کے علاوہ کوئی اور آواز نہیں تھی بس کبھی کبھی کوئی پرندہ آواز نکالتا تھا۔ رینا اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ اور اینڈرسن ندی کے بالکل کنارے بیٹھے تھے۔ ندی کا پانی جیسے پگھلے شیشے کی طرح بہہ رہا تھا۔ رینا نے ذرا جھک کر پانی کی چادر کو چھونا چاہا اور چونکی۔ پانی میں اسی لڑکی کا عکس تھا وہ بالکل اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ رینا ہڑبڑا کر پیچھے ہوئی اور اس نے پلٹ کر دیکھا مگر اس کے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ اینڈرسن پریشان ہو گیا۔ ”کیا ہوا؟“

”وہ... وہ یہاں تھی؟“

”کون؟“

”وہ ایک لڑکی... اس نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا اور میرے پیچھے کھڑی تھی۔“

اینڈرسن نے اٹھ کر دیکھا۔ ندی کا کنارہ دور تک صاف تھا، پاس بڑے درخت اور جھاڑیاں بھی نہیں تھیں جن میں کوئی روپوش ہو جاتا۔ اس نے رینا کو تسلی دی۔ ”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی... ندی میں کسی چیز کا عکس کس طرح آیا ہوگا۔“

”نہیں وہ...“ رینا کہتے کہتے رک گئی۔ اسے خیال

آیا کہ اگر اس نے اینڈرسن کو بتایا تو کیا وہ اس کی بات کا یقین کرے گا۔ ''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

اینڈرسن اس کے بالکل پاس تھا۔ اچانک وہ اس کے چہرے پر جھک گیا اور رینا کو لگا کہ اس کی سانس ہی نہیں وقت بھی تھم گیا ہے۔ اینڈرسن نے نرمی سے اسے بازوؤں میں لے لیا اور اسے گھاس پر لٹا دیا۔ کچھ دیر بعد وہ الگ ہوئے اور پاس پاس لیٹ گئے۔ رینا خوش تھی کہ اسے یہ سب اچھا لگا تھا۔ اینڈرسن کے انداز میں نرمی اور محبت تھی۔ اس نے ذرا بھی زور زبردستی نہیں کی تھی۔ رینا نے محسوس کیا کہ وہ اس سے بات کرسکتی ہے، وہ خود سے بولنے لگی۔ وہ اسے اپنے اور اپنے احساسات کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اپنی ماں کے بارے میں جس سے کوئی اچھی یاد وابستہ نہیں تھی اور اپنے باپ کے بارے میں جسے اس نے بچپن میں کھو دیا تھا۔ اپنی بیماری کے بارے میں جس کی وجہ سے وہ سب کے مذاق کا نشانہ بنتی تھی۔ البتہ اس نے اس لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ چپ ہوئی تو اینڈرسن نے پوچھا۔

''مسٹر اور مسز وارڈ کا رویہ کیسا ہے؟''

''دیکھا جائے تو بہت اچھا ہے۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے مجھے یہاں نہیں رہنا چاہیے۔''

''تم اٹھارہ کی ہونے والی ہو۔''

''ڈھائی مہینے بعد ہو جاؤں گی۔'' اس نے جواب دیا۔

''پھر تم ان سے الگ ہو جاؤ گی؟''

''ہاں میں یہاں سے چلی جاؤں گی؟''

اینڈرسن فکرمند ہوگیا۔ ''کہاں اور کیوں؟''

''میں کسی ایسی جگہ جاؤں گی جہاں بہت سے انسان ہوں، میں ان میں کھو جاؤں اور جہاں کوئی مجھے نہ جانتا ہو۔''

''سنو، یہاں بھی تو اچھے کالج ہیں۔'' اینڈرسن نے کہا۔

''کیا فائدہ، یہاں مجھے وہی لوگ ملیں گے جنہیں میں اسکول میں بھگت رہی ہوں۔'' رینا نے نفی میں سر ہلایا۔

اینڈرسن مایوس ہوگیا۔ ''مجھے یہیں داخلہ لینا ہوگا پھر ڈیڈی مجھے اسپرنگ فیلڈ بھیجیں گے، وہاں میں میڈیکل پڑھوں گا۔''

''ممکن ہے ہم اپنی تعلیم مکمل کرکے پھر ملیں۔'' رینا نے اسے تسلی دی۔ اسے اینڈرسن کے تاثرات دیکھ کر اس پر ترس آرہا تھا۔ وہ ذرا سی دیر میں اس سے بہت زیادہ قریب ہوگیا تھا۔ وہ کھڑا ہوگیا۔

''اب چلو ورنہ کچھ دیر بعد جنگل میں اندھیرا ہو جائے گا۔''

وہ جنگل میں داخل ہوئے تو درختوں تلے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ رینا سہم کر اینڈرسن کے قریب آگئی۔ ''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''فکر مت کرو اب یہاں خطرے کی بات نہیں ہے۔''

''جیسمین شاید اسی جنگل میں غائب ہوئی تھی۔''

''وہ دس سال پرانی بات ہے۔ اس کے بعد سے یہاں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔''

''لیکن ضروری تو نہیں ہے کہ مستقبل میں بھی نہ پیش آئے۔''

''لگتا ہے تم اس پر کچھ زیادہ ہی سوچ رہی ہو۔''

رینا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تیز قدم اٹھا رہے تھے اور ان کے پیروں تلے آنے والی خشک شاخیں اور پتے آواز پیدا کر رہے تھے۔ اچانک رینا کو لگا کہ ان کے ساتھ کوئی اور بھی چل رہا ہے۔ وہ رک گئی اور اینڈرسن بھی رک گیا مگر آواز آرہی تھی۔ اگرچہ یہ آواز مشکل سے ایک سیکنڈ کے لیے آئی تھی مگر انہوں نے واضح سنی تھی۔ رینا نے اس کا بازو تھام لیا۔ ''تم نے سنا کوئی آس پاس ہے؟''

''یہ جنگل ہے اور یہاں ایسی آوازیں آتی رہتی ہیں۔'' اینڈرسن نے اسے تسلی دی مگر رینا ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ یہ بالکل صاف ایسی آواز تھی جیسی ان کے قدموں سے آرہی تھی۔ اینڈرسن نے اس کا بازو پکڑا۔ ''اب چلو۔''

مجبوراً رینا حرکت میں آئی۔ وہ جنگل سے باہر آئے تو رینا نے اپنی سائیکل اٹھائی اور گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ وہ گھر میں آئی تو شین اور مارش عقبی صحن میں تھے۔ شین کہیں جانے کی تیاری کر رہی تھی اور مارش لکڑی کاٹ رہا تھا۔ یہ لکڑی مکان کے تہ خانے میں لگی بھٹی میں ڈالی جاتی تھی جو پورے گھر کو گرمائش اور گرم پانی مہیا کرتی تھی۔ انہیں تقریباً سارا سال اس کی ضرورت رہتی تھی۔ ان کے مکان میں الیکٹرانک ہیٹنگ سسٹم بھی تھا مگر مارش لکڑی جلانے کو ترجیح دیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ لکڑی کاٹنے سے اس کی اچھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے۔ دوسرے لکڑی کاٹنے والے مزدوروں کا روزگار اس سے چلتا تھا۔ اگر لوگ لکڑی جلانا بند کردیں تو بہت سے لوگ بے روزگار ہو جائیں گے اور اس کا علاقے کی معیشت پر برا اثر پڑے گا۔ شین نے اسے دیکھ کر کہا۔ ''میں مارکیٹ جا رہی ہوں، تم نے کچھ منگوانا ہے؟''

''نہیں۔''

''اوکے میں ایک گھنٹے میں آجاؤں گی، اگر بھوک لگے تو فریج میں کھانا تیار ہے گرم کر لینا۔''

شین کے جانے کے بعد مارش نے کہا۔ ''رینا! کیا تم نے کبھی لکڑی کاٹی ہے؟''

''نہیں۔''

''آؤ میں تمہیں سکھاتا ہوں۔'' مارش نے پیشکش کی۔ رینا آگے آئی تو اس نے کلہاڑی اس کے ہاتھ میں تھمائی۔ ''اسے یوں پکڑو۔'' مارش اس کے عقب میں آگیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کی دونوں کلائیاں پکڑیں اور پھر کلہاڑی بلند کی۔ ''اسے یوں مارو۔''

رینا نے محسوس کیا کہ وہ اس کے کچھ زیادہ ہی قریب آگیا تھا۔ مارش کا جسم اسے چھو رہا تھا اور اس کی سانسیں رینا کو اپنی گردن پر محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میں خود کرلوں گی۔''

مارش خفیف ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ رینا نے کٹے تنے پر رکھے لکڑی کے ٹکڑے کو دیکھا اور گھما کر کلہاڑی ماری۔ پھل بالکل ٹھیک جگہ لگا اور لکڑی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ کلہاڑی تنے میں گڑ گئی تھی۔ مارش نے ستائشی انداز میں کہا۔ ''شاندار، تم نے کلہاڑی کا درست استعمال کیا ہے۔''

رینا نے کلہاڑی تنے پر لگی چھوڑی اور اندر آگئی۔ اس نے کئی بار مارش کے انداز میں اپنے لیے دلچسپی محسوس کی تھی مگر یہ دلچسپی بس نظروں کی حد تک تھی۔ آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ مارش اس کے کچھ زیادہ ہی نزدیک آیا تھا۔ مارش عمر میں اس سے کئی سال بڑا تھا.... وہ چالیس سال کا تھا، اگرچہ بہت فٹ اور دیکھنے میں جوان نظر آتا تھا۔ شین کی عمر اڑتیس برس تھی اور خوب صورتی میں وہ بھی کسی سے کم نہیں تھی۔ رینا کا خیال تھا کہ ایسی بیوی کے ہوتے ہوئے مارش کو کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس میں بھی شبہ نہیں تھا کہ مارش اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ شین کا ہر ممکن خیال رکھتا تھا۔ صرف شین کی خاطر اس نے ملازمت نہیں کی تھی۔ تاکہ صبح سے شام تک دفتر جانے کی پابندی سے آزاد رہے۔ وہ صبح اور شام کے اوقات میں دو ڈھائی گھنٹے کے لیے دفتر جاتا تھا اور اس کا زیادہ تر وقت گھر پر گزرتا تھا۔ اپنے گاہکوں اور ملازموں سے موبائل پر اس کا رابطہ رہتا تھا۔ اگر سائٹ پر کام چل رہا ہوتا تو وہ دفتر جانے کے بجائے وہاں چکر لگا لیتا تھا۔ مارش کی آمدنی بہت اچھی تھی۔ شین ملبوسات اور دوسری چیزوں پر دل کھول کر خرچ کرتی تھی۔ مہینے میں ایک بار ان کے گھر پارٹی ہوتی تھی جس میں ان کے دوست احباب شریک ہوتے تھے۔ ان کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔

اس رات بارش ہونے لگی۔ گرمی کے آغاز میں عام طور سے ہر دوسرے تیسرے دن بارش ہو جاتی تھی۔ رینا سو

سرداری

ایک سردار کی بس نہر میں گر گئی
پولیس۔ ''بس کیسے گری؟''
سردار۔ ''مجھ کو پتا نہیں ہے۔''
پولیس۔ ''کیوں۔''
سردار۔ ''وہ آج سکندر نہیں آیا تھا تو میں پیچھے لوگوں سے کرایہ لینے میں لگا تھا۔''

آسمان سے اترا...

ایک چور پولیس سے چھپتا ہوا ایک ٹوٹی قبر میں لیٹ گیا۔

قریب سے شرابی گزرے تو انہوں نے سوچا کہ شاید لوگ قبر پر مٹی ڈالنا بھول گئے انہوں نے فٹافٹ مٹی ڈالنی شروع کر دی۔ چور بولا۔ ''بچاؤ بچاؤ۔''

پٹھان بولا۔ ''او جلدی جلدی مٹی ڈالو عذاب شروع ہو گیا۔''

مرسلہ: عبدالغفور خان ساغری خٹک، ضلع اٹک

اثر

ڈاکٹر مریضہ سے۔ ''دیکھا، میری دی ہوئی گولیاں کھانے کا کتنا اثر ہوا۔ آپ کا موٹاپا دور ہو گیا۔''

مریضہ۔ ''جی ہاں، مگر وہ گولیاں میں نے نہیں کھائیں۔ وہ میری تین سالہ بیٹی کے ہاتھ لگ گئیں اور وہ ساری گولیاں کھا گئی۔ اس کے بعد وہ اپنی شرارتوں میں اتنی سرگرم ہو گئی کہ رات دن اس کے پیچھے دوڑ دوڑ کر میری جان ہلکان ہو گئی۔''

عقلمندی

ماں بیٹے سے۔ ''بیٹا میں جو دوائی لے کر آئی تھی، وہ تم نے پی لی تھی۔''

''نہیں امی، اسے تو میں نے اونچی جگہ پر رکھ دیا ہے۔''

''کیوں؟'' ماں نے بیٹے کو گھورتے ہوئے کہا۔

''امی، اس کے اوپر لکھا ہوا تھا۔ تمام دوائیں بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں۔''

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

رہی تھی۔ اچانک اسے لگا جیسے کوئی اس کی انگلی پکڑ کر کھینچ رہا ہے۔ وہ نیند میں کسمسائی لیکن جب انگلی زیادہ ہی کھنچی تو اس کی آنکھ کھل گئی اور اسی لمحے اس کا ہوا میں اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گر گیا۔ اس کے چھلے والی انگلی کھلی تھی جیسے اسے کسی نے پکڑ رکھا ہو۔ وہ سہم کر بستر میں سمٹ گئی، اس نے اپنی انگلی دیکھی جو کسی قدر سرخ ہو رہی تھی۔ پھر اس کی نظر کمرے کے کھلے دروازے پر گئی۔ جبکہ وہ رات کو دروازہ بند کر کے اور اندر سے لاک کر کے سوئی تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ اندر سے لاک کیا اور بستر پر آ گئی۔ وہ چھلے والا ہاتھ سمیٹ کر لیٹ گئی۔ کچھ دیر تک وہ جاگتی رہی پھر رفتہ رفتہ نیند نے غلبہ پا لیا اور وہ دوبارہ گہری نیند میں چلی گئی۔

☆☆☆

شمین نے کمرے میں جھانکا اور بولی۔ ”کیا تمہارے پاس کچھ وقت ہے؟“

رینا پڑھ رہی تھی، اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔ شمین اندر آئی مگر اس نے ہاتھ پیچھے کیا ہوا تھا۔ ”تمہارے لیے ایک گفٹ ہے۔“

”کیسا گفٹ؟“

شمین نے ہاتھ آگے کیا تو اس میں ایک خوب صورت لباس تھا۔ ”یہ میں تمہارے لیے لائی ہوں۔ تم اسکول کی الوداعی پارٹی میں پہنوگی۔“

رینا بستر سے اتر آئی، اس نے شوق سے لباس لیا۔ ڈوریوں اور کلیوں سے بنی فراک سرخ رنگ کی تھی اور اس کے دامن پر شوخ نیلے رنگ کے پھول بنے ہوئے تھے۔ شمین نے پوچھا۔ ”اچھی لگی؟“

”بہت خوب صورت ہے۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

”تھینک یو ورنہ میں سوچ رہی تھی کہ پتا نہیں تمہیں پسند بھی آتا ہے یا نہیں۔“ شمین نے کہا۔ ”ویسے تم نے اپنا پارٹنر منتخب کیا؟“

”ہاں۔“ وہ ہچکچائی۔ ”اینڈرسن ہے۔“

”ڈاکٹر پیٹرسن کا بیٹا؟“ شمین نے کہا۔ ”اچھا نوجوان ہے لیکن ہینڈسم نہیں ہے۔“

رینا نے اس کی رائے پر کچھ نہیں کہا، وہ آئینے کے سامنے لباس اپنے جسم سے لگا کر دیکھ رہی تھی کہ وہ کیسی لگ رہی ہے؟ پارٹی تین دن بعد تھی۔ شمین کے جاتے ہی اس نے ایس ایم ایس کر کے اینڈرسن کو بتایا کہ اس کا پارٹی ڈریس آ گیا ہے۔ پھر اس نے لباس کی تصویر لے کر اسے اینڈرسن کو ایم ایم ایس کر دیا۔ اسے بھی پسند آیا تھا۔ اس نے رینا کو بتایا کہ وہ سات بجے اسے لینے آئے گا۔ اس دن رینا شام سے پُرجوش تھی۔ اس نے تیار ہو کر لباس پہنا۔ شمین نے اس کا ہیئر اسٹائل بنایا۔ ہلکا سا میک اپ کیا۔ وہ یقیناً بہت اچھی لگ رہی تھی کیونکہ نیچے آئی تو مارش نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا مگر شمین کے سامنے ان نظروں میں وہ خاص تاثر نہیں تھا جو شمین کی عدم موجودگی میں رینا کو دیکھ کر آتا تھا۔ شمین کے سامنے وہ اس سے بچی کا سا سلوک کرتا تھا۔ شمین نے ڈنر تیار کر لیا تھا، اس نے رینا سے کہا کہ وہ بھی کھا کر جائے۔ وہ تینوں میز پر تھے کہ کال بیل بجی۔ رینا نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔ سامنے اینڈرسن کھڑا تھا، اس نے تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ رینا اسے اندر لے آئی۔

”ہیلو۔“ اینڈرسن نے اعتماد سے کہا۔

”ہائے۔“ شمین نے کہا۔

”آپ کیسی ہیں؟“ اینڈرسن نے شمین کی طرف دیکھا۔

”فائن، تم بہت اچھے لگ رہے ہو۔“

”شکریہ... میں رینا کو لینے آیا ہوں۔“

”اوہ، ہاں کیوں نہیں۔“ مارش جواب تک خاموش تھا، بولا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اینڈرسن اسے پسند نہیں آیا تھا۔ وہ دونوں باہر نکل آئے۔ اینڈرسن اپنے باپ کی شاندار کار لے آیا تھا۔ وہ اسکول کی طرف روانہ ہوئے۔ اینڈرسن نے کہا۔

”تم اچھی لگ رہی ہو۔“

”شکریہ۔“ وہ شرمیلے انداز میں بولی۔

کچھ دیر بعد وہ اسکول جمنازیم کے سامنے تھے جہاں یہ تقریب ہو رہی تھی۔ اینڈرسن نے اسے جمنازیم کے سامنے اتار دیا۔ ”تم چلو، میں کار پارک کر کے آتا ہوں۔“

اینڈرسن نے کار گھمائی۔ وہ اندر جانے لگی تھی کہ اس کی نظر جمنازیم کے اوپری فلور کی ایک کھڑکی کی طرف گئی اور وہ ٹھٹک گئی۔ وہاں اسے وہی لڑکی دکھائی دی تھی۔ وہ رینا کو دیکھ رہی تھی۔ اچانک عقب سے آتی سارہ نے اسے دھکا دیا تو وہ چونکی۔ سارہ ہنستی ہوئی اس کے پاس سے گزر گئی۔ اس نے پھر اوپر دیکھا تو اس بار کھڑکی خالی تھی جبکہ اس نے واضح طور پر اس لڑکی کو وہاں دیکھا تھا۔ رینا اندر آئی، ہال میں پارٹی جاری تھی۔ اسٹیج پر آرکسٹرا موجود تھا مگر ابھی اسے سیٹ کیا جا رہا تھا، موسیقی جمنازیم کے اسپیکر سے پھوٹ رہی تھی۔ بعض جوڑے ابھی سے رقص والے حصے میں موجود تھے۔ ایک طرف بڑی سی میز پر پینے پلانے کے لوازمات موجود تھے اور اس کے ساتھ ہی دوسری میز پر کھانے کی بہت

سی چیزیں موجود تھیں۔ رینا کچھ دیر سوچتی رہی پھر وہ اسٹیج اسکرین کے پیچھے آ گئی۔ یہاں جمنازیم کے اندر جانے کا راستہ تھا۔ وہ ہال وے میں آئی اس کے آخری سرے پر سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ وہ ہچکچائی پھر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

یہاں سناٹا تھا۔ کمرے بند تھے اور بہت کم روشنیاں جل رہی تھیں۔ وہ سہمے ہوئے قدموں سے سیڑھیوں کے ذریعے جمنازیم کی اوپری منزل پر آ گئی۔ یہاں اسکول کی لائبریری تھی۔ اسے یاد تھا لڑکی جس کھڑکی میں نظر آئی تھی وہ لائبریری کی ہی تھی۔ داخلی دروازہ کھلا ہوا تھا مگر اندر تقریباً تاریکی تھی۔ ظاہر ہے اس وقت وہاں کوئی نہیں ہوتا تھا، شام چار بجے لائبریری بند کر دی جاتی تھی۔ اسے حیرت ہوئی داخلی دروازہ کیسے کھلا ہوا تھا۔ ورنہ یہ بھی لاک ہوتا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ لائبریری کے آخری حصے میں روشنی تھی۔ وہ اس طرف بڑھی۔ اسے ڈر بھی لگ رہا تھا مگر وہ خود کو روک بھی نہیں پا رہی تھی۔ اس حصے میں کمپیوٹرز تھے۔ یہاں طلبا انٹرنیٹ اور آن لائن لائبریری استعمال کرتے تھے۔ وہ لرزتے قدموں سے آگے آئی۔ اس نے ایک ریک سے جھانک کر دیکھا تو اسے کمپیوٹرز والے حصے میں ایک اسکرین روشن دکھائی دی۔ یہاں جھلکنے والی روشنی اسی کی تھی۔ اسے تعجب ہوا اس وقت کون یہاں کمپیوٹر استعمال کر رہا تھا؟

مگر خلافِ توقع یہاں کوئی نہیں تھا۔ رینا کمپیوٹر کے پاس آئی۔ اسکرین آن لیکن خالی تھی۔ اس نے جھک کر دیکھا اور کی بورڈ کا ایک بٹن دبایا تھا کہ اچانک اسکرین پر اسی لڑکی کی تصویر ابھری۔ وہ ہڑبڑا کر پیچھے ہٹی اور گرتے گرتے بچی۔ اس نے دہشت سے اسکرین کی طرف دیکھا لڑکی اسے گھور رہی تھی۔ رینا پلٹ کر بھاگی۔ اسے لگ رہا تھا کہ ابھی کوئی اسے عقب سے پکڑ لے گا۔ اس کا دل طوفانی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے اس کے پاؤں سے ایک جوتی نکل گئی مگر وہ رکی نہیں۔ سیڑھیوں کے پاس آ کر اس نے پلٹ کر دیکھا تو ہال وے خالی تھا۔ اس کے باوجود اس کا خوف کم نہیں ہوا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ واپس جا کر اپنی جوتی اٹھا لاتی۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی، نیچے آتے ہوئے وہ کسی سے ٹکرائی اور اس کے منہ سے چیخ نکلی۔

”آرام سے... آرام سے۔“ اینڈرسن نے کہا۔ ”کیا ہوا، تم اتنی خوفزدہ کیوں ہو؟“

”وہ... وہ اوپر لائبریری میں... وہی لڑکی۔“

”کون لڑکی؟“

”وہی جو مجھے نظر آتی ہے... وہی جو ندی کے پانی میں نظر آئی تھی... وہ لائبریری کے کمپیوٹر اسکرین پر نظر آ رہی ہے...“ رینا بولتے بولتے اچانک رک گئی۔ اینڈرسن اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ”تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے... آؤ میرے ساتھ۔“ وہ اسے ہاتھ پکڑ کر اوپر لانے لگی۔ راستے میں وہ اسے بتا رہی تھی کہ اوپر تمام کمپیوٹرز بند تھے اور صرف ایک کی اسکرین آن تھی۔ پہلے وہ خالی تھی پھر اچانک اس پر اسی لڑکی کی تصویر نمودار ہوئی تھی۔ راستے میں اس نے اپنی جوتی اٹھا کر پہن لی تھی۔ وہ لائبریری میں داخل ہوئے اور رینا اسے کمپیوٹر سیکشن تک لائی مگر جب وہ اندر داخل ہوئے تو وہاں تمام کمپیوٹر آف تھے۔ رینا رک گئی پھر اس نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ آن تھی اور اس پر اسی لڑکی کی تصویر...“

”یہ اب آف ہے۔“ اینڈرسن نے کہا۔ اس نے مانیٹر کا بٹن دبایا مگر وہ آن نہیں ہوا۔ ”یہ پیچھے سے بند ہے۔ اس کے آن ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

رینا روہانسی ہونے لگی۔ ”میں قسم کھا کر کہتی ہوں۔“

”رینا! آؤ نیچے چلو... پارٹی شروع ہو گئی ہے۔“ اینڈرسن نے اس کا بازو پکڑا اور اسے نیچے لے آیا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اسے رینا کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ رینا کو غصہ آنے لگا۔ ہال میں آتے ہی اس نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا اور باہر کی طرف لپکی۔ عقب سے اینڈرسن نے پکارا اور پھر تیزی سے اس کے پیچھے آیا۔ رینا باہر نکل آئی تھی۔ اینڈرسن نے اسے روکا، مگر وہ چلتی رہی۔ اینڈرسن اس سے معذرت کر رہا تھا۔ ”رینا آئی ایم سوری، تمہیں میری بات بری لگی۔“

”مجھے واپس جانا ہے۔“ وہ قطعی لہجے میں بولی تو اینڈرسن چپ ہو گیا پھر اس نے کہا۔

”رکو میں کار لے آؤں پھر تمہیں چھوڑ دوں گا۔“

”میں خود چلی جاؤں گی۔“

”نہیں، میں لے کر آیا تھا میں ہی چھوڑ کر آؤں گا۔“

اینڈرسن کار لے آیا۔ وہ راستے میں خاموش رہا تھا۔ اس نے گھر کے سامنے کار روکی تو رینا نے سر جھکا کر آہستہ سے سوری کہا اور اتر کر اندر چلی گئی۔ ابھی صرف ساڑھے سات بجے تھے۔ شین اور مارش لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے، وہ اسے دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔ شین نے پوچھا۔ ”خیریت ہے تم اتنی جلدی واپس آ گئیں۔“

رینا کچھ کہے بغیر اوپر آ گئی۔ کچھ دیر بعد شین اس

کے پیچھے آئی۔ ''ڈیئر تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' ریتا نے اپنا ہینڈ اتار کر دیوار پر دے مارا۔ ''پلیز، مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

شیین کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر دروازہ بند کر کے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد ریتا کو نیچے سے مارش کی آواز سنائی دی۔ وہ دروازے کے پاس آئی اور ذرا سا کھول کر سنا، مارش کہہ رہا تھا۔ ''تمہیں یقین ہے وہ ٹھیک ہے اسے انجکشن کی ضرورت تو نہیں ہے۔''

''نہیں وہ ٹھیک ہے، میرا خیال ہے وہاں کچھ ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ فرسٹریٹ ہے۔'' شیین نے تردید کی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ اس گولی سے بیزار تھی جو اسے روز کھانی پڑتی تھی۔ انجکشن کے لیے وہ کسی صورت تیار نہ ہوتی۔ وہ انجکشن اس کا ذہن خالی کر دیتا تھا۔ اسکول بند ہو چکے تھے اور اب انہیں پیپر زدینے کے لیے جانا ہوتا مگر اس میں ابھی دو ہفتے باقی تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب سارا دن گھر میں رہنا پڑے گا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پاتی کہ اسے گھر سے زیادہ چڑ ہے یا اسکول سے۔ اگلے دن وہ دیر تک سوتی رہی۔ پھر اٹھ کر نیچے آئی اُس نے فریج سے ڈبل روٹی اور جام نکال کر ناشتا کیا۔ شیین کا آج لانڈری ڈے تھا، وہ نیچے مصروف تھی۔ ریتا باہر نکل آئی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی اور موسم خوشگوار ہو رہا تھا مگر ریتا کا دل بجھا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ لڑکی نظر آئی تو وہ اسے جانے نہیں دے گی، اسے پکڑے گی اور پوچھے گی کہ یہ کیا اسرار ہے؟ اس نے ابھی سوچا ہی تھا کہ لڑکی اسے سڑک کے پار دکھائی دی۔ اس کی نظر پڑتے ہی وہ ایک بڑے تنے والے درخت کے پیچھے ہو گئی۔ ریتا تیزی سے تنے کی طرف بڑھی مگر جب وہ درخت تک پہنچی تو اسے جھٹکا لگا لڑکی وہاں نہیں تھی۔ اس نے آس پاس دیکھا وہ کہیں نہیں تھی۔ تب ریتا نے اس کی ایک جھلک گلی کے کونے پر دیکھی، وہ گلی سے مڑ رہی تھی۔ ریتا اس کے پیچھے لپکی اور ساتھ ہی اس نے اینڈرسن کو کال کی۔ اینڈرسن نے کال ریسیو کی تو ریتا نے جلدی سے اسے لڑکی کے بارے میں بتایا۔

اینڈرسن نے پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

ریتا گلی مڑ چکی تھی اس نے لڑکی کو سڑک پار کر کے ایک دکان کے شیشے کے سامنے کھڑے دیکھا۔ ''وہ نشتر کی لانڈری کے سامنے موجود ہے۔''

''میں آ رہا ہوں، میں پاس ہی ہوں۔''

ریتا آگے بڑھ رہی تھی لیکن جب اس نے سڑک عبور کرنا چاہی ایک بڑا ٹرک اس کے سامنے سے گزرا اور جب وہ گزر گیا تو لڑکی دکان کے سامنے نہیں تھی۔ ریتا نے بے قراری سے دیکھا۔ وہ اسے ایک بلاک آگے ایک لیٹر بکس سے آگے جاتی دکھائی دی۔ اتنی جلدی اس کا اتنی دور پہنچ جانا ناممکن تھا لیکن ریتا یہ سب نہیں سوچ رہی تھی۔ وہ بس اسے اپنی نظر میں رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے اینڈرسن کو ایس ایم ایس کر کے لڑکی کی تازہ لوکیشن بتائی اور اس کی طرف بڑھی۔ اینڈرسن کا جوابی ایس ایم ایس آیا۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ جتنی دیر میں ریتا ایس ایم ایس دیکھتی لڑکی اسے کمرشل اسٹریٹ کے کونے سے مڑتی نظر آئی۔ اب ریتا بھاگنے لگی تھی۔ اسے یہ پروا بھی نہیں تھی کہ آتے جاتے لوگ اسے کن نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ کمرشل اسٹریٹ تک پہنچی تو اس کی سانس پھول رہی تھی۔ اس نے اینڈرسن کو پھر ایس ایم ایس کیا۔ لڑکی اب سڑک پار کر کے پارک کی طرف جا رہی تھی۔ ریتا نے کونے سے سڑک پار کی اور لڑکی والے فٹ پاتھ پر آ گئی۔

''ہیے ریتا۔'' عقب سے اینڈرسن کی آواز آئی۔

ریتا نے مڑ کر دیکھا وہ دوڑا چلا آ رہا تھا۔ ریتا رک گئی مگر اس نے لڑکی پر بھی نظر رکھی تھی۔ اینڈرسن کے پاس آتے ہی اس نے اشارہ کیا۔ ''وہ دیکھو ... وہ رہی ... سفید لبادے والی۔''

مگر اسی لمحے لڑکی پارک میں مڑ گئی۔ اینڈرسن غور سے دیکھ رہا تھا اور اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ لڑکی کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''سوری، مجھے نظر نہیں آ رہی ہے۔''

''وہ پارک میں مڑ گئی ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔'' ریتا نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھی۔ وہ دروازے سے پارک میں داخل ہوئے تو لڑکی دور درختوں میں گم ہو رہی تھی۔ ''وہ رہی ...'' ریتا چلائی۔

مگر اس بار بھی اینڈرسن دیکھنے میں ناکام رہا تھا۔ ریتا درختوں کی طرف بڑھی۔ اینڈرسن اس کے عقب میں تھا، اس نے اپنا موبائل نکالا اور اس پر ایس ایم ایس کرنے لگا۔ درختوں کے پار ایک چھوٹے سے خالی قطعے کے بعد سلور اسٹون کی مارکیٹ تھی۔ ریتا نے دیکھا لڑکی مارکیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ اب دور تک ایسی کوئی آڑ نہیں تھی جس کے پیچھے وہ چھپ سکتی۔ ریتا نے اینڈرسن کو آواز دی۔ ''اب تم دیکھ سکتے ہو۔''

اینڈرسن ایس ایم ایس کر رہا تھا، وہ چونک کر آگے

آیا۔ ''کہاں ہے؟''

''وہ دیکھو براؤن سپر اسٹور کے ساتھ۔''

اینڈرسن نے غور سے دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ ''وہاں کوئی نہیں ہے۔''

''پلیز غور سے دیکھو۔'' رینا نے التجا کی۔ ''مجھے صاف نظر آرہی ہے۔''

اینڈرسن نے کہا۔ ''اوہ اچھا، اب مجھے بھی نظر آرہی ہے۔ مگر یہ کہاں جارہی ہے؟''

''پتا نہیں آؤ اس کے پیچھے چلتے ہیں۔''

اب لڑکی آرام سے چلتی رہی اور کچھ دیر بعد وہ ایک شاپ میں داخل ہوگئی۔ رینا اس کے پیچھے لپکی۔ اس نے دیکھا یہ ایک چھوٹا سا ریستوران تھا۔ وہ رینا کو ٹی وی کے سامنے کھڑی نظر آئی۔ اس پر نیوز چینل لگا ہوا تھا اور ایک قیدی کے بارے میں دکھایا جارہا تھا۔ اینڈرسن اس کے پیچھے آگیا۔ اس نے چونک کر کہا۔ ''یہ تو اسٹیو ہے۔''

''کون اسٹیو؟'' رینا نے اس کی طرف دیکھا۔

''وہی جسے جیسمین کی گمشدگی کا ذمے دار قرار دیا گیا تھا۔''

وہ دوبارہ لڑکی کی طرف متوجہ ہوئی مگر اب وہ اندر نہیں تھی۔ رینا نے بے تابی سے پورے ریستوران پر نظر ڈالی لیکن اب لڑکی کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ اسی لمحے ریستوران کے سامنے مارش کی وین آکر رکی اور اس سے مارش، شین اور ڈاکٹر پیٹرسن اترے۔ وہ سیدھے اس کی طرف آئے۔ مارش نے آتے ہی رینا کو پکڑ لیا۔ وہ خود کو چھڑانے لگی۔ اس نے چلا کر اینڈرسن سے کہا۔ ''انہیں بتاؤ ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔''

''میں نہیں جانتا۔'' اینڈرسن پیچھے ہٹ گیا۔

''تم نے اس لڑکی کو دیکھا تھا؟''

''میں نے کسی لڑکی کو نہیں دیکھا۔''

رینا کا منہ کھلا رہ گیا۔ ''ذلیل... میں نے تم پر اعتماد کیا اور تم...'' اس نے ان تینوں کو دیکھا۔ ''انہیں تم نے بلایا ہے؟''

''تمہیں علاج کی ضرورت ہے۔'' اینڈرسن نے کہا تو ڈاکٹر پیٹرسن انجکشن تولتا ہوا آگے آیا۔

''اینڈی ٹھیک کہہ رہا ہے، تمہیں مکمل علاج کی ضرورت ہے۔'' اس نے کہتے ہوئے سوئی اس کے بازو میں گھونپ دی پھر اسے ہوش نہیں رہا۔

☆☆☆

رینا کرسی پر بیٹھی تھی اور اس کے سامنے ڈاکٹر پیٹرسن کلپ بورڈ اور پین لیے موجود تھا، وہ اس سے سوال کررہا تھا۔ پھر اس نے کلپ بورڈ رکھ دیا اور بولا۔ ''اگر تم مجھ سے تعاون کرو گی اور اپنے علاج پر آمادہ رہو گی تو ایک ہفتے یا پندرہ دن بعد مجھے دیکھو گی۔ دوسری صورت میں تمہیں ہر دوسرے دن مجھے دیکھنا پڑے گا۔''

رینا اسے گھور رہی تھی۔ ''میں سرے سے تمہیں نہیں دیکھنا چاہتی۔''

ڈاکٹر پیٹرسن مسکرایا۔ ''میری بھی یہی خواہش ہے بلکہ اینڈی کی بھی یہی خواہش ہے۔'' وہ کہتے ہوئے سنجیدہ ہو گیا۔ ''اینڈی ذہین لڑکا ہے، ابھی اسے بہت آگے جانا ہے۔ لیکن وہ تمہارے چکر میں پڑ کر برباد ہوجائے گا۔ اس لیے بہتر ہے تم اس سے دور رہو۔''

''یہ بات تم مجھ سے نہیں اینڈی سے کہو۔''

''میں نے اسے بھی سمجھایا ہے۔ ایک بات یاد رکھو... تمہارا ٹریٹ منٹ میرے ہاتھ میں ہے اور میری ایک رپورٹ تمہیں نفسیاتی اسپتال میں داخل کراسکتی ہے۔''

رینا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر باہر نکل آئی جہاں کلینک کے ویٹنگ روم میں شین اس کی منتظر ایک رسالہ دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ کھڑی ہوگئی۔ اس نے راستے میں سیشن کے بارے میں پوچھا تو رینا نے جبراً مسکرا کر کہا۔ ''بہت اچھا رہا، ڈاکٹر پیٹرسن بہت اچھا ڈاکٹر ہے۔''

''امید ہے تمہیں مزید سیشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

رینا کے پیپرز ہونے والے تھے اور مئی میں وہ اٹھارہ سال کی ہوجاتی۔ مگر یہاں یہ چکر شروع ہوگیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ ابھی اسے آزادی نہیں ملے گی۔ جب تک ڈاکٹر پیٹرسن اس کے بارے میں کلیئر رپورٹ نہیں دے گا۔ اس کے بعد سے اینڈرسن سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی، وہ دو بار گھر پر آیا مگر اس نے ملنے سے انکار کردیا۔ وہ کئی دن تک اسے سوری کے ایس ایم ایس کرتا رہا مگر رینا نے کسی کا جواب نہیں دیا۔ اسکول بند ہونے کے بعد وہ فارغ تھی لیکن اسے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اسے اکیلا بھی نہیں چھوڑا جاتا تھا، مارش یا شین میں سے کوئی نہ کوئی گھر میں موجود ہوتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ لان میں نکل سکتی تھی۔ اسے معلوم تھا اگر اس نے مارش کی وارننگ کو نظر انداز کیا تو حالات اس کے لیے مزید خراب ہوجائیں گے اور یہ بھی ممکن ہے ڈاکٹر پیٹرسن اسے نفسیاتی اسپتال بھیجنے میں کامیاب ہوجائے۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد کلیئر ہوجائے اور اس جگہ سے کہیں دور چلی جائے۔ اسے اب اس لڑکی سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی جو صرف اسے

دکھائی دیتی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا اب وہ اسے دکھائی بھی دی تو وہ اسے نظرانداز کر دے گی۔ اس کی وجہ سے وہ اس حال کو پہنچی تھی۔

اس واقعے کے ایک ہفتے بعد مارش اور شین کسی تقریب میں شام کے وقت گھر سے نکلے ..... رینا اسی موقع کا انتظار کر رہی تھی۔ ان کے جاتے ہی وہ جلدی سے مارش کے کمرے میں آئی اور اس کا لیپ ٹاپ آن کیا۔ اس پر پاس ورڈ نہیں تھا ورنہ وہ اسے استعمال نہیں کر پاتی۔ اس نے جیسمین کیس کے بارے میں سرچ کیا اور جب اس کی تصویر سامنے آئی تو وہ ساکت رہ گئی..... وہ وہی لڑکی تھی جسے وہ تباہ حال دیکھتی رہتی تھی۔ اس کی ایک ہائی اسکول کی تصویر تھی۔ اس میں اس کا ہاتھ سامنے تھا۔ رینا کو اس کی بائیں ہاتھ کی چوتھی انگلی میں ویسا ہی چھلا دکھائی دیا جیسا اس کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن یہ چھلا ذرا موٹا تھا۔ اس نے زوم کر کے ہاتھ کو واضح کیا۔ تب اسے پتا چلا چھلا موٹا نہیں تھا بلکہ یہ جڑواں چھلے تھے۔ چھلے کے ساتھ ویسا ہی دوسرا چھلا تھا۔ تصویر میں اسے تین بالز کے اوپر اور نیچے کچھ لکھا نظر آیا۔ اس نے مزید زوم کیا تو چھلے پر لکھا جے واضح ہو گیا۔ مگر یہ اتنا باریک تھا کہ مشکل سے نظر آتا۔ رینا نے چھلا آنکھ کے بالکل پاس لا کر دیکھا اور اسے اس پر دونوں جے نظر آ گئے۔

پھر وہ اس کیس کی ہسٹری دیکھنے لگی۔ اسٹیو بڑھئی تھا اور پولیس کو اس کی ورکشاپ سے جیسمین کے لباس کے ٹکڑے ملے تھے، ساتھ ہی اس کے کچھ اوزاروں پر خون لگا ہوا ملا تھا۔ اس وقت ڈی این اے کا رواج نہیں تھا مگر بلڈ گروپ جیسمین کا ہی تھا۔ پولیس کا کہنا تھا کہ اسٹیو نے لڑکی کو قتل کر کے اس کی لاش جنگل میں کہیں چھپا دی تھی۔ اچانک رینا کے کان کے پاس کسی نے سرگوشی میں کہا۔ ”یہ جھوٹ ہے۔“

وہ بستر سے گرتے گرتے بچی..... اس نے جیسمین کو دروازے کے پاس دیکھا۔ پھر وہ مڑ کر باہر نکل گئی۔ رینا نے عجلت میں لیپ ٹاپ بند کر کے اسے اپنی جگہ رکھا اور باہر نکلی۔ لڑکی اسے کچن کی طرف جاتی دکھائی دی اور جب وہ کچن میں پہنچی تو لڑکی تہ خانے کے دروازے کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ رینا اس کے پیچھے سیڑھیوں تک آئی۔ لڑکی تہ خانے کے درمیان میں کھڑی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر مارش کے کام کی جگہ کی طرف اشارہ کیا اور یوں غائب ہو گئی جیسے زمین میں جذب ہو گئی ہو۔ رینا دم بہ خود سی کھڑی تھی۔ پھر وہ مارش کے کام والی جگہ آئی۔ یہاں ایک بڑی سی ڈرائنگ میز تھی۔ مارش کے کام کے اوزار اور سامان رکھا تھا۔ مارش سول ڈرافٹس مین بھی تھا اور وہ یہ کام یہاں کرتا تھا۔ رینا کچھ دیر چیزوں کو دیکھتی رہی مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ اوزار اٹھا اٹھا کر دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس کے موبائل نے بیل دی۔ وہ تیزی سے مڑ کر سیڑھیوں پر آئی اور ساتھ ہی موبائل نکال لیا۔ اینڈرسن کال کر رہا تھا۔ اس نے سوچا اور کال ریسیو کر لی۔

”ہیلو، کیوں کال کی ہے؟“

”رینا میں تم سے سوری کرنا چاہتا ہوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے، وہ میری بے وقوفی تھی جو میں نے تم پر اعتبار کیا۔“

”رینا! آئی ایم رئیلی سوری۔“ اینڈرسن عاجزی سے بولا تو رینا کا دل نرم پڑنے لگا۔ پھر اسے خیال آیا۔

”تم جانتے ہو میرے ہاتھ میں جو چھلا ہے اور جو مجھے ندی کنارے سے ملا تھا وہ جیسمین کا ہے۔ تم انٹرنیٹ پر اس کی تصاویر نکال کر چیک کر سکتے ہو ایک تصویر میں یہ چھلا بالکل نمایاں ہے۔“

اینڈرسن کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا پھر اس نے کہا۔ ”رینا پلیز تم اس موضوع کو چھوڑ نہیں سکتیں؟“

”تم سب جہنم میں جاؤ۔“ رینا کو پھر غصہ آ گیا۔ اس نے کہتے ہوئے کال کاٹ دی اور اوپر آئی۔ اینڈرسن نے پھر کال کی مگر اس نے ریسیو نہیں کی۔ دس بج رہے تھے شین اور مارش ابھی تک نہیں آئے تھے۔ سونے سے پہلے نہانے کے لیے وہ باتھ روم میں آئی، اس نے ٹب میں پانی ڈالا اور کپڑے اتار کر اس میں بیٹھ گئی۔ وہ جیسمین کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ اسے ہی کیوں دکھائی دے رہی تھی اور آخر وہ اس سے کیا چاہتی تھی؟ اسے مختلف جگہوں پر لے جانا، اشارے کرنا۔ وہ سوچتے ہوئے اپنی انگلی کا چھلا گھما رہی تھی۔ پھر وہ سانس روک کر پانی کے اندر سر لے گئی۔ کچھ دیر اسی طرح لیٹی رہی پھر اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو اسے لگا جیسے کسی نے اس کا سر تھام لیا ہو۔ اس نے تڑپ کر اٹھنا چاہا مگر اس سے اٹھا نہیں گیا، اس کے منہ سے ہوا نکل رہی تھی۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا پھر اچانک بوجھ ہٹ گیا اور وہ اٹھ بیٹھی۔ وہ دیوانہ وار سانس لے رہی تھی۔ اسی لمحے اسے احساس ہوا کہ کوئی باتھ روم کا دروازہ بجا رہا ہے۔ باہر سے شین کی آواز آئی۔

”رینا تم ٹھیک ہو..... پلیز جواب دو۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے سانس لیتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آئی تو شین سامنے کھڑی تھی۔ ”تم

دروازہ کیوں بجا رہی تھیں؟''

''اندر سے عجیب سی آوازیں آرہی تھیں جیسے کوئی پانی میں ڈوب رہا ہو۔'' شین نے کہا۔ ''ہم پریشان ہوگئے تھے۔''

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے' میں ٹھیک ہوں' تم لوگوں کو پانی گرنے کی آواز سے غلط فہمی ہوئی ہو گی۔'' رینا کہتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ مارش وہاں آیا۔ ان دونوں نے دیکھا۔ باتھ روم کے فرش پر پانی گرا ہوا تھا۔ شین نے آہستہ سے کہا۔

''معاملہ گڑ بڑ ہے' مجھے لگ رہا ہے اسے علاج کے لیے اسپتال بھیجنا پڑے گا۔''

''ڈاکٹر پیٹرسن سے بات کرنا ہوگی۔'' مارش نے آہستہ سے کہا۔ ''وہ اس بارے میں کیا کہتا ہے۔''

شین اسے گھورنے لگی۔ ''تم اس کی کچھ زیادہ ہی طرف داری نہیں کرنے لگے ہو؟ اب بھی تم نے ڈاکٹر کو اسے اسپتال بھیجنے سے روکا۔''

''صرف اس لیے کہ کچھ دن کی بات ہے پھر وہ ہائی اسکول پاس کرلے گی اور یہاں سے چلی جائے گی۔''

''تم کیسے جانتے ہو وہ یہاں سے چلی جائے گی؟''

''مجھے یقین ہے۔'' مارش نے کہا اور پیچھے چلا گیا۔ رینا اپنے کمرے کے دروازے سے لگی سن رہی تھی پھر اس نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔ یہ سن کر وہ پریشان ہوگئی تھی کہ ڈاکٹر پیٹرسن اور شین اسے اسپتال میں داخل کرانا چاہتے تھے۔ شین اس کے خلاف ہوگئی تھی' کیا اس نے مارش کی اس میں دلچسپی محسوس کر لی تھی؟ وہ ہراساں ہوگئی' اسے خیال آیا کہ اسے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ اسے نفسیاتی اسپتال سے بہت خوف آتا تھا۔ اسے لگتا تھا ایک بار وہ وہاں داخل ہوگئی تو پھر وہاں سے نہیں نکل پائے گی۔ اب تک وہ مارش کو ناپسند کرتی آئی تھی مگر پہلی بار اس نے اس کے لیے دل میں اچھے جذبات محسوس کیے تھے۔ اب اسے اس لڑکی سے نفرت ہو رہی تھی جو اس کے پیچھے پڑ گئی تھی اور اسے ہی نظر آتی تھی۔ اس نے بے خیالی میں آواز سے کہا۔ ''تم کیا چاہتی ہو؟''

جواب میں اس کی ڈریسنگ ٹیبل کی اوپری دراز کھلی اور پھر بند ہوگئی۔ وہ دہل گئی... اس نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ''پلیز' میرا پیچھا چھوڑ دو ورنہ یہ لوگ مجھے پاگل بنا دیں گے۔''

ایک بار پھر دراز کھلی اور بند ہوگئی۔ وہ ڈرتے ڈرتے دراز تک آئی۔ اس نے اسے کھولا مگر اس میں سوائے اس کے استعمال کی چیزوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ نظر آنے والی لڑکی اگر جیسمین کی روح تھی اور وہ اسے کوئی اشارہ دینا چاہتی تھی تو یہ اشارہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اچانک اسے خیال آیا اور اس نے اپنے سیل فون سے کال کر کے ایمرجنسی سے کاؤنٹی جیل کا نمبر لیا اور وہاں کال کی۔ اس نے آپریٹر سے کہا۔ ''میں قیدی اسٹیو کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔ پلیز' میری کسی آفیسر سے بات کرائی جائے۔''

کچھ دیر بعد جیل کا ڈپٹی آفیسر سام لائن پر تھا۔ اس نے پوچھا' ''تم کون ہو اور کیا چاہتی ہو؟''

رینا نے تعارف کرایا اور اسٹیو کے بارے میں پوچھا' سام نے کہا۔ ''اس کی آخری اپیل بھی مسترد ہوگئی ہے اور کل رات بارہ بجے اسے الیکٹرک چیئر پر بٹھا دیا جائے گا۔''

رینا حیران ہوئی...۔ ''کیا اس کا جرم ثابت ہو گیا ہے اور جیسمین کی لاش مل گئی ہے؟''

''لاش تو نہیں ملی ہے لیکن اس کا جرم ثابت ہو گیا ہے۔'' سام نے جواب دیا۔ رینا نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اسٹیو ہی جیسمین کا قاتل ہے تو اب وہ کیوں بے چین ہے' اسے سکون مل جانا چاہیے تھا مگر وہ اس کے آس پاس منڈلا رہی تھی۔ اس کا انداز پراسرار تھا مگر اس نے رینا کو خوفزدہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ رینا خود کو بے بس محسوس کر کے جھنجلانے لگی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا یہاں سے نکل کر کہیں دور بھاگ جائے۔ مگر یہ مسئلے کا حل نہیں تھا' اگر وہ ایسا کرتی تو پولیس جلد یا بدیر اسے تلاش کر لیتی اور پھر وہ نفسیاتی اسپتال پہنچا دی جاتی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں موجود چھلے کی طرف دیکھا۔ یہ طے تھا کہ یہ جیسمین کا تھا اور اس وقت اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا جب وہ قاتل سے بچنے کے لیے ندی کے کنارے گئی تھی۔ وہ رینا کو مل گیا۔ اچانک اسے خیال آیا کہیں جیسمین اس چھلے کی وجہ سے تو اس کے پیچھے نہیں آئی ہے۔ رینا نے ایک بار پھر چھلا انگلی سے اتارنے کی کوشش کی لیکن اس بار بھی وہ ناکام رہی۔ اسے خیال آیا کہ شین کی مدد حاصل کرے۔ مگر اس وقت وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اگلے دن وہ ناشتے کی میز پر دودھ میں شامل پورج کھا رہی تھی۔ اس کے ذہن سے چھلے کا خیال نکل گیا تھا مگر شین نے خود دیکھ لیا۔ وہ چونکی اور اس نے پوچھا۔ ''یہ تمہارے ہاتھ میں چھلا کہاں سے آیا؟''

رینا بتانے جا رہی تھی کہ اسے کہاں سے ملا مگر اس کی نظر سامنے کرسی پر بیٹھی جیسمین پر گئی۔ وہ نفی میں سر ہلا رہی تھی

جیسے اسے منع کر رہی ہو کہ وہ یہ بات نہ بتائے۔ ریتا نے کہا۔ ”مجھے پڑا ملا تھا۔“

شین نے جھک کر دیکھا۔ ”خوب صورت ہے۔“

ریتا بتانا چاہ رہی تھی کہ یہ اس کی انگلی سے نہیں اتر رہا ہے مگر ایک بار پھر لڑکی نے نفی میں سر ہلایا۔ ریتا کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا چاہ رہی تھی لیکن اس نے اس بار بھی اس کے مشورے پر عمل کیا۔ شین نے کافی نکال کر مارش کے سامنے رکھی اور بولی۔ ”آج مجھے ڈینٹسٹ کے پاس جانا ہے۔“

”کس وقت؟“ مارش نے پوچھا۔

”چھ بجے کا اپائنٹمنٹ ہے۔“

مارش نے سر ہلایا۔ ”میں آجاؤں گا۔“

ریتا یہ سن کر خوش ہوئی تھی کہ اسے شام کو کچھ وقت اکیلے رہنے کا موقع ملے گا۔ اس خوشی میں اس نے شین کی مدد کی اور برتن دھو دیے..... شین بھی خوش ہو گئی تھی۔ شام تک ریتا پڑھتی رہی۔ مارش پانچ بجے آگیا تھا اور وہ دونوں ساڑھے پانچ بجے تک گھر سے نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی ریتا تیزی سے ان کے کمرے میں آئی۔ اس نے ایک بار پھر مارش کا لیپ ٹاپ کھولا اور اس کا ای میل اکاؤنٹ چیک کرنے کی کوشش کی مگر اس کا پاس ورڈ نہیں لگا تھا۔ ریتا کا خیال تھا کہ وہ آن ہوگا مگر مارش اس معاملے میں محتاط تھا۔ اس نے مایوس ہو کر اسے بند کر دیا۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ مارش نے ڈاکٹر پیٹرسن سے اس کے بارے میں ای میل پر کوئی بات تو نہیں کی ہے؟ وہ لیپ ٹاپ اپنی جگہ رکھ رہی تھی کہ شین کی ڈریسنگ کی اوپری دراز کھلی اور بند ہو گئی۔ یہ بالکل اس کی ڈریسنگ کی طرح تھی۔ ریتا سہمے قدموں سے ڈریسنگ تک آئی اس نے اس کی اوپری دراز کھولی۔ اس میں شین کی جیولری رکھی تھی۔ اس نے باکس کھول کر دیکھا اس میں سیٹ تھا۔ پھر اس کی نظر پیچھے رکھے ایک خاصے پرانے باکس پر گئی۔ ریتا نے اسے نکال کر کھولا۔ اس میں مختلف انگوٹھیاں اور رنگز تھیں۔

وہ انہیں دیکھ رہی تھی کہ چونکی۔ اسے ایک رنگ بالکل اپنے چھلے جیسا لگا۔ اس نے اسے نکال کر دیکھا۔ غور سے دیکھنے پر اسے ذرا بھی شک نہیں رہا تھا۔ یہ جیسمین کی انگلی میں جڑواں چھلے کا دوسرا حصہ تھا۔ اس نے اسے بھی پہن کر دیکھا تو یہ بالکل جڑ گیا۔ وہ دنگ رہ گئی... جیسمین کے چھلے کا یہ دوسرا حصہ یہاں کیسے آیا؟ اچانک اسے محسوس ہوا کہ عقب میں کوئی ہے اور پھر اسے شین کی آواز آئی۔ ”تم نے دیکھ لیا... پتا نہیں میں نے اسے کیوں سنبھال کر رکھا تھا۔“

ریتا نے مڑنا چاہا تھا کہ کوئی چیز اس کے سر سے لگی پھر اسے ہوش نہیں رہا... جب اسے ہوش آیا تو وہ تہ خانے میں ایک دیوار سے لگی اس طرح بیٹھی تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باریک ڈوری سے بندھے تھے اور یہی ڈوری دیوار میں کسی چیز سے بندھی تھی۔ وہ اس جگہ سے اٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے منہ پر کپڑے کی پٹی کس کر بندھی تھی۔ شین اس کے سامنے ٹہل رہی تھی اور مارش ایک طرف کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک شین نے مارش کی طرف دیکھا۔ ”یہ تمہارا خیال تھا؟“

”میں نے سوچا نہیں تھا کہ یہ لڑکی اتنی تیز نکلے گی۔“ مارش بولا۔ ”مجھے تو اس پر ترس آگیا تھا۔“

شین اسے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔ ”اب اسے بھی ان دو کے پاس پہنچانا ہوگا۔“

مارش ہچکچایا۔ ”میرا خیال ہے یہ غیر ضروری ہوگا۔“

شین نے اسے گھورا۔ ”تمہارا دماغ درست ہے؟ یہ دیکھ چکی ہے کہ رنگ کا دوسرا حصہ میرے پاس ہے۔“

”اسے کیا پتا...؟“

”اسے سب پتا ہے۔“ شین نے شوہر کی بات کاٹی۔ عام حالات میں نرم مزاج اور تابع دار بیوی بن کر رہنے والی شین اس وقت نہایت حاکمانہ انداز میں بات کر رہی تھی۔ ”اس کا انداز بتا رہا تھا کہ یہ سب سمجھ گئی ہے۔ یقیناً اس نے جیسمین کی گمشدگی کے بارے میں انٹرنیٹ پر دیکھا ہے، اس پر اس رنگ کی تصویریں بھی ہیں۔“

”پتا نہیں تم نے اسے کیوں سنبھال کر رکھا تھا؟“

”میرا خیال تھا کوئی اسے نہیں دیکھ سکے گا۔“

”اس نے دیکھ لیا۔“

شین نے شانے اچکائے۔ ”اب کیا ہو سکتا ہے... بہر حال مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ شکر ہے راستے میں اس کی کال آگئی اور ہم واپس آگئے ورنہ یہ اب تک پولیس کے پاس پہنچ چکی ہوتی۔“

”اپائنٹمنٹ اب ساڑھے سات بجے کا ہے۔“ مارش نے کہا۔ ”بہت وقت ہے۔“

”نہیں، مجھے کچھ سامان بھی لانا ہوگا اس کے لیے۔“ شین نے ریتا کی طرف دیکھا۔ ”میں جاتی ہوں۔ پہلے سامان لوں گی اور پھر ڈاکٹر کے پاس جاؤں گی۔ تم اس کے پاس رکو۔“

”یہ یہاں قید ہے۔“ مارش نے کہا۔

”نہیں، میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی۔“ شین

فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ اسی لمحے اوپر کال بیل بجی۔ وہ فکر مند ہوگئی۔ ''اس وقت کون آگیا؟''

''میں جاکر دیکھتا ہوں۔''

''نہیں، تم اس کے پاس رہو' میں جاکر دیکھتی ہوں۔'' شین نے اوپر جاتے ہوئے کہا۔ وہ سیڑھیوں سے اوپر آئی اور کیٹ آئی سے باہر جھانکا تو اسے اینڈرسن دکھائی دیا۔ اس نے سوچا اور دروازہ کھول دیا۔

''مسز وارڈ۔'' اینڈرسن نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''مجھے رینا سے ملنا ہے۔''

''اوہ رینا۔'' شین نے مسکرا کر کہا۔ ''دراصل اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور میں نے اسے دوا دے کر سلا دیا ہے۔''

''پلیز مسز وارڈ۔'' اینڈرسن نے التجا کی۔ ''یہ بہت ضروری ہے۔''

''سوری بوائے۔'' شین کا لہجہ سرد ہوگیا۔ ''میں اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔ تم جانتے ہو وہ بیمار ہے اور اسے آرام کی کتنی ضرورت ہے۔''

شین نے کہتے ہی دروازہ بند کردیا پھر وہ اندر آئی۔ اس نے پرس اور اپنا کوٹ اٹھایا۔ بارش کے بعد موسم دوبارہ سرد ہوگیا تھا۔ مارش لاؤنج میں آگیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''اینڈرسن کیا کہہ رہا تھا؟''

''تم اوپر آگئے....؟'' شین نے ناگواری سے کہا۔ ''میں نے کہا تھا کہ نیچے اس کے پاس رہو۔''

''وہ قید ہے اور اس کا منہ بھی بند ہے۔'' مارش نے کہا۔ اسی لمحے انہیں رینا کے چلانے کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''مدد.... مدد.... کوئی ہے.... پلیز.... مدد.... مدد۔''

شین نے بدمزگی سے کہا۔ ''یہ اس کا منہ بند کیا ہے تم نے۔''

وہ دونوں نیچے آئے جہاں رینا نے سر دیوار سے رگڑ کر پٹی منہ سے ہٹا دی تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ رونے لگی۔ ''مجھے کیوں باندھا ہے؟''

''آرام سے بے بی' آرام سے۔'' شین نے پیار سے پٹی دوبارہ اس کے منہ پر کردی اور اسے پیچھے سے مزید کس دیا۔ مارش اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ شین نے اس سے کہا۔ ''جب تک میں نہیں آؤں' اس کے پاس رہنا پھر ہم اس کا کام کریں گے۔''

شین کے جانے کے بعد مارش اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ رینا اسے ملتجی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اوپر سے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو مارش نے کہا۔ ''مجھے ایسے مت دیکھو، میں کچھ نہیں کرسکتا۔''

رینا نے سر ہلایا اور آنکھوں سے منہ پر بندھی پٹی کی طرف اشارہ کیا۔ مارش نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے لیکن شرط یہ ہے کہ تم آواز نہیں نکالو گی۔"

رینا نے سر ہلا کر آمادگی ظاہر کی تو اس نے اس کے منہ سے پٹی ہٹا دی۔ منہ آزاد ہوتے ہی رینا نے سرگوشی میں کہا۔ "پلیز... پلیز مجھے جانے دو۔"

مارش نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اس معاملے میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔"

"تب تم کیا کر سکتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔" اس نے سادگی سے کہا۔ "تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ یہاں کی انچارج شین ہے۔"

"جیسمین کو تم نے قتل کیا تھا؟"

"نہیں... شین نے کیا تھا، میں نے صرف اسے پکڑا تھا وہ بھاگ گئی تھی۔"

"کیوں... اس نے کیا کیا تھا؟"

مارش نے گہری سانس لی۔ "اس نے مجھ سے محبت کر لی تھی۔ یہی اس کا قصور بن گیا۔"

رینا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "شین نے اتنی سی بات پر اسے مار دیا؟"

مارش نے گہری سانس لی۔ "تم نہیں جانتیں، وہ جتنی نرم دکھائی دیتی ہے اندر سے اتنی ہی سخت اور سفاک ہے۔ کوئی میرے پاس آئے یہ اسے بالکل برداشت نہیں ہے۔ ربیکا کو بھی اس نے اسی لیے قتل کیا تھا۔"

"ربیکا بھی تم سے محبت کرتی تھی؟"

"نہیں، اس سے میں محبت کرتا تھا لیکن اس وقت میں شین سے نہیں ملا تھا۔ پھر وہ ہمارے درمیان میں آگئی۔ ربیکا کا شین سے جھگڑا ہوا اور شین نے اسے مار دیا۔"

رینا نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی مہربان اور نرم دل نظر آنے والی شین اتنی سفاک بھی ہوگی۔ اس نے ایک نہیں دو قتل کیے تھے اور اب اس کی باری تھی۔ یہ سوچتے ہوئے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ "ربیکا وہی لڑکی ہے جو تین سال پہلے غائب ہوئی تھی؟"

مارش نے سر ہلایا۔ "وہ بھی یہیں ہے۔"

"یہاں کہاں؟"

"اس تہ خانے میں... وہ سل دیکھ رہی ہو نا" مارش نے فرش کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے نیچے خلا ہے... وہ دونوں وہیں ہیں۔"

رینا لرزنے لگی۔ مارش اسے سب بتا رہا تھا، اس کا مطلب تھا اس کی آزادی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ رونے لگی۔ "خدا کے لیے... میں مرنا نہیں چاہتی... مجھے جانے دو۔"

مارش کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آگئی۔ "میں بھی نہیں چاہتا کہ تمہیں کچھ ہو۔ میں تمہیں آزاد کر سکتا ہوں۔"

"تو پلیز کرو... اس سے پہلے وہ آجائے۔"

"وہ ابھی دیر سے آئے گی۔" مارش نے کہا اور آگے آکر رینا کے ہک سے بندھے ہاتھ کھول دیے اب وہ دیوار کی قید سے آزاد ہو گئی تھی لیکن اس کے ہاتھ بہ دستور بندھے ہوئے تھے۔ مارش نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اسے ایک طرف فرش پر بچھی ربر شیٹ تک لایا۔ رینا کو اس پر بٹھا کر اس نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "تم... بہت خوب صورت... ہو۔"

مارش کا لہجہ جذبات سے بوجھل تھا اور رینا اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

☆☆☆

اینڈرسن کو مایوسی ہوئی تھی۔ وہ مکان کے کونے پر کھڑی اپنی سائیکل کی طرف بڑھا... اس نے نیٹ پر جیسمین کی تصاویر دیکھی تھیں اور ان میں ویسی انگوٹھی نمایاں تھی جیسی اس نے رینا کے ہاتھ میں دیکھی تھی اور وہ اس کی تصدیق کے لیے ہی یہاں آیا تھا مگر شین نے اسے رینا سے ملنے نہیں دیا۔ وہ سائیکل اٹھا رہا تھا کہ اسے ہلکی سی آواز آئی۔ اسے لگا جیسے وہ رینا کی آواز ہو۔ وہ ٹھٹک گیا۔ اس نے کان لگا کر سنا۔ ایک بار پھر اسے آواز آئی لیکن یہ بہت مدھم تھی۔ وہ متذبذب ہو گیا۔ کیا اندر رینا کے ساتھ کوئی برا سلوک ہو رہا تھا؟ ان لوگوں نے اس سے کسی قسم کی زیادتی کی تھی؟ وہ سوچ رہا تھا اور پھر دوبارہ دروازے کی طرف بڑھا کہ دروازہ کھلنے لگا اور اینڈرسن تیزی سے واپس آگیا۔ کونے کی آڑ سے اس نے دیکھا۔ شین باہر آئی تھی پھر وہ اپنی چھوٹی فاکس میں بیٹھی اور کہیں روانہ ہو گئی۔ ڈرائیو وے میں فورڈ وین کھڑی تھی اس کا مطلب تھا کہ مارش مکان کے اندر تھا۔

اینڈرسن نے دروازہ چیک کیا وہ اندر سے بند تھا۔ پھر وہ کھڑکیوں کو دیکھنے لگا مگر سب اندر سے بند تھیں۔ اس نے پیچھے ہٹ کر مکان کا جائزہ لیا تو اسے سیڑھیوں والی اوپری فرنچ ونڈو دکھائی دی۔ اس نے برآمدے کے ساتھ اوپر سے آنے والا پائپ تھاما اور کسی قدر مشکل سے ترچھی چھت پر چڑھ گیا۔ پھر وہ سرک کر کھڑکی تک آیا۔ اس نے شیشہ اوپر کیا اور یہ دیکھ کر اسے خوشی ہوئی کہ وہ آسانی سے اوپر ہو سکتا ہے۔ وہ اندر آیا۔ پہلے اس نے اوپری منزل کے کمرے دیکھے مگر

وہاں کوئی نہیں تھا۔ پھر وہ دبے قدموں نیچے آیا۔ یہ حصہ بھی خالی تھا۔ آخر میں وہ کچن کے ساتھ تہ خانے کے دروازے تک آیا اور اسے کھولتے ہی اسے رینا کی آواز سنائی دی۔ وہ دھیمے اور بے بس سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''پلیز نہیں... پلیز۔''

اینڈرسن دبے قدموں نیچے آیا اور اس نے جھانک کر دیکھا تو مارش زمین پر دراز رینا پر چھایا ہوا تھا۔ وہ اسے قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ مچل رہی تھی۔ اینڈرسن کا خون کھول اٹھا۔ وہ اندر آیا اور ایک طرف رکھا بیس بال کا بلا اٹھالیا۔ وہ دبے قدموں ان تک آیا۔ رینا نے اسے دیکھا اور پھر اس کے تاثرات نے مارش کو خبردار کیا جیسے ہی اس نے اینڈرسن کی طرف دیکھا، اس نے بلا گھما کر مارا۔ بلا مارش کے سر پر لگا اور وہ کراہ کر گرا۔ اینڈرسن نے دوسرا وار کیا تو وہ ساکت ہوگیا۔ وہ بلا پھینک کر رینا کے پاس آیا جو اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ اینڈرسن اس کے ہاتھ کھولنے لگا۔ رینا رو رہی تھی اور اس کی شرٹ مارش کی دست درازی سے بے ترتیب ہوگئی تھی۔ ہاتھ آزاد ہوتے ہی اس نے اپنی شرٹ درست کی۔

''تم ٹھیک ہونا؟'' اینڈرسن نے پوچھا۔

''ہاں۔'' رینا نے سر ہلایا اور مارش کی طرف دیکھا۔ ''کیا یہ مر گیا ہے؟''

''نہیں، بے ہوش ہوا ہے۔'' اینڈرسن نے کہا۔

''انہوں نے تمہیں کیوں قید کیا ہے؟''

رینا جلدی سے اسے بتانے لگی۔ اینڈرسن دم بہ خود رہ گیا... ''یہ میاں بیوی... ان لڑکیوں کی گم شدگی کے ذمے دار ہیں؟''

''یہی نہیں انہوں نے انہیں یہیں دفن کیا ہوا ہے۔'' رینا نے اسے فرش دکھایا۔ اینڈرسن خوفزدہ ہوگیا۔

''ہمیں فوراً پولیس کو خبردار کرنا ہوگا۔ آؤ میرے ساتھ۔'' اینڈرسن اسے لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا مگر پھر رک گیا اوپر سے شمین آرہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ ٹھٹک گئے۔ رینا سہم کر اینڈرسن کے پیچھے ہوگئی... خود اینڈرسن کی حالت خراب ہورہی تھی۔ شمین نیچے آتے ہوئے بولی۔

''میں نے تمہیں مکان کے کونے میں دیکھ لیا تھا۔ اس لیے روانہ ہوکر تمہیں موقع دیا کہ تم اندر آسکو۔ دوسری صورت میں یہ مشکل کام مجھے کرنا پڑتا۔'' اس نے رینا کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیسے آزاد ہوئی اور مارش کہاں ہے؟'' اس کی نظر بے سدھ پڑے مارش پر گئی تو اس کے تاثرات بگڑ گئے اور وہ غرائی۔ ''یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔''

''تم دونوں قاتل ہو جلد پولیس تمہیں گرفتار کر لے گی۔'' اینڈرسن نے ہمت کر کے کہا۔ شمین نے آگے آتے ہوئے گھاس اور جھاڑیاں کاٹنے والی درانتی اٹھالی۔

''پولیس کو کون بتائے گا؟''

وہ دونوں ڈر کر پیچھے ہٹے۔ شمین نے اچانک درانتی گھمائی تو بچنے کی کوشش میں اینڈرسن نیچے گرا۔ رینا نے چیخ ماری اور ایک طرف ہوگئی۔ شمین اس کی طرف توجہ دیے بغیر اینڈرسن کی طرف آئی۔ اس نے درانتی تولتے ہوئے کہا۔ ''یہاں تہ خانے کے نیچے موجود خانے میں بہت جگہ ہے تم دونوں بھی آسانی سے آجاؤ گے۔'' اس نے کہتے ہوئے پھر ہاتھ گھمایا اور اینڈرسن بال بال بچا۔ وہ زمین پر پاؤں مارتے ہوئے پیچھے ہو رہا تھا۔ شمین اسے اٹھنے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔ شمین کا تیسرا وار اینڈرسن نے وائپر کے ڈنڈے پر روکا، وہ اس کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ لیکن درانتی سے اس ڈنڈے کے دو ٹکڑے ہوگئے تھے۔ اب اینڈرسن کے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ شمین نے درانتی بلند کی تو اس نے ہاتھ آگے کرتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں مگر درانتی نہیں چلی، اس کی جگہ ٹھک کی آواز آئی۔ اینڈرسن نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ شمین درانتی لیے کھڑی جھول رہی تھی۔ عقب سے رینا نے بیس بال کے بلّے سے دوسرا وار کیا تو وہ کٹے ہوئے تنے کی طرح فرش پر ڈھیر ہوگئی۔ اینڈرسن لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا درانتی کا کنارہ اسے چھو گیا تھا۔ رینا نے پوچھا۔

''تم ٹھیک ہونا؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' اینڈرسن نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''یہاں سے نکلو اور پولیس کو کال کرو۔'' اس نے بے ہوش پڑے شمین اور مارش کی طرف دیکھا۔ ''اس سے پہلے کہ یہ ہوش میں آجائیں۔''

رینا نے اپنی شرٹ کا کنارا پھاڑ کر اینڈرسن کے ہاتھ پر باندھ دیا اور پھر اسے سہارا دے کر سیڑھیوں تک آئی۔ اوپر جانے سے پہلے اس نے پلٹ کر دیکھا تو بے ہوش مارش کے پاس جیسمین کھڑی تھی۔ اس نے رینا کی طرف دیکھا اور پہلی بار مسکرا دی۔ اسے انصاف مل گیا تھا۔ اینڈرسن نے مڑ کر دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا دیکھ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں، آؤ اوپر چلیں۔'' رینا نے سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔

ستاروں پر کمند

قسط: 3

طاہر جاوید مغل

اصول اور انقلاب... ہمیشہ دو مختلف طبقات کے درمیان عمل اور ردِعمل کی ایسی کُھلی جنگ کا نام جو طاقتور اور کمزور کے درمیان ازل سے جاری ہے۔ چابکوں کو در و بام میں قید کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ انہونیاں بھی کبھی کبھی ہو جاتی ہیں... کیونکہ روزن کو کریدنے والے اپنے حوصلے سے اسے دہانہ بنا دیتے ہیں... وہ بھی عجیب دہرے نظام اور مزاج کا شکار تھا جیسے کیکر اور ٹاہلی کے گھنے درختوں کے جُھنڈ میں کئی جگہ اونچے سرکنڈے بھی ہوتے ہیں ایسے ہی وہ بھی سر اٹھا کر جینے کی خواہش میں اپنی جڑیں زمین میں اتارنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ اچانک اس کے بچپن کی دیوار سے ایک کھلونا گر کر ٹوٹ گیا لیکن... اس کی امیدوں کے دیے تیز ہواؤں کے سرکش جھونکے بھی نہ بجھا سکے... دوسری جانب اس کی چاہت تھی جو سود و زیاں کی حد کو پہنچے بیٹھی فاصلوں کو سمٹنے ہی نہیں دے رہی تھی لیکن وہ جو ایک پل کی رفاقت میں قید تھا... ان گنت اندیشوں کے باوجود اسے انہونیوں کی امید تھی اگرچہ برسوں سے اس کے آنگن میں دشت کی ویرانی تھی لیکن دل کی گلیوں میں وہی جل تھل موسم کی کسک لیے وہ ایسی مسافت کے لیے رختِ سفر باندھ بیٹھا تھا جس میں اس کے پاس حوصلوں اور عزمِ مصمم کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ جو خواہش گمانیوں میں آکر ستاروں پر کمند ڈال چکا تھا... جس کے پیر تو زمین میں دھنسے تھے مگر... آنکھیں آسمانوں کی بلندیوں میں گم تھیں ایسے میں لگنے والی ہر ٹھوکر اسے ایک نئے رمز... اور ہر دکھ اسے ایک نئی لذت سے آشنا کر رہے تھے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ستارے فلک سے زمین کی طرف نہیں آتے مگر... کمند تو زمین سے فلک کی جانب جا سکتی ہے۔ لہٰذا دور بہت دور اس کے مقدر کا ستارہ بھی اسے روشنی دکھا رہا تھا۔

رقیبوں کی زہریلی چالوں...... پیار کی مدھر تالوں اور بدلتی رُتوں کا

رومان انگیز طویل سلسلہ

وہ رمزی کے پیچھے پیچھے بائیں جانب بڑھے۔ رمزی نے اپنے زخمی کندھے پر ایک مفلر نما کپڑا کس کر باندھ لیا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ یہ وہی پستول تھا جو ان پاؤنڈوں نے ہمایوں سے برآمد کیا تھا۔ رمزی کے عقب میں ہمایوں تھا۔ ہمایوں کے پیچھے کرسٹل اور پھر خود عادل۔ عادل کے عقب میں موچھیل فولاد جان رائفل بدست آرہا تھا۔ رمزی نے برف پر قدموں کے نشان ڈھونڈنے کی کوشش کی جو جلدی اسے مل گئے۔ یہ بات ثابت ہوگئی کہ جس وقت رمزی خاں نے شرابی داخون کو گولی ماری، کوئی یہاں ان برفیلے تودوں کے پیچھے موجود تھا۔ قدموں کے نشان قدرے نشیب کی طرف جارہے تھے۔ وہ آگے بڑھتے گئے اور پھر پتھروں سے بنے ہوئے ایک کوٹھری نما کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ ایک چھوٹے سے چوبی دروازے کے سوا اس میں آنے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہ جگہ اندر سے بالکل تاریک تھی۔ رمزی خاں نے افراتفری میں اس کوٹھری کے اندر جھانکا اور پھر موچھیل فولاد جان کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ بائیں جانب مڑے اور قدرے تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ دفعتاً رمزی خاں رک گیا۔ اس نے انگلی سے نشیب میں اشارہ کیا۔ سفید برف پر ایک دھبا سا حرکت کرتا نظر آیا۔

اب وہ لوگ بھاگنے والے انداز میں آگے بڑھے۔ کرسٹل ذرا پیچھے رہ گئی تھی۔ عادل نے بھی اپنی رفتار ذرا دھیمی کرلی اور کرسٹل کا ساتھ دیا۔ کچھ دیر بعد دھبا واضح نظر آنے لگا۔ یہ ایک بھاری جسم والا شخص تھا۔ وہ موٹے کپڑوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے سر منڈوا رکھا تھا۔ وہ جیسے گھبراہٹ کے عالم میں بھاگ رہا تھا۔ جب رمزی خاں نے اس کی طرف رائفل سیدھی کرلی تو وہ چونک گیا۔

چند منٹ بعد وہ سب اس شخص کے روبرو تھے۔ وہ واضح طور پر پریشان نظر آتا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس سال سے اوپر رہی ہوگی۔ وہ نشے میں دھت لگتا تھا۔ چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور منڈے ہوئے سر کی رگیں بھی نمایاں دکھائی دیتی تھیں۔ رمزی نے مقامی لب و لہجے میں اس سے کہا۔ ''مالکا! واپس چلیں تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

اس نے پہلے تو حیلے بہانے سے کام لیا پھر جب دیکھا کہ رمزی خاں کا لہجہ اٹل ہے تو چاروناچار چلنے پر راضی ہوگیا۔ وہ سب لوگ واپس اسی کوٹھری نما کمرے میں پہنچ گئے۔ راستے میں رمزی خاں اور وہ مالکا نامی شخص دھیمے لہجے میں کچھ باتیں بھی کرتے رہے۔ عادل کی سماعت سے یہ باتیں دور ہی رہیں۔

یہ کوٹھری قریباً بارہ ضرب بارہ فٹ کی رہی ہوگی۔ فرش پر موٹا اونی نمدہ بچھا ہوا تھا۔ دیواروں پر بھی نمدے دکھائی دے رہے تھے۔ یہاں الکحل کی بوتلیں اور کچھ عجیب وغریب چیزیں دکھائی دے رہی تھیں۔ انسانی کھوپڑی، چند ہڈیاں، ریچھ کی کھال، غالباً شیر کا حنوط شدہ پنجہ، بھینسے کے سینگ اور اسی طرح کی دیگر اشیا۔

جلد ہی عادل کو معلوم ہوگیا کہ اس شخص کا پورا نام مالکا نے زادہ ہے۔ یہ جس کوٹھری میں رہتا تھا، یہ ایک طرح سے پاؤنڈہ بستی کے مضافات میں واقع تھی۔ یعنی وہ اس وقت پاؤنڈہ بستی کے کافی قریب تھے۔ مالکا نے زادہ کو پراسرار علوم کا ماہر سمجھا جاتا تھا اور یہ بستی کے ان سرکردہ لوگوں میں سے تھا جو سیاحوں کے بانگڑی چوٹی کی طرف جانے کے شدید مخالف تھے۔

عادل نے سرگوشی میں ہمایوں سے پوچھا۔ ''یہ کیا باتیں چل رہی ہیں؟''

ہمایوں مقامی زبان کچھ کچھ سمجھتا تھا۔ اس نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ ''یہ بندہ داخون کو رمزی خاں کی گولی سے مرتے دیکھ چکا تھا۔ اگر یہ بستی پہنچ جاتا تو رمزی اور رابے خاں وغیرہ کا سارا پول کھل جاتا تھا۔''

''تو اب کیا ہوگا؟''

''مجھے لگتا ہے کہ رمزی خاں اس بندے کو اپنے ساتھ کیمپ میں لے جانا چاہے گا۔''

اسی دوران میں رمزی خاں اور مالکا کے درمیان ہونے والی گفتگو میں تیزی آگئی۔ مالکا کا چہرہ کچھ اور تمتما گیا۔ سوجی ہوئی آنکھوں سے جیسے چنگاریاں چھوٹنے لگیں۔ پھر وہ عادل اور ہمایوں وغیرہ کی طرف متوجہ ہوکر گرجا۔ ''تم سب کا سب مرے گا۔ برباد ہوجائے گا۔ وہاں اوپر جائے گا تو دفن ہوجائے گا۔ تمہارا لالچ تم کو لے ڈوبے گا۔ ام سچ کہتا ہے، لے ڈوبے گا۔''

''مالکا! خاموش رہو۔'' رمزی خاں نے کہا۔

''ام خاموش نہیں رہے گا۔ اگر ام خاموش رہے گا تو یہ مرے گا اور تم سب بھی مرے گا کیونکہ تم ان کے ساتھ مل گیا ہے۔ وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ جو دہاں تھا، وہ بہت سال پہلے وہاں سے نکال لیا گیا تھا۔ اب وہاں تم کو موت کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔'' مالکا کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابلی پڑ رہی تھیں اور شکل ڈراؤنی ہوئی تھی۔

ہمایوں نے ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہمارے پاس کچھ معلومات ہیں محترم۔ ہم ان کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں اور یہ تصدیق کر کے ہی جائیں گے۔"

"کیا معلومات ہے؟ کیا ہے تمہارے پاس؟ بتاؤ ام کو۔ ام بھی سنے۔" وہ شخص کڑک کر بولا۔

ہمایوں کے بجائے رمزی نے جواب دیا۔ "ان کو زیادہ معلوم نہیں۔ ان کے ساتھ ان کا ملک (لیڈر) ہے۔ وہ جانتا ہے سب کچھ۔"

مالکا پھر گرجا۔ "کون ہے وہ الّو کا پٹھا۔ وہ بہت بڑا گدھا ہے یا پھر بہت بڑا خرانٹ ہے۔ وہ جھوٹ بول رہا ہے، بکواس کر رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ تم لوگوں کے ساتھ کوئی چکر چلا رہا ہو۔ امارا بات کراؤ اس سے۔ ام پوچھتا ہے کہ کون سا خزانہ چھپا رکھا ہے اس کی والدہ نے وہاں پر۔"

"تمیز سے بات کرو مالکا۔" عادل پھنکارا۔ "وہ ہمارے بڑے ہیں۔ ان کے بارے میں بکواس کرو گے تو منہ توڑ دوں گا۔" وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ ہمایوں کے تیور بھی بگڑ گئے تھے۔

رمزی نے جلدی سے کھڑے ہو کر عادل کو روکا اور سمجھا بجھا کر نیچے بٹھایا۔ رائفل بدست موچھیل پہلے سے زیادہ چوکس نظر آنے لگا۔

مالکا بدستور بھڑ بھڑ کر رہا تھا۔ کرخت لہجے میں بولا۔ "اگر امارا کہا غلط نکلے تو ام اپنے ہاتھوں سے اپنا گردن کاٹ کر تمہارے پاؤں میں ڈال دے گا۔ تم کو جو کوئی بھی، وہاں سونے چاندی اور زیوروں کے بارے میں بتا رہا ہے، غلط بتا رہا ہے۔ وہاں اب کچھ نہیں، تہ خانہ خالی پڑا ہے...... تم لوگوں کے دماغوں کی طرح اور...... اور۔" وہ کہتے کہتے چپ ہوگیا۔

"اور کیا؟" عادل نے پوچھا۔

مالکا نے اپنی نشیلی آنکھوں کو کچھ اور بھی نشیلا بنالیا۔ سامنے رکھی ہوئی انسانی کھوپڑی پر نگاہیں جمائیں اور عاملوں کے انداز میں سرسراتے لہجے میں بولا۔ "اگر تم لوگ وہاں جائے گا تو موت کو اپنا انتظار کرتا ہوا پائے گا۔ ہاں، وہ ہے وہاں۔ اپنے پر پھیلائے بیٹھا ہوا ہے وہ موت۔ تم کو دیکھے گا تو ایک دم جھپٹے گا تم پر۔ تم اس سے بھاگ نہیں سکے گا۔ وہ بہت بھوکا ہے۔ بڑی تیزی سے نیچے آئے گا اور دبوچ لے گا۔ تم سب کو برف کی قبروں میں دفن ہونا پڑے گا۔ ایک بھی نہیں بچے گا۔"

وہ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور جیسے کسی مراقبے میں چلا گیا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں کوٹھری کا منظر آسیب زدہ نظر آنے لگا تھا۔

عادل، ہمایوں اور کرسٹل پر مالکا کی باتوں کا ذرہ بھر اثر نہیں ہوا لیکن رمزی خاں اور موچھیل فولاد جان کچھ پریشان نظر آنے لگے تھے۔ بہر حال یہ بات تو وہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ اب مالکا کو اس جگہ چھوڑ کر ہرگز نہیں جایا جاسکتا۔ وہ دوا خون کے قتل کا چشم دید گواہ بن چکا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ واپس اپنے کیمپ کی طرف روانہ ہوگئے۔ بہر حال اب مالکا ان کے ساتھ تھا۔ وہ آسانی سے آنے پر تیار نہیں ہوا تھا۔ رمزی خاں اسے بڑی دیر سمجھانے بجھانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ آخر عادل نے راست قدم اٹھایا۔ وہ خاموشی کے ساتھ مالکا کے عقب میں پہنچا تھا اور کلہاڑی کے پچھلے حصے سے ایک زوردار ضرب مالکا کے سر پر لگائی تھی۔ وہ ادھ موا ہو کر گر پڑا تھا۔ عادل کی اس کارروائی پر رمزی خاں اور موچھیل فولاد کی آنکھوں میں خوف نمودار ہوا تھا۔ بہر طور ان سب نے مل کر مالکا کی مشکیں کس دی تھیں اور ایک کپڑا بھی اس کے منہ میں ٹھونس دیا تھا تاکہ وہ آواز نہ نکال سکے۔

وہ کافی وزنی تھا۔ اب ان سب کو باری باری اسے کندھے پر لادنا پڑ رہا تھا۔ رمزی خاں چونکہ زخمی تھا اس لیے اسے اس مشقت سے چھوٹ دے دی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ کرسٹل بھی اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کرسکتی تھی۔ زیادہ بوجھ ہمایوں اور عادل پر ہی رہا۔ ایک بار جب موچھیل فولاد جان نے مالکا کو کندھے پر لاد رکھا تھا، رمزی کو یکایک اس کلہاڑی کا خیال آگیا جس کی مدد سے عادل نے مالکا کے سر پر چوٹ لگائی تھی۔ چھوٹے دستے والی یہ کلہاڑی ابھی تک عادل کے پاس ہی تھی۔ اس نے اپنی پتلون کی بیلٹ میں اڑسی ہوئی تھی۔ کلہاڑی کا پھل اس کی بغل کے نیچے تھا۔ اوپر موٹی جیکٹ تھی۔ رمزی خاں نے عادل سے کہا۔ "وہ کلہاڑی ام کو دے دو۔"

"اتنا بھی اعتبار نہیں کر پا رہے ہو؟" ہمایوں نے پوچھا۔

"ام دو دفعہ دھوکا کھا چکا ہے۔ تیسری بار نہیں کھائے گا۔ ویسے بھی یہ خاناں (رابے خاں) کا آرڈر ہے کہ تمہارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہونا چاہیے۔"

"لیکن یہ کوئی ہتھیار تو نہیں ہے۔" عادل نے کہا۔

"ہتھیار نہیں ہے تو پھر دے کیوں نہیں رہے؟ ادھر لاؤ۔" رمزی کا لہجہ اچانک سخت ہوگیا۔ اس نے رائفل کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

عادل نے کمر سے کلہاڑی نکال کر رمزی کی طرف

برف پر پھینک دی جسے اس نے اٹھا کر اپنی کمر کے پٹکے میں اڑس لیا۔ زخمی ہونے کے باوجود رمزی خاں کے طمطراق میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ عادل، ہمایوں اور کرسٹل کی طرف سے پوری طرح چوکس تھا۔ اس کے کندھے سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ کرسٹل کے میڈیکل پاؤچ میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود رہتا تھا۔ خوش قسمتی سے، داخون کے ساتھ زبردست کھینچا تانی کے باوجود یہ میڈیکل پاؤچ اب بھی کرسٹل کی بیلٹ کے ساتھ اٹیچ تھا۔ اس نے رمزی کی بینڈیج تو کردی تھی مگر ابھی اسے مزید ٹریٹمنٹ کی ضرورت تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اسی جگہ پر واپس پہنچ گئے جہاں کرسٹل والا واقعہ ہوا تھا۔ بدمست داخون ''فرنگن کرسٹل'' سے شاید انگریز دورِ حکومت کا کوئی بدلہ چکانا چاہتا تھا۔ اب وہ شام کی نیم تیرگی میں برف پر بے سدھ پڑا تھا۔ اس کا مردہ جسم تیزی سے اکڑنا شروع ہوگیا تھا۔ رمزی خاں کے حکم پر عادل اور ہمایوں نے آئس ایکس کے ساتھ برف میں گڑھا کھودنا شروع کیا۔ گاہے بگاہے فولاد جان نے بھی اس میں مدد کی۔ آدھ پون گھنٹے میں قریباً چار فٹ گہرا گڑھا تیار ہوگیا۔ اسی دوران میں مالکا نے بھی کسمسانا شروع کردیا تھا۔ وہ ہوش میں آرہا تھا۔ رمزی نے کرسٹل سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''او چھوکری! اس کو کوئی ٹیکا میکا لگادو۔''

کرسٹل کے پاس انجکشن کی صورت میں ٹرنکولائزر موجود تھا۔ وہ اس نے مالکا کے چربی دار بازو میں ٹھونک دیا۔ وہ چند منٹ میں پُرسکون ہوگیا۔ اس دوران میں فولاد جان نے داخون کے لباس کی مکمل تلاشی لے کر کچھ اشیا نکال لیں۔ پھر عادل اور ہمایوں نے اس کی لاش گھسیٹ کر گڑھے میں ڈال دی۔ کرسٹل نے اس سارے منظر کی طرف سے پشت کررکھی تھی۔

عادل نے رمزی خاں کو مخاطب کرکے کہا۔ ''میرا تو مشورہ ہے، اس موٹے عاش کو بھی لٹا دو، اس شرابی کے ساتھ۔ قصہ پاک ہوگا۔''

رمزی نے عادل کو بری طرح گھورا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ جو تم کرچکے ہو، یہی ضرورت سے زیادہ ہے۔ اب چپ رہو۔

دراصل اس موٹے تشی نے سرمد صاحب سمیت بیرونی سیاحوں کے بارے میں جس طرح کی بے ہودہ زبان استعمال کی تھی، اس نے عادل کو دکھ پہنچایا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ داخون کو اس سنسان ڈھلوان پر ''سپردِ برف'' کرکے آگے روانہ ہورہے تھے۔

وہ جب کیمپ میں واپس پہنچے تو رات کے دس بج چکے تھے۔ سردی میں بے حد اضافہ ہوگیا تھا۔ ہوا برفانی تودوں کی بھول بھلیوں میں سے گزرتی تھی تو مزید یخ بستہ ہوجاتی تھی۔ ابھی وہ کیمپ سے ایک دو فرلانگ دور ہی تھے کہ انہیں ٹارچوں کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ یہ رابے خاں اور اس کے ساتھی ہی تھے جو انہیں ڈھونڈنے کے لیے نکلے تھے۔

رمزی کو دیکھتے ہی رابے خاں برس پڑا۔ مقامی لب ولہجے میں بولا۔ ''کہاں مرگئے تھے تم سب؟''

پھر اس کی ٹارچ کی روشنی، رمزی کے خون آلود کندھے پر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی اسے عقب میں ہمایوں دکھائی دیا جس نے عامل مالکا نے زادہ کا بھاری جسم بمشکل اپنے کندھے پر سنبھالا ہوا تھا۔ رابے خاں بری طرح چونک گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی زبردست گڑبڑ ہوگئی ہے۔

رمزی اور رابے خاں میں چند جملوں کا تبادلہ ہوا۔ پھر دراز قد رابے خاں مقامی لہجے میں بولا۔ ''تمہیں داخون کا کچھ پتا ہے؟ وہ بھی صبح سے نہیں مل رہا۔''

رمزی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اسے گولی لگ گئی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' رابے خاں مزید چونک گیا۔

رمزی نے ایک گہری سانس لی اور پھر وہیں کھڑے کھڑے ساری روداد الف سے ے تک رابے خاں کے گوش گزار کردی۔ اس روداد کا بس کوئی کوئی فقرہ ہی عادل کی سمجھ میں آرہا تھا۔ رابے خاں کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ ساری حقیقت جاننے کے بعد اسے یہ بھی پتا چل گیا کہ مالکا نے زادہ کو بے ہوشی کی حالت میں کندھے پر لاد کر یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ وہ بے طرح پیچ و تاب کھانے لگا۔ پھر وہ کرسٹل کی طرف متوجہ ہوا اور دانت پیس کر بولا۔ ''تم گوری چمڑی والوں کا ہر کام الٹا ہوتا ہے۔ تم کو کیا ضرورت پڑا تھا، وہاں اکیلے رکنے کا اور تصویریں کھینچنے کا۔ حرامزادی...... تو نے ام سب کو ایک بڑا مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ خانہ خراب کیا ہے ام سب کا۔'' ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ کرسٹل کو مارنے کے لیے جھپٹ پڑے گا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور چند گہری سانسیں لے کر نیم بے ہوش مالکا کو دیکھنے میں مصروف ہوگیا۔ مالکا کو ہمایوں نے اب برف پر لٹا دیا تھا۔ ٹارچ کے روشن دائرے میں مالکا کا منڈا ہوا سر شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ دیکھنے میں اس کے خدوخال کچھ کچھ نیپالیوں اور چینیوں سے ملتے تھے۔

اب مزید پاؤندے بھی موقع پر جمع ہوگئے تھے۔ وہ

لوگ نیم بے ہوش مالکا نے زادہ کو اٹھا کر کیمپ میں لے آئے۔ وہ سب کے سب کچھ ہراساں بھی دکھائی دے رہے تھے، جیسے انہیں ڈر ہو کہ ابھی مالکانے زادہ اٹھے گا اور ان سب کو اپنے کسی آسیبی عمل میں جکڑ لے گا۔ توہمات اور شکوک کی ایسی پرچھائیاں عادل نے اپنے دور دراز گاؤں لالی میں بھی بہت دیکھی تھیں لیکن یہاں پر پرچھائیاں کچھ زیادہ ہی گہری اور طویل نظر آتی تھیں۔ پاؤنڈوں نے مالکانے زادہ کو بڑے احترام سے، رابے خاں والے خیمے میں رکھا۔ اس کے جسم کو گرم لحافوں میں لپیٹا گیا، تاہم ہاتھ پاؤں بندھے ہی رہنے دیے گئے۔

عادل اور ہمایوں نے اپنے خیمے میں سرمد صاحب کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے بھی کرسٹل کو اس بات پر سرزنش کی کہ وہ فوٹوگرافی کے چکر میں اکیلی پیچھے رہ گئی۔ ہمایوں نے سرمد صاحب کو مالکا کے اس واویلے کے بارے میں بھی بتایا جو اس نے اپنی کوٹھری میں کیا تھا۔ اس نے سینے پر ہاتھ مار مار کر دعویٰ کیا تھا، اوپر بانگڑی کی چوٹی پر اب کچھ نہیں ہے...... اور ان سب کو کسی آسمانی آفت سے بھی ڈرایا تھا۔

سرمد صاحب نے ان باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ تاہم انہوں نے بتایا کہ اب انہیں زیادہ تیزی سے عمل کرنا ہوگا۔ انہوں نے کہا۔ ''یہ بات تو آپ سب کی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ یہ لوگ مالکا کو اٹھا کر یہاں کیوں لائے ہیں۔ رمزی خاں سے قتل ہوگیا ہے اور مالکا اس کا چشم دید گواہ ہے۔ رابے خاں فی الوقت تو ہرگز نہیں چاہے گا کہ اس واقعے کی خبر بستی تک پہنچے۔ دوسری طرف وہ مالکا کو زیادہ دیر یہاں اپنے پاس بھی نہیں رکھ سکتے۔ وہ چاہیں گے کہ اب ہم نے جو بھی کرنا ہے جلد سے جلد کریں۔''

کرسٹل بہت بجھی بجھی ہوئی تھی۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا، دل دہلا دینے والا تھا۔ اگر عادل وغیرہ بروقت نہ پہنچتے تو عین ممکن تھا کہ اس کی جان ہی چلی جاتی۔ عادل بھی خود کو دل گرفتہ محسوس کر رہا تھا۔ داخون کو گولی لگنے اور برف پر گر کر اس کے مرنے کا منظر بار بار اس کی نگاہ میں آتا تھا۔ بے شک لالی گاؤں میں لڑائی جھگڑے کے واقعات ہوتے تھے۔ ایک دو بار مقامی زمینداروں میں زبردست فائرنگ بھی ہوئی تھی جس میں دو چار لاشیں بھی گری تھیں مگر اس طرح اپنی آنکھوں کے سامنے کسی کو مرتا عادل نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

کچھ دیر بعد رابے خاں نے سرمد صاحب کو اپنے خیمے میں بلا لیا۔ وہ یقیناً ان سے یہی کہنا چاہتا تھا کہ اب جو کرنا ہے جلدی کرنا ہے۔

وہ سب بہت پژمردہ تھے۔ اگلے روز صبح سویرے سرمد صاحب نے انہیں ایک لیکچر دیا اور روزمرہ مصروفیت کے لیے تیار کیا۔ انہوں نے کہا کہ صبح سویرے اپنی مرضی اور منشا کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے اور چل پڑنے میں ہی بندے کی کامیابی چھپی ہے۔ جب کسی پریشانی یا دکھ نے جسم کو ناتواں کر رکھا ہو تو روزمرہ کے معمولات کو بحال رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ مگر اس مشکل پر قابو پانے کا نام ہی ہمت اور دلیری ہے۔

اگلے تین چار روز ان سب کے لیے سخت ترین تھے۔ خاص طور سے عادل کے لیے۔ سرمد صاحب اس پر خصوصی توجہ دے رہے تھے۔ وہ اسے روزانہ چودہ چودہ گھنٹے مشق کرا رہے تھے۔ یہ مشق ایک ایسی چٹان پر تھی جو عمودی ہی نہیں تھی، اس سے بھی زیادہ زاویہ بناتی تھی۔ وہ تھک کر چور ہوجاتا۔ ہاتھ پاؤں شل ہوجاتے۔ اسے لگتا کہ اس کی برداشت کی حد پہنچ گئی ہے۔ سرمد صاحب بھی جان جاتے کہ یہ اس کی برداشت کی حد ہے مگر وہ اس حد کو کچھ اور وسیع کرنے کی کوشش کرتے۔ اسے پھر سے اٹھاتے اور خطرناک چڑھائی پر لگا دیتے...... ایسے میں وہ عادل کو... بے رحم محسوس ہونے لگتے لیکن رات کو جب عادل ٹھنڈے دل سے سوچتا تو اسے لگتا کہ یہ سب اس کی بھلائی کے لیے تھا اور اس سے بھلائی ہوئی بھی ہے۔ اس کی برداشت کی آخری حد کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ ایسے میں سرمد صاحب کا کہا ہوا فقرہ اس کے کانوں میں گونجنے لگتا۔ وہ کہتے تھے۔ ''کسی بھی ہنر میں کمال حاصل کرنے کی اصل کوشش تب شروع ہوتی ہے جب ہم سمجھتے ہیں کہ اب ہم میں مزید مشق کرنے کی ہمت نہیں رہی۔ جب ہم اپنی ہمت کی حد کو ایک دیوانی کوشش کے ساتھ توڑ دیتے ہیں تو بے مثال کامرانیاں سامنے کھڑی نظر آتی ہیں۔''

عمودی اور مشکل ترین چٹانوں پر چڑھنے میں عادل نے جس تیزی سے مہارت حاصل کی تھی، اس نے سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ یہ اس کی فطری صلاحیت تھی جسے سرمد صاحب کی تربیت اور کوچنگ نے چمکا کر بے مثال کر دیا تھا اور اب وہ اپنی اصل چڑھائی کے لیے تقریباً تیار تھے۔ کئی ہفتے پہلے اس سفر کا آغاز کرتے وقت سرمد صاحب نے جو باتیں کی تھیں، وہ ابھی تک عادل کے حافظے پر نقش تھیں۔ سرمد صاحب کو ننانوے فیصد یقین تھا کہ وہ بانگڑی کی

چوٹی پر اپنا مقصد حاصل کرلیں گے۔ ان زیورات اور برتنوں تک پہنچ جائیں گے جو تقریباً ساڑھے تین سو برس سے کسی تاریک تہ خانے میں موجود تھے...... اور ابھی تک انسانی نظر ان تک نہیں پہنچ پائی تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ پاؤندہ بستی کے سرکردہ لوگوں نے چوٹی پر پہنچ کر اس کھنڈر کو وقتاً فوقتاً کھنگالا ہو لیکن سرمد صاحب کو یقین تھا کہ وہ ان زیورات کے خاص مقام تک نہیں پہنچ سکے۔ یہ پاؤندے اب اسے ایک کارِلاحاصل سمجھتے تھے اور ان لوگوں سے بھی چڑ کھاتے تھے جو صرف چوٹی کو سر کرنے کی نیت سے اس جانب آتے تھے۔ انہوں نے کہانیاں گھڑی ہوئی تھیں کہ چوٹی پر جانا اپنے لیے کسی بڑی مصیبت کو دعوت دینا ہے۔ چند روز پہلے مالکانے زادہ نے بھی اسی طرح کا واویلا کیا تھا۔ اس نے حتی الامکان خوفناک شکلیں بنائی تھیں اور انہیں کسی قدرتی آفت سے ڈرانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ مالکانے زادہ ابھی تک راب خاں کی تحویل میں تھا۔ اس کی ایک ٹانگ کو زنجیر سے اس طرح باندھ دیا گیا تھا کہ وہ خیمے سے باہر نہ نکل سکے۔ اسے باندھنا ان لوگوں کی مجبوری تھی اور اس پر وہ شرمندہ تھے۔ کفارے کے طور پر مالکانے زادہ کی بہت خاطر مدارت کی جارہی تھی۔ اس کے آرام و آسائش کا بے حد خیال رکھا جارہا تھا۔ عادل نے کئی دفعہ دیکھا تھا کہ کوئی نہ کوئی پاؤندہ خیمے میں مالکا کی مٹھی چاپی میں مصروف رہتا تھا۔ کسی وقت مالکا غصے میں گالیاں بھی بکنے لگتا تھا...... جسے خندہ پیشانی سے سن لیا جاتا تھا۔ بلکہ اس کے تھپڑ وغیرہ بھی برداشت کرلیے جاتے تھے۔ وہ نشہ بھی کرتا تھا۔ اس کی شراب کی ضرورت پوری کرنے کے لیے راب خاں نے اپنے سارے ساتھیوں پر پینے کی پابندی عائد کردی تھی۔ اس کا ایک فائدہ تو بہرحال ہوا اور وہ یہ کہ جو پاؤندے پینے کے بعد سرخ انگارہ آنکھوں سے کرسٹل کو گھورتے رہتے تھے، ان کی نظر بازی میں نمایاں کمی واقع ہوگئی۔

عادل واضح طور پر محسوس کررہا تھا کہ سرمد صاحب متذبذب ہیں۔ کسی وقت تو اسے لگتا تھا کہ وہ اب اوپر جانا چاہ ہی نہیں رہے۔ لیکن اس لیے جارہے ہیں کہ انہیں جانا پڑ رہا ہے۔ راب خاں اور اس کے ساتھیوں کے پاس ہتھیار ہیں اور ان ہتھیاروں کی وجہ سے سرمد صاحب مجبور ہیں کہ اوپر جائیں۔ شاید انہیں پورا یقین نہیں تھا کہ پاؤندے اپنے وعدے کا پاس کریں گے۔ یعنی زیورات میں سے، طے شدہ شرائط کے مطابق انہیں حصہ دیں گے۔ یا شاید...... وہ کسی اور خطرے کی بو سونگھ رہے تھے۔ عادل نے اب تک ان کی غیرمعمولی چھٹی حس کے کئی حیران کن ثبوت ملاحظہ کیے تھے۔ وہ جیسے آنے والی آفات کو اپنے اندر کی آنکھ سے دیکھ لیتے تھے اور بے قرار ہوجاتے تھے۔

جس رات کی صبح انہیں روانہ ہونا تھا، اس رات کے پہلے پہر راب خاں اور سرمد صاحب کے درمیان تھوڑا سا تلخ مکالمہ بھی ہوا۔ سرمد صاحب نے کہا۔ ”ابھی میرا کندھا پوری طرح ٹھیک نہیں۔ اگر میری رائے لیتے ہو راب تو ہمیں تین چار دن مزید انتظار کرلینا چاہیے۔“

راب خاں تنک کر بولا۔ ”دیکھو سرمد صیب! ام کو تمہارا نیت میں گڑبڑی لگتا ہے۔ آخر تم اس کام میں دیری کیوں چاہتا ہے۔ تم اچھی طرح جانتا ہے، ام مالکا کو زیادہ دیر اپنے پاس چھپا کر نہیں رکھ سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ ایک آدھ دن میں اس کا تلاش شروع ہوجائے اور تلاش کرنے والا لوگ یہاں تک بھی پہنچ جائے۔“

سرمد صاحب بولے۔ ”تم خود ہی تو کہتے ہو کہ مالکا کبھی کبھی ہفتوں تک اپنی کوٹھری سے غائب رہتا ہے۔ اب بھی یہی سمجھا جائے گا کہ وہ کسی کو بتائے بغیر کہیں نچلے علاقے کی طرف نکل گیا ہے۔“

”پھر بھی ام اس طرح کا کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ ام کو پورا یقین ہے کہ تمہارا کندھا اب اوپر چڑھنے کے لائق ہے۔ اگر تم کئی دن پہلے کچے زخم کے ساتھ اوپر چڑھ گیا تھا تو اب کیوں نہیں چڑھ سکتا؟“

کرسٹل بولی۔ ”آئی تھنک۔ اسی وجہ سے ان کا زخم ابھی تک کاچا (کچا) ہے۔“

راب پھنکارا۔ ”تم اپنا چونچ بند ہی رکھو ولایتی چڑیا۔ ورنہ ام تمہارے سارے پر کھینچ کر تمہیں سیخ پر چڑھا دے گا۔“

کرسٹل نے کچھ بولنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر سرمد صاحب کے تاثرات دیکھ کر خاموش رہی۔

راب فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ”سب لوگ تیاری مکمل کرلے۔ پروگرام کے مطابق ام لوگ صبح دس بجے تک یہاں سے نکل جائے گا۔“

اس کے بعد وہ اٹھا اور اپنی لمبی لمبی ٹانگیں چلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ پروگرام کے مطابق اب رمزی کو دیگر ساتھیوں کے ہمراہ یہاں مالکا کے پاس رہنا تھا۔ راب خاں، موچھیل فولاد جان اور ان کے ایک تیسرے ساتھی خناب گل کو ان کے ساتھ ہانگڑی کی فلک بوس چوٹی کی طرف روانہ ہونا تھا۔ عادل کی معلومات کے مطابق فولاد جان اور خناب گل اچھے

کوہ پیما تھے۔ پاؤندہ ہونے کے باوجود وہ انگلش کے ٹوٹے پھوٹے لفظ بھی بول لیتے تھے۔ رابے خاں چڑھائی کی جدید تکنیک میں زیادہ ماہر تو نہیں تھا لیکن وہ بہ آسانی ان کا ساتھ دے سکتا تھا۔ وہ رات کو دیر تک ضروری تیاری میں مصروف رہے اور آخری پہر تازہ دم ہونے کے لیے سو گئے۔

وہ بڑی صاف شفاف صبح تھی۔ دنیا کی یہ عظیم الشان چوٹیاں جن میں سے کوئی بھی 8000 میٹر سے کم اونچی نہیں تھی، نیلے آسمان کے پیش منظر میں دمک رہی تھیں...... حسین دوشیزاؤں کی طرح یہ سینہ تانے کھڑی تھیں اور جیسے دعوت دے رہی تھیں کہ آؤ ہمیں فتح کرو۔ اگر بازوؤں میں طاقت ہے تو ہمیں تسخیر کر کے دکھاؤ۔ ہاں یہ خوب صورت دوشیزاؤں کی طرح تھیں لیکن جس طرح کبھی کبھی حسین عورت زہریلی ناگن کا روپ دھار لیتی ہے، یہ چوٹیاں بھی اپنے عاشقوں سے ایک دم آنکھیں پھیر لیتی تھیں۔ ان کے موسم اتنی تیزی سے بدلتے تھے کہ عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ وہ گھیر کے بے بس کر دیتی تھیں اور پھر اپنی مہلک بلندیوں میں اپنے چاہنے والوں کو یوں مارتی تھیں کہ ان کا نام و نشان بھی نہیں ملتا تھا اور آج ایک ایسی ہی حسین چوٹی ان کے سامنے کھڑی تھی۔ انہیں دعوت دے رہی تھی اپنی ہمت آزمانے کی۔

وہ اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ اس ساز و سامان میں چار خیمے بھی تھے۔ انہوں نے خود کو ایک دوسرے کے ساتھ رسّے کے ذریعے منسلک کیا اور آگے بڑھنے لگے۔ رابے خاں سب سے آگے تھا کیونکہ وہ پہاڑ تک جانے والے راستوں کا بھیدی تھا۔ فولاد جان سب سے پیچھے تھا۔ خم دار میگزین والی خوفناک آٹھ ایم ایم گن پوری طرح لوڈ تھی اور اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کی عقابی نظریں ہر وقت چاروں اطراف گردش کرتی رہتی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی بھی خطرے کے وقت بلا جھجک فائر کھول سکتا ہے۔ ان کا تیسرا ساتھی بھی مشین پسٹل سے مسلح تھا اور کافی ہتھیار شناس اور نڈر شخص نظر آتا تھا۔ ان دونوں کی موجودگی میں کسی طرح کا رسک لینا خود کو شدید خطرے کے حوالے کرنا ہی تھا۔ چند روز پیشتر جب ہمایوں مشکوک انداز میں رابے خاں کے خیمے کے قریب پایا گیا تھا، رابے نے بے دریغ اس کے پاؤں کی طرف تین چار فائر داغ دیے تھے اور علی الاعلان کہا تھا کہ اگلی دفعہ وہ اس طرح اپنا ایمونیشن ضائع نہیں کرے گا بلکہ سیدھی سر میں گولی مارے گا۔

وہ سہ پہر دو بجے تک مسلسل چڑھتے رہے۔ ابھی وہ رسّوں کی مدد کے بغیر ہی چڑھ رہے تھے۔ ایک دو جگہ چڑھائی مشکل ہوئی تو ہمایوں آگے چلا گیا۔ اسی دوران میں اس کا ایک پاؤں برف کے اندر چلا گیا اور وہ ایک عمیق برفانی دراڑ میں گرتے گرتے بچا۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ رسّوں سے بندھے ہوئے تھے اس لیے باقیوں نے اسے مزید نیچے پھسلنے سے بچا لیا۔ برفانی دراڑ میں گرنے کا خوف، کوہ پیما کے بدترین اندیشوں میں سے ایک ہوتا ہے۔ ایسی برفانی دراڑیں اوپر سے برف سے ڈھکی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان میں گرنے والا زندہ درگور ہو جاتا ہے اور یہ برف کی ''گور'' ہوتی ہے۔ یہ عموماً نیچے سے چوڑی اور اوپر سے تنگ ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کی دیواروں پر چڑھ کر باہر نکلنا بھی ناممکن ہوتا ہے۔

دوپہر کو کچھ دیر آرام کرنے کے بعد انہوں نے چڑھائی دوبارہ شروع کی۔ اب خطرناک مرحلے شروع ہو رہے تھے۔ انہیں برف میں میخیں ٹھونک ٹھونک کر رسّوں کے ذریعے اوپر چڑھنا تھا۔ ہمایوں اور عادل سب سے آگے تھے۔ ہمایوں میخیں ٹھونک رہا تھا اور پیچھے آنے والوں کے لیے چڑھائی کو آسان بنا رہا تھا۔ عادل میخیں اور بولٹس وغیرہ چیک کر رہا تھا اور جہاں کوئی کمی محسوس ہوتی، اسے درست کرتا۔ تربیت زبردست کام آ رہی تھی۔ عادل کے پیچھے کرسٹل تھی، پھر سرمد صاحب۔ اس کے بعد رابے خاں اور اس کے دونوں ساتھی۔

کوئی پانچ سو میٹر کی دشوار چڑھائی کے بعد جب وہ ایک جگہ بیٹھے تو انہیں دور نیچے برف کی سفید چادر پر اپنا کیمپ ماچس کی تین چار چھوٹی ڈبیوں کی طرح نظر آیا۔ ٹوائلٹ والا ٹینٹ علیحدہ ایک چھوٹی ڈبیا کی طرح نظر آتا تھا۔ عادل نے ہمایوں کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔
''تم نے رابے خاں کی ایک غلطی نوٹ کی؟''
''کیسی غلطی؟''

''جب ہم اوپر آ رہے تھے، ایک موقع ایسا آیا تھا کہ ہم چاروں آگے تھے اور وہ تینوں پیچھے تھے۔'' عادل کی بات نے ہمایوں کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ جان گیا کہ بات قابلِ غور ہے۔

عادل نے سرگوشی جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر اگلی دفعہ ہم کوشش کریں تو بات بن سکتی ہے۔ جب ہم چاروں اوپر چڑھ جائیں...... اور ان کا پہلا بندہ اوپر آئے تو ہم اس سے ہتھیار چھین سکتے ہیں۔ ایسے میں ان تینوں کو شوٹ کرنا ہمارے لیے زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔''

''کیا سرمد صاحب اس طرح کے ایڈونچر کی اجازت دیں گے؟'' ہمایوں نے بھی سرگوشی کی۔

''ہمایوں بھائی! ہم حالتِ جنگ میں ہیں۔ جنگ میں ایسے موقع بھی آتے ہیں جب سپاہی کو کمانڈر کی اجازت کے بغیر اپنے طور پر قدم اٹھانا پڑتا ہے۔''

فولاد جان اپنی رائفل کو حرکت دیتے ہوئے بولا۔

''یہ تم کیا بڑبڑ کرتا ہے۔ چپ بیٹھو اور کھانا کھاؤ۔''

اگلے مرحلے کی چڑھائی شروع ہوئی۔ ایک مرتبہ پھر انہیں رسّوں کے ذریعے اوپر جانا تھا۔ یہ مرحلہ قریباً ڈھائی تین سو میٹر کا تھا۔ مشکل ترین کام ایک بار پھر ہمایوں کے ذمے تھا۔ وہ ٹھوس برف میں جگہ جگہ میخیں ٹھونکتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور رسّے کو ان میخوں سے منسلک کرتا جا رہا تھا۔ عادل کی دھڑکن تیز ہوچکی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس مرتبہ اوپر چڑھنے کی ترتیب کیا ہوتی ہے۔ اگر رابے اور اس کے دونوں ساتھی حسبِ سابق سب سے پیچھے رہتے تو دو آپشن تھے۔ ایک تو یہ کہ رسّے کی سپورٹ ختم کرکے انہیں نیچے گرانے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔ دوسرا یہ کہ پہلے اوپر چڑھنے والے شخص کو پکڑ کر اس سے ہتھیار چھینا جاسکتا تھا ...... کچھ دیر بعد عادل کے سینے سے ٹھنڈی سانس خارج ہوئی۔ رابے نے اس مرتبہ پہلے والی غلطی نہیں دہرائی تھی۔ ہمایوں کے بعد اوپر جانے والا شخص فولاد جان تھا۔ اس کے بعد عادل، سرمد صاحب اور کرسٹل تھے۔ کرسٹل کے عقب میں رابے اور اس کا ساتھی تھے۔ ہمایوں اکیلا فولاد جان کو بے بس نہیں کرسکتا تھا اور اگر کر بھی لیتا تو نیچے آنے والا رابے خاں بہ آسانی کرسٹل کو یا ان تینوں میں سے کسی کو نشانہ بنا سکتا تھا۔

یہ چڑھائی قریباً ایک گھنٹے میں مکمل ہوئی۔ وہ ہمایوں کے پاس ہموار سطح پر پہنچ گئے۔ یہ پہاڑ کی عمودی چڑھائی کے درمیان ایک چھجا نما جگہ تھی۔ اس کی لمبائی بیس پچیس فٹ ہوگی مگر زیادہ سے زیادہ چوڑائی سات فٹ ہوگی۔ سات فٹ کی اس بغیر جنگلے والی ''بالکونی'' میں کھڑے ہوکر نیچے ہزاروں فٹ کی خوفناک گہرائی میں دیکھنا رونگٹے کھڑے کردیتا تھا۔ برفانی ہوائیں ان کے جسموں سے ٹکراتی تھیں تو یوں لگتا تھا کہ کوئی تند و تیز جھونکا انہیں اس ''قدرتی بالکونی'' سے دھکیل کر نیچے عمیق گہرائیوں میں پھینک سکتا ہے۔ بہ امر مجبوری انہیں یہیں پر قیام کرنا تھا۔

رابے خاں کی ہدایت پر یہاں دو چھوٹے خیمے نصب کردیے گئے۔ ایک خیمے میں سرمد صاحب اور ان کے ساتھی تھے، دوسرے میں رابے خاں اور اس کے ساتھی۔

رات کو عادل نے ہمت کرکے سرمد صاحب سے یہ بات چھیڑ دی۔ اس نے کہا۔ ''سر! میں محسوس کر رہا ہوں کہ اس وقت ہم آزاد نہیں بلکہ قیدی ہیں۔ رابے خاں ہمیں اپنی مرضی کے مطابق چلا رہا ہے۔''

''ظاہر ہے کہ وہ ایسا کرسکتا ہے۔'' سرمد صاحب نے کہا۔ ''ان کے پاس ہتھیار ہیں اور تم نے دیکھا ہی ہے کہ وہ ایک لمحے کے لیے غافل نہیں ہوتے۔ ہمارے پاس صرف ایک پستول تھا، اب وہ بھی ان کے قبضے میں ہے اور ہمارے خلاف استعمال ہو رہا ہے۔''

عادل نے ہمایوں کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آمادگی پاکر سرگوشی میں بولا۔ ''سر! اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم ایک کوشش کرسکتے ہیں۔ رات کے وقت یقیناً یہ سب کے سب تو نہیں جاگ رہے ہوں گے۔ دو یقیناً سوئیں گے ایک جاگے گا۔ ہم کسی بہانے ان کے خیمے میں جھانک کر صورتِ حال دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد کارروائی کرسکتے ہیں۔''

سرمد صاحب نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں پتا ہی ہے پچھلی دفعہ رابے خاں نے ہمایوں کے پاؤں کے پاس گولیاں چلائی تھیں اور اعلان کیا تھا کہ اب اگر کوئی ان کے خیموں کے پاس بھی نظر آیا تو سیدھا فائر کریں گے۔ ابھی شام کے وقت بھی اس نے یہی بات دہرائی ہے۔ جس طرح ہم سوچ رہے ہیں، اسی طرح وہ بھی سوچ رہے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ کسی کو خیمے کے قریب آنے دیں گے۔ وہ دور ہی سے بات کرنے کے لیے کہیں گے۔''

''مگر سر! ایک کوشش کرنے ......''

''نہیں عادل۔'' سرمد صاحب نے تیز سرگوشی میں اس کی بات کاٹی۔ ''میں کسی طرح کے ایکشن کی حمایت نہیں کروں گا۔ خاص طور سے اس خطرناک جگہ پر۔ یہاں کوئی دھینگا مشتی ہوئی تو بہت نقصان ہوگا۔ چھ سات فٹ جگہ ہے۔ ایک طرف پہاڑ، دوسری طرف اندھی کھائی ہے۔ جسے بھی ذرا سا دھکا لگا وہ نیچے گیا۔''

سرمد صاحب کا حتمی لہجہ سن کر عادل اور ہمایوں خاموش ہوگئے۔ بہرحال سرمد صاحب کی باتوں میں عادل کو امید کی ہلکی سی کرن بھی نظر آئی تھی۔ وہ جیسے کہنا چاہ رہے تھے کہ اگر کوئی کوشش کرنی ہی ہے تو پھر اس کے لیے یہ جگہ موزوں نہیں ہے۔ یعنی آگے چل کر کہیں کوئی ایسا موقع بن بھی سکتا تھا مگر پھر ایسا ہوا کہ وہ رات ایک ہنگامے کا سبب بن گئی۔

ابھی رات کے قریباً دس ہی بجے تھے۔ مدھم

آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ رابے خاں اور اس کے دونوں ساتھی اپنے خیمے میں گپ شپ کر رہے ہیں۔ ساتھ میں قہوے کی ہلکی سی خوشبو بھی ان تک پہنچ رہی تھی۔ سرمد صاحب اور ان کے تینوں ساتھی یعنی عادل، ہمایوں اور کرسٹل بھی کھانے سے فارغ ہوچکے تھے اور سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ زمین سے ہزاروں فٹ کی بلندی پر اس تھوڑی سی ہموار جگہ پر لگا ہوا یہ جدید خیمہ انہیں گھر جیسا آرام فراہم کر رہا تھا۔ باہر ہواؤں کا شور تھا اور کبھی کبھی کسی چھوٹے گلیشیئر کے نشیب میں گرنے کی گونج دار آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔

اچانک انہیں محسوس ہوا کہ رابے خاں وغیرہ کے خیمے سے ابھرنے والی آوازیں بلند ہوگئی ہیں۔ ان لوگوں میں شاید کسی بات پر بحث ہو رہی تھی۔ فولاد جان اور اس کے ساتھی خناب کی آوازیں زیادہ بلند تھیں۔ وہ جھگڑ رہے تھے۔ ان کی گفتگو میں بار بار ماکانے زادہ کا نام بھی آرہا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ جھگڑا سنگین صورت اختیار کرگیا۔ گاہے بگاہے رابے خاں کی رعب دار آواز بھی ابھرتی تھی۔ وہ فولاد اور خناب کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اندازہ ہوا کہ فولاد اور خناب گتھم گتھا ہوگئے ہیں۔ وہ لڑتے ہوئے خیمے سے باہر آگئے۔ ہمایوں، عادل اور سرمد بھی باہر نکل آئے۔ وہ دونوں جانوروں کی طرح لڑ رہے تھے۔ رابے خاں کے ہاتھ میں رائفل تھی اور وہ ان دونوں کو پیچھے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ عادل کی نگاہوں کے سامنے بجلی سی کوند گئی۔ یہ ایک سنہری موقع تھا۔ اس سنہری موقع کو ہمایوں نے عادل سے بھی پہلے تاڑ لیا۔ وہ رابے خاں کے زیادہ قریب تھا۔ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح رابے خاں کی طرف گیا اور پوری طاقت سے اس سے ٹکرایا۔ رابے خاں رائفل سمیت دور لڑھک گیا۔ ہمایوں جست کر کے اس پر جا پڑا۔ دوسری طرف عادل اور سرمد صاحب دونوں گتھم گتھا افراد پر جھپٹے۔ عادل نے فولاد کو اس کے لمبے بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور پستول ڈھونڈنے کے لیے اس کی کمر کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن پستول وہاں نہیں تھا۔ عادل نے سر کی زوردار ٹکر سے فولاد کو دور پھینک دیا۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ اسے خیمے کی طرف جانا چاہیے۔ یقیناً دوسری رائفل اور پستول خیمے میں ہی تھے۔ وہ خیمے کی طرف لپکا۔ اسی دوران میں فولاد کے ساتھی خناب نے دو قدم بھاگ کر چھلانگ لگائی اور عادل کو لیتا ہوا خیمے پر گرا۔ خیمے کی لچک دار سپورٹس ٹوٹ گئیں اور وہ منہدم ہوگیا۔ عادل اوندھا گرا تھا، خناب اس کی پشت پر تھا۔ عادل نے اس کی پسلیوں میں کہنی کی مہلک ضرب لگائی۔ وہ ذرا ڈھیلا پڑا تو عادل مچھلی کی طرح تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گیا۔ لالی گاؤں میں ''نوری نت'' کے پتلے پر کی گئی کڑی مشق اس کے کام آرہی تھی۔ اس کی ایک زوردار ٹانگ نے خناب کو کئی قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا۔ وہ پیچھے ہٹا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ ''کئی قدم'' کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ صرف سات فٹ جگہ تھی اور عقب میں کئی ہزار فٹ گہری اندھی کھائی تھی۔ کنارے پر خناب نے ایک لمحے کے لیے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن پھر لڑھک گیا۔ گرتے ہوئے اس نے کنارہ تھام لیا تھا۔ اب اس کا جسم کھائی کے جان لیوا خلا میں تھا اور وہ دونوں ہاتھوں کی مدد سے جھول رہا تھا۔ اس نے بازوؤں کے زور سے پھر اوپر چڑھنے کی کوشش کی مگر عادل یہ موقع دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ اس کی دوسری بے رحم ٹھوکر خناب کے چہرے پر پڑی۔ کنارے سے اس کی گرفت ختم ہوگئی اور وہ ایک کربناک آواز کے ساتھ موت کے سفر پر روانہ ہوگیا۔ یہ سب کچھ تین چار سیکنڈ کے اندر ہی وقوع پذیر ہوا تھا۔ ''عادل.....'' سرمد صاحب کی چلاتی ہوئی آواز کانوں میں پڑی۔

وہ اضطراری طور پر نیچے جھکا اور اس کا یوں جھکنا اسے شدید زخمی ہونے سے بچا گیا۔ رابے خاں کی چلائی ہوئی کلہاڑی اس کے سر کے بالوں کو چھوتی گزر گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ رابے دوسرا وار کرتا، عادل بیٹھے بیٹھے اس کی ٹانگوں سے چمٹا اور اسے پشت کے بل گرادیا۔

سرمد صاحب اور ہمایوں، فولاد جان کو زیر کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ خبیث غیر معمولی طاقت اور پھرتی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ یکایک وہ تڑپ کر گرفت سے نکلا۔ کرسٹل دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ وہ سیدھا اس پر جا پڑا۔ ''رک جاؤ......'' وہ چنگھاڑا۔ ''نہیں تو ام اس حرامزادی کو گولی مار دے گا۔''

سب اپنی اپنی جگہ ساکت رہ گئے۔ فولاد جان کے ہاتھ میں واقعی پستول تھا۔ یہ پستول اس نے اپنے بھاری... بھرکم لباس میں سے کب اور کس وقت نکالا، کسی کو پتا نہیں چلا۔ فولاد جان کی لرزہ خیز آواز اس امر کی گواہی دے رہی تھی کہ ان تینوں میں سے کوئی آگے بڑھا تو واقعی وہ جیتی جاگتی کرسٹل کو لاش میں تبدیل کردے گا۔

''مار دے گا...... ہاں مار دے گا۔'' وہ پھر نوحہ کرنے والے انداز میں دہاڑا۔ لگتا تھا کہ وہ رو رہا ہے۔

رابے خاں تیزی سے آگے گیا۔ اس نے اپنی گری ہوئی رائفل اٹھائی اور اُلٹے قدموں چل کر فولاد جان کے قریب کھڑا ہوگیا۔ وہ ایک بار پھر بے دست و پا تھے۔ فولاد جان نے وحشت کے عالم میں کرسٹل کو اس کے سنہری بالوں سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی، کھائی کے کنارے پر گری۔ وہ تھوڑا سا اور زور لگاتا تو وہ بھی شاید خناب کے پیچھے ہی پیچھے روانہ ہوجاتی۔ اب وہ چاروں اندھی کھائی کے کنارے پر تھے۔ فولاد جان اور رابے خاں نے اپنے آتشیں ہتھیار ان کی طرف سیدھے کر رکھے تھے۔

فولاد جان ایک بار آواز میں گرجا...... عادل کو مخاطب کر کے بولا۔ ”تم نے مار دیا اسے۔ تم قاتل ہے، ام تم کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔“ اس نے پستول عادل کی طرف سیدھا کیا۔ عادل کو اپنی آنکھوں کے سامنے موت بالکل صاف نظر آئی۔ اسے لگا کہ گولی اس کے سر یا گردن میں کہیں لگے گی۔ وہ پیچھے کی طرف جائے گا اور پھر ایک ایسی تاریک کھائی کے اوپر پرواز کرنے لگے گا جس کی تہ کا کچھ اندازہ نہیں ہے۔ وہ کتنی دیر گرتا رہے گا؟ کیا وہ ٹھوس جگہ پر ٹکرانے سے پہلے ہی مرجائے گا، یا ٹکرانے کے بعد مرے گا؟ اپنی بوڑھی ماں اور غم ناک آنکھوں والی شہزادی کے چہرے اس کی نگاہوں میں آئے۔ جب اس کی موت کی خبر ان تک پہنچے گی اور انہیں معلوم ہوگا کہ ایک یخ بستہ رات میں زمین سے ہزاروں فٹ کی بلندی پر سے گر کر عادل کی جان چلی گئی تھی تو وہ کیا سوچیں گی؟ کیسے برداشت کریں گی یہ سب کچھ؟

یکایک رابے خاں کی کڑک دار آواز عادل کے کانوں میں پڑی۔ وہ اپنے ساتھی فولاد جان سے مخاطب تھا۔ ”نہیں...... نہیں۔“ وہ اسے روک رہا تھا۔ اس نے زور لگا کر فولاد جان کے پستول کا رخ نیچے کرنا چاہا۔ فولاد جان ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا چکا تھا۔ پستول نے دھماکے سے شعلہ اگلا اور گولی نیچے برف میں کہیں گھس گئی۔

”نہیں فولاد نہیں...... ابھی نہیں۔“ رابے خاں پھر چلّایا اور بائیں ہاتھ سے فولاد کی کلائی مضبوطی سے تھام لی۔ دائیں ہاتھ میں آٹھ ایم ایم رائفل تھی اور اس کا رخ عادل وغیرہ کی طرف تھا۔ وہ دونوں ہی سرتاپا شعلہ تھے۔

رابے خاں نے ان چاروں کو خیمے میں چلنے کا حکم دیا۔ وہ خیمے میں چلے گئے اور رابے خاں کے حکم پر نکاسی کے راستے کی دونوں زپ بند کردیں۔

سرمد صاحب کے چہرے اور گردن پر خراشیں نظر آرہی تھیں۔ یہ خراشیں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہونے والی دھینگا مشتی کا نتیجہ تھیں۔ سرمد صاحب نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”جو ہوا اچھا نہیں ہوا۔ خناب کی موت ان کو آسانی سے ہضم نہیں ہوگی۔“

سرمد صاحب کی بات یقیناً درست تھی۔ باہر سے فولاد جان کے رونے اور گرجنے برسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ رابے خاں اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کرسٹل نے لرزاں آواز میں سرمد صاحب سے پوچھا۔ ”یہ خناب کیا فولاد جان کا رشتے دار تھا؟“

سرمد صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اس کا پھوپھی زاد تھا۔“

باہر صورتِ حال سنگین ہوتی جارہی تھی۔ فولاد جان غضب ناک انداز میں رو رہا تھا۔ مشتعل فولاد جان اور رابے خاں کے درمیان جو باتیں ہو رہی تھیں ان سے انہیں اندازہ ہوا کہ فولاد اور خناب میں ماکانے زادہ کے حوالے سے بحث ہوئی اور پھر جھگڑا ہوا۔ خناب، ماکانے زادہ کے عقیدت مندوں میں سے تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ماکانے زادہ نے اوپر بانگڑی پر جانے سے منع کیا ہے تو انہیں اوپر نہیں جانا چاہیے۔ کم از کم کھنڈر سے تو باہر ہی رہنا چاہیے۔ بس اسی تکرار نے لڑائی کی شکل اختیار کرلی۔ لیکن یہ تو فولاد کے بھی وہم وگمان میں نہیں تھا کہ اس لڑائی کا نتیجہ خناب گل کی اچانک موت کی صورت میں نکل آئے گا۔ وہ اب سراپا غیظ و غضب تھا اور خون کے بدلے خون کا مطالبہ کر رہا تھا۔ مقامی عقیدے کے مطابق اسے فوری انصاف درکار تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے قتل ہوا تھا اور اگر اسے فوری انصاف نہ ملتا تو مرنے والے کی روح آسمان اور زمین کے درمیان بھٹکتی رہ جاتی اور اس کا سارا وبال خود فولاد جان پر پڑتا۔

پھر باہر ہونے والی باتوں سے یوں لگا کہ اگر رابے خاں نے ابھی فی الفور کوئی فیصلہ نہ کیا تو فولاد جان اس سے بھی باغی ہوجائے گا اور اسے اپنا دشمن تصور کرے گا۔ یہ دونوں مقامی زبان میں بات کر رہے تھے۔ ان سب میں سے صرف ہمایوں ہی یہ باتیں اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔

سرمد صاحب نے اس سے پوچھا۔ ”ہاں، اب کیا بات چل رہی ہے؟“

”وہ ایک ہی رٹ لگا رہا ہے جی۔ خون کا بدلہ خون، ورنہ وہ رابے خاں کی بھی نہیں سنے گا اور جو اس سے بن پڑا وہ کرے گا۔ وہ عادل سے بدلہ لینے کی بات کر رہا ہے لیکن رابے خاں اسے بتا رہا ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ رابے کہہ رہا ہے کہ اس لڑکے کو خاص طور سے ساتھ لایا گیا ہے اور اس

کے بغیر یہ سفر مکمل نہیں ہو سکے گا۔"

باہر فولاد جان اب باقاعدہ چنگھاڑ رہا تھا۔ وہ بار بار ایک فقرہ بولتا تھا اور اس کے جواب میں راہبے خاں بھی کچھ کہتا تھا۔ عادل نے محسوس کیا کہ ہمایوں کا رنگ کچھ پھیکا پڑ رہا ہے۔ ہمایوں اب تک ایک دلیر ساتھی ثابت ہوا تھا لیکن ان لمحوں میں وہ ذرا نروس دکھائی دیا۔

"کیا ہوا ہے؟ کیا کہہ رہے ہیں وہ؟" سرمد صاحب نے پوچھا۔

"نہیں، کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ وہی بدلے کی بات ہو رہی ہے۔"

سرمد صاحب جیسے کچھ تاڑ گئے تھے۔ غالباً باہر ہونے والی باتوں میں سے بھی کچھ جملے ان کی سمجھ میں آرہے تھے۔ انہوں نے ہمایوں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ شاید...... اب تمہارے بارے میں بات کررہے ہیں۔ یعنی...... اگر عادل نہیں تو پھر تم۔ ایک کے بدلے ایک، چاہے ہم میں سے کوئی بھی ہو......"

ہمایوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی دوران میں جیسے باہر کوئی فیصلہ ہو گیا۔ ٹارچ کا روشن دائرہ خیمے کی طرف پڑا۔ "چرر" کی طویل آواز سے پہلے خیمے کا بیرونی غلاف چاک ہوا، پھر اندرونی بھی ہو گیا۔ غلاف چاک کرنے والا راہبے خاں ہی تھا۔ اس نے ہمایوں کو گریبان سے دبوچا اور زور لگا کر باہر کھینچ لیا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر چمک رہا تھا۔ اسی تیز دھار خنجر سے اس نے خیمے کو چاک کیا تھا۔ خنجر کمر میں اڑس کر اس نے پستول نکال لیا اور ہمایوں کو پتھریلی دیوار کے ساتھ کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ فولاد جان نے بھری ہوئی آٹومیٹک رائفل کا رخ ان تینوں کی طرف کر رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ذرا سے شک پر بھی وہ گولیوں کی بوچھاڑ کر دے گا۔

"رک جاؤ۔" سرمد صاحب جلدی سے باہر نکل آئے۔

"تم پیچھے ہٹو۔" راہبے خاں نے انہیں زوردار دھکا دیا پھر چند قدم پیچھے ہٹ کر پستول کا رخ ہمایوں کی طرف کر لیا۔

یہ نازک ترین صورتِ حال تھی۔ راہبے خاں کی رائفل بھی اب اس کے دائیں ہاتھ میں آگئی تھی۔ یعنی وہ تین ہتھیاروں کی زد میں تھے۔ راہبے خاں نے اب تینوں کو کور کر لیا تھا۔ فولاد جان نے اپنی رائفل کا رخ ہمایوں کی طرف موڑ دیا۔ اب وہ کسی بھی لمحے ہمایوں پر ٹریگر دبا سکتا تھا۔ یہ عادل کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کی جگہ ہمایوں کو قربانی کا بکرا بنایا جائے، یہ اسے کسی طرح قبول نہیں تھا۔ اس کے کشادہ سینے میں ایک بار پھر چنگاریاں بکھر گئیں۔ اس کا دل چاہا وہ نتائج سے بے پروا ہو کر فولاد جان پر جا پڑے...... حالانکہ وہ جانتا تھا کہ کامیابی کے امکانات پندرہ بیس فیصد سے زیادہ نہیں ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا، سرمد صاحب کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ وہ راہبے خاں سے کہہ رہے تھے۔ "اگر ہمایوں کو کچھ ہوا تو نتیجہ تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔"

عادل نے دھیان سے دیکھا اور سرتاپا لرز گیا۔ سرمد صاحب اس قدرتی بالکونی کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے۔ اس طرح کہ ان کے دونوں پاؤں کا کچھ حصہ خلا میں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ہوا کا کوئی تند جھونکا بھی انہیں ہزاروں فٹ کی گہرائی میں پھینک سکتا ہے۔

وہ بالکل ساکت نظر آتے تھے اور پختہ ارادے نے جیسے انہیں سر سے پاؤں تک ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ پھر بولے۔ "میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، تم اس پر گولی چلاؤ گے تو میں نیچے کود جاؤں گا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔"

خدا کی پناہ...... سرمد صاحب کی آواز میں ایسا مصمم ارادہ تھا کہ جس نے راہبے خاں کو تو چونکایا ہی، فولاد جان بھی ٹھٹک کر رہ گیا۔

"رک کیوں گئے ہو، چلاؤ اس بچے پر گولی اور مجھے بھی مرتا ہوا دیکھو......" وہ پھر بولے۔ آواز میں اطمینان ہی اطمینان تھا۔

لمحے صدیوں پر بھاری تھے۔ یہ اعصاب کی جنگ تھی۔ یہ دونوں پاؤندے بڑی اچھی طرح جانتے تھے کہ سرمد صاحب کے بغیر ان کا سفر بیکار ہوگا۔ تہ خانے میں زیورات کی اصل جگہ کے بارے میں صرف وہی جانتے ہیں اور وہی انہیں وہاں تک پہنچا سکتے ہیں۔

راہبے خاں نے ہاتھ بڑھا کر فولاد جان کی رائفل کا رخ نیچے کر دیا۔ پھر سرمد صاحب سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تم اپنے ہوش میں تو ہے؟ یہ کیا کر رہا ہے؟"

"یہی سوال میں تم سے کر رہا ہوں، تم نے اپنے ہوش کیوں کھو دیے ہیں۔ یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے ہاتھاپائی کے دوران میں ہوا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی نیچے گر سکتا تھا اور کسی کی وجہ سے بھی گر سکتا تھا۔ کیا پتا کہ فولاد اور خناب جس طرح گتھم گتھا ہوئے تھے، دونوں ہی نیچے گر جاتے۔"

"تم کیا سمجھتا ہے کہ تم ایسا دھمکی دے کر ہم کو اپنے بھائی کا بدلہ لینے سے باز رکھ سکے گا۔" فولاد جان چنگھاڑا۔

"میں دھمکی نہیں دے رہا۔ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو گولی چلا کر دیکھو۔ تمہیں اپنا پھوپھی زاد جتنا عزیز تھا اس سے کہیں زیادہ مجھے میرا یہ بچہ عزیز ہے۔ میں کچھ اور تو نہیں کر سکتا لیکن اس کی موت کا بدلہ تمہارے اس سفر کو بری طرح ناکام کر کے لے سکتا ہوں۔" سرمد صاحب کے لہجے میں غیر معمولی سکون اور ٹھہراؤ تھا اور یہی ٹھہراؤ ان دونوں پاؤندوں کو سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔

رابے خاں، فولاد جان کو لے کر چند قدم پیچھے ہٹا اور اس کے کان میں سرگوشیاں کرنے لگا۔ یہ سرگوشیاں دو تین منٹ جاری رہیں۔ دونوں کی رائفلوں کا رخ بہ دستور ان چاروں کی طرف تھا، پھر غیر متوقع طور پر فولاد جان نے بڑی نفرت سے عادل اور ہمایوں کی طرف تھوکا اور ان کی طرف گولی چلائی۔ اس نے تین فائر کیے۔ یہ فائر اس نے برف پر کیے تھے۔ تب وہ پھنکارتا ہوا اپنے خیمے کی طرف چلا گیا۔

بلا ٹل گئی۔ کم از کم وقتی طور پر ٹل گئی۔ رابے خاں، عادل کی طرف دیکھ کر گرجا۔ "خناب کا خون تمہیں معاف نہیں کیا ہے۔ اس کا فیصلہ سفر سے واپسی پر ہوگا۔ تم کو حساب دینا پڑے گا، ہر صورت میں دینا پڑے گا۔"

اس ہنگامے میں دونوں خیمے بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ رابے خاں والے خیمے کو ٹھیک کیا گیا۔ دوسرے خیمے کی جگہ سامان میں سے ایک اور خیمہ نکال لیا گیا۔ فولاد جان ابھی تک شدید غم و غصے کے ریلے میں بہہ رہا تھا۔ وہ نہ جانے کیا کیا بول رہا تھا۔ گاہے بگاہے وہ عادل کے لیے گالیاں بھی بکنے لگتا تھا۔ کرسٹل ابھی تک داخون کے قتل والے واقعے کو ہی نہیں بھولی تھی، اب اس نئے واقعے نے اسے مزید متاثر کر دیا تھا۔ وہ بالکل گم صم بیٹھی تھی اور بار بار اس کنارے کو دیکھنے لگتی تھی جس سے آگے ایک تاریک خلا تھا...... اور جس خلا نے کچھ دیر پہلے جیتے جاگتے خناب کو نگلا تھا۔ وقتی طور پر تو عادل کی جان بچ گئی تھی اور ہمایوں کی بھی لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کب شعلہ صفت فولاد جان کے اعصاب جواب دے جائیں اور وہ ان دونوں پر فائر کھول دے۔ یہ بہت تناؤ والی صورتِ حال تھی۔

☆☆☆

وہ رات جیسے تیسے گزر گئی۔ اگلی صبح وہ پھر چڑھائی کے لیے تیار تھے۔ رونے سے فولاد جان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس کے تیور خطرناک تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اب وہ ان چاروں میں سے کسی کی کوئی غلطی معاف نہیں کرے گا اور نتائج سے بے پروا ہو کر اپنی آٹھ ایم ایم استعمال کر گزرے گا۔ رابے خاں بھی ہمیشہ سے زیادہ سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے نہایت کرخت لہجے میں ان چاروں کو اٹھنے اور تیاری کرنے کی ہدایت کی۔ اس موقع پر تو یہی لگ رہا تھا جیسے ان چاروں اور دو عدد خطرناک رائفلوں کے درمیان بس ایک "دفینہ" ہی حائل ہے۔ اگر رابے اور فولاد کو سونا چاندی ملنے کی امید نہ ہو تو وہ ابھی اسی جگہ پر ان تینوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیں اور کرسٹل پر مزید ستم توڑنے کے لیے اسے اپنی تحویل میں لے لیں۔ عادل کے ذہن میں بے شمار اندیشے چنگھاڑ رہے تھے اور یقیناً ایسے ہی اندیشے دیگر ساتھیوں کے ذہنوں میں بھی ہوں گے۔ زیورات ملنے کے بعد صورتِ حال کیا ہوگی؟ حصہ ملنا تو اب دور کی بات نظر آ رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ انہیں قتل کر دیا جاتا اور انہی ویران برفوں میں کہیں دفن کر دیا جاتا جیسے داخون دفن ہوا تھا۔ اگر تہ خانے میں سے کچھ نہ ملتا تو بھی یہی صورتِ حال پیش آ سکتی تھی۔ ناکامی کے بعد یہ لوگ سخت مایوسی کا شکار ہوتے۔ انہیں مار ڈالنا ان دونوں کے لیے بالکل دشوار نہ ہوتا۔ یہ بات تو طے تھی کہ یہ انہیں "پاؤندہ بستی" میں ہرگز نہیں لے جائیں گے۔ ایسی صورت میں ان کے پاس یہی راستہ تھا کہ ان چاروں کو قتل کر دیا جاتا۔ ماکانے زادہ کا معاملہ پیچیدہ تھا۔ ممکن تھا کہ اسے بھی مار دیا جاتا یا پھر زیورات ملنے کی صورت میں لالچ وغیرہ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا جاتا۔

اب چڑھائی دشوار ہوتی جا رہی تھی اور وہ مشکل ترین مرحلہ بھی قریب آ گیا تھا جس کے لیے بڑی محنت سے عادل کو تیار کیا گیا تھا۔ سرمد صاحب نے عادل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ اب تم ہمیں لیڈ کرو۔ تمہیں ایک طرح سے وارم اپ ہونے کا موقع بھی مل جائے گا۔"

"جو آپ کا حکم سر۔" عادل نے کہا اور اس کے جسم میں میٹھا میٹھا جوش لہر لینے لگا۔

آخر وہ گھڑیاں قریب آ ہی گئی تھیں جس کے لیے اس نے سخت تربیت حاصل کی تھی اور طویل مشقیں کی تھیں۔ اس نے "ہارنیس" پہنا۔ ہیلمٹ، چشمہ، دستانے اور دیگر لوازمات پورے کیے۔ ہتھوڑی، ڈرل مشین اور بولٹس وغیرہ لے کر چڑھائی شروع کر دی۔ خوف کہیں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اب اسے مزہ آ رہا تھا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ سرمد صاحب نے اس کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، وہ درست ہے۔ وہ بلندی کی طرف جانے کے لیے دوسروں سے بہت بہتر ہے۔ اس میں یہ خداداد صلاحیت ہے۔ وہ ایک عمودی

چڑھائی پر جس طرح میخیں گاڑتا اوپر چڑھتا جا رہا تھا، وہ سب کو حیران کر رہا تھا۔ کرسٹل کے بیک پیک (کمر کے تھیلے) میں ویڈیو کیمرا ابھی موجود تھا۔ سرمد صاحب کی ہدایت کے مطابق وہ کہیں کہیں کلپس بھی بنا رہی تھی۔ اوپر چڑھتے ہوئے عادل نے چند لمحے رک کر اپنے اردگرد دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ کیا یہ جاگتی آنکھوں کا خواب تھا۔ وہ قریباً انیس ہزار فٹ کی بلندی پر موجود تھا۔ ایک سپاٹ برفیلی دیوار کے ساتھ چیونٹی کی طرح چپکا ہوا تھا اور اس کے اردگرد دنیا کی بلند ترین برفیلی چوٹیاں تھیں۔ نیچے ایسی گہرائیاں تھیں جن کی تہ کا اندازہ لگانا بھی دشوار تھا۔ خطرہ اور جوش...... خطرہ اور جوش یہ دونوں احساس اس طرح آپس میں گڈمڈ ہو گئے تھے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناممکن تھا۔ کہیں ایک بولٹ دھوکا دے جاتا یا ایک کارابینر کھل جاتا تو زندگی...... موت کی اتھاہ گہرائیوں کی طرف روانہ ہو سکتی تھی۔

کرسٹل اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ باقی افراد ابھی بہت نیچے تھے۔ کرسٹل کی ہانپتی ہوئی سانسیں عادل کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ پھر کرسٹل نے عجیب کام کیا۔ اس نے عادل کے بوٹ کو بوسہ دیا اور بولی۔ ”ہام، توم سے محبت کرتا عادل...... بہت زیادہ محبت۔“

عادل شپٹا کر رہ گیا۔ ہزاروں فٹ کی بلندی پر رسے سے لٹک کر اظہارِ محبت کرنے کا یہ اچھا طریقہ تھا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔

”ڈو یو لسن می؟“ اس نے پوچھا۔

”نو۔“ عادل نے اطمینان سے کہا۔

”توم بہت نائی۔ اسی لیے ہام کو اچھا لگتا۔ توم دوسروں سے بہت ڈفرنٹ، یو آر گاڈ گفٹڈ۔ خدا نے توم کو اسی خاص کام کے لیے بنایا۔“

”شکریہ۔“ عادل نے ایک جگہ ڈرل سے سوراخ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے پھر عادل کے پاؤں کو بوسہ دیا۔ ”ہام، توم کے لیے سب کچھ کر سکتا۔ اگر توم کہے کہ ہام اپنے کارابینرز کھول کر نیچے چھلانگ لگا دے تو ہام ابھی لگا سکتا ہا ئیں۔“

”اوکے، تو پھر لگا دو۔“ عادل نے ٹھوس برف میں ایک لمبا بولٹ کستے ہوئے کہا۔

”واقعی لگا دے؟“ کرسٹل نے پوچھا۔

کرسٹل کے لہجے نے عادل کو چونکا دیا۔ عجیب ہیجانی سا لہجہ تھا جس میں خود فراموشی اور سرکشی کی جھلک تھی۔ اس دیوانی لڑکی سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ کوئی بھی الٹی سیدھی حرکت کر سکتی تھی۔ نیچے نہ بھی گرتی تو خود کو کسی شدید خطرے میں ڈال دیتی۔ اس نے بات آگے بڑھنے سے پہلے ہی ختم کر دی۔ ”مذاق کر رہا ہوں۔ مجھے پتا ہے تم اتنی جلدی میرا پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہو۔“

”اگر کوئی شک ہو تو کبھی ہام کو آزمانا مانگتا ہوئیں گا۔“

”تم اردو کا کچومر نکال دیتی ہو۔ شاید تم کہنا چاہتی ہو کہ اگر مجھے کوئی شک ہو تو کبھی تمہیں آزما لوں۔“

”یس اٹ از۔“

”ٹھیک ہے، اب اپنی بات یاد رکھنا۔ میں کبھی تمہیں آزماؤں گا۔“

”لیکن آچھا آزمانا۔ برا نائیں۔“

”آزمانا تو آزمانا ہی ہوتا ہے۔“ عادل نے رسے کے ذریعے کچھ اوپر جاتے ہوئے کہا۔

”آچھا...... یہ کاچومر (کچومر) کیا ہوتا۔ توم نے ابھی بولا ہے۔“

”اس کو روغنی نان کے ساتھ کھاتے ہیں۔ اچھا اب چپ ہو جاؤ۔“ عادل نے شپٹا کر کہا اور کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

چڑھائی کافی مشکل تھی۔ پورے دن میں وہ صرف دو ڈھائی ہزار فٹ اوپر جا سکے پھر ایک نسبتاً ہموار جگہ پر انہوں نے کیمپ لگا لیا۔ دو خیمے ایستادہ کر دیے گئے۔ اب انہیں اپنا بیس کیمپ نظر آنا بند ہو گیا تھا۔ ہاں، دوسرا کیمپ دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ رابے خان کے کہنے پر سرمد صاحب نے واکی ٹاکی کے ذریعے ”بیس کیمپ“ سے رابطہ قائم کیا۔ بہت مدھم آواز آ رہی تھی۔ بہرحال رابے خان ساتھیوں کی خیر خیریت دریافت کرنے میں کامیاب ہوا۔ اسے یہ بھی پتا چلا کہ ماکانے نزادے کو شدید بخار ہے اور وہ بہت اول فول بول رہا ہے۔

جتنی دیر رابے خان واکی ٹاکی پر بات کرتا رہا فولاد جان اپنی آٹومیٹک رائفل دونوں ہاتھوں میں لیے بالکل چوکس کھڑا رہا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی غافل ہونے کو تیار نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں ابھی تک ورم زدہ تھیں اور چہرے سے غم و غصہ ٹپکتا تھا۔ خاص طور سے عادل کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی چھوٹ جاتی تھیں۔

وہ اپنے اپنے خیموں میں جانے لگے تو فولاد جان کرخت لہجے میں بولا۔ ”تم میں سے ایک امارے ساتھ امارے خیمے میں رہے گا۔ ام تم پر اب زیادہ اعتبار نہیں کر سکتا۔“

وہ طائرانہ نظروں سے ان چاروں کی طرف دیکھنے لگا جیسے سوچ رہا ہو کہ کس کو اپنے خیمے میں چلنے کا کہے۔ اس کی نگاہیں کرسٹل پر آ کر رک گئیں۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔

تاثرات گواہی دے رہے تھے کہ وہ کرسٹل کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ایسا ممکن نہیں۔ سرمد صاحب اسے ایسا ہرگز نہیں کرنے دیں گے۔

''ہاں، کون جائے گا؟'' رابے خاں نے پوچھا۔ پھر کسی کے جواب دینے سے پہلے ہی بولا۔ ''تم آجاؤ سرمد صاحب۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے، تمہاری آشیرباد سے ہی تو ہوتا ہے۔''

سرمد صاحب فوراً رابے خاں اور فولاد جان کے خیمے کی طرف چلے گئے۔ عادل نے آگے بڑھنا چاہا تھا لیکن سرمد صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

عادل، ہمایوں اور کرسٹل اپنے خیمے میں آ گئے۔ کل والے واقعے کے بعد رابے اور فولاد بہت محتاط ہو گئے تھے اور ان کا رویہ بھی پہلے سے بہت سخت ہو گیا تھا۔ یہ پھر ایک نہایت یخ بستہ اور ابر آلود رات تھی۔ گہرے بادلوں کے مرغولوں نے ان کے خیموں کو ڈھانپ لیا تھا۔ ٹمپریچر نکتۂ انجماد سے 30 درجے نیچے تھا۔ وہ ٹن پیک فوڈ سے مختصر ڈنر کرنے کے بعد اپنے اپنے سلیپنگ بیگز میں گھس گئے۔ ہمایوں اپنی ڈائری لکھتا رہا۔ کرسٹل اور عادل باتیں کرتے رہے۔

عادل نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے کرسٹل! اگر کل معاملہ بگڑ جاتا، میرا مطلب ہے کہ فولاد جان ہمایوں پر فائر کر دیتا تو کیا سرمد صاحب واقعی گہرائی میں چھلانگ لگا دیتے؟''

ہمایوں نے ڈائری ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ''بات چھلانگ لگانے یا نہ لگانے کی نہیں تھی عادل۔ بات اپنے یقین اور اپنے اندر کی توانائی کی تھی۔ سر کا یقین، فولاد وغیرہ کے یقین سے زیادہ پختہ ثابت ہوا۔ ان کے یقین نے فولاد کے یقین کو شکست دے دی......''

''ہمایوں بھائی! تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو سکتا تو پھر......؟''

''یہی تو بے یقینی ہے۔ سر سرمد جیسے لوگ ''اگر'' کے بارے میں سوچتے ہی نہیں۔ وہ بس یہ جانتے ہیں کہ یہ ہوگا اور ہو کر رہے گا۔ اسی لیے وہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ بہرحال ہمیں آئندہ بہت محتاط رہنا ہوگا۔ اس خبیث فولاد جان کی آنکھ میں سور کا بال ہے۔ اس کو ذرا سا اشتعال آیا تو یہ کچھ نہ کچھ کر گزرے گا۔''

ہمایوں کو سر میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔ وہ حسبِ عادت پچھلے دو روز سے دوا سے اجتناب کر رہا تھا لیکن آج کرسٹل کے کہنے پر اسے کھانا پڑی۔ کرسٹل نے اپنے میڈیکل پاؤچ میں سے ٹیبلٹس نکال کر اسے دیں جو اس نے پانی کے ساتھ نگل لیں اور سو گیا۔ عادل اور کرسٹل ہلکی پھلکی باتوں میں مصروف رہے۔ باہر ہواؤں کا شور تھا اور بادلوں کے مرغولے تھے۔ اچانک کرسٹل نے عادل سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''توم نے اس بات کو مائنڈ تو نہیں کیا جو ہام نے آفتر لون میں کہا؟'' اس کا اشارہ اظہارِ محبت کی طرف تھا۔

''اگر تم نے مذاق میں کہا تو کوئی بات نہیں۔ لیکن اگر سنجیدگی سے کہا تو پھر مائنڈ کرنا چاہیے۔''

''تو پھر مائنڈ کر لو۔'' وہ شوخی سے بولی۔

عادل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''کرسٹل! تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ تم کسی بھی لڑکے کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہو اور وہ نہ ہو، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن...... میرا مسئلہ کچھ اور ہے کرسٹل۔ میں نے تمہیں بتایا ہے، میں کسی سے پیار کرتا ہوں۔ بہت زیادہ...... میں یہاں ان برفوں میں جو مارا مارا پھر رہا ہوں تو اس کے پیچھے اصل وجہ وہی ہے۔ میں اس کے لیے کچھ کر کے دکھانا چاہتا ہوں اور وہ یہاں سے سیکڑوں میل دور ہے۔ وہ وہاں کی تپتی دوپہروں میں کھیتوں کھلیانوں میں گھومتی ہے، خالی راستوں کو دیکھتی ہے اور میرا انتظار کرتی ہے۔''

کرسٹل نے عادل کی آنکھوں میں دیکھا۔ جیسے اس کی آنکھوں میں شہزادی کی تصویر کھوجنا چاہتی ہو۔ مسکرا کر بولی۔ ''وہ کیسی ہے عادل؟...... کیا وہ بہت بیوٹی فل ہا ئیں؟''

عادل نے تکیہ سر کے نیچے درست کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو تمہیں اس کے بارے میں کافی کچھ بتایا ہے...... اور اس کے علاوہ بھی کئی باتیں بتائی ہیں لیکن تم نے ابھی تک منہ پر چپ کی مہر لگا رکھی ہے۔ کچھ تم بھی تو بتاؤ۔''

''ہام کیا بتائے؟'' وہ لگاوٹ سے بولی۔

''میرے خیال میں بہت کچھ بتانے کو ہے...... مثلاً وہ لڑکا جو تمہیں ایبٹ آباد کے ہوٹل میں ملا تھا۔ آدھی رات کو تمہارے کمرے میں داخل ہوا تھا اور شاید...... تمہاری مرضی کے خلاف ہی داخل ہوا تھا۔''

وہ ایک بار پھر چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ چند سیکنڈ بعد اٹھ کر بیٹھ گئی تا کہ عادل سے روبرو ہو کر بات کر سکے۔ عادل اسی طرح نیم دراز رہا۔ ''تو یہ بات انڈر اسٹڈ ہے کہ توم نے ہام کا جاسوسی کیا۔''

''نہیں کرسٹل! یہ سب ایک اتفاق تھا۔ میں جاگ رہا تھا جب تمہارے کمرے کے دروازے پہ دستک ہوئی تو تجسس سے مجبور ہو کر باہر نکلا۔ وہ برٹش لڑکا تمہارے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے اسے نکلتے بھی

دیکھا۔ اس دوران میں تم دونوں کے درمیان شاید کوئی سخت کلامی بھی ہوئی تھی۔'' عادل یہ بات چھپا گیا کہ اس نے روشن دان پر چڑھائی کی تھی اور وہاں سے یہ نظارہ دیکھا تھا۔

وہ ایک دم بجھی بجھی سی نظر آنے لگی۔ وہ ہر وقت ہشاش بشاش رہتی تھی اس لیے افسردگی اس کے چہرے پر کچھ عجیب سی دکھائی دی۔ عادل نے اس کی خاموشی کو توڑنے کے لیے تھوڑا سا اصرار کیا تو وہ بولی۔ ''عادل! وہ ایک رائل فیملی ہے۔ وہ ہام سے شادی کرنا مانگتا لیکن ہام نا ئیں مانگتا۔ وہ ام سے اکثر شادی کا ڈیمانڈ کرتا۔''

''تو تم صاف انکار کیوں نہیں کر دیتیں؟''

''بس ہام کا کچھ مجبوری۔ وہ کچھ اور ہام کچھ اور۔ بہت ڈیفرنس ہا ئیں۔''

''ڈیفرنس کیا ہے؟ وہ کسی رائل فیملی سے ہے تو تم بھی تو شاید کسی ڈیوک، لارڈ وغیرہ کی بیٹی ہو۔''

''پھر بھی ہام میں بہت فرق۔ ہام کے مقابلے میں اس کا اسٹیٹس بہت اونچا۔ ویسے بھی ہام اس کو بالکل لائیک نا ئیں کرتا۔''

''پھر بھی مجبوری کیا ہے، جس کی وجہ سے تم اسے صاف انکار نہیں کرتیں؟ تمہارے ملکوں میں تو عورت ایک بار ''نو'' کہہ دے تو سارے ملک کی عدالتیں اس کے پیچھے آن کھڑی ہوتی ہیں۔ آخر ایسی کون سی مجبوری ہے؟''

''سوری۔ ہام اس مجبوری کو تم سے شیئر نا ئیں کر سکتا۔''

''کیا سر نے منع کیا ہے؟''

''ہاں...... ایسا ہی سمجھ لو عادل۔''

''کیا اس مجبوری کے دور ہونے کا کوئی امکان ہے؟ میرا مطلب ہے کوئی چانس؟''

''ہاں، سر سرمد کو ہوپ تو ہے کہ یہاں سے واپسی پر وہ کچھ کر سکیں گے۔''

''کہیں اس مجبوری کا تعلق بھی تو روپے پیسے سے نہیں؟ میرا مطلب ہے کہ اس لڑکے سے پیچھا چھڑانے کے لیے تمہیں کسی بڑی رقم وغیرہ کی ضرورت ہو؟''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''ہام اب اتنا غریب بھی نا ئیں ہے۔''

''نہیں، میرا مطلب تھا کہ ہو سکتا ہے کہ اپنے والدین کو بتائے بغیر تمہیں کسی بڑی رقم کا انتظام کرنا ہو۔''

''نا ئیں۔ ایسا سرے سے کچھ نا ئیں ہے۔ یو آر کمپلیٹلی رانگ۔'' پھر وہ ایک دم لہجہ بدل کر بولی۔ ''لیکن یہ تم نے کیسا باتیں شروع کر دیا۔ دیکھو یہ کتنا رومانٹک جگہ ہے اور انوائرمنٹ اس سے بھی زیادہ رومانٹک ہے۔''

عادل نے چونک کر ہمایوں کی طرف دیکھا۔ وہ براؤن رنگ کے سلیپنگ بیگ میں آرام سے سو رہا تھا۔ اس کی بھاری سانسیں، جو مدھم خراٹوں سے مشابہ تھیں خیمے میں گونج رہی تھیں۔ ''کہیں تم نے ہمایوں بھائی کو ضرورت سے زیادہ ڈوز تو نہیں دے دیا؟'' عادل نے پوچھا۔

''تھوڑا سا زیادہ۔'' وہ شوخی سے بولی۔ ''جیسے حلاوے میں نمک۔''

عادل کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ وہ دونوں پاس پاس لیٹے تھے۔ جیسے پیٹرول کے قریب ہی آگ دھری ہو۔

''تم کیا چیز ہو۔ مجھے تمہاری کچھ سمجھ نہیں آتی۔'' عادل نے کہا۔

''تو م غلط مت لو۔ ہام صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ کمفرٹ ایبلی سویا رہے۔ تو م کو بتایا ہے نا کہ بس تھوڑا سا زیادہ دیا ہے جیسے حلاوے میں نمک۔''

عادل بیزار انداز میں بولا۔ ''ایک تو غلط سلط کام کرتی ہو، اوپر سے اتنی بری اردو بھی بولتی ہو۔ تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ حلاوا نہیں ہوتا حلوا ہوتا ہے اور حلوے میں نمک نہیں ہوتا، آٹے میں نمک ہوتا ہے۔''

اس نے عادل کی بات کو بالکل نظر انداز کیا۔ کھوئی کھوئی سی آواز میں بولی۔ ''عادل! کل کیا ہو کچھ پتا نا ئیں۔ ہمارے سفر کا سب سے ڈیفکلٹ مرحلہ شروع ہو ئیں گا۔ کیا پتا کس کے ساتھ کیا ہو جانے اور پھر اوپر چوٹی پر بھی تو خطرات ہی ہیں۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''آج کا یہ نائٹ کتنا پرسکون ہے۔ پیس فل اور کمفرٹ ایبل...... ہام دونوں کتنا پاس نا ہے۔ کیا تو م کے اندر ہام کے لیے کوئی فیلنگ نا ئیں؟''

''میں نے تمہیں بتایا ہے نا، میں کسی سے بہت محبت کرتا ہوں۔''

''لیکن اگر ہام دونوں کچھ ٹائم کے لیے پاس آتا ہے تو اس سے اس محبت کا کیا لاس ہوتا ہا ئیں۔''

''یہی بات تو تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔'' عادل نے کہا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

باہر ہواؤں کا شور تھا۔ ٹینٹ کے لیمپ کی بیٹری کمزور پڑ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بجھ گیا اور ٹینٹ میں تاریکی چھا گئی۔ ''چھوٹی ٹارچ کہاں ہے؟'' عادل نے کرسٹل سے پوچھا۔

''لیفٹ سائڈ کی پاکٹ میں دیکھو۔'' کرسٹل نے

جواب دیا۔

عادل گہرے اندھیرے میں ٹٹولتا رہا لیکن پاکٹ میں ٹارچ نہیں تھی۔ ''نہیں ملی۔'' اس نے کہا۔

''تو رائٹ والے میں دیکھو۔'' کرسٹل بولی۔

وہ خیمے کی رائٹ پاکٹ دیکھنے کے لیے دائیں طرف گیا تو اس کا ہاتھ کسی زندہ چیز سے ٹکرایا۔ اس نے سمجھا شاید یہ ہمایوں کی پنڈلی ہے۔ لیکن وہ کرسٹل کا عریاں بازو تھا۔ اس نے ہاتھ کو ذرا سی حرکت دی تو اسے کرنٹ سا لگا۔ کرسٹل کا سارا بالائی جسم عریاں تھا۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

''یہ کیا حرکت ہے؟'' وہ پھنکارا۔

''اس کو حرکت نائیں، جسم کہتے ہیں۔ کیا توم کو ہام کا جسم پسند نائیں۔''

''اب میں تم کو سیدھا سیدھا تھپڑ مار دوں گا۔'' وہ سرسراتے لہجے میں بولا۔

''بس ایک تھپڑ...... اونلی ون؟'' اس کی شوخی برقرار تھی۔

عادل دھم سے دوبارہ لیٹ گیا۔ اس نے کروٹ بدل لی تھی اور منہ میں بڑبڑا کر اپنی ناراضگی کا اظہار بھی کیا تھا۔ خیمے میں تاریکی کے ساتھ ساتھ خاموشی بھی چھا گئی۔ اس خاموشی میں بس برفانی ہواؤں کی ''سائیں سائیں'' تھی یا ہمایوں کے بوجھل سانسوں کی گونج تھی۔ دو چار منٹ بعد کرسٹل نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔ ''توم سو گیا؟''

عادل نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ جواب کا مطلب یہ تھا کہ وہ نہیں سویا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے بس اس کے بالائی جسم کو محسوس کیا تھا معلوم نہیں کہ اس کی عریانی کی حدیں کہاں ختم ہوتی تھیں۔ وہ سراپا فتنہ اس سے صرف چند انچ کے فاصلے پر لیٹی ہوئی تھی۔ سراپا دعوت تھی۔ یہ کیسا کڑا امتحان تھا...... یہ کتنی سخت آزمائش تھی۔ عادل کی رگوں میں جوان خون سر پٹختا تھا۔ اسے لگا کہ اس کا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا ہے۔ شاید سرمد صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ کسی کے لیے باوقار ہنا اور بات ہے لیکن نہایت موزوں اور جذبات انگیز صورتِ حال کے باوجود خود کو باوقار رکھنا اور اپنا دامن آلودہ ہونے سے بچا لینا دیگر بات ہے۔ اس میں بہت تکلیف جھیلنا پڑتی ہے اور یہی تکلیف ہے جو قدرت کو محبوب ہوتی ہے اور قدرت کسی نہ کسی شکل میں تکلیف جھیلنے والے کو اس کا صلہ دیتی ہے اور عموماً یہ صلہ عشق کی مراد کی صورت میں ملتا ہے۔ سرمد صاحب کا چہرہ عادل کی آنکھوں کے سامنے آ گیا اور وہ اپنے دل و دماغ پر بے پناہ دباؤ جھیل کر خاموش لیٹا رہا۔

آخر کرسٹل نے دوبارہ کہا۔ ''آئی نو۔ یو آر ناٹ سلیپنگ۔'' عادل پھر بھی خاموش رہا۔ وہ ہاری ہوئی سی آواز میں بولی۔ ''او کے...... او کے عادل۔ ہام، توم سے کچھ نائیں مانگتا...... بس...... ایک بار توم کو گلے لگا کر تمہارے رخسار پر Kiss کرنا مانگتا۔ یہ تو ٹھیک ہائیں...... یہ تو سیکس نائیں ہے نا۔''

عادل کا دل سر پیٹنے کو چاہ رہا تھا۔ پھر بھی وہ حوصلہ کر کے بولا۔ ''میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔ پہلے تم کپڑے پہنو۔''

''او کے!'' اس کی آواز گہری تاریکی میں ابھری۔ اس کے بعد ایک دو منٹ کپڑوں کی مدھم سرسراہٹ سنائی دیتی رہی۔ تب وہ دوبارہ بولی۔ ''لیں، ہام اب ڈریس میں ہائیں۔''

''بس اب چپ کر کے سو جاؤ۔'' عادل نے سخت لہجے میں کہا۔

''اینڈ...... یور پرامس؟''

عادل کوئی مناسب سا جواب ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ قدرت نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ ہمایوں کو ایک دم شدید کھانسی ہوئی، وہ پہلے تو کسمسایا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''پانی......'' اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

کرسٹل نے فوراً چھوٹی ٹارچ روشن کی۔ یہ ٹارچ اس کے لباس میں ہی تھی۔ ہمایوں کھانستا چلا جا رہا تھا۔ کرسٹل نے اسے پانی پلایا، عادل نے اس کی پشت سہلائی۔ دو تین منٹ بعد وہ بہتر ہو گیا۔ اسے کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ عادل نے اسے ایک ''انرجی بار'' کھلائی، پھر وہ باتوں میں مصروف ہو گئے۔ کرسٹل کچھ بجھی بجھی ہوئی سی تھی۔

اگلا دن پھر بہت مشکل چڑھائی کا تھا۔ حسبِ سابق عادل سب سے آگے تھا۔ اس کے عقب میں رابے خاں خود آ رہا تھا۔ فولاد جان سب سے آخر میں تھا۔ یہ ایک ایسی ترتیب تھی جس میں کسی طرح کی مہم جوئی کی گنجائش نہیں تھی۔ رابے اور فولاد جان نے اس ترتیب کے ذریعے خود کو تقریباً محفوظ کر لیا تھا۔ اس نہایت مشکل پہاڑ پر چڑھتے ہوئے عادل کو یہی لگ رہا تھا جیسے وہ کسی پرانی کہانی کا کردار ہو۔ پہاڑ کی چوٹی پر کوئی قلعہ ہو، جہاں کسی نے اس کی شہزادی کو قید کر رکھا ہو اور وہ اسے چھڑانے کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر بلندیوں کی طرف جا رہا ہو۔ واقعی یہ سب کچھ شہزادی کے لیے ہی تو تھا۔ پھر اسے کنول شہزادی والی کہانی یاد آ گئی جو ماں اسے بچپن میں سنایا کرتی تھی۔ شہزادی

کنول کے پھول میں رہتی تھی اور کنول میں بہت اندھیرا تھا۔ پروانوں کا ایک گروہ ادھر سے گزرا۔ ان میں سے ہر کسی نے چاہا کہ شہزادی اس سے شادی کرلے۔ شہزادی نے شرط رکھی کہ جو اس کے لیے روشنی لائے گا، وہ اس کی دلہن بن جائے گی۔ پروانے روشنی کی تلاش میں نکل پڑے۔ کچھ دن بعد کنول کی طرف سے ایک جگنو کا گزر ہوا۔ اس کے پاس روشنی تھی۔ شہزادی نے اس سے شادی کرلی۔ بے خبر پروانے ابھی تک روشنی کی تلاش میں ہر رات اپنی جانیں قربان کرتے رہتے ہیں۔ یہ آخری فقرہ عادل کو ہمیشہ بہت متاثر کیا کرتا تھا، آج اس نے کچھ زیادہ ہی کیا۔ ایک آہنی میخ کے ہول میں رسا پروتے ہوئے اس کا پاؤں نیچے والی سپورٹ سے پھسلا۔ وہ جھٹکے سے پیچھے کی طرف گیا۔ ہیمر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ہزاروں فٹ گہرائی کی طرف پرواز کر گیا۔ رابے خاں کے منہ سے بے ساختہ ''اوہ'' کی آواز نکل گئی۔ نیچے کرسٹل بھی چلا کر رہ گئی۔ عادل ہوا میں معلق تھا، اس کا سر نیچے کی طرف تھا۔ حفاظتی رسے نے اسے گرنے سے بچالیا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ سیدھا ہوگیا اور اپنا توازن درست کرلیا۔

''کیا ہوا عادل؟'' نیچے سے سرمد صاحب نے بلند آواز سے پوچھا۔

''کچھ نہیں سر۔ ذرا پاؤں پھسل گیا تھا۔'' عادل نے بھی بلند آواز میں جواب دیا۔

اس نے یہ نہیں بتایا کہ اس کا پاؤں کیوں پھسلا تھا، اس نے اپنے خیال کی طویل پرواز کے بارے میں نہیں بتایا اور نہ ہی یہ بتایا کہ بچپن کی ایک کہانی کا سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں کے سامنے دلہن بنی شہزادی کا چہرہ آگیا تھا۔

اس روز انہوں نے قریباً ایک ہزار فٹ تک کلائمبنگ کی اور تھک کر چور ہوگئے۔ ابھی سہ پہر ہی ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر مزید چڑھائی جاری رکھ سکتے تھے مگر چونکہ کیمپ لگانے کے لیے ایک مناسب جگہ نظر آگئی تھی اس لیے وہ رک گئے۔ یہاں سے اردگرد کا نظارہ شاندار تھا۔ کے ٹو اور راکاپوشی کی چوٹیاں نئے زاویوں سے دکھائی دے رہی تھیں۔ موسم صاف تھا اس لیے انہیں اپنا کیمپ نمبر دو دکھائی دے رہا تھا لیکن صرف ایک سیاہ نکتے کی طرح۔ اوپر کی طرف اب وہ خطرناک ترین چڑھائی انہیں صاف نظر آرہی تھی جس کے لیے سرمد صاحب نے عادل کو خصوصی تربیت دی تھی اور اس کی صلاحیتوں پر بھروسا کیا تھا۔ یہ ایسی چڑھائی تھی جس کا نظارہ ہی دل میں خوف جگا دیتا تھا۔

نہایت بلندی پر ہونے کے باوجود پہاڑ کے اس حصے پر برف نہ ہونے کے برابر تھی۔ عمودی چڑھائیاں خطرناک ہوتی ہیں لیکن یہ عمودی سے بھی زیادہ تھی۔ ایک سائبان کی طرح ان کے سروں پر جھکی محسوس ہوتی تھی۔ اس کی نہایت سخت اور چکنی سطح اسے مزید خطرناک بناتی تھی۔ قریباً ایک ہزار فٹ کی چڑھائی کو طے کیے بغیر وہ لوگ بانگڑی چوٹی تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس کے سوا اس رخ پر کوئی اور راستہ ہی نہیں تھا۔ یہ چڑھائی ایک مہیب چیلنج کی طرح ان کے سامنے تھی اور وہ دوربینوں کے علاوہ خالی آنکھ سے بھی اسے وضاحت کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔

کیمپ لگ گیا تو طے شدہ پروگرام کے مطابق رابے خاں نے اعلان کیا۔ ''اس سے آگے ام صرف چار بندے جائے گا۔ یعنی سرمد صاحب، عادل، فولاد جان اور ام خود...... اگر موسم ٹھیک ہوا تو ام کل صبح گیارہ بجے کے قریب چڑھائی شروع کرے گا۔ اگر کسی کے ذہن میں کوئی سوال ہے تو پوچھ لے۔''

''آپ کا واپسی کتنے ٹائم میں ہوئیں گا۔'' کرسٹل نے اپنے مخصوص انداز میں سوال کیا۔

''امید ہے کہ ام لوگ کل شام سے پہلے یہاں واپس پہنچ جائے گا۔ کیا خیال ہے سرمد صیب؟'' رابے خاں نے سوالیہ نظروں سے سرمد صاحب کو دیکھا۔

''ہاں امید تو یہی ہے۔'' سرمد صاحب کا لہجہ سپاٹ تھا۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ اوپر جانا نہیں چاہ رہے۔ اب جو کچھ بھی ہو رہا ہے، مجبوری کے تحت ہو رہا ہے۔

رابے خاں بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''پھر بھی ام لوگ تم سے واکی ٹاکی پر رابطہ رکھے گا۔ اگر کوئی ویری والا معاملہ ہوا تو ام تم کو اطلاع دے گا۔''

تیز ہوا سے کرسٹل کی ٹوپی اڑ گئی۔ اس کے بال بکھر کر ہوا میں لہرانے لگے۔ ہمایوں اس کی ٹوپی پکڑنے کے لیے تیزی سے آگے گیا۔ فولاد جان تڑپ کے پیچھے ہٹ گیا اور رائفل ہمایوں کی طرف سیدھی کرلی۔ ''رک جاؤ۔'' وہ گرجا۔ ہمایوں جہاں کا تہاں رک گیا۔ یوں لگا کہ اگر وہ ایک قدم بھی مزید آگے بڑھتا تو فولاد جان اس پر فائر کر دیتا۔ رابے خاں نے خود آگے بڑھ کر اڑتی ٹوپی اٹھائی اور کرسٹل کے حوالے کی۔ کرسٹل کا رنگ برف کی طرح سفید نظر آنے لگا تھا۔ فولاد جان نفرت انگیز انداز میں پھنکارا۔ ''تم سے دس بار بکواس کیا ہے کہ کسی طرح کا تیزی نہ دکھاؤ، ورنہ

مارے جاؤ گے۔ ام سے زیادہ برداشت نہیں ہوگا۔ امارے بھائی کو مار کر تم نے امارا برداشت چھین لیا ہے۔''

وہ چاروں اپنی جگہ ساکت وجامد کھڑے رہ گئے۔ آج بھی رابے خاں نے سرمد صاحب کو بطور یرغمال اپنے خیمے میں چلنے کا حکم دیا۔ عادل، ہمایوں اور کرسٹل اپنے خیمے میں آ گئے۔ عادل اپنے کندھوں میں تھوڑا سا کھچاؤ محسوس کر رہا تھا۔ سرمد صاحب نے عادل کے کندھوں کو اچھی طرح ٹٹولا۔ پھر کرسٹل سے کہا کہ عادل کو فزیوتھراپی کی ضرورت ہے۔ بہتر ہے کہ وہ سب سے پہلے اچھی طرح اس کی پشت اور کندھوں کا مساج کر دے۔ کرسٹل نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

تاہم کچھ دیر بعد جب وہ تینوں کھانا کھانے کے بعد لیٹے اور کرسٹل نے اپنی آستینیں اڑس کر عادل کے مساج کی تیاری کی تو عادل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''نہیں، میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا۔''

''عادل! سر نے ابھی تمہارے سامنے کیا کہا؟''

''سر کو میں خود جواب دے لوں گا۔ مساج سے میرے مسل اور سخت ہونے لگتے ہیں۔ میں ہمایوں بھائی سے کہتا ہوں، وہ تھوڑا سا دبا دیتے ہیں۔''

''دیکھو عادل۔ کل بہت امپورٹنٹ ڈے ہے، تمہیں فلی فٹ ہونا چاہیے ہو کیں گا۔''

''میں نے کہا نا۔ میں ضرورت نہیں سمجھتا۔'' عادل نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ عادل اوندھا لیٹ گیا اور اس نے ہمایوں سے کہا کہ وہ اس کے کندھوں کو تھوڑا دبا دے۔ ہمایوں اس ساری صورتِ حال کو سمجھ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر متذبذب رہا۔ جب عادل نے اصرار کیا تو وہ اس کی طرف بڑھ آیا۔

کرسٹل خاموشی سے سلیپنگ بیگ میں گھس کر لیٹ گئی۔ کل واقعی ایک اہم ترین دن تھا۔ بس چالیس پچاس میٹر کے بعد ہی چڑھائی کا وہ مشکل ترین پورشن شروع ہو جاتا تھا جس سے ان کی مہم کی ناکامی یا کامیابی کا فیصلہ ہونا تھا۔ اس کے بعد حالات ٹھیک رہتے تو انہیں سہ پہر چار بجے تک چوٹی پر پہنچ جانا تھا۔ چوٹی پر کیا صورت حال پیش آنا تھی، اس کے بارے میں ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ جب تک سرمد صاحب ان دونوں پاؤنڈوں کو قدیم زیورات تک نہ پہنچاتے، وہ اور عادل دونوں محفوظ تھے۔ زیورات تک پہنچنے کے بعد ان دونوں پاؤنڈوں کا رویہ کیا ہوگا، اس بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ عادل کا ذاتی خیال تھا کہ رابے اور فولاد کو زیورات کی اصل جگہ تک پہنچانے سے پہلے سرمد صاحب کو ایک دو شرطیں رکھنی چاہئیں۔ کم از کم اتنا تو ہو کہ وہ رابے خاں سے اپنا مقبوضہ پستول واپس لے لیں۔ انہی باتوں کے بارے میں سوچتے سوچتے عادل کو نیند آنے لگی۔ ہمایوں مسلسل اس کی گردن اور کندھوں کے مساج میں مصروف تھا۔ عادل نے ہمایوں سے بھی سونے کی درخواست کی۔ دونوں کچھ دیر اپنے اپنے سلیپنگ بیگ میں لیٹے باتیں کرتے رہے۔ کرسٹل شاید سو چکی تھی۔ باہر تیز ہوائیں برفانی تودوں سے سر پٹخ رہی تھیں۔ بلندی 22 ہزار فٹ کے قریب تھی اور برفستان کی ایک نہایت برفیلی رات ویران پہاڑی سلسلوں کو اپنے پنجوں میں جکڑ چکی تھی۔ کچھ دیر بعد عادل سو گیا۔

دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو خیمے میں نیم تاریکی تھی اور ہمایوں کے دھیمے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ چار بجے تھے اور ابھی سپیدۂ سحر نمودار نہیں ہوا تھا۔ اچانک اسے سسکیوں کی مدھم آواز آئی۔ یہ کرسٹل تھی۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی اور رو رہی تھی۔ پہلے تو عادل نے سوچا کہ بے خبر بنا رہے لیکن پھر اس سے رہا نہیں گیا۔

''کیا بات ہے کرسٹل؟'' اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

اس نے چونک کر عادل کو دیکھا اور سر پھر گھٹنوں پر جھکا دیا۔

''میری کوئی بات بری لگی ہے؟'' عادل نے پوچھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''نا ئیں، توم بہت اچھا۔ ہام برا، ہام نے توم کو بہت تنگ کیا۔ سوری ویری سوری۔ ہام کو 'نا' نے ''دے دو۔''

عادل نے طویل سانس لے کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''کرسٹل! میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا۔ تم بہت اچھی اور دلکش لڑکی ہو۔ کوئی مرد بھی تم کو ٹھکرانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ میرا جو رویہ ہے، اس کے پیچھے ایک مجبوری ہے اور میں تمہیں اس کے بارے میں بتا چکا ہوں۔''

وہ توقف سے بولی۔ ''لیکن...... ہام نے توم سے کوئی بہت بڑا چیز تو نائیں مانگا تھا عادل۔ بس ایک چھوٹا سا...... دو چار سیکنڈ کا خوشی مانگا تھا۔ جیسے...... ایک بٹرفلائی کو چند سیکنڈ کے لیے اپنی مٹھی میں بند کیا جائے...... اور پھر...... ریلیز کر دیا جائے۔ پھر اس کی یاد کو ایک فوٹو کی طرح اپنے البم میں لگا لیا جائے...... لیکن اگر توم کو یہ بھی برا لگا، تو ہام اس کے لیے مافی مانگتا۔''

عادل نے اسے کندھوں سے تھام کر اپنی طرف گھمایا

اور گلے سے لگالیا۔ وہ اس سے چمٹ گئی۔ اس کا سینہ ہچکیوں سے دہل رہا تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو عادل نے اپنی گردن پر محسوس کیے۔ وہ اسی طرح عادل کو اپنے ساتھ بھینچے بیٹھی رہی۔ تب اس نے کئی بار بڑے جذباتی انداز میں عادل کے رخساروں کو چوما اور دوبارہ اس کے ساتھ لگ گئی۔ اس کی انگلیاں عادل کے سر کے بالوں میں الجھی ہوئی تھیں۔

کچھ دیر بعد وہ پیچھے ہٹی، نیلی آنکھوں میں اب بھی آنسو تھے۔ لیکن ان آنسوؤں میں اب خوشی کی چمک بھی تھی۔ ''توم بہت آچھا عاڈل! ہام توم کو زندگی بھر بھول نائیں سکتا۔ اس کے ساتھ ہام زندگی بھر گاڈ سے ''پرے'' کرے گا کہ وہ توم کو اور شہزادی کو بہت خوش رکھے۔''

عادل نے مسکرا کر اس کے لہجے کی نقل کی۔ ''اور ہام بھی توم سے ایک بات کہنا مانگتا...... جب توم کی لائف میں کوئی آچھا سا لڑکا آئے...... اور ضرور آئے گا...... تو اس سے فوراً شادی کرلو۔ عورت کا زندگی ایک ہسبینڈ اور ایک ہوم کے بغیر نامکمل۔''

''تو ٹھیک ہے، توم ہام کے لیے کوئی اچھا سا لڑکا ڈھونڈنا۔ جو ہام کا لائف پارٹنر بنے۔ کیا ایسا لڑکا ملنا ہوسکیں گا؟؟''

عادل بولا۔ ''تمہارے دیس میں تو مشکل سے ملنا ہوسکیں گا۔ لیکن ہمارے ہاں شاید اتنا مشکل نہیں ہے۔''

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ تب دوبارہ عادل کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''ہام نے کوئی غلط لفظ بولا ہو تو ہام اس کے لیے مافی مانگتا۔''

''یہی تو غلط بول رہی ہو۔'' عادل نے کہا۔ ''یہ مافی نہیں معافی ہوتا ہے...... معافی۔''

''مافی...... مافی...... مافی۔'' کرسٹل نے تین چار بار دہرایا اور پھر خود ہی ہنسنے لگی۔

☆☆☆

چند گھنٹے بعد سرمد صاحب، عادل، فولاد اور راب خاں اس سفر کے مشکل ترین مرحلے میں داخل ہوچکے تھے۔ یہ ایک چمکیلی دوپہر تھی۔ کے ٹو اور اس کی نواحی چوٹیاں بادلوں کے آنچل اتار کر سینہ تانے کھڑی تھیں۔ گہرا نیلا آسمان ان پر جھکا ہوا تھا۔ گہری خاموش وادیاں محویت سے یہ ملاپ دیکھ رہی تھیں۔ بہرحال یہ دلکش منظر ان چاروں کے لیے زیادہ دلکش نہیں تھا۔ ان کے سامنے ایک کٹھن ترین چڑھائی تھی۔ نیچے نگاہ ڈالتے تھے تو ایسی ہولناک گہرائیاں منہ پھاڑے کھڑی تھیں جن کی تہ کا نظر آنا ناممکن تھا۔ یہاں غلطی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ جس سطح پر انہیں چڑھنا تھا، وہ عمودی سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ کوہ پیماؤں کے لیے ایسی چڑھائیاں ایک چیلنج سے کم نہیں ہوتیں۔ لیکن اصل چیلنج اس شخص کے لیے ہوتا ہے جو ٹیم میں سب سے آگے ہوتا ہے۔ اسے راستہ بنانا ہوتا ہے، میخیں گاڑنا ہوتی ہیں یا ڈرل کرکے بولٹنگ کرنا ہوتی ہے تاکہ رسوں کا حفاظتی بیک اپ مہیا کیا جاسکے۔ طاقتور خشک بیٹریوں سے چلنے والی دو ڈرل مشینیں عادل کے پاس موجود تھیں۔ اضافی خشک بیٹریاں پیچھے آنے والے فولاد جان کے پاس تھیں۔ عادل یہاں سب سے آگے تھا اور اصل چیلنج بھی اسے ہی درپیش تھا۔ وہ ڈرل کرتا اور بولٹ کستا ہوا اوپر کی طرف سرکنے لگا۔ یہ راستہ نہیں پل صراط تھا۔ ان کے دل شدت سے دھڑک رہے تھے۔ پیشانیوں پر پسینا تھا۔ ان دشوار ترین لمحوں میں بس دو چہرے تھے جو گاہے بگاہے عادل کی آنکھوں کے سامنے آتے تھے۔ اس کی والدہ کا چہرہ اور شہزادی کا چہرہ۔ وہ ان دونوں چہروں کو خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ دنیا بھر کی راحتیں ان کی نذر کرنا چاہتا تھا اور وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر آج وہ کامیاب ہوگیا تو یہ راحتیں اور خوشیاں ان کی نذر کرسکے گا۔ ماں کی غیر مرئی آواز جیسے رہ رہ کر اس کے کانوں سے ٹکراتی تھی۔ ''سنبھل کے عادے پتر...... دھیان سے، آرام سے۔''

ماں کی آواز معدوم ہوتی تو شہزادی کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگتی۔ ''عادل! میرا مان رکھنا۔ میرا سر میرے گھر والوں کے سامنے جھکنے نہ دینا۔ میں دن رات تمہارا انتظار کررہی ہوں اور مجھے یقین ہے تم اباجی کی شرط پوری کرکے دکھاؤ گے۔ لیکن جو کچھ بھی کرنا، احتیاط سے، دھیان سے۔ اللہ نہ کرے تمہیں کچھ ہوا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی۔''

عادل کے بازو شل ہورہے تھے۔ ڈرل کرتے ہوئے اچانک اس کا پاؤں پھسلا۔ وہ جھٹکے سے نیچے کو گیا۔ ایک بولٹ اکھڑ گیا لیکن دوسرے بولٹ نے اپنا کام کیا۔ وہ مضبوطی سے جما رہا اور عادل مزید نیچے جانے سے رک گیا۔ تاہم ڈرل مشین اس کے ہاتھ سے نکل گئی اور ہزاروں فٹ کی اندھی گہرائی کی طرف نکل گئی۔ یہ سب کچھ دو یا تین سیکنڈ میں ہوا۔ عادل سمیت سب کی دھڑکنیں جیسے تھم گئی تھیں۔ جلد ہی وہ دوبارہ اپنا بیلنس حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ پیچھے آنے والے سرمد صاحب نے اس سے تسلی کے چند بول بولے اور وہ پھر سے اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ صرف ایک دن پہلے بھی تو ایک اسی طرح کا واقعہ پیش آیا تھا، جب

وہ پھسلا تھا اور ہتھوڑی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ اس وقت دلہن بنی شہزادی اس کے ذہن میں آئی تھی لیکن آج تو ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔

پھر ایک اور آواز عادل کے کانوں میں گونجنے لگی۔ یہ پاؤندہ بستی کے نشئی عامل مالکانے زادہ کی آواز تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ''اوپر مت جاؤ، وہ موت تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ وہ تم پر جھپٹے گی۔ تم کو برف کی قبروں میں دفن کر دے گی۔''

اس آواز کے اثر کو زائل کرنے کے لیے سرمد صاحب کے کہے ہوئے فقروں کی بازگشت عادل کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''واہمے ہمیں کمزور کرتے ہیں۔ انسان کی تقدیر صرف اور صرف اس کے عمل سے جڑی ہوتی ہے۔ عمل اور مسلسل عمل۔ جو لوگ اپنے ارادوں پر کاربند رہتے ہیں، وہ دریاؤں کے رخ موڑ دیتے ہیں۔ وہ تاج محل تعمیر کرتے ہیں اور چاند پر قدم رکھ کے دکھا دیتے ہیں۔''

اس آخری آواز نے عادل کے اندر اضافی توانائی پیدا کر دی۔ وہ اردگرد سے بے خبر ہو کر چیونٹی کی رفتار سے اوپر کی طرف کھسکتا رہا اور اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے راستہ بناتا گیا۔ ہمت بالکل جواب دے جاتی تو وہ دو چار منٹ کے لیے رک جاتا اور تب ایک بار پھر کام شروع کر دیتا۔ کسی وقت تو اس کا زاویہ اس چھپکلی کی طرح ہو جاتا جو چھت پر رینگ رہی ہو۔ اس قسم کی چڑھائی میں میخوں اور بولٹس کے اکھڑنے کا اندیشہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔

وہ واقعی پل صراط جیسا راستہ تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کے نیچے برف کا دوزخ تھا۔ آخر اس کی جاں توڑ کوششیں رنگ لائیں اور وہ یہ خطرناک ترین 700 فٹ طے کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس نے رسّے کے ذریعے جو سپورٹ مہیا کی تھی، اس نے پیچھے آنے والوں کے لیے مشکلات کو نصف سے بھی کم کر دیا۔ سرمد صاحب تو خیر کلائمبنگ کے ماہر تھے ہی، رابے خاں اور فولاد جان بھی جدید طریقہ کار کے مطابق مشکل چڑھائیاں چڑھ چکے تھے۔ انہوں نے سست روی لیکن تسلسل کے ساتھ اپنا کام مکمل کیا اور عادل کے پاس پہنچ گئے۔ اب چوٹی انہیں بالکل سامنے نظر آ رہی تھی۔ یہ باقی ماندہ چڑھائی بھی مشکل تھی لیکن چونکہ انہوں نے مشکل ترین راستہ طے کر لیا تھا، اس لیے یہ چڑھائی آسان محسوس ہو رہی تھی۔ عادل نے خوشگوار لہجے میں سرمد صاحب کو مخاطب کیا اور بولا۔ ''سر! لگتا ہے کہ یہ چڑھائی تو میں بھاگتا ہوا چڑھ جاؤں گا۔''

سرمد صاحب بولے۔ ''اس لیے سیانے لوگ کہتے ہیں کہ مشکل ترین کام پہلے کر لو پھر اس سلسلے کے دیگر مشکل کام آسان لگنے لگیں گے۔ بہرحال ویل ڈن۔'' انہوں نے عادل کی پیٹھ تھپکی۔

رابے خاں اور فولاد جان سات آٹھ فٹ کے فاصلے پر موجود تھے۔ چھوٹی رائفل فولاد جان کے گلے میں تھی لیکن وہ کسی بھی وقت اسے استعمال کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ وہ گاہے بگاہے رائفل کو ٹٹول بھی لیتا تھا جیسے اس کے صحیح رخ کا اندازہ کر رہا ہو۔ سرمد صاحب اور عادل سے اپنا درمیانی فاصلہ بھی اس نے مسلسل برقرار رکھا ہوا تھا۔ یہاں اس بلندی پر ہوا بے حد تیز تھی اور اس میں برف کے ذرات تھے۔ ان سب کو اپنے گلاسز بار بار صاف کرنے پڑ رہے تھے۔ اب انہیں آکسیجن سلنڈرز کی ضرورت بھی پڑ رہی تھی۔

عادل باقی کے دو تین سو فٹ طے کرنے کے لیے... بے قرار تھا۔ بادل کے کسی گہرے ٹکڑے نے چوٹی کو ڈھانپ لیا تھا اور سرمد صاحب بادل کے گزرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''عادل! کوہ پیما کو کسی بھی وقت کسی بھی مرحلے کو آسان نہیں لینا چاہیے۔ اضافی جوش سے بے پروائی پیدا ہوتی ہے اور یہ بے پروائی کبھی کبھی سخت نقصان کرتی ہے۔''

انہوں نے کچھ دیر انتظار کرنے کی ہدایت کی اور آخری چڑھائی کے سلسلے میں ضروری باتیں بتائیں۔

عادل کی بے چین نظریں اس کھنڈر کو تلاش کر رہی تھیں جو ان کی منزل تھا لیکن فی الوقت اس کے آثار کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔

قریباً پندرہ منٹ بعد وہ دوبارہ چڑھائی کے لیے تیار ہوئے۔ ترتیب وہی پہلے والی تھی۔ سب سے پہلے عادل پھر رابے خاں پھر سرمد صاحب اور آخر میں فولاد جان جس کا چہرہ چٹان کی طرح سخت نظر آتا تھا۔ یہ برفانی چڑھائی تھی لیکن برف اتنی سخت تھی کہ اس میں اور پتھر میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ ایک جاں گسل کوشش نے انہیں بالآخر چوٹی پر پہنچا دیا۔ بانگڑی کی وہ فلک بوس چوٹی جو کئی ماہ سے ان کے لیے ایک چیلنج بنی ہوئی تھی۔ عادل جب پہاڑ کی بلند ترین جگہ پر کھڑا ہوا تو فتح کے احساس نے اسے سرشار کر دیا...... اب اسے دوسری فتح کا انتظار تھا۔ وہ کھنڈر...... جس کا اسرار انہیں یہاں تک کھینچ کر لایا تھا۔ اس نے دھند آلود فضا میں اردگرد نگاہ دوڑائی۔ ''وہ دیکھو۔'' سرمد صاحب نے اپنی انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا۔

ہر طرف پھیلی ہوئی برف کی سفیدی کے درمیان،

عادل کو کچھ سیاہ نشان سے نظر آئے۔ یہ قریباً تین سو فٹ دور اور قدرے ڈھلوان پر تھے۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ یہ ایک پتھریلی دیوار ہے جس کا کچھ حصہ برف میں سے جھانک رہا ہے۔ تو یہ تھا وہ قدیم کھنڈر جس کی کشش نے انہیں ان گنت مشکلات میں سے گزارا تھا اور یہاں پہنچایا تھا۔

سرمد صاحب نے چوٹی پر ایک چھوٹا سا جھنڈا گاڑا۔ تصویریں اور دو چار ویڈیو کلپ بنائے گئے۔ پھر وہ لوگ انتہائی تیز ہوا میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے نشیب میں واقع کھنڈر کی طرف بڑھنے لگے۔ یہ پہاڑ کی وہ سائڈ تھی جس پر کہیں بہت نیچے جا کر پاؤندو بستی بھی آباد تھی۔ اس جانب کے سارے مناظر ان کے لیے نئے تھے۔ کم از کم عادل کے لیے تو نئے ہی تھے۔ بادلوں کے مرغولے حدِ نگاہ کو محدود کر رہے تھے ورنہ وہ سینکڑوں میل تک پھیلی ہوئی وادیاں اور چوٹیاں دیکھ سکتے۔

عادل کا دل شدت سے دھڑکنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے برف میں دبے ہوئے قدیم کھنڈر کے آثار دیکھے اور اس کے ذہن میں وہ کہانی تازہ ہونے لگی جو ایک رات کیمپ میں سرمد صاحب نے اسے سنائی تھی۔ بلند حوصلہ راجپوت قبیلے اور جابر سردار دشوا ناتھ کی کہانی۔ جب محصور ہو جانے والوں نے اپنی عورتوں کو چتا میں ڈالا اور خود سب کے سب کٹ مرے۔ عادل بڑی محویت سے کھنڈر کو دیکھتا رہا۔ کھنڈر کا قریباً 95 فیصد حصہ تو ضرور برف میں دبا ہوا تھا۔ بمشکل ایک بیرونی دیوار کا تیس چالیس مربع فٹ کا حصہ نظر آ رہا تھا۔ یہ قدیم دیوار وزنی پتھروں کی بنی ہوئی تھی اور صدیاں گزرنے کے بعد اور سخت ترین موسم جھیلنے کے بعد بھی پوری استقامت سے اپنی جگہ موجود تھی۔

''اندر جانے کا راستہ تو شاید دائیں طرف ہے۔'' فولاد جان نے ٹھٹھری ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

''نہیں، یہ ہمارے بالکل سامنے ہے لیکن نظر نہیں آ رہا۔ بہت زیادہ برف پڑی ہوئی ہے اس طرف۔'' سرمد صاحب نے جواب دیا۔

''تو پھر اندر جانے کے لیے ام کو اپنے ہاتھوں سے راستہ بنانا پڑے گا۔'' فولاد جان بولا۔ سردی اتنی زیادہ تھی کہ وہ بہ مشکل بول پا رہے تھے۔ جب وہ بات کرتے تھے، منہ سے بھاپ کے گاڑھے مرغولے برآمد ہوتے تھے۔

''عمارت کے دروازے تک پہنچنے کے لیے ہمیں کوئی پندرہ بیس فٹ برف کھودنا پڑے گی اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔'' سرمد صاحب نے کہا۔

اس معاملے پر ان تینوں میں دس پندرہ منٹ گفتگو ہوئی۔ عادل بس خاموش تماشائی بنا کھڑا رہا۔ سرمد صاحب کا خیال تو یہی تھا کہ نیچے کی برف پتھر کی طرح سخت ہے اور اس میں راستہ بنانا آسان کام نہیں ہوگا۔ فولاد جان کا خیال تھا کہ دیوار پر کوشش کی جائے۔ اسے توڑا جائے یا پھر کھسلا کر کے اس میں راستہ بنا لیا جائے۔ دھماکا خیز مواد ان کے سامان میں کسی ایسے ہی مقصد کے لیے رکھا گیا تھا۔ یہ مواد طاقتور ڈائنامیٹ اسٹکس کی صورت میں موجود تھا۔

سرمد صاحب نے کہا۔ ''میرے خیال میں یہاں دو تین طاقتور دھماکے کرنا ہمارے لیے کسی بھی طرح اچھا نہیں ہوگا۔ یہ کافی عمودی ڈھلوان ہے اور برف سے ڈھکی ہوئی ہے۔ برف نے جگہ چھوڑی تو کافی مشکل ہو جائے گی۔''

''ام کو پتا ہے..... اور اچھی طرح پتا ہے۔ یہ بہت سخت برف ہے۔ یہ اتنی آسانی سے حرکت نہیں کر سکتا۔'' فولاد جان نے بیزار لہجے میں کہا۔ رائفل اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ ایک لمحے کے لیے بھی ان کی طرف سے غافل نہیں ہوتا تھا۔ خاص طور سے وہ اپنا اور عادل کا درمیانی فاصلہ ضرور برقرار رکھتا تھا۔

سرمد صاحب نے ٹیلی اسکوپ سے برف کا بہ غور جائزہ لیا اور آنکھیں شیشوں سے لگائے لگائے بولے۔ ''ہمیں اس ڈھلوان کا زاویہ بھی تو دیکھنا چاہیے۔ یہ کم از کم ستر اسی درجے کا ہے۔ جب وائبریشن ہوگی تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

اب شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ وہ اس کھنڈر سے تھوڑا ہٹ کر اور نیچے چلے گئے اور ایک مناسب جگہ ٹینٹ کے لیے چن لی۔ اتنی بلندی پر اور اتنی مختصر جگہ پر کیمپ لگانا ایک کارِ دشوار ہوتا ہے۔ جگہ اتنی مختصر تھی کہ ٹینٹ کا کھڑا ہونا بھی محال نظر آ رہا تھا۔ بہرحال وہ کسی نہ کسی طور کر گزرے، کیونکہ وہ اس کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ یہاں آکسیجن کی کمی تھی اور سردی بھی انتہا درجے کی تھی۔ وہ رات جیسے تیسے گزر گئی۔ فولاد جان نے بس شروع میں ڈیڑھ دو گھنٹے نیند لی۔ پھر وہ ساری رات جاگتا رہا اور ان دونوں کا پہرا دیتا رہا۔ اگلا دن ان سب کے لیے اہم ترین تھا۔ آج انہیں اس قدیم عمارت کے اندر جانا تھا جس کے کسی تہ خانے میں ساڑھے تین سو سال پرانے زیورات اور قیمتی پتھر جوں کے توں موجود تھے۔ اور اس دفینے کی درست جگہ کا علم صرف اور صرف سرمد صاحب کو تھا۔

صبح پو پھٹنے سے پہلے ہی فولاد جان اور دراب خان ٹینٹ سے باہر نکل گئے۔ ان کی بے تابی عروج پر پہنچ چکی

تھی۔ ان کی نگاہیں مسلسل، ذرا بلندی پر واقع پتھریلی دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ فیصلہ رات کو ہی ہو گیا تھا کہ کھنڈر کے دروازے تک جانے کے لیے برف نہیں کھودی جائے گی بلکہ دیوار توڑی جائے گی اور ڈائنامیٹ کے ذریعے اندر جانے کا راستہ بنایا جائے گا۔

خیمے میں اب سرمد صاحب اور عادل ہی تھے۔ سرمد صاحب نے عادل کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''عادل! تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔ شاید یہ بات تمہیں عجیب لگے لیکن ہمارے پاس اب صرف ایک یہی راستہ ہے۔''

''آپ بتائیں جناب۔'' عادل ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''ہم ان لوگوں کے ساتھ کھنڈر میں نہیں جا رہے۔''

''کیا...... مطلب...... سر؟''

''ہمارے پاس یہاں سے نکل بھاگنے کا وہ بہترین موقع ہوگا، جب یہ لوگ ڈائنامیٹ پھاڑیں گے۔ دھماکے کے وقت ان دونوں کی پوری توجہ دیوار کی طرف ہی ہوگی۔ ہم کچھ فاصلے پر موجود رہیں گے اور اپنے موقع کا انتظار کریں گے۔''

''لیکن سر! ہم جس مقصد کے لیے یہاں آئے ہیں......؟''

''وہ پورا ہو چکا ہے۔'' سرمد صاحب نے ترت جواب دیا۔ عادل اپنے سلیپنگ بیگ میں لیٹا ہوا تعجب سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں سر؟''

سرمد صاحب نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''چند دن پہلے جب تم نے نیچے ایک کوٹھری میں مالکانے زادے کو پکڑا تھا تو اس نے میرے بارے میں اور اس کھنڈر کے بارے میں کیا کہا تھا؟''

عادل چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ ''اس وقت وہ شراب کے نشے میں وحشت تھا سر۔ اس نے کہا تھا کہ کھنڈر میں کچھ نہیں ہے۔ جو تھا، وہ بہت پہلے نکالا جا چکا ہے...... اور جو بندہ یہ کہہ رہا ہے کہ وہاں اب بھی کچھ ہے، وہ غلط بیانی کر رہا ہے۔ یا پھر...... اسے پتا نہیں ہے۔ اس نے کچھ بے ہودہ باتیں کہیں، جس پر میں نے اس کا گریبان پکڑنا چاہا مگر رحری وغیرہ نے میرا راستہ روک لیا۔ اس نے عاملوں والا انداز اختیار کر کے ہمیں ڈرانے کی کوشش بھی کی۔ پتا نہیں کیا کیا کہتا رہا...... موت ایک بڑے پرندے کی صورت وہاں بیٹھی ہے۔ وہ تم پر جھپٹ پڑے گی...... مار دے گی......''

سرمد صاحب نے روزن سے باہر دیکھا۔ رابے اور فولاد و جان مگن تھے۔ بہرحال رائفل بدستور فولاد کے ہاتھ میں تھی اور وہ گاہے بگاہے ٹینٹ کی طرف بھی نگاہ اٹھا لیتا تھا۔ سرمد صاحب نے عادل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں یہ کہوں عادل کہ اس شرابی مالکانے زادہ نے جو کچھ کہا، وہ بالکل درست تھا تو پھر......''

عادل کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ وہ بے حد حیرت سے سرمد صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اپنے دھیمے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''ہاں عادل! مالکانے زادہ جیسا بھی ہے جو بھی ہے لیکن وہ بات سو فیصد ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہاں تہ خانے میں اب کچھ نہیں ہے۔ لوہے کا ایک زنگ آلود باکس ہے جس کی قیمت ہزار دو ہزار سے زیادہ نہیں ہوگی۔ مالکانے زادہ کی یہ بات بھی کافی حد تک درست ہے کہ میں تم لوگوں سے غلط بیانی کرتا رہا ہوں...... اور دھوکا دیتا رہا ہوں لیکن یہ دھوکا کسی بری نیت سے نہیں تھا اور نیت اچھی ہو اور نتیجہ بھی اچھا ہو تو پھر دھوکا...... دھوکا نہیں رہتا۔''

عادل اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر حیرت کی یورش تھی۔ سرمد صاحب سر کے نیچے بازو رکھے لیٹے تھے اور اسی بھید بھرے انداز میں عادل کو دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگے۔ ''عادل! میں تم سے شرمندہ ہوں لیکن میں نے جو کچھ کیا تمہاری بہتری کے لیے کیا۔ میں تمہیں ہر صورت...... کسی بھی قیمت پر یہاں ان پہاڑوں میں لانا چاہتا تھا اور مجھے پتا تھا کہ تم صرف ایک ہی صورت میں ان ساری تکلیفوں اور مصیبتوں سے گزر سکتے ہو کہ تمہیں ایک اچھی رقم ملنے کی امید ہو۔ اتنی رقم جو شہزادی کو حاصل کرنے میں تمہاری مدد کر سکے۔''

''سر...... سر! میں معافی چاہتا ہوں لیکن مجھے آپ کی باتیں بالکل بھی سمجھ میں نہیں آ رہیں۔ آپ درست کہہ رہے ہیں تو پھر...... آپ مجھے کیوں یہاں لانا چاہ رہے تھے۔ اور ابھی...... آپ نے یہ بھی کہا نا کہ جو مقصد آپ حاصل کرنا چاہتے تھے، وہ آپ نے کر لیا ہے......؟''

''ہاں عادل! جن زیورات کے لیے...... یا جس دولت کے لیے تم یہاں آئے تھے، وہ تمہیں مل گئی ہے۔ بے شک وہ دولت تمہیں مل گئی ہے۔ وہ تمہارے پاس ہے اور اب اسے تم سے کوئی چھین بھی نہیں سکتا۔''

''آپ کس دولت کی بات کر رہے ہیں سر؟''

''اس دولت کی۔'' سرمد صاحب نے کہا اور اپنے کیمرے کی اسکرین عادل کے سامنے کر دی۔ اسکرین پر

عادل کی پرسوں کھینچی جانے والی ایک تصویر تھی۔ وہ نہایت خطرناک ڈھلوان پر رسوں کے ذریعے چڑھ رہا تھا اور اس کے نیچے ہزاروں فٹ گہری کھائیاں منہ پھاڑے کھڑی تھیں۔ اس وسیع منظر میں وہ خود ایک چیونٹی کی طرح دکھائی دے رہا تھا لیکن اس چیونٹی کی ہمت اور دلیری کو دیکھا جاتا تو وہ ان پہاڑوں سے بلند تھی۔

"دیکھو عادل! یہی ہے وہ بے مثال دولت جو تمہیں اس دشوار ترین سفر میں حاصل ہوئی ہے۔ قدرت نے تمہیں بلندی کی طرف جانے کی خاص صلاحیت عطا کی تھی۔ تمہاری یہ حیرت انگیز صلاحیت اس دور دراز گاؤں میں کھجور کے درختوں پر چڑھ چڑھ کر ضائع ہو رہی تھی۔ اب تم اس صلاحیت کا درست ترین استعمال کرنے کے قابل ہو چکے ہو۔ تم نے ہم سب کو ورطۂ حیرت میں ڈالا ہے۔ تم جانتے نہیں ہو عادل! تم کیا حاصل کر چکے ہو۔"

سخت سردی کے باوجود عادل کو لگا کہ اس کے جسم کے سارے مسام پسینا اگل رہے ہیں۔ یہ کیسے انکشافات کر رہے تھے سرمد صاحب۔ وہ جیسے گنگ سا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہنے میں کامیاب ہوتا یا سرمد صاحب بات کو آگے بڑھاتے، فولاد جان اور رابے خاں خیمے کی طرف آتے دکھائی دیے۔ وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

دن کا اجالا اب تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ دبیز دھند کی تہ پتلی ہو رہی تھی اور بانگڑی کی چوٹی کا ہیولا دکھائی دینے لگا تھا۔ تیز ہوائیں مسلسل ان کے قدم اکھاڑ رہی تھیں۔ خیمے میں داخل ہوتے ہی رابے خاں نے کہا۔ "امارا خیال ہے کہ اب ام کو وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اتنا بلندی ہو تو موسم کسی بھی وقت خراب ہو سکتا ہے۔"

فولاد جان چونکہ ہر وقت رائفل کے ساتھ ہوتا تھا اس لیے رابے خاں نے ڈائنامیٹ والا وزنی باکس اٹھایا۔ عادل نے اس کی مدد کو آگے بڑھنا چاہا لیکن اس نے منع کر دیا۔ وہ لوگ کوئی چھوٹے سے چھوٹا رسک بھی نہیں لے رہے تھے اور چاہتے تھے کہ عادل اور سرمد صاحب ان سے فاصلے پر رہیں۔ وزنی باکس کے ساتھ چڑھائی چڑھ کر رابے خاں دیوار کے اس حصے کے پاس پہنچ گیا جو برف کی دبیز تہوں کے اندر سے نظر آ رہی تھی۔ ایک ڈرل مشین ابھی تک ان کے سامان میں موجود تھی اور اس کی فاضل بیٹریاں بھی تھیں۔

رابے خاں نے عادل کو حکم دیا۔ "چلو، بچہ جی! تم دیوار میں سوراخ کرو۔"

عادل کو پتا تھا کہ یہ مشکل کام اسی سے کرنے کو کہا جائے گا۔ اس نے ڈرل مشین کے ساتھ ایک موٹا بر بانچ کیا اور دس پندرہ منٹ کے اندر دیوار میں تین جگہ سوراخ کر دیے۔ ان سوراخ میں ڈائنامیٹ اسٹکس رکھی جا سکتی تھیں۔ اس دوران میں سرمد صاحب دور کھڑے رہے تھے اور ٹیلی اسکوپ سے ارد گرد کا جائزہ لیتے رہے تھے۔ سوراخ مکمل کرنے کے بعد عادل ذرا ہانپتا ہوا سا ان کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اب رائفل رابے خاں کے ہاتھ میں تھی اور فولاد جان سوراخوں میں ڈائنامیٹ لگا رہا تھا اور تار وغیرہ بچھا رہا تھا۔

سرمد صاحب نے ٹیلی اسکوپ عادل کی طرف بڑھاتے ہوئے اوپر بانگڑی کی چوٹی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کچھ دکھانا چاہ رہے تھے۔

عادل نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ اسے ایک جگہ برف کی سفید چادر کے درمیان ایک سیاہ لکیر سی نظر آئی۔ جیسے بالکل سفید کاغذ پر کسی عورت کا بال رکھا ہوا ہو۔ یہ دراصل برف کی دراڑ تھی۔

"یہ کیا ہے سر؟" عادل نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"وہی جس کا ذکر بالا نے زادہ نے کیا تھا اور میں نے بتایا ہے نا کہ اس نے جو کچھ بھی کہا وہ درست تھا۔ سمجھو یہ وہی موت ہے جو اوپر اپنے پر تول رہی ہے۔ ان عقل کے اندھوں کو کچھ نظر نہیں آ رہا۔" سرمد صاحب کا اشارہ رابے اور فولاد کی طرف ہی تھا۔

"آپ کا مطلب ہے کہ دھماکوں کی وجہ سے برف کھسک سکتی ہے؟"

"مجھے ڈر ہے کہ ایسا ہوگا۔ اگر یہ ساری برف نہ بھی کھسکی اور کچھ حصہ بھی کھسک گیا تو اس کھنڈر عمارت کی چھت بیٹھ جائے گی۔"

"پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"بس، اس جگہ سے دور ہٹنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

اسی دوران میں فولاد جان نے اپنا کام مکمل کر لیا۔ فولاد اور رابے دیوار کے پاس سے ہٹ کر ان کے قریب آن کھڑے ہوئے۔ اب یہ فیصلہ کن لمحے تھے۔ فولاد جان نے لائٹر کے ذریعے ڈائنامیٹس کے فلیتے کو آگ دکھا دی تھی۔ آگ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ چاروں محفوظ فاصلے پر تھے۔

آخر پہلا دھماکا ہوا۔ سنسان قرب وجوار گونج اٹھے۔ پھر دوسرا دھماکا ہوا۔ شعلے کے ساتھ قدیم دیوار کے پتھر اور سخت برف کے ٹکڑے ہوا میں اڑتے نظر آئے۔ دھماکے والی جگہ ایک دھند سی پھیل گئی۔ تیسرا دھماکا پہلے

دونوں دھماکوں سے زیادہ طاقتور تھا۔ عادل نے دیکھا کہ اس دھماکے کے بعد فصیل نما دیوار کے درمیان ایک سیاہ خلا نمودار ہوگیا ہے۔ رابے اور فولاد کامیاب ہوگئے تھے۔ انہوں نے اندر جانے کا راستہ بنالیا تھا۔ سرمد صاحب کے اندیشے ابھی تک تو غلط ثابت ہوئے تھے۔

جونہی دیوار میں خلا نمودار ہوا، رابے اور فولاد کی بے قراری دیدنی ہوگئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور تیزی سے خلا کی طرف دوڑے لیکن اس عالم میں بھی چوکنا فولاد جان ان دونوں کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔ اس خبیث کی نگاہیں کسی ریڈار کی شعاعوں کی طرح کام کرتی تھیں۔ دھماکوں سے پہلے اور دھماکوں کے دوران میں بھی اس نے سرمد صاحب اور عادل کو کسی طرح کی مہم جوئی کا موقع نہیں دیا تھا۔ اب بھی وہ دیوار کے خلا کی طرف بھاگتے ہوئے مڑمڑ کر ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ رائفل پوری طرح لوڈ تھی اور اس کے داہنے ہاتھ میں تھی۔

خلا کے سامنے پہنچ کر رابے اور فولاد کو احساس ہوا کہ وہ ان دونوں کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ ویسے بھی سرمد صاحب کے بغیر ان کا اس کھنڈر عمارت میں گھسنا بے کار تھا۔ انہیں کچھ معلوم ہی نہیں تھا کہ انہیں کدھر جانا ہے۔ رابے خاں نے ہانپی ہوئی آواز میں سرمد صاحب کو پکارا اور بولا۔ ''اوئے خدائی خوار! اب تم ادھر کھڑا کیا کرتا ہے، آجاؤ ادھر۔''

عادل اور سرمد صاحب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ رابے کے حکم پر عمل کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ فولاد جان کی آٹھ ایم ایم رائفل اتنے فاصلے سے بھی ٹھیک ٹھیک نشانہ لے سکتی تھی۔ وہ انہیں مارنے کے لیے گولی نہ چلاتا لیکن زخمی تو کر ہی سکتا تھا۔ اب وہ منزل پر پہنچ چکے تھے اور سرمد صاحب کو صرف اصل جگہ کی نشاندہی کرنا تھی۔

''کھڑا منہ کیا دیکھتا ہے۔ چلو آؤ ادھر۔'' فولاد کڑک کر بولا۔ اس کا غضب ناک لہجہ ابھی تک تین دن پہلے والے واقعے کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ جب فولاد کا پھوپھی زاد بھائی ہزاروں فٹ گہرے کھڈ میں جا گرا تھا۔

''چلو عادل!'' سرمد صاحب نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

وہ دونوں دیوار میں نمودار ہونے والے مستطیل خلا کی طرف بڑھے۔ اس خلا کی لمبائی قریباً چھ فٹ اور چوڑائی چار فٹ کے لگ بھگ تھی۔ اندر گہری تاریکی تھی...... اور وہ ہوا تھی جو زمانوں سے ان در و دیوار میں ٹھہری ہوئی تھی۔

ابھی سرمد صاحب اور عادل دیوار سے پچاس ساٹھ قدم دور ہی تھے کہ وہ ہوا جس کی توقع نہیں تھی...... اور رابے وغیرہ کو تو بالکل بھی نہیں تھی۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور شدید تھا کہ سرمد صاحب اور عادل اپنی جگہ بت بنے کھڑے رہ گئے۔ ایک زبردست گڑگڑاہٹ ہوئی۔ کھنڈر عمارت سے اوپر ڈھلوان پر ہزاروں لاکھوں ٹن برف نے یکایک حرکت کی اور برف کے چند بہت بڑے تودوں نے اردگرد کی ہر شے کو ڈھانپ لیا۔ رابے اور فولاد جان تو رہے ایک طرف، یوں لگا کہ پورا کھنڈر ہی پیوندِ زمین ہوگیا ہے...... اور یہ صرف ابتدا تھی، ابھی بہت کچھ اور بھی ہونا تھا۔ عادل نے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا۔ اوپر بلندی پر نظر آنے والی سیاہ دراز تیزی سے چوڑی ہوتی جارہی تھی۔ قریباً نصف کلومیٹر تک پھیلی ہوئی برف اپنی جگہ چھوڑ رہی تھی۔ کسی بھی وقت اردگرد کی ہر شے برف کے بے پناہ بوجھ کے نیچے دب سکتی تھی۔ ''آؤ عادل۔'' سرمد صاحب نے چلاّتی ہوئی سی آواز میں کہا۔

عادل اضطراری طور پر نشیب کی طرف بڑھا لیکن سرمد صاحب نے اس کا بازو پکڑ لیا اور داہنی طرف کھینچا۔ اس وقت سب سے اہم ضرورت یہ تھی کہ وہ نیچے کھسکنے والی برف کی براہِ راست زد سے بچ جائیں۔ خیمے کے پاس سے گزرتے ہوئے سرمد صاحب چند سیکنڈ کے لیے اندر گئے۔ واپس آئے تو ان کے ہاتھوں میں دو تین ڈائنامیٹ اسٹکس تھیں، جو انہوں نے اپنے بیگ پیک میں رکھ لیں۔ وہ واکنگ اسٹکس کے سہارے سنبھل سنبھل کر چلتے، گرتے پڑتے دائیں جانب ہٹتے چلے گئے۔ یہ نہایت کٹھن وقت تھا اور راستہ اس سے بھی مشکل۔ یہ عمودی ڈھلوانیں تھیں۔ لگا بہ لگا ہے انہیں برف پر لیٹ کر اور ڈھلوان سے چمٹ کر آگے بڑھنا پڑ رہا تھا۔ پہلے خوفناک تودوں کے گرنے کے بعد بہ ظاہر سکون تھا لیکن اوپر برف مسلسل حرکت کر رہی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ حرکت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ جیسے کوئی خوفناک عفریت دبے پاؤں آگے سرک رہا ہو اور کسی بھی وقت ایک چنگھاڑ کے ساتھ جھپٹنے والا ہو۔ اوپر دراڑ کی چوڑائی مسلسل بڑھ رہی تھی اور یہ اس امر کا بین ثبوت تھا کہ برف نیچے آنے والی ہے۔

قریباً دس منٹ کی جاں گسل کوشش کے بعد وہ برف کے متوقع راستے سے ہٹ گئے اور اوپر چڑھنا شروع ہوئے۔ جلد ہی وہ چوٹی پر تھے۔ یہاں سے سیاہ دراڑ کی چوڑائی مزید واضح نظر آرہی تھی۔ نیچے کھنڈر والی جگہ پر اب برف کا ایک چھوٹا سا پہاڑ دکھائی دے رہا تھا۔ رابے خاں

اور فولاد جان اپنے آتشیں ہتھیاروں سمیت اور اپنی آتشیں خواہشوں سمیت اس ہزاروں ٹن برف کے نیچے دفن ہو چکے تھے۔ وہ جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔

''وہ مر گئے جناب؟'' عادل نے اپنی آواز میں پوچھا۔

''اس سوال کا جواب ہاں کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔'' سرمد صاحب نے کہا۔ عادل کی طرح ان کی نظریں بھی برف کے عظیم الشان مقبرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ابھی کچھ دیر بعد شاید یہ مقبرہ مزید بلند ہونے والا تھا۔

''ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ موسم بگڑ رہا ہے۔'' سرمد صاحب نے کہا۔

انہوں نے اپنے آخری کیمپ کی طرف رخ کیا اور نیچے اترنے لگے۔ جو بولٹ اور رسے وہ لٹکتے چھوڑ آئے تھے، وہ ان کی مدد کرنے لگے۔ عادل نیچے تھا اور سرمد صاحب چند فٹ اوپر۔ عادل کے کانوں میں سرمد صاحب کا کہا ہوا ایک فقرہ گونجنے لگا۔ ''کوہ پیمائی میں اترتے ہوئے زیادہ حادثے پیش آتے ہیں، اس لیے کوہ پیما کو زیادہ ہوش سے کام لینا چاہیے۔''

وہ ڈیڑھ دو سو فٹ ہی نیچے اترے ہوں گے جب ان دونوں کو گڑگڑاہٹ کی مہیب آواز سنائی دی پھر ہولناک دھماکوں سے کوہ و دامن لرز سے گئے۔ ایک گونج تھی جو پہاڑ میں ہر طرف سرایت کرتی محسوس ہوئی۔ آخر چوٹی کی دوسری جانب نیچے کھسکتی ہوئی برف نے جگہ چھوڑ دی تھی اور ایک بڑی ''ایوالانچ'' کی شکل میں نیچے گری تھی۔ وہ اسے دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن تصور کر سکتے تھے کہ کھنڈر اور اس کے قرب و جوار کیا شکل اختیار کر گئے ہوں گے۔

مالکانے زادہ، جس کا تصور عادل کے ذہن میں ایک شرابی اور فریبی عامل کا تھا...... اپنے تصور سے بالکل مختلف نکلا تھا۔ اس نے جو جو کچھ کہا، درست نکلا۔ حتیٰ کہ اس کی آخری پیشین گوئی (برف کی قبروں والی) بھی پوری ہوئی۔ مکمل نہ سہی لیکن جزوی طور پر تو پوری ہوئی تھی۔ سرمد صاحب اور عادل بچ گئے تھے لیکن رابے خاں اور فولاد جان کا حد سے بڑھا ہوا لالچ ان کو لے ڈوبا تھا......

رابے خاں اور فولاد جان کا ارادہ تھا کہ یہ مہم ختم ہونے کے بعد وہ خناب کے قتل کا حساب کتاب کریں گے۔ ان کا یہ حساب کتاب بھی ان کے ساتھ ہی دفن ہو گیا تھا۔

وہ دونوں سنبھل سنبھل کر نیچے اترتے رہے۔ عادل کے پورے بدن میں ایک ہلکی سی لرزش موجود تھی۔ یہ لرزش پچھلے ایک گھنٹے میں پیش آنے والے واقعات اور انکشافات کے سبب تھی۔ وہاں اوپر مغلیہ دور کے کھنڈر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ سرمد صاحب یہ بات اچھی طرح جانتے تھے لیکن پھر بھی وہ اسے اور دیگر ساتھیوں کو یہاں لے آئے تھے۔ اب عادل کے ذہن میں خیال آنے لگا...... شاید سرمد صاحب اس حد تک نہیں جانا چاہتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ ان کا پروگرام بس یہی ہوتا کہ مختلف ڈھلوانوں پر مشق کی جائے...... یا زیادہ سے زیادہ چھ سات ہزار میٹر تک چڑھائی کر لی جائے۔ لیکن جب رابے خاں وغیرہ نے انہیں آدبوچا تو سرمد صاحب کو بچ بچ چوٹی تک کا سفر کرنا پڑ گیا۔

عادل کا ذہن انہی خیالوں میں الجھا رہا اور وہ سرمد صاحب کے ساتھ واپسی کا سفر طے کرتا رہا۔ واپسی کے سفر میں سب سے زیادہ مشقت چھاتی اور ٹانگوں کو سہنا پڑ رہی تھی۔ بالآخر انہیں اپنا سیکنڈ لاسٹ کیمپ نظر آنا شروع ہو گیا۔ خیمے کے قریب کرسٹل کی سرخ جیکٹ ایک نکتے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ ایک زرد نکتہ ہمایوں کی جیکٹ کی نشاندہی کر رہا تھا۔ یقیناً وہ لوگ ٹیلی اسکوپس کی مدد سے انہیں دیکھ رہے تھے اور شاید حیران بھی ہو رہے تھے کہ باقی دو بندے کہاں ہیں۔

ابھی وہ دونوں کیمپ سے ڈیڑھ دو سو فٹ اوپر ہی تھے کہ انہیں کرسٹل اور ہمایوں کے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ خوشی کی آوازیں نہیں تھیں۔ ان میں اضطراب تھا اور عجلت تھی۔ وہ جیسے پکار رہے تھے۔

''کوئی مسئلہ لگ رہا ہے۔'' سرمد صاحب کی ہانپی ہوئی آواز عادل کے کانوں میں پڑی۔

انہوں نے اپنے اترنے کی رفتار بڑھا دی۔ ساتھ ساتھ وہ نیچے بھی دیکھ رہے تھے۔ کرسٹل اور ہمایوں انہیں کچھ بتا رہے تھے اور بائیں طرف اشارہ بھی کر رہے تھے۔ سرمد صاحب نے پھسلتے ہوئے رسوں کے ذریعے تین چار طویل جستیں نیچے کی طرف لگائیں اور کیمپ کے پاس لینڈ کر گئے۔ عادل نے بھی ان کی تقلید کی۔

ہمایوں نے تیزی سے پوچھا۔ ''آپ دونوں خیریت سے تو ہیں؟''

''ہاں ہم بالکل ٹھیک ہیں، یہاں کیا مسئلہ ہوا ہے؟'' سرمد صاحب نے پوچھا۔

''رات گیارہ بجے کے لگ بھگ وائرلیس سگنل ٹھیک آنے لگے تھے۔ بیس کیمپ سے رابے خاں کے ساتھیوں نے اطلاع دی کہ مالکانے زادہ کا بخار بہت شدت اختیار کر گیا ہے اور اس کی ناک سے خون رس رہا ہے۔ پھر کچھ

دیر بعد یہ خبر آئی کہ وہ جانبر نہیں ہوسکا۔ ابھی ہم اس خبر کے اثر سے نہیں نکلے تھے کہ ایک دوسری اطلاع آگئی...... رابے خاں کے ساتھیوں نے بتایا کہ مالکا نے زادہ کو تلاش کرتے کرتے بستی کے لوگ بیس کیمپ تک پہنچ گئے ہیں اور ان کے تیور بڑے خطرناک ہیں۔ اس کے بعد بیس کیمپ سے ہمارا رابطہ ختم ہوگیا۔ لیکن اب لگ رہا ہے کہ معاملہ ہماری توقع سے زیادہ سنگین ہوگیا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' سرمد صاحب نے پوچھا۔

ہمایوں نے ٹیلی اسکوپ ان کی طرف بڑھا دی اور نیچے اتھاہ گہرائی کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ لو عادل! تم اس سے دیکھو۔'' کرسٹل نے دوسری ٹیلی اسکوپ عادل کی طرف بڑھائی۔

عادل نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائی اور ہمایوں کی بتائی ہوئی سمت میں دیکھنے کی کوشش کی۔ اب دن کے قریباً گیارہ بج چکے تھے۔ بلندیوں پر چھائی ہوئی دھند کچھ چھٹنے لگی تھی۔ کہیں کہیں سفید برف پر دھوپ کے دھبے بھی نظر آتے تھے۔ یقیناً یہ دھبے میلوں کے حساب سے لمبے چوڑے تھے۔ انہی دھبوں کے درمیان اپنے کیمپ نمبر دو کے پاس عادل کو کئی سیاہ نکتے دکھائی دیے۔ اس کی رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ یقیناً یہ پاؤنڈہ بستی کے کوہ پیما تھے۔ مالکا نے زادہ کی موت کے بعد وہ شدید غم و غصے کی لپیٹ میں آگئے تھے اور اب اسی کیفیت میں ان کی طرف آرہے تھے۔

سرمد صاحب نے ٹیلی اسکوپ اپنی آنکھوں سے ہٹائی اور بولے۔''یہ لوگ یقیناً کل رات سے ہی سفر کر رہے ہیں اور کافی اوپر آگئے ہیں۔ لیکن ابھی بھی یہاں تک پہنچنے کے لیے انہیں دس بارہ گھنٹے کی کلائمبنگ کرنا پڑے گی۔''

کرسٹل نے کہا۔''سر! آج موسم کافی اچھا۔ مے بی کہ یہ لوگ یہ ڈسٹینس زیادہ تیزی سے طے کرلیں۔''

''لیکن پھر بھی آٹھ دس گھنٹے تو کہیں نہیں گئے۔'' سرمد صاحب نے کہا۔

''اب ہام کو کیا کرنا ہوئیں گا سر! لیکن اس سے پہلے یہ بتائیں کہ...... رابے خاں اور فولاد کا کیا ہوا؟''

''وہی جو ان کی قسمت میں لکھا تھا اور وہی جس کے لیے انہوں نے خود تگ و دو کی ہے...... تم لوگوں نے ابھی کچھ دیر پہلے ایوالانچ کی گھن گرج سنی ہے؟''

''جی سر۔ بہت زیادہ آواز تھی۔ ہم بہت پریشان ہوئے تھے......'' ہمایوں نے کہا۔

''اس سے پہلے تین بلاسٹ ہوئے تھے۔ ان کی آواز بھی پہنچی یا نہیں؟'' سرمد صاحب نے دریافت کیا۔

''نو سر۔ بلاسٹ تو ہام نے نائیں سنا۔'' کرسٹل نے آنکھیں جھپک کر کہا۔

''رابے اور فولاد نے ہمارے منع کرنے کے باوجود کھنڈر کی ایک دیوار توڑنے کے لیے یہ بلاسٹ کیے اور ایوالانچ کا سبب پیدا کردیا۔''

''ان دونوں کا کیا ہوا؟'' کرسٹل نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا۔

''وہ نہیں بچ سکے۔'' سرمد صاحب نے کہا۔''برف کا ایک پہاڑ بن گیا ان کے اوپر اور...... کھنڈر کے اوپر بھی۔''

کچھ دیر کے لیے وہ چاروں بالکل خاموش رہے۔ ان دونوں نے ان چاروں کے لیے بدترین دشمنوں کا روپ دھارا ہوا تھا مگر ان کی اس اچانک موت نے ان کے دلوں پر اثر چھوڑا تھا۔

سرمد صاحب نے ٹیلی اسکوپ پھر آنکھوں سے لگائی تھی اور دور نیچے خطرناک گہرائیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عادل کا خیال تھا کہ شاید کرسٹل یا ہمایوں اس مقصد کے بارے میں بھی کچھ سوال کریں گے جس کے لیے وہ اس دور دراز سفر پر آئے تھے، یعنی زیورات کی موجودگی یا غیر موجودگی۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ شاید وہ دونوں پہلے سے یہ ساری حقیقت جانتے تھے یا پھر...... وہ سر سرمد کے احترام کی وجہ سے سوال و جواب کرنا نہیں چاہ رہے تھے۔ عادل کو پہلی وجہ ہی زیادہ معتبر معلوم ہوئی۔

کچھ دیر بعد سرمد صاحب نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے ہٹائی اور پُرسوچ انداز میں ارد گرد دیکھنے لگے۔

''اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟'' عادل نے سرمد صاحب سے سوال پوچھا۔

''ہمیں نیچے اترنا ہوگا لیکن نئے راستے سے۔''

''کیا مطلب سر؟''

''اسی راستے سے اتریں گے تو ظاہر ہے کہ پاؤنڈوں سے مڈبھیڑ ہوجائے گی...... وہ تعداد میں کافی زیادہ ہیں۔ انیس بیس کے قریب۔ یقینی بات ہے کہ ان کے پاس اسلحہ بھی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسنیپر ٹائپ گن بھی ہو یا ایک سے زیادہ ایسی گنیں ہوں......''

''نئے راستے سے اترنا تو کافی مشکل ہوگا۔'' عادل نے کہا۔

''یہ مشکل تو اب جھیلنی ہی ہے۔'' سرمد صاحب نے

دائیں جانب دور تک نگاہ دوڑائی۔ پھر ٹیلی اسکوپ دوبارہ آنکھوں سے لگائی۔ پہلے دائیں جانب کا جائزہ لیا، پھر بائیں جانب دیر تک دیکھتے رہے۔ اس جائزے میں ہمایوں بھی ان کے ساتھ شریک ہوگیا۔ یہ بڑی طاقتور ٹیلی اسکوپس تھیں اور موسم صاف ہونے کی وجہ سے وہ کافی دور تک دیکھنے کے قابل تھے۔ سرمد صاحب اور ہمایوں باتیں کرتے ہوئے کچھ آگے چلے گئے۔

پانچ دس منٹ کی گفتگو کے بعد وہ جیسے کسی حتمی نتیجے پر پہنچ گئے۔ سرمد صاحب نے کہا۔ ''ہمیں دائیں جانب چلنا ہوگا اور پھر کوئی مناسب جگہ دیکھ کر اترائی شروع کرنا ہوگی۔''

یہ بڑی خطرناک ڈھلوانیں تھیں۔ کہیں کہیں تو قدم جمانے کو جگہ بھی نہیں تھی۔ یہاں اوپر کی طرف جانا جتنا مشکل تھا، اتنا ہی شاید افقی رخ پر جانا بھی تھا۔

بہرحال سرمد صاحب کے فیصلے کے مطابق انہوں نے خود کو ایک دوسرے کے ساتھ رسے سے منسلک کیا اور برف پر اپنے کانٹے دار Crampons کو جما جما کر دائیں طرف سرکنے لگے۔ وہ جگہ جگہ خود کو بولٹس کے ذریعے اینکر بھی کر رہے تھے تاکہ اچانک پھسلنے کی صورت میں تحفظ مل سکے۔ تازہ دم ہونے کی وجہ سے ہمایوں سب سے آگے تھا۔

کچھ آگے جا کر انہیں وہ سیاہ نکتے نظر آنا بند ہوگئے...... جو دراصل ان کی طرف آنے والے مسلح پاؤنڈرے تھے۔ دور سے دیکھنے پر وہ غیر متحرک ہی لگتے تھے لیکن یقینی بات تھی کہ وہ غیر متحرک نہیں ہیں اور اپنی تمام تر توانائی کے ساتھ اوپر کی طرف آرہے ہیں۔

ہمایوں، کرسٹل، عادل اور سرمد صاحب، قریباً دو گھنٹے تک اسی طرح افقی رخ پر حرکت کرتے رہے لیکن نیچے کی طرف جانے کے لیے انہیں کہیں بھی مناسب جگہ نظر نہیں آئی۔ کرسٹل کی ہانپی ہوئی سانسیں عادل کے کانوں تک بڑی وضاحت سے پہنچ رہی تھیں۔ یقیناً یہ سانسیں سرمد صاحب نے بھی سن لی تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ''کرسٹل! اگر زیادہ تھک گئی ہو تو سانس لے لیتے ہیں۔''

''نائیں سر۔'' وہ فوراً بولی۔ ''ہام بالکل ٹھیک۔''

یہ بات وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ رکنا خطرناک ہے۔ وہ لوگ جتنی جلدی جتنی زیادہ دور چلے جاتے اتنا ہی بہتر تھا...... لیکن سب سے بڑی پریشانی یہی تھی کہ انہیں نیچے کا سفر شروع کرنے کے لیے کوئی مناسب لوکیشن دکھائی نہیں پڑ رہی تھی۔ برف ایسی نہیں تھی کہ اس میں بولٹنگ کی جاسکے یا میخیں ٹھونکی جاسکیں۔ ہاں اینکر وغیرہ استعمال ہوسکتے تھے لیکن وہ بھی تب جب کوئی مناسب دراڑ نظر آتی۔ بالآخر تلاشِ بسیار کے بعد ان کی محنت رنگ لائی اور ایک جگہ کسی حد تک مناسب دکھائی دی۔ لیکن تب تک دن کی روشنی غائب ہونا شروع ہوگئی تھی۔ برفانی بلندیوں کی شام بڑی تیزی سے اپنے پر پھیلا رہی تھی اور اندھیرا سر پر تھا۔ ایسے میں نیچے اترنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ انہیں جیسے تیسے یہیں پر رات بسر کرنا تھی۔

اب فقط ایک خیمہ ان کے پاس موجود تھا۔ اسے ایک نہایت مشکل جگہ پر نہایت دشواری کے ساتھ ایستادہ کیا گیا اور وہ تھکے ماندے اس میں گھس گئے۔ کرسٹل کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر سرمد صاحب نے کہا۔ ''ابھی! ٹھیک ہے کہ ہم رک گئے ہیں لیکن پاؤنڈروں کو بھی تو رکنا پڑا ہے۔ اندھیرے میں وہ بھی سفر جاری نہیں رکھ سکتے۔''

''لیکن اگر انہوں نے جاری رکھا تو پھر کیا ہوئیں گا؟'' کرسٹل نے کہا۔

''پھر وہ مریں گے۔ یہ ممکن نہیں ہے۔'' سرمد صاحب نے اسے تسلی دی۔

بہرحال وہ بڑی بے قراری کی رات تھی۔ عادل بھی بہت تھوڑی دیر کے لیے سو سکا۔ انہیں بس یہی خیال تھا کہ جلد سے جلد صبح کا اجالا پھیلے اور وہ نیچے اترنے کا آغاز کریں۔ وہ چاروں بالکل خاموش تھے۔ آج صبح سویرے ہونے والے لرزہ خیز واقعات کے بارے میں ان چاروں کے درمیان کسی طرح کی کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ ہمایوں جیسے ابھی تک راہبے اور فولاد کی موت کا یقین نہیں کر پا رہا تھا۔

صبح کا اجالا ابھی پوری طرح پھیلا نہیں تھا کہ سرمد صاحب اور ہمایوں خیمے سے نکل آئے۔ سرمد صاحب اینکر لگانے کے لیے کسی اچھی جگہ کی تلاش میں تھے۔ یہ وہی اسپیشل اینکر تھا جو کرسٹل اور سرمد صاحب نے بڑی مشکلوں سے ایک اندھی دراڑ میں سے نکالا تھا۔

خیمے میں اب عادل اور کرسٹل اکیلے تھے۔ دونوں لیٹے تھے، تاہم ان کے درمیان فاصلہ تھا۔ کرسٹل نے بڑی بے باکی سے لیٹے لیٹے دو تین پلٹنیاں کھائیں اور عادل کے گلے لگ گئی۔ پھر اس نے زور سے اس کا رخسار چوما اور جتنی تیزی سے آئی تھی، اتنی ہی تیزی سے پلٹنیاں کھا کر واپس اپنی جگہ پر چلی گئی۔ عادل اس اچانک ''حملے'' اور ''حملے'' کی تیزی پر ہکا بکا تھا۔

وہ مسکرائی۔ ''بس یہ ہام کا آخری غلطی تھا۔ ہام کی یادوں میں ایک اور یاد کا اضافہ ہوگیا۔ این اورا یورلاسٹنگ

میموری۔ ہام یہاں سے جانے کے بعد ان یادوں کو بہت سنبھال کر رکھے گا۔ تمہاری یہ فرینڈ شپ ہام کو بہت انسپائریشن دے گا۔ پتا ہے ہام کو کیسا لگتا۔''

''کیسا لگتا؟'' عادل نے ٹھنڈی سانس لی۔

''ہام نے پہلے بھی بتایا تھا۔ ہام کو ایسا لگتا ہے کہ جیسے تمہارا یہ بیوٹی فل ساتھ ایک چھوٹی سی خوشی کی طرح ہے۔ جیسے ایک بٹر فلائی کو چند سیکنڈ کے لیے اپنی مٹھی میں بند کیا جائے...... اور پھر...... ریلیز کر دیا جائے۔ پھر اس کی یاد کو ایک فوٹو کی طرح اپنے البم میں لگا لیا جائے۔'' اس کی نیلی آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک تھی۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''ہام بالکل سچے دل سے دعا کرتا کہ توم کو شہزادی ملے اور توم بہت اچھی لائف گزارو۔''

''عادل! ذرا باہر آؤ۔'' سرمد صاحب کی آواز نے عادل اور کرسٹل کو چونکایا۔ عادل اپنی جیکٹ کی زپ درست کرتا ہوا باہر نکل آیا۔ سرمد صاحب نے اینکر پھنسانے کے لیے ایک بڑی اچھی جگہ ڈھونڈلی تھی۔ وہ باقی کا کام تیزی سے کرنا چاہتے تھے۔ ان چاروں نے چلتے پھرتے ہی ریڈی میڈ ناشتا بھی کیا۔ سرمد صاحب نے ہمایوں کو ذمے داری دی کہ وہ رسے کو مختلف جگہوں پر اینکر کرتے ہوئے نیچے اترنا شروع کرے۔ سب سے پہلا اینکر وہی دو نچیل اینکر تھا اور یہ کافی تحفظ فراہم کر رہا تھا۔

کرسٹل ٹیلی اسکوپ کے ذریعے قرب وجوار پر نگاہ دوڑا رہی تھی۔ اچانک اس کی سرسراتی ہوئی آواز ابھری۔ ''سر! وہ نظر آرہے ہیں۔''

یہ ایک انتہا کا خیز فقرہ تھا۔ سرمد صاحب نے کرسٹل کے ہاتھوں سے دوربین لے کر اس کی بتائی ہوئی سمت میں نگاہ دوڑائی۔ سرمد صاحب کے تاثرات نے عادل کو بتایا کہ کرسٹل کی اطلاع درست ہے۔ پاؤنڈ دکھائی دینا شروع ہوگئے ہیں۔ یقیناً انہوں نے توقع سے زیادہ تیزی کے ساتھ سفر کیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ پوری طرح اجالا پھیلنے سے پہلے ہی پھر چل پڑے ہوں۔

''ہمیں جلدی کرنا ہوگی۔'' سرمد صاحب نے کہا۔

اگلے پندرہ بیس منٹ میں وہ لوگ رسے کو اس پوزیشن میں لے آئے کہ اس کے ذریعے ایک ایک کرکے نیچے اترا جاسکے۔ پروگرام اور ترتیب کے مطابق سب سے پہلے ہمایوں نے نیچے اترنا شروع کیا۔ یہ بڑی خوفناک اترائی تھی۔ کہیں کہیں تو عمودی ڈھلوان ہمایوں کے جسم سے دور چلی جاتی تھی اور وہ مکمل طور پر ہوا میں جھولنے لگتا تھا۔

اس کے اترنے کی رفتار کافی سست تھی۔ لیکن وہ تینوں جانتے تھے کہ اسے رفتار بڑھانے کا بھی نہیں کہا جاسکتا..... یہ اس کے لیے خطرات میں اضافے کا سبب ہوتا۔ قریباً ایک گھنٹے کی کوشش سے وہ لگ بھگ ایک ہزار فٹ نیچے اترنے میں کامیاب ہوگیا۔

دوسرا نمبر کرسٹل کا تھا۔ اس نے اپنے ''ہارنیس'' کو درست کیا اور چھوٹی چھوٹی جستوں کے ذریعے نیچے اترنا شروع کیا۔ وہ ابھی نصف راستے تک پہنچی ہوگی، جب اس کے رسے نے نیچے پھسلنے سے انکار کردیا۔ یہ کاربینرز اور رسے کا الجھاؤ تھا جو مشکلات پیدا کررہا تھا..... ورنہ کرسٹل کو ہمایوں کے وقت سے نصف وقت لینا چاہیے تھا۔

اچانک عادل کی نگاہ سات آٹھ سو فٹ دور ایک برفانی تودے پر پڑی اور اسے خون اپنی رگوں میں منجمد ہوتا محسوس ہوا۔ تودے کے عقب میں کوئی پچاس میٹر کی دوری پر سیاہ ہیولے نظر آرہے تھے۔ وہ لوگ پہنچ گئے تھے۔ اب انہیں خالی آنکھ سے بھی دیکھا جاسکتا تھا۔ ٹیلی اسکوپ سے دیکھنے پر ان کے کندھوں سے جھولتی ہوئی رائفلیں بھی صاف نظر آرہی تھیں..... نیچے کرسٹل اسی طرح رسوں میں الجھی ہوئی تھی۔

یہ بڑی خطرناک سچویشن تھی۔ اسلحے کے نام پر سرمد صاحب اور عادل کے پاس کوئی چیز نہیں تھی۔ ان کا واحد ہتھیار ان کا پستول تھا، جو رابے خاں کے قبضے میں تھا اور اس کے ساتھ ہی قبر میں دفن ہوگیا تھا۔

اسی دوران میں ایک اچھی تبدیلی آئی۔ کرسٹل کے رسے نے پھر سے حرکت کرنا شروع کردی۔ وہ تیزی سے نیچے اترنے لگی لیکن اب اتنا وقت ہرگز نہیں تھا کہ عادل اور سرمد صاحب بھی نیچے اتر سکتے۔ وہ لوگ تیزی سے قریب پہنچ رہے تھے۔

''ان کو روکنا ہوگا۔'' سرمد صاحب نے کہا اور اپنے عقبی تھیلے میں سے کوئی چیز نکالی۔ عادل نے دیکھا یہ وہی ڈائنامیٹ اسٹکس تھیں جو انہوں نے کھنڈر کے قریب سے بھاگتے ہوئے اٹھائی تھیں۔ اس وقت تو سرمد صاحب کے اس عمل کی وجہ، عادل کی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن اب آرہی تھی۔ ان کی یہ احتیاط سود مند رہی تھی۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ پاؤندہ کوہ پیماؤں نے ان دونوں کو دیکھ لیا ہے اور اپنی رفتار بڑھادی ہے۔ سرمد صاحب نے اپنے لائٹر کے ذریعے ایک ڈائنامیٹ اسٹک کے فلیتے کو آگ دکھادی۔ کچھ دیر انتظار کیا اور پھر بازو گھما کر یہ اسٹک پاؤندوں والے رخ پر پھینک دی۔ چند سیکنڈ بعد ایک زوردار دھماکا ہوا اور سفید برف اوپر اچھلتی نظر آئی۔ یہ دھماکا پاؤندوں سے کافی فاصلے پر ہوا تھا اور یقیناً انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ عادل کو اندازہ ہوا کہ سرمد صاحب پاؤندوں کو کسی طرح کا نقصان پہنچانا چاہتے بھی نہیں۔ وہ صرف ان کو خود سے دور رکھنا چاہتے ہیں اور اس دھماکے نے یہ مقصد پورا کیا۔ وہ جو تیزی سے قریب آرہے تھے رک گئے۔ وہ اب اتنا نزدیک تھے کہ ان کی للکارتی ہوئی آوازیں بھی عادل اور سرمد صاحب کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔

پھر پاؤندوں کی طرف سے جوابی کارروائی ہوئی۔ ان کی طرف سے اوپر تلے چار پانچ فائر ہوئے۔ یہ گولیاں کسی آٹومیٹک رائفل سے چلائی گئی تھیں۔ اب پتا نہیں کہ یہ ہوائی فائرنگ تھی یا انہیں ٹارگٹ کیا گیا تھا۔ بہرحال وہ دونوں کسی بھی نقصان سے محفوظ رہے۔

وہ ایک ابھری ہوئی برفیلی چٹان کی آڑ میں تھے۔ عادل نے ٹیلی اسکوپ کی مدد سے نیچے جھانکا۔ کرسٹل ہمایوں کے پاس پہنچ چکی تھی۔ اب وہ دونوں اوپر دیکھ رہے تھے۔ یقیناً انہوں نے بھی دھماکے اور فائرنگ کی آوازیں سن لی تھیں۔

''آپ نیچے اتریں سر! میں ان لوگوں کو یہاں روکتا ہوں۔''

''یہ نہیں رکیں گے۔ وہ دیکھو..... اب وہ پھیل گئے ہیں..... اور آڑ لیتے ہوئے آرہے ہیں۔''

''آپ ڈائنامیٹ اسٹک استعمال کریں۔''

''عادل! ہمارے پاس صرف دو اسٹکس ہیں اور یہ دیکھو..... ان میں سے ایک ناکارہ ہے۔ ہم اس ایک اسٹک کے ذریعے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور ہمیں بگاڑنا بھی نہیں چاہیے۔ اگر کوئی مزید ہلاکت ہوگئی تو ہمارا زندہ بچ کر نکلنا اور مشکل ہوجائے گا۔''

''تو پھر؟''

''ہمیں ایک خطرہ مول لینا ہوگا..... یہاں سے چھلانگ لگانے کا۔'' عادل کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔

سرمد صاحب نے وہ دو چھوٹے پیراشوٹ نکال لیے جو ان کے سامان میں موجود تھے۔ یہ حجم میں چھوٹے لیکن بہت جدید پیراشوٹ تھے۔ اگلے چار پانچ منٹ کے اندر سرمد صاحب نے کمال مہارت سے یہ پیراشوٹ اپنے اور عادل کے جسم سے باندھ دیے۔ اس دوران میں پاؤندوں

کی طرف سے ان کی جانب چند فائر مزید کیے گئے۔ پاؤندوں کو دھمکانے کے لیے عادل نے بھی سرمد صاحب کی ہدایت پر ایک ڈائنامیٹ اسٹک ان کی طرف اچھالی، جو کافی تاخیر سے بلاسٹ ہوئی۔

اور اب وہ چھلانگ لگانے کے لیے تیار تھے۔ اتنی بلندی سے اور اتنی تیز ہوا میں یہ چھلانگ..... موت کی چھلانگ ہی تھی لیکن یہ ان دونوں کو لگانی تھی کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ سرمد صاحب کی مقناطیسی شخصیت نے عادل کے اندر یہ حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ یہ چھلانگ لگا سکے۔ سرمد صاحب نے اسے آخری ہدایات دیں۔ پھر وہ رسا کھول کر نیچے پھینک دیا جو کرسٹل اور ہمایوں کو گہرائیوں میں لے کر گیا تھا۔ پاؤندے اب کسی بھی وقت ان دونوں پر جھپٹ سکتے تھے۔ وہ للکار رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے۔

عادل نے اپنی آنکھیں بند کیں اور سرمد صاحب کے ساتھ بانگڑی کی اندھی گہرائیوں میں چھلانگ لگا دی۔

یہ یقین اور بھروسے کی چھلانگ تھی۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کب تک ایسے ہی پتھر کی طرح گرے گا۔ اس کا پیراشوٹ کب کھلے گا اور وہ کہاں اور کیسے لینڈ کرے گا۔ بس وہ گر رہا تھا۔ شہزادی کا چہرہ اس کی نگاہوں میں تھا۔ وہ سنہری دھوپ میں سبز کھیتوں کے درمیان کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

عادل اونچی نیچی برفیلی چٹانوں کے درمیان کہیں گرا تھا۔ اس کا کھلا ہوا پیراشوٹ اس کے قریب ہی پھڑ پھڑا رہا تھا۔ سرمد صاحب کی ہدایت کے مطابق اس نے کوشش کی اور خود کو پیراشوٹ کی ڈوریوں سے آزاد کروایا۔ اس کے پورے بدن پر خراشیں اور چھوٹی بڑی چوٹیں آئی تھیں۔ لگتا تھا کہ پورا بدن خراشوں کی وجہ سے جل رہا ہے۔ سرمد صاحب کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔

پیراشوٹ سے آزاد ہونے کے بعد وہ سرمد صاحب کو ڈھونڈنے کے لیے نکلا۔ تقریباً آدھ گھنٹے کی کوشش کے بعد وہ اسے نظر آ گئے۔ وہ کافی دور گرے تھے۔ اپنی آئس اسٹک کے سہارے وہ بری طرح لنگڑاتے ہوئے اس کی طرف آ رہے تھے۔ ان کی بائیں ٹانگ پر شدید چوٹ آئی تھی۔

''تم خیریت سے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی ہاں..... لیکن آپ.....''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔ معمولی ضرب آئی ہے۔'' پھر انہوں نے بلندی کی طرف دیکھا۔ بانگڑی کی چوٹی آسمان کو چھو رہی تھی۔ وہ اس کے دامن میں تھے لیکن اب بھی ان کی بلندی ڈیڑھ ہزار میٹر کے قریب تھی۔

''کرسٹل اور ہمایوں نظر آئے؟'' سرمد صاحب نے پوچھا۔

''نہیں سر۔''

''مجھے آئے ہیں۔'' انہوں نے کہا اور ٹیلی اسکوپ عادل کی طرف بڑھا کر اوپر ڈھلوانوں کی طرف اشارہ کیا۔ عادل نے کچھ دیر تلاش کیا پھر اسے برف کی سفید سطح پر دو سیاہی مائل نکتے نظر آ گئے۔ یقیناً یہ ہمایوں اور کرسٹل ہی تھے۔ وہ نیچے آ رہے تھے۔

''پاؤندے تو بہت اوپر ہوں گے۔'' عادل نے کہا۔

''ہاں..... انہیں نیچے اترنے میں ابھی بہت وقت لگتا ہے۔''

''مم..... میں آپ کی ٹانگ دیکھوں؟''

''نہیں عادل! کہا ہے نا، زیادہ چوٹ نہیں۔ میں نے خود ہی جینڈ تیج کر لی ہے۔'' انہوں نے کہا اور اپنے سامان میں سے نقشہ نکال لیا۔ عادل نے پھر ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگا لی۔ ان دونوں کی بس اب ایک ہی خواہش تھی، کرسٹل اور ہمایوں جلد از جلد نیچے اتر آئیں۔ بے شک انہوں نے پاؤندوں کو زبردست چکما دیا تھا لیکن ابھی وہ ان کی دسترس سے پوری طرح دور نہیں تھے۔

اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے سخت اضطراب کے تھے۔ واکی ٹاکی سیٹ کی چارجنگ ختم ہو چکی تھی۔ عادل ٹیلی اسکوپ کے ذریعے مسلسل ہمایوں اور کرسٹل پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ کبھی تیز رفتاری سے اور کبھی آہستہ آہستہ نیچے اتر رہے تھے۔ گاہے بگاہے انہیں اینکرز اور بولٹس وغیرہ کا سہارا لینا پڑ رہا تھا۔ دوسری طرف سرمد صاحب اپنی ٹانگ کی تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے مسلسل نقشے پر جھکے ہوئے تھے اور پنسل سے نشان وغیرہ لگا رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ بھی ٹیلی اسکوپ کے ذریعے ہمایوں اور کرسٹل کو دیکھ لیتے تھے۔ پاؤندوں کے آثار ابھی کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔

بالآخر وہ خوش کن گھڑی آ گئی جب ہمایوں اور کرسٹل ان سے آن ملے۔ وہ سب ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے اور ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کی۔ تفصیلی گفتگو کا یہ وقت نہیں تھا۔ انہیں جلد از جلد حرکت میں آنا تھا۔ ان کے سامنے حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی برف تھی اور اونچی نیچی چٹانیں تھیں۔ اس بیکراں ویرانے کی دوسری جانب انسانی

آبادیاں تھیں، جہاں تک انہیں پہنچنا تھا اور پاؤ ندوں سے بچتے ہوئے پہنچنا تھا۔ انہوں نے باگڑی کی بلند و بالا...... ''بھیدوں بھری'' ...... چوٹی کی طرف سے رخ پھیرا...... اور چل پڑے۔

☆☆☆

یہ چھٹے دن بعد کی بات ہے۔ نیلے آسمان پر سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ دن کے کوئی گیارہ بجے کا عمل تھا۔ سرمد صاحب، ہمایوں، کرسٹل اور عادل چلاس کے ایک چھوٹے سے ریسٹ ہاؤس میں موجود تھے، تھکے ہارے اور نڈھال۔ ان کے چہروں پر طویل مسافت کی نقاہت تھی۔ سرمد صاحب ایک بستر پر لیٹے تھے۔ ایک مقامی ڈاکٹر نے ان کی زخمی ٹانگ کا طویل معائنہ کرنے کے بعد حیرت سے کندھے اچکائے اور گہری سانس لے کر مقامی لہجے میں بولا۔ ''مجھے بالکل یقین نہیں آرہا کہ...... جناب نے اس ٹانگ کے ساتھ اتنا طویل سفر کیا ہے۔ اٹ از امپاسیبل۔''

''چوٹ زیادہ ہے؟'' عادل نے پوچھا۔

''چوٹ؟ ان کی ٹانگ تین جگہ سے ٹوٹی ہوئی ہے...... جی ہاں تین جگہ سے...... پنڈلی کی چھوٹی ہڈی کا ایک فریکچر تو ہیئر لائن ہے مگر بڑی ہڈی دو جگہ سے مکمل ٹوٹ چکی ہے۔''

عادل اور ہمایوں کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔ یہ واقعی ناقابلِ یقین بات تھی۔ سرمد صاحب نے راستے میں انہیں اپنی ٹانگ کی صورتِ حال کے بارے میں زیادہ نہیں جاننے دیا تھا۔ انہوں نے شاید اپنی ہمت سے بھی بڑھ کر برداشت کا مظاہرہ کیا تھا اور ان پر بوجھ بنے بغیر دشوار سفر جاری رکھا تھا۔ اب پتا چل رہا تھا کہ انہوں نے اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے گرد خود ہی تین چار لکڑیاں رکھ کر ٹوٹی ہوئی بڑی ہڈی کو سیدھا کیا تھا اور پٹی باندھ لی تھی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ''ان کو فوری طور پر ٹریٹمنٹ اور سرجری کی ضرورت ہے، ورنہ اندرونی زخم ہیں جو خراب ہوسکتے ہیں۔''

''فوری طور پر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' ہمایوں نے پوچھا۔

''آپ کسی طرح انہیں داسو یا پھر ایبٹ آباد تک لے جائیں تاکہ سرجری ہوسکے۔''

عادل، ہمایوں اور کرسٹل گنگ تھے۔ یقیناً انہیں اپنے اپنے طور پر شرمندگی بھی ہورہی تھی کہ وہ سرمد صاحب کی شدید ترین تکلیف سے بے خبر رہے۔

سرمد صاحب کے چہرے پر ایک دھیمی مسکراہٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ عادل کو لگا جیسے وہ کسی گوشت پوست کے شخص کو نہیں، فولادی انسان کو دیکھ رہا ہے۔ اسے وہ ناقابلِ فراموش منظر یاد آگیا جب ان دونوں نے ہزاروں فٹ کی بلندی سے اندھی چھلانگ لگائی تھی۔ پہاڑ کی ایک عمودی دیوار کے ساتھ ساتھ تیرتے ہوئے وہ چار پانچ ہزار فٹ نیچے گئے تھے اور پھر پیراشوٹس نے کھل کر انہیں سنبھالا دیا تھا۔ اگلے چوبیس گھنٹے بڑے اہم تھے۔ پہلے انہوں نے جیپ پر شاہراہ قراقرم کا دشوار سفر کیا اور داسو پہنچے۔ یہاں کرسٹل اور ہمایوں نے سرمد صاحب کو مجبور کرکے انہیں ایک پین کلر انجکشن لگوایا۔ دو انجکشن راستے کے لیے رکھ لیے گئے۔ داسو سے مانسہرہ تک کا کٹھن سفر تقریباً نو گھنٹے میں مکمل ہوا۔ وہ لوگ جس وقت ایبٹ آباد کے بارونق شہر میں پہنچے، وہ اتنا بارونق نہیں تھا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ وہ لوگ سیدھے ایک بڑے پرائیویٹ اسپتال میں پہنچے۔ صبح تک سرمد صاحب کے سارے ٹیسٹ وغیرہ ہوگئے اور نو بجے انہیں آپریشن تھیٹر میں پہنچا دیا گیا۔ اس شخص کی غیر معمولی قوتِ برداشت کا جو مظاہرہ عادل نے دیکھا، وہ ششدر کر دینے والا تھا۔ اس ساری تکلیف کے دوران میں فقط صرف ایک پین کلر انجکشن انہیں لگایا گیا تھا اور وہ بھی بہت مجبور کرکے۔ انہیں مناتے ہوئے کرسٹل کی آنکھوں میں باقاعدہ آنسو آگئے تھے۔

تین گھنٹے بعد سرمد صاحب آپریشن تھیٹر سے نکلے۔ ان کی ٹانگ میں پلستر وغیرہ ڈالی گئی تھیں۔ انہوں نے عادل کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہا۔ ''میں تو شاید اب بھی پہاڑوں پر نہ چڑھ سکوں لیکن پہاڑوں کو تم جیسا ہم جو تو میں نے دے ہی دیا ہے۔'' عادل کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس نے ان کا پاؤں چھو لیا۔ سرمد صاحب کی طبیعت کچھ بحال ہوئی تو عادل کو اپنے گھر کا حال احوال معلوم کرنے کی خواہش شدت سے محسوس ہونے لگی۔ حقیقت یہ تھی کہ پچھلے قریباً تین ماہ سے اسے پیچھے کی کچھ خبر نہیں تھی۔ جہاں وہ اور سرمد صاحب وغیرہ موجود تھے، وہاں کسی طرح رابطے کا ذریعہ ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے اردگرد سے بالکل کٹے رہے تھے۔ لاہور سے چلے آنے کے بعد وہاں کیا ہوا تھا؟ اس کے گاؤں کے حالات کیا تھے؟ والدہ کہاں تھی؟ شہزادی کی طرف صورتِ حال کیا تھی؟ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔

وہ اسپتال سے باہر نکل کر ایک پی سی او پر پہنچا اور وہاں سے اپنے دوست صادق کا نمبر ملایا۔ اسے اندازہ تھا

کہ صادق لاہور میں ہی ہوگا اور بہ دستور کباڑ کے کام میں دلچسپی لے رہا ہوگا۔ اس کے یہ دونوں اندازے بعدازاں درست ثابت ہوئے۔ صادق کی جانی پہچانی آواز عادل کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''ہیلو کون؟''

''چند مہینوں میں آواز بھی بھول گئے۔ میں عادل بول رہا ہوں۔''

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ وہ جیسے حیرت کے شدید حملے سے سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر وہ لرزاں آواز میں پکارا۔ ''عادے...... یار...... کہاں چلے گئے تم؟ کوئی اطلاع نہیں۔ کوئی خیر خبر نہیں......'' اس نے کہا اور پھر بولتا چلا گیا۔

کوئی پانچ منٹ تک وہ اسی طرح کے تابڑ توڑ سوالات کرتا رہا اور عادل جواب دیتا رہا۔ عادل نے بھی والدہ...... شہزادی...... اور ماموں طفیل وغیرہ کی خیر خیریت دریافت کی۔ پھر اس نے تایا فراست اور چودھری مختار وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔

تایا فراست کے ذکر پر صادق چند سیکنڈ کے لیے خاموش ہوا۔ پھر بولا۔ ''ہاں، وہ بھی ٹھیک ہیں۔ تمہارے تایا اور چودھری مختار کی دوستی دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے اور......''

وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔

''کوئی خاص بات ہے؟'' عادل نے پوچھا۔

''نہیں...... کوئی ایسی خاص بھی نہیں...... بہرحال...... تم آؤ گے تو...... تفصیل سے بات کریں گے۔''

عادل سمجھ گیا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔ یہ بات تو اسے کئی ماہ پہلے ہی معلوم ہو چکی تھی کہ چودھری مختار اپنے بیٹے ناصر کے لیے شہزادی کا رشتہ چاہتا ہے اور اسی سلسلے میں تایا فراست سے تعلقات گاڑھے کرنے کی کوششیں کر رہا ہے۔ اب صادق نے بھی یہ بتایا تھا کہ اس کی کوششیں بار آور رہی ہیں۔

عادل کے سینے میں بے چینی سی پھیل گئی۔ بہرحال فون پر تو لمبی بات نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس نے صادق کو بتایا کہ وہ دو روز تک لاہور پہنچ رہا ہے۔

تیسرے روز سہ پہر کے وقت وہ لوگ لاہور واپس پہنچے۔ برسات کا موسم زوروں پر تھا۔ بے حد حبس تھا لیکن ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی۔ سرمد صاحب اپنی گاڑی کی پچھلی نشست پر لیٹ کر آئے تھے۔ ہمایوں اور ڈرائیور ان کے ساتھ تھے۔ عادل اور کرنل بذریعہ لگژری کوچ لاہور پہنچے تھے۔

اب عادل والدہ اور شہزادی سے ملنے کے لیے بے تاب تھا۔ اس نے سرمد صاحب سے گوجرانوالہ، والدہ کے پاس جانے کی اجازت مانگی۔

''کب تک آجاؤ گے؟'' سرمد صاحب نے پوچھا۔

''جب آپ کہیں۔''

وہ کچھ دیر سوچ کر بولے۔ ''ٹھیک ہے، ابھی تم چند دن آرام کرو۔ جیسے ہی تمہاری ضرورت محسوس ہوئی، میں تمہیں کال کر لوں گا۔''

انہوں نے ''ضرورت'' کی کوئی وضاحت نہیں کی۔ عادل نے بھی وضاحت نہیں چاہی۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ سرمد صاحب پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کرنے لگا ہے۔

سرمد صاحب نے ایک چیک پہلے ہی لکھ کر رکھا ہوا تھا۔ یہ تیس ہزار کا چیک تھا۔ عادل کو دیتے ہوئے بولے۔ ''یہ تمہارے اخراجات کے لیے۔''

عادل نے بہت انکار کیا لیکن انہوں نے چیک زبردستی عادل کی جیب میں ڈال دیا۔

کرنل اور ہمایوں یہاں سرمد صاحب کے پاس ہی موجود تھے اور عادل کی معلومات کے مطابق ان دونوں کو ابھی یہیں رہنا تھا۔ لہٰذا عادل کو سرمد صاحب کی تیمارداری کی طرف سے تسلی تھی۔ کرنل اور ہمایوں سے رخصت ہو کر عادل...... سرمد صاحب کے عجیب وضع گھر سے نکل آیا۔ یہ گھر کیا تھا، ایک درویش کا ڈیرا تھا۔ یہاں زندگی کی آسائشیں نہیں تھیں۔ گرمی سردی کا مقابلہ کرنے کے انتظامات نہیں تھے۔ یہاں کا مکین اپنا کھانا خود پکاتا تھا، اپنے کپڑے خود دھوتا تھا۔ وہ اپنا رزق براہِ راست زمین سے حاصل کرتا تھا اور اس کے لیے اپنے ہاتھوں سے کھیتی باڑی کی صعوبتیں بھی برداشت کرتا تھا۔ اسے دیکھ کر یہ مصرع بے ساختہ زبان پر آجاتا تھا۔ عجیب مانوس اجنبی تھا، مجھے تو حیران کر گیا وہ۔

سرمد صاحب کے گھر سے نکل کر عادل سیدھا صادق کے پاس پہنچا۔ صادق نے اب کباڑ خانے کو ایک ٹھیک ٹھاک گودام کی شکل دے دی تھی۔ وہ اب پرانی مشینری بھی خرید رہا تھا اور اس مشینری کو ''ری پیئر'' بھی کروا رہا تھا۔ اس نے عادل کا استقبال گرم جوشی سے نم آنکھوں کے ساتھ کیا۔ دونوں دوست گودام کے ایک ٹھنڈے کمرے میں آبیٹھے اور سوال و جواب کا طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔

عادل نے اپنے بارے میں تو صرف وہی باتیں بتائیں جو اس نے بتانا ضروری سمجھیں۔ بہرحال صادق نے یہاں کے حالات کے بارے میں سب کچھ کھول کر بیان

کر دیا۔ وہ عادل کی غیر موجودگی میں دو تین بار لالی گاؤں کا چکر لگا کر آیا تھا۔ وہ گوجرانوالہ میں عادل کی والدہ کی خبر گیری بھی کرتا رہا تھا اور کام میں جو تھوڑا بہت منافع ہو رہا تھا، وہ بھی ان تک پہنچاتا رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ آج کل اس کی والدہ گوجرانوالہ سے واپس لالی گاؤں اپنے بھائی طفیل کے پاس گئی ہوئی ہیں۔ صادق نے یہ بھی بتایا کہ عادل کی آمد کی خبر ان تک پہنچ گئی ہے اور وہ اس سے ملنے کے لیے سخت بے تاب ہیں۔

شہزادی کے بارے میں عادل نے سوال کیا تو صادق کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ ''کیا بات ہے؟ جو کچھ بھی ہے کھل کر بتاؤ صادق؟''

اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''عادل الوگ بات کا بتنگڑ بناتے ہیں..... گاؤں میں یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ شہزادی کی منگنی چھوٹے چودھری ناصر کے ساتھ ہو گئی ہے۔ بس سنی سنائی بات ہے۔ یقین سے کوئی نہیں کہہ سکتا اور نہ ہی حویلی میں کوئی ایسا فنکشن وغیرہ ہوا ہے۔''

عادل کے سینے میں ایک تیر سا لگا۔ تایا فراست نے اسے مہلت دی ہوئی تھی اور تین سال کی اس مہلت میں سے ابھی تو آدھا سال ہی گزر رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا اور اگر ہوا تھا تو..... بد عہدی تھی۔

صادق نے کہا۔ ''بہرحال ایک بات ہے عادل..... اگر منگنی نہیں بھی ہوئی تو ہو ضرور جانی ہے۔ دونوں گھرانے آگے بڑھ بڑھ کر ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔ چودھری مختار کے بیٹے ناصر اور تمہارے تایا کے بیٹے قاسم نے مل کر چاولوں کا کام شروع کیا ہے۔ یہ کام شروع ہوتے ہی بڑی ''اسپیڈ'' سے چل پڑا ہے۔ انہوں نے دو شیلر اور لگا لیے ہیں۔ شیلروں سے لے کر گاؤں تک پکی سڑک بھی اپنے خرچے سے بنوا رہے ہیں۔ بڑی تیزی سے ترقی کر رہے ہیں یہ لوگ.....''

صادق مختلف باتیں کر رہا تھا لیکن عادل کا ذہن ابھی تک منگنی والی بات میں اٹکا ہوا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟

صادق نے اس سے کئی بار پوچھا کہ سرمد صاحب کے ساتھ شمالی علاقوں کے سفر پر جانے کا رزلٹ کیا نکلا ہے؟ عادل نے ہر بار گول مول جواب دے کر اسے ٹال دیا۔ اس نے کہا۔ وہ صرف ایک ٹریننگ تھی، اس ٹریننگ کا نتیجہ بعد میں نکلے گا۔

''یعنی کیش کی صورت میں ابھی کوئی نتیجہ نہیں؟''

''ایسا ہی سمجھ لو۔'' عادل نے کہا۔

''تم نے سرمد صاحب کو شہزادی والی ساری گل بات بتائی ہوئی ہے نا؟''

''ہاں، پتا ہے ان کو۔'' عادل نے جواب دیا۔

سہ پہر کو لالی گاؤں کا پرانا چوکیدار معراج دین بھی صادق سے ملنے آ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ کباڑ کا یہ کام صادق اور عادل نے مل کر کیا ہوا ہے۔ چوکیدار معراج دین یہاں لاہور میں کچھ خریداری کرنے آیا ہوا تھا اور اب واپس گاؤں جا رہا تھا۔ چائے وغیرہ پی کر وہ گاؤں جانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس نے عادل کو بھی ساتھ چلنے کی پیشکش کی لیکن عادل کو کل سرمد صاحب کا دیا ہوا چیک کیش کرانے کے بعد گاؤں جانا تھا۔ وہ ماں اور ماموں طفیل کے لیے خریداری بھی کرنا چاہتا تھا اور شہزادی کے لیے بھی کچھ لینا چاہتا تھا اس امید پر کہ شاید کوئی تحفہ شہزادی تک پہنچانے کا موقع مل جائے۔

وہ اگلے روز سہ پہر سے ذرا پہلے اپنے گاؤں کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کا دل اندیشوں، امیدوں اور وسوسوں سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ عجیب سی کیفیت تھی جسے وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ پہلے بس، پھر لاری اور پھر تانگے کا دشوار اور طویل سفر طے کر کے وہ اگلے روز صبح اپنے گاؤں لالی پہنچ سکا۔ ساری رات ہی بارش ہوتی رہی تھی۔ بہار پور سے آگے کا سفر اس کے لیے زیادہ دشوار ثابت ہوا تھا۔ جب وہ گاؤں پہنچنے کے لیے شہزادی کے گاؤں پال پور کے پاس سے گزرا اور اسے تایا کی حویلی کے بلند و بالا برج نظر آئے تو سینے میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ اس زمین پر ایک ایسی ہی حویلی کھڑی کرنے کا اس نے دعویٰ کیا تھا لیکن ابھی تک اس دعوے کے پورے ہونے کی شروعات بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اسے سرمد صاحب کی زبان پر بھروسا تھا اور یہی بھروسا اسے مایوسی و ناامیدی سے دور رکھے ہوئے تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ بانگڑی کی چوٹی تک پہنچ گئے تو بہت کچھ حاصل کریں گے۔ ان کا کہنا اس طرح تو پورا نہیں ہوا تھا، جس طرح عادل سمجھا تھا..... یعنی وہاں قیمتی زیورات والا تو کوئی موقع پیدا نہیں ہوا تھا لیکن سرمد صاحب نے اسے ایک اور نوید سنائی تھی اور وہ نوید یہی تھی کہ جو کچھ عادل کو اس سفر سے حاصل کرنا چاہیے تھا، وہ اس نے حاصل کر لیا ہے۔ وہ غیر معمولی مہارت..... وہ صلاحیت جو اسے مستقبل قریب میں بہت کام دے سکتی ہے۔ مستقبل قریب میں کیا تھا، یہ بھی انہوں نے عادل کو نہیں بتایا تھا۔

ماموں طفیل کا گھر لالی گاؤں کی بیرونی حدود میں تھا۔ عادل نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ اس کی والدہ اور ماموں گھر سے باہر کھڑے تھے۔ یقیناً چوکیدار معراج دین کی زبانی اس کی آمد کی اطلاع گاؤں میں پہنچ چکی تھی۔ والدہ کو دیکھتے ہی وہ تانگے سے اتر آیا اور دوڑتا ہوا ان کے گلے لگ گیا۔ ماں بیٹے کا ملاپ رقت آمیز تھا۔ وہ بار بار اس کا منہ چوم رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔ ''میرا پتر کتنا ماڑا ہوگیا ہے۔ ہڈیاں نکل آئی ہیں۔''

حالانکہ ہڈیاں تو ان کی نکلی ہوئی تھیں۔ وہ پہلے ہی کمزور تھیں، اب مزید ہوگئی تھیں۔ عادل کو یوں لگ رہا تھا، اس نے ماں کو نہیں ہڈیوں کے پنجر کو گلے سے لگا رکھا ہے لیکن اس پنجر میں اتنی محبت اتنی گرم جوشی تھی جس نے عادل کو سرتاپا توانائی سے بھر دیا۔ اپنی بھوک کو چھپا کر بیٹے کو کھانا کھلانے والی ماں بے شک بہت کمزور تھی لیکن اس کی پاپتا کمزور نہیں تھی۔ یہ ماںتا جب بھی عادل کو گلے سے لگاتی تھی اس کے حوصلے آسمان کو چھونے لگتے تھے۔ یہ بوڑھی ہڈیاں اپنے اندر کرشماتی اثرات رکھتی تھیں۔

ماموں طفیل بھی بڑی گرم جوشی سے ملے۔ وہ بار بار عادل کے عقب میں بھی دیکھ رہے تھے، جیسے کسی چیز کو تلاش کر رہے ہوں۔

''عادے پتر! اپنی گاڑی کہاں چھوڑ آئے ہو؟''

آخر انہوں نے پوچھا۔

ممانی بھی پاس ہی کھڑی تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ''ساری رات بارش ہوتی رہی ہے۔ کیچڑ ہی کیچڑ ہے۔ ادھر بہاولپور میں ہی کہیں کھڑی کر آیا ہوگا۔''

''اور وہ اٹیچی کیس وغیرہ بھی گاڑی کے اندر ہی ہیں؟'' ماموں طفیل نے پوچھا۔

عادل تھوڑا سا حیران تھا۔ یہ گاڑی اور اٹیچی کیسوں وغیرہ کا ذکر کہاں سے آگیا تھا۔ اس کے پاس تو ایک ہی چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا جو اس نے تانگے کی سیٹ کے نیچے رکھا ہوا تھا۔

ماں نے اسے پھر اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''کیا کر رہے ہو؟ ساری باتیں یہیں پر کھڑے کھڑے کرو گے۔ میرا پتر اتنا لمبا پینڈا کر کے آیا ہے۔ پتا نہیں ناشتا بھی کیا ہے یا نہیں۔''

''ناشتا کرلیا ہے ماں اور بڑا تگڑا کیا ہے۔''

کچھ بچے بھی عادل کے ارد گرد جمع ہوگئے تھے اور ذرا تعجب سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک بچے نے پوچھ ہی لیا۔ ''چاچا عادل! تیری لال گڈی کدھر ہے؟''

''وہ بھی آجائے گی۔'' عادل نے گول مول جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی ہوا کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہے۔ شاید کسی نے اس کے بارے میں کچھ جھوٹ موٹ باتیں کہی ہیں۔ لال گاڑی اٹیچی کیس وغیرہ۔

ماں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے آلو والے پراٹھے پکائے۔ ساتھ میں دہی تھا جس میں پودینے کی چٹنی ڈالی گئی تھی۔ عادل بہت کہتا رہا کہ اس نے راستے میں ناشتا کیا تھا مگر وہ ماں ہی کیا جو مان جاتی۔ دوسری طرف ماموں اور دیگر گھر والے عادل کا چھوٹا سا اٹیچی کیس دیکھ دیکھ کر کچھ حیران ہو رہے تھے۔ وہ لوگ عادل سے اس کی تین چار مہینوں کی کارکردگی دریافت کرنے لگے۔ اسی دوران میں بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کی پڑوسن اور رازدان...... ریحانہ اس سے ملنے آئی تھی۔ ساتھ میں اس کی والدہ اور چھوٹے بھائی بھی تھے۔

ریحانہ نے بھی چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''عادے بھائی! تمہاری گاڑی کدھر ہے؟''

اس سے پہلے کہ عادل کچھ وضاحت کرتا، دروازے پر پھر دستک ہونا شروع ہوگئی۔ اس دفعہ عادل باہر گیا۔ باہر لالی اور پال پور کے جڑواں دیہات کا پرانا ٹھیکیدار نوازش علی کھڑا تھا۔ وہ علاقے میں زمینداروں کے ڈیرے، ٹیوب ویلوں کے کوٹھے اور پکی حویلیاں وغیرہ بناتا تھا۔ نوازش علی کے ساتھ دو اور بندے بھی تھے۔ نوازش کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا تھا اور چہرے پر خوشامدی مسکراہٹ۔ ''جی آیاں نوں عادل پتر۔ تیرے بغیر تو یار پنڈ ہی ویران ہوگیا تھا۔ پوچھ لے اپنے ماے سے، میں کئی بار آکر تیرا پتا کرچکا ہوں۔''

ٹھیکیدار نوازش کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بیٹھنے اور چائے وغیرہ پینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ طوعاً وکرہاً عادل نے اس کے لیے بیٹھک کھلوائی اور چائے وغیرہ پلائی۔ ٹھیکیدار کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ بھی کسی غلط فہمی کا شکار ہے۔ اس کا خیال ہے کہ عادل کو شہر میں کہیں سے کافی سارا مالی فائدہ ہوا ہے اور وہ اپنے ماموں کی کاشت والی زمین پر حویلی وغیرہ بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس بار وہ حویلی کے لیے بنیادیں کھدوائے گا اور بھروائے گا۔ سال کے آخر میں وہ دوبارہ گاؤں آئے گا اور حویلی کی تعمیر شروع کرا دے گا۔

عادل یہ باتیں سن سن کر حیران ہو رہا تھا۔ ٹھیکیدار نوازش کو خطرہ تھا کہ کہیں عادل بنیادیں وغیرہ بھروانے کے

لیے اس کے حریف ٹھیکیدار افضل آرائیں کو نہ چن لے۔

عادل نے ٹھیکیدار نوازش سے بھی گول مول باتیں ہی کیں اور اس سے کہا کہ ابھی کوئی آخری فیصلہ نہیں ہوا۔ جب بھی ضرورت پڑی، وہ اسے یاد ضرور کرے گا۔

اب عادل کو اس سارے معاملے میں کسی شرارت یا سازش کی بو آرہی تھی۔

کچھ دیر بعد عادل نے اکیلے میں ماموں طفیل سے بات کی۔ اس نے کہا۔ ''ماما! یہ پنڈ میں کیا باتیں پھیلی ہوئی ہیں؟''

ماموں طفیل کو بھی اب کسی حد تک گڑبڑ کا اندازہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ''عادے! کیا واقعی تو کار وغیرہ لے کر نہیں آیا؟'' عادل نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اور وہ ولایتی سامان سے بھرے ہوئے چار اٹیچی کیس؟''

''نہیں ماما! ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے کوئی ڈاکا تو نہیں مارنا تھا اور نہ ہی کوئی لاٹری شاٹری لگی ہے میری......''

''تو پھر یہ باتیں کیسی پھیلی ہیں؟ سب سے پہلے کل چوکیدار معراج دین نے بتایا تھا کہ عادل لاہور آگیا ہے۔ اس کے بعد دوپہر تک یہ باتیں ہونے لگیں کہ اس نے لال رنگ کی لمبی کار لے لی ہے اور کافی سارے پیسے بھی آگئے ہیں اس کے پاس...... تیری ماں وچاری تو کل سے مبارکبادیں وصول کررہی ہے۔'' ماموں نے ذرا تاسف سے کہا۔

''کہیں یہ چودھری مختار اور اس کے پتر کی شرارت تو نہیں؟'' عادل نے کہا۔

''لگتا تو مجھے بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اپنے کارندوں سے کہہ کر یہ پنڈ میں کوئی بھی بات منٹوں میں پھیلا سکتے ہیں۔ یہ چوکیدار معراج بھی تو ان کے کارندوں کی طرح ہی ہے۔''

عادل کے سینے میں چنگاریاں سی سلگ گئیں۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''ماما! یہ جو شہزادی کی منگنی والی بات ہے، یہ کہاں تک صحیح ہے؟''

ماموں طفیل نے ذرا توقف سے کہا۔ ''ہم نے بھی یہ گل بس سنی ہی ہے۔ کئی لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ منگنی نہیں ہوئی بس اندر خانے بڑوں میں 'ہاں' ہی ہوئی ہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔ یہ وڈے لوگ ہیں۔ ان کے اپنے طور طریقے ہوتے ہیں۔ ویسے میں تو ایک گل کہوں گا تجھ سے، اگر تو برا نہ مانے تو۔''

''کہو ماما! تمہارے اور ماں کے سوا میرا اور ہے کون؟''

''تو یہ شہزادی کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔ رشتے ناتے اپنے جیسوں میں ہی چنگے ہوتے ہیں اور پھر یہ جو دشمنی چل پڑی ہے نا، تیری چھوٹے چودھری ناصر وغیرہ کے نال...... یہ بھی بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ صبح تیری ماں بھی یہی گل کررہی تھی۔ تجھے...... پنڈ آنا ہی نہیں چاہیے تھا...... چلو اب آگیا ہے تو زیادہ دیر یہاں رکنا نہ۔ خوامخواہ کوئی گل نہ ہوجائے۔''

عادل نے ماموں کے تاثرات دیکھے اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ چند گھنٹے پہلے تک ماموں اور ممانی کا رویہ اور تھا تب ان کا خیال تھا کہ عادل واقعی کوئی کار وغیرہ اور پیسا لے کر آیا ہے۔ لیکن اب وہ پریشان نظر آنے لگے تھے اور شاید یہی چاہتے تھے کہ وہ اور سکینہ جلد یہاں سے چلے جائیں۔

عادل کو خاموش دیکھ کر ماموں طفیل جلدی سے بولا۔ ''میں جو کہہ رہا ہوں، تیرے اور سکینہ کے بھلے کے لیے ہی کہہ رہا ہوں۔ اس طرح کی دشمنی چنگی نہیں ہوتی اور میرا یہ بھی مشورہ ہے کہ ایک بار حویلی جا کر اپنے تائے کو سلام کرآ۔ بلکہ حویلی بھی نہ جانا...... ڈیرے پر چلے جانا۔''

''سلام کرنے تو میں ضرور جاؤں گا ماما۔ وہاں جانا بنتا ہے میرا۔'' عادل نے پُرحرارت اور معنی خیز لہجے میں کہا۔

''تائے کے پتروں سے بھی کسی طرح کا بکھیڑا کرنے کی لوڑ نہیں ہے۔ ان سے آمنا سامنا ہو تو کنی کترا کر گزر جانا...... بلکہ...... میرا تو پھر یہی مشورہ ہے تجھے کہ سکینہ کو لے کر جلدی سے واپس گوجرانوالہ چلا جا۔ وہ سیانے کہتے ہیں نا کہ جب جھکڑ تیز چل رہا ہو تو ٹہنیاں جھک جاتی ہیں اور ٹوٹنے سے بچ جاتی ہیں۔''

عادل کی خواہش تھی کہ کسی طرح جلد از جلد ریحانہ سے تنہائی میں ملاقات ہوجائے۔ وہ اس کی ہمراز و غم خوار تھی اور جو کچھ شہزادی کے بارے میں وہ عادل کو بتا سکتی تھی، کوئی اور نہیں بتا سکتا تھا۔ شام کے وقت عادل گھر کی چھت پر چلا گیا۔ دو دن کی بارش اور بونداباندی کے بعد آج آسمان نکھرا ہوا تھا۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں ہر شے نکھری نکھری اور صاف ستھری دکھائی دیتی تھی۔ گاؤں کے جوہڑ میں بطخیں تیر رہی تھیں اور کناروں پر چمکیلے پتوں والی جھاڑیاں، جیسے پانی میں اپنا عکس دیکھ رہی تھیں۔ اپنے گاؤں کی ایسی ہی سنہری شامیں عادل کے دل کی گہرائی میں چھپی رہتی تھیں۔ ایسی شاموں میں وہ اپنے کھلنڈرے دوستوں کے ساتھ گلی ڈنڈا، والی بال اور کشتی جیسے کھیلوں میں حصہ لیتا تھا اور نہر پر خوب خوب تیراکی کیا کرتا تھا۔ شہزادی کا خیال ایسی سنہری شاموں میں زیادہ شدت سے اس پر حملہ آور ہوتا تھا اور وہ دور اونچی حویلی کے کلس دیکھ کر شہزادی

کا تصور ذہن میں اجاگر کیا کرتا تھا۔ آج بھی کچھ یہی کیفیت تھی۔ غروب ہوتے سورج کی آخری کرنیں قریباً چار فرلانگ دور پال پور کی بلند حویلی کے در و بام کو روشن کر رہی تھیں۔ ان در و بام میں اس کی شہزادی رہتی تھی۔ اس سے قریب ہو کر بھی وہ اس سے بہت زیادہ دور تھی۔

پھر عادل کی نگاہ نہر کی طرف دو تین پختہ عمارتوں پر پڑی۔ یہ چاول صاف کرنے والے وہ کارخانے تھے جو چودھری ناصر اور قاسم نے مل کر لگائے تھے۔ ان کارخانوں کے سامنے سے گزرنے والی پختہ سڑک کے کام کا آغاز ہو چکا تھا۔ دن بھر کے تھکے ماندے مزدور اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔

اچانک ایک آہٹ پر عادل چونک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے کچی سیڑھیوں پر سے فربہ اندام ریحانہ اوپر آ رہی تھی۔ یقیناً اس نے اپنے گھر کی چھت سے عادل کو چھت پر دیکھ لیا تھا اور اب اس سے ملنے آ رہی تھی۔ شام کی سرخی اب تیزی سے اندھیرے میں بدل رہی تھی۔ دونوں منڈیر کی اوٹ میں علیحدہ علیحدہ چارپائی پر بیٹھ گئے۔

''شہزادی کیسی ہے ریحانہ؟'' عادل نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''بس ٹھیک ہے۔'' ریحانہ نے مختصر جواب دیا۔ ''تو بتا عادے بھائی! تجھے شہر میں کچھ کامیابی ملی کہ نہیں؟''

''ملے گی ریحانہ...... ضرور ملے گی۔ محنت کبھی ضائع نہیں جاتی۔''

''لیکن...... عادے بھائی! مجھے لگتا ہے کہ تجھے بہت دیر ہو جائے گی بلکہ......شاید...... دیر ہو بھی چکی ہے۔''

عادل کے سینے میں سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ ریحانہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تو تو ہر روز حویلی میں جاتی ہے ریحانہ! تجھے تو ہر بات کا پتا ہوگا۔ شہزادی کی منگنی والی کیا بات ہے؟''

''مجھے بھی اتنا ہی پتا ہے، جتنا دوسروں کو ہے۔ لگتا ہے کہ...... اندر خانے کوئی ''ہاں'' وغیرہ ہوئی ہے۔ پر کھل ڈل کر منگنی والی بات نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ تایا فراست اس کو پسند نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ لمبی منگنیاں ہونی ہی نہیں چاہئیں۔ اگر ہو بھی تو دو تین ماہ کی ہو اور پھر ویاہ ہو جائے......''

''اگر کوئی ''ہاں'' ہوئی ہے تو وہ بھی تایا جی کی مرضی سے ہی ہوئی ہوگی نا؟''

''ہاں، یہ بات بھی ٹھیک ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ اس معاملے میں تمہاری تائی مجیدہ زیادہ آگے آگے ہے۔''

''شہزادی اس بارے میں کیا کہتی ہے؟''

ریحانہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اس وچاری نے کیا کہنا ہے، وہ تو بس اس آس پر ہے کہ شاید اللہ میاں کی طرف سے کوئی کرشمہ ہو جائے۔ تو کچھ بن جائے اور...... تایا فراست کا دل تیرے لیے نرم ہو جائے۔ کل جب یہ خبر پھیلی کہ تو لمبی کار پر پنڈ آ رہا ہے اور تیرے پاس کافی سارے روپے آ گئے ہیں تو وہ خوش تھی۔ میں نے دیکھا اس نے کمرے میں جا کر نفل وغیرہ بھی پڑھے تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ ساری افواہ تھی اور چودھری مختار کے کاموں (کارندوں) نے جان بوجھ کر پھیلائی تھی تو وہ بالکل گم صم ہو گئی۔''

عادل کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ اس نے کہا۔ ''ریحانہ! کل حویلی میں کام کرنے جانا ہے تو نے؟''

''ہاں عادے بھائی! وہ تو روز ہی جانا ہوتا ہے۔''

''تو شہزادی سے یہ کہنا، میں کوئی آرام سے نہیں بیٹھا ہوا۔ پوری پوری کوشش کر رہا ہوں اور اس کوشش کا پھل جلد ہی مل بھی جانا ہے۔ اللہ کے گھر سے پوری پوری امید ہے۔ وہ ہمت نہ ہارے۔ میں اسے ہر صورت میں جیت کر رہوں گا۔ دیر ہو سکتی ہے لیکن اندھیر نہیں۔''

''اچھا عادے بھائی! میں کوشش کروں گی۔ دو تین دن سے تائی مجیدہ مجھ پر بھی پوری نظر رکھ رہی ہے۔ شاید اسے شک ہے کہ میں تمہاری بات شہزادی تک پہنچاتی ہوں اگر کسی کو پتا چل گیا نا عادے بھائی...... تو اس قاسم نے تو میری چمڑی ہی ادھیڑ دینی ہے۔ تم کو پتا ہی ہے وہ کتنا ڈھاڈا ہے۔''

عادل نے ریحانہ سے تسلی تشفی کے چند بول بولے۔ اسی دوران میں عادل کے ہم عمر لڑکوں کی ایک ٹولی اس سے ملنے کے لیے آ گئی اور دروازے پر دستک شروع ہو گئی۔ ان میں عادل کا قریبی دوست شاہد بھی تھا۔ عادل ان سے ملنے نیچے چلا گیا۔

☆☆☆

اگلے روز شام کو ریحانہ نے شہزادی کا جوابی پیغام عادل تک پہنچا دیا۔ ان کی ملاقات وہیں چھت کی تاریکی میں ہوئی۔ ریحانہ افسردہ نظر آ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''عادے بھائی! میں اپنی طرف سے ایک لفظ بھی بولوں تو میری زبان سڑ جائے۔ وہی کہوں گی جو شہزادی نے مجھ سے کہا ہے......''

''ٹھیک ہے کہو۔''

وہ آزردہ لہجے میں بولی۔ ''عادے بھائی! شہزادی نے کہا ہے کہ تم خوامخواہ اپنے آپ کو نہ رولو۔ اس خواری سے کچھ حاصل نہیں ہونا ہے۔ وہ کہتی ہے گھر میں کوئی ایک

بھی ایسا نہیں جو میری اور تمہاری شادی کے حق میں ہو۔ چودھری مختار کی دوستی اباجی سے بہت پکی اور گاڑھی ہو گئی ہے۔ اکٹھے کاروبار شروع ہو گئے ہیں۔ چودھری گھرانے کے لوگ اب کسی طرح بھی اس رشتے سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ یہ سب بڑے زور والے لوگ ہیں۔ یہ تمہاری کوئی پیش نہیں چلنے دیں گے۔''

''لیکن ریحانہ! جو بات میں نے تم سے کہی تھی، اس کا کیا جواب دیا اس نے؟''

''وہ کیا جواب دے عادے بھائی! دوسروں کی طرح اس کو بھی یہ بات نہ ہونے والی لگتی ہے کہ تم بہت سارا روپیا جمع کرلو گے اور اپنے تایا کا نام چلا ہو کر دکھا دو گے۔ چودھری مختار کے کاے بھی تمہارے بارے میں الٹی سیدھی باتیں پھیلاتے رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تم اپنے کسی یار کے ساتھ مل کر وہاں لاہور میں کباڑیے کا کام کر رہے ہو۔ ردی بیچتے ہو۔ پھر یہ بات مشہور ہوئی کہ تم نے کباڑیے کا کام بھی چھوڑ دیا ہے اور کسی خبطی بندے کے ساتھ پہاڑوں کی طرف نکل گئے ہو، جڑی بوٹیاں ڈھونڈنے کے لیے...... کیا تم واقعی جڑی بوٹیاں ڈھونڈنے نکلے ہوئے تھے عادے بھائی؟''

''نہیں، یہ جھوٹی باتیں ہیں۔'' عادل نے سخت بیزاری سے کہا۔

''یہ لوگ تم پر ہنستے ہیں عادے بھائی...... اور میں جانتی ہوں جب بھی کوئی ایسی گل ہوتی ہے، شہزادی کا دل خون ہو جاتا ہے۔ ابھی پچھلی ہی عید پر چودھری ناصر کی بہن نے ایسی بات کر کے بڑے رلایا تھا وچاری کو۔ وہ آج کل بہت ملتی جلتی ہے نا شہزادی سے......'' بات ختم کر کے ریحانہ نے کھوئی کھوئی نظروں سے عادل کو دیکھا اور دوبارہ بولی۔

''ویسے عادے بھائی! تمہارے ہاتھ پیر دیکھ کر اور تمہارا رنگ دیکھ کر لگتا تو یہی ہے کہ تم بہت دن پہاڑی علاقوں میں اور برفوں میں گھومتے پھرتے رہے ہو، کیا واقعی ایسا تھا؟''

''ہاں، میں گیا تھا پہاڑوں میں...... لیکن جڑی بوٹیاں ڈھونڈنے کے لیے نہیں۔'' عادل نے پُرتپش لہجے میں کہا۔

رات کو ماں بھی اسے دیر تک سمجھاتی رہی۔ وہ لالٹین کی روشنی میں لیٹی تھی۔ وہ اس کے پاؤں دبا رہا تھا۔ جو چیزیں وہ لاہور سے اس کے لیے لایا تھا، وہ اس کے سرہانے رکھی تھیں۔ ماں کی آنکھوں میں بار بار خوشی کے آنسو آتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اندیشوں کی نمی بھی آنکھوں میں چمک جاتی تھی۔ اس نے کہا۔ ''عادل پتر! وہ وڈے لوگ ہیں، ہم ان کی دشمنی مول نہیں لے سکتے۔ میں گوجرانوالہ میں ہوتی تو تجھے یہاں آنے ہی نہ دیتی۔ چل آ اب واپس چلے جائیں۔ تو ماشاء اللہ اب کمانے لگ گیا ہے۔ دیکھنا میں تیرے لیے ایسی ووہٹی لاؤں گی کہ سب دیکھدے رہ جائیں گے۔ تو بس چھڈ دے اس وڈی امیر زادی کا خیال۔''

''ٹھیک ہے ماں! جیسا تو کہتی ہے ویسا ہی ہوگا۔'' عادل نے کہا۔ اس کی نگاہیں لالٹین کے شعلے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ جو بلند ترین پہاڑوں کو جیت کر آیا تھا، ماں سے بحث کرنے اور جیتنے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا تھا۔ اس نے اس موقع پر خاموشی ہی بہتر سمجھی۔

اس نے گاؤں سے چلے تو جانا تھا لیکن جانے سے پہلے وہ ایک بار تایا فراست کو سلام کرنے ضرور جانا چاہتا تھا۔ یہ کام وہ کل ہی نمٹانا چاہتا تھا۔

ماں نے اسے خیالوں میں گم دیکھ کر کہا۔ ''کیا سوچنے لگ گیا ہے عادے...... کہیں...... کہیں شہزادی سے ملنے کا خیال تو تیرے دل میں نہیں آ رہا؟'' ماں کے لہجے میں اندیشوں کے دیو چنگھاڑ رہے تھے۔

''نہیں ماں نہیں۔ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے تائے سے وعدہ کر رکھا ہے کہ شہزادی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں رکھوں گا اور میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ تائے کی عزت میری عزت ہے۔''

جس وقت ماں بیٹے میں یہ باتیں ہو رہی تھیں، عین اسی وقت گاؤں کی چند گلیاں چھوڑ کر چودھری مختار کی حویلی میں اس کا دراز قد بیٹا ناصر بھی خاص قسم کی بات چیت میں مصروف تھا۔ اس کے سامنے فراست علی کے ڈیرے کا چوکیدار فربہ اندام انور بیٹھا تھا۔ ابھی ابھی ایک ہزار روپے کے دو کڑکتے نوٹ انور کی جیب میں گئے تھے اور وہ چودھری ناصر کی بات بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ نوجوان چودھری ناصر نے رازداری کے لہجے میں کہا۔ ''بالکل پکی اطلاع ہے اندر سے۔ سویرے اتوار ہے۔ عادے کو بھی چنگی طرح پتا ہے کہ اتوار کے دن سویرے آٹھ نو بجے چودھری فراست ڈیرے پر ہی ہوتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ نو بجے تک ڈیرے پر پہنچ جائے گا۔ وہ چودھری فراست سے ملنے کا کہے گا۔ تم نے کہنا ہے کہ چودھری صاحب اندر نہیں ہیں۔''

''اگر اس نے ان کی جیب وغیرہ دیکھ لی تو؟''

"تو کہنا کہ وہ جیب کھڑی کر کے پیدل چلے گئے ہیں، باغیچے والے نئے احاطے کی طرف۔ باغیچے والے نئے احاطے کا عادے کو پتا نہیں ہے۔ تم نے کہنا ہے کہ چلو میں تمہیں ساتھ لے چلتا ہوں۔ اسے احاطے کے پچھلے والے دروازے کی طرف سے لے جانا۔ چابی تو ہوتی ہے نا تمہارے پاس؟"

"ہاں جی، چابی تو ہے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ آگے کی بات کا تو تجھے پتا ہی ہے۔"

فربہ اندام انور نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ ناصر نے اس کی چادر ہٹائی اور اچانک اس کا گریبان پکڑ لیا۔ پھر ایک جھٹکے سے انور کا گریبان پھٹ گیا اور نیچے سے بنیان بھی پھٹ گئی۔ اس نے حیرت سے چودھری ناصر کی طرف دیکھا۔ چودھری کے ہاتھ میں اب چرخی والا ریوالور نظر آ رہا تھا۔ اس نے ریوالور زور سے انور کی چربی دار چھاتی پر مارا۔ وہاں گہری خراشیں آئیں اور خون کا رساؤ بھی دکھائی دیا۔

انور کا چہرہ زرد ہو گیا تھا لیکن چودھری ناصر کے تاثرات دیکھ کر وہ ذرا سنبھلا۔ چودھری ناصر بولا۔ "گھبراؤ نہیں، یہ جان بوجھ کر کیا ہے میں نے۔ کوئی ثبوت تو ہونا چاہیے کہ عادے نے زبردستی کی تم سے۔"

انور نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ اب تکلیف کے آثار اس کے چہرے سے معدوم ہو گئے تھے۔ چودھری ناصر نے اپنی کڑھائی دار قمیص کی بغلی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ سو روپے کا ایک اور نوٹ نکال کر انور کے ہاتھ میں دے دیا۔ "یہ تمہاری اس چوٹ کے لیے۔" وہ مسکرایا۔

انور خوش نظر آنے لگا۔ اس نے چادر کو دوبارہ بکل کی شکل میں لپیٹ لیا۔ ناصر نے آخری ہدایت دیتے ہوئے کہا۔ "اپنے ساتھی جھورے کو بھی ساری بات سمجھا دینی ہے، یہ نہ ہو کہ وہ کوئی گڑبڑ کرے۔"

"آپ بے فکر رہیں چھوٹے چودھری جی۔" انور نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔

☆☆☆

عادل نو بجے کے بعد تایا سے ملنے کے لیے نکلا۔ اس نے ماں کو پوری تسلی دی تھی کہ وہاں کسی طرح کی کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ وہ بس تایا کو سلام کر کے اور ان کی خیر خیریت دریافت کر کے واپس آجائے گا۔ بہرحال احتیاط کے طور پر عادل نے پستول اپنی قمیص کے نیچے لگا لیا تھا۔ ماں چاہتی تھی کہ عادل نے اگر جانا ہی ہے تو ماموں کو ساتھ لے کر جائے لیکن وہ خاموشی سے ہی نکل آیا تھا۔ ایک ٹریکٹر ٹرالی پال پور کی طرف جا رہی تھی۔ وہ اس پر سوار ہو گیا اور دو چار منٹ کے اندر ہی پال پور کی مغربی سمت تایا کے ڈیرے کے پاس اتر گیا۔

تائے کا ڈیرا گھنے درختوں میں تھا۔ شام کے وقت یہاں کافی رونق ہوتی تھی لیکن یہ تو سویرا سویرا تھا۔ اسے درختوں میں بس اِکا دُکا بندے ہی کام کرتے نظر آئے۔ ابھی وہ ڈیرے کے مین دروازے سے تیس چالیس قدم دور ہی تھا کہ اسے تائے کا خاص کارندہ انور نظر آیا۔ انور ایک طرح سے ڈیرے کا نگران بھی تھا۔

"کیا حال ہے انورے؟" عادل نے پوچھا۔

"ٹھیک ٹھاک ہوں عادے صاحب! آپ یہاں کیسے؟" اس نے چادر کی بکل درست کرتے ہوئے کہا۔

"بس تایا جی کو سلام کرنے آیا تھا۔ وہ اندر ہی ہیں نا؟"

"ہاں آئے تو تھے لیکن چلے گئے ہیں۔ باغیچے والے احاطے کی طرف۔"

"باغیچے والا احاطہ؟" عادل نے پوچھا۔

"آہو جی، یہ نیا احاطہ بنوایا ہے نا چودھری صاحب نے۔ آموں کے باغ کے اندر ہے...... آپ نے جانا ہے تو میں لے چلتا ہوں۔"

"چلو۔" عادل نے کہا۔

وہ انور کے ساتھ درختوں کے نیچے سے گزرتا آموں والے گھنے باغ کی طرف چل دیا۔ برسات کی وجہ سے کہیں کہیں پانی کھڑا تھا۔ وہ ایک تنگ پگڈنڈی سے تھوڑا سا چکر کاٹ کر گئے۔ جلد ہی باغ کے بیچوں بیچ عادل کو ایک اونچی چار دیواری نظر آئی...... اندر ایک دو کمرے بھی تھے۔ یہ ساری نئی تعمیر تھی...... اور پچھلے چار پانچ مہینوں میں ہی ہوئی تھی۔ لوہے کے ایک دروازے کے سامنے پہنچ کر انور رک گیا۔ اس نے شلوار کی جیب میں سے چابیوں کا گچھا نکالا اور مقفل دروازہ کھولنے لگا۔ اس موقع پر عادل کو کچھ عجیب سا لگا۔ لیکن اس سے پہلے کہ عادل کچھ سوچتا یا کسی طرح کا ردِعمل ظاہر کرتا، انور نے کہا۔ "ادھر پانی کھڑا ہے نا۔ اس لیے ہم پچھلے دروازے سے آئے ہیں، آپ چلے جاؤ اندر......"

عادل دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا۔ یہ احاطہ تین چار کینال میں ہوگا۔ آموں سے لدے ہوئے بے شمار درخت یہاں موجود تھے۔ کئی درختوں پر بڑے بڑے جھولے ڈالے گئے تھے۔ عادل نے حیران نظروں سے

دیکھا۔ شہزادی اور اس کی دو سہیلیاں جھولے جھول رہی تھیں۔ دونوں سہیلیاں اٹھکیلیاں کر رہی تھیں جبکہ شہزادی قدرے خاموش اور کھوئی کھوئی سی ایک بے حرکت جھولے پر بیٹھی تھی۔ اس کا دوپٹا گلے میں تھا۔ لمبے بال کمر پر لہرا رہے تھے۔ ہلکے گلابی رنگ کی شلوار قمیص میں وہ ایک حسین تصویر کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ آج عادل نے اسے کئی ماہ کے بعد دیکھا تھا۔ وہ جیسے سکتہ زدہ سا اسے تکتا رہ گیا۔ پھر وہ سب کچھ بھول کر بے ساختہ چند قدم آگے بڑھا...... لڑکیوں نے اسے دیکھا۔ وہ چلاتی ہوئی اس درخت کی طرف بھاگیں جہاں ان کے دوپٹے لٹک رہے تھے۔ انہوں نے دوپٹے سروں پر لیے۔ شہزادی جھولے سے اتر آئی تھی مگر اسی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اس کی منتظر آنکھوں میں جیسے دیپ سے جل اٹھے تھے۔ چند لمحوں کے لیے لگا جیسے وہ اپنے گرد و پیش کو فراموش کر کے اس کی طرف لپکے گی اور اس کے سینے سے لگ جائے گی۔ لیکن پھر ایک دم اس کے تاثرات بدلے۔ حسین چہرے پر حیرانی اور خوف کی یلغار ہوئی۔

”عادل! تم یہاں؟“ وہ لرزاں آواز میں بولی۔

عادل بھی جیسے یکا یک ہوش میں آیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ عقب میں چار دیواری کا آہنی دروازہ بند ہو چکا تھا۔ انور بھی دکھائی نہیں دیا۔

”تم...... یہاں...... کیوں آئے ہو؟“ اس مرتبہ شہزادی کی آواز میں خوف کے ساتھ ساتھ غصہ بھی تھا۔ وہ بغیر دوپٹے کے تھی۔ اس نے اپنے بازو موڑ کر اپنے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ عقب میں دونوں لڑکیاں بھی سکتہ زدہ سی کھڑی تھیں۔

اس سے پہلے کہ عادل جواب میں کچھ کہتا، چار دیواری کا سامنے والا پھاٹک ایک دم کھلا اور چار پانچ بندے تیزی سے اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک کے کندھے سے رائفل جھول رہی تھی، باقی کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ عادل نے پہچان لیا، یہ تایا فراست کے کارندے تھے۔ ان کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ لڑکیوں کے چلانے کی آواز سن کر اندر آئے ہیں۔ وہ عادل کو شہزادی کے قریب کھڑے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ رائفل والے کا نام مشتاق تھا اور عادل اسے جانتا تھا۔ وہ چند قدم آگے آیا اور کڑے تیوروں کے ساتھ بولا۔ ”اوئے عادے! تو یہاں؟“

عادل نے سنبھل کر کہا۔ ”میں یہاں تایا جی سے ملنے آیا تھا......“

مشتاق پھنکارا۔ ”یہ عورتوں کا احاطہ ہے، تایا جی یہاں، کہاں سے آ گئے؟“

”مم...... مجھے انورے نے کہا ہے، تایا جی یہاں ہیں۔“

”یہ بکواس کر رہا ہے۔“ ایک دوسرا کارندہ گرج کر بولا۔ ”اس کی نیت ٹھیک نہیں...... کمینہ، چوروں کی طرح گھسا ہے اندر۔“

اوئے...... پالتو کتے...... زبان سنبھال کر بات کر۔“ عادل کے سینے میں چٹختی ہوئی چنگاریاں شعلہ بن گئیں۔

”پکڑو اسے۔“ مشتاق گرجا۔

مشتاق اور اس کے ساتھی غضب ناک ہو کر اس پر جھپٹے۔ یہ سب کچھ عادل کے لیے نیا نہیں تھا۔ وہ ایسے بہت سے مرحلوں سے گزر چکا تھا اور اب برف پوش پہاڑوں کی سختیاں جھیلنے کے بعد تو وہ اور بھی پتھریلا ہو چکا تھا۔ بالکل کڑک۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹا۔ لاٹھی کے وو وار اس نے جھک کر بچائے۔ پھر اس نے ایک لاٹھی بردار کے منہ پر سر کی طوفانی ٹکر رسید کی۔ وہ کئی قدم پیچھے جا گرا۔ عادل نے لاٹھی بھی اس کے ہاتھ سے چھین لی تھی۔ اگلے دو تین منٹ میں تایا کے کارندوں سے اس کی زوردار لڑائی ہوئی۔ لاٹھی ٹوٹ گئی تو عادل نے انہیں گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔ اس کے چھریرے جسم میں برق کوندر رہی تھی۔ تائے کا ایک کارندہ تو تخت تڑوا کر پشت کے بل گرا پڑا تھا، دوسرا سر پر چوٹ لگنے سے مکمل بے ہوش تھا۔ باقی تینوں لڑ تو رہے تھے لیکن ہکا بکا بھی تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو مدد کے لیے پکار رہے تھے۔ لڑکیوں کے چلانے کی آوازیں بھی عادل کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ پھر احاطے کا عقبی دروازہ دھماکے سے کھلا اور فربہ اندام انور تین چار ساتھیوں کے ساتھ دوڑتا ہوا اندر آیا۔ اس نے پیچھے سے عادل کے سر پر ہاکی کا زوردار وار کیا۔ عادل گھٹنوں کے بل گر گیا۔ تائے کے کارندے اس پر پل پڑے۔ وہ اسے لاٹھیوں سے بے دریغ پیٹنے لگے۔ عادل ان آہنی بالٹیوں پر گرا جن میں آم ٹھنڈے کرنے کے لیے رکھے گئے تھے۔ اس کے سینے پر شدید چوٹ آئی۔ شہزادی کی چلاتی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ دور کھڑی اپنے نوکروں کو پکار رہی تھی۔ ”چھوڑ دو اسے...... نہ مارو۔ مر جائے گا...... چھوڑ دو......“

زندگی کے دشوار گزار رستوں پر لمحہ بہ لمحہ طوفان وبادوباراں سے نبرد آزما اس داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ...

ماہرِ تولید

ابوضیا اقبال

یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر انسان چاہے تو خدا کے دیے ہوئے اس تحفے سے بے انتہا فائدہ اٹھا سکتا ہے جو عقل و دانش کی صورت میں عطا کیا گیا ہے۔ اس نے بھی ایک ادنیٰ سی کوشش کر ڈالی اور ذرا سی عقل کے طفیل اتنا بڑا کارنامہ انجام دے ڈالا کہ دنیا حیران رہ گئی... دریافت اور ایجاد... علم کی مرہونِ منت سہی مگر ان کا استعمال صرف اور صرف انسان کے شعور پر منحصر ہوتا ہے، ویسے ہی اس کے نتائج بھی برآمد ہوتے ہیں۔

انسانی عقل کا ناقابلِ یقین اور حیرت انگیز شاہکار

میں یونیورسٹی کیمپس کے کمپیوٹر سیکشن سے نکلا تو ایشے پر نظر پڑی۔ وہ راہداری میں دیوار سے پشت لگائے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید تھا۔ آنکھیں پھیلی پھیلی سی تھیں۔ میں سمجھا اسے ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔ دوڑ کر اس کے پاس گیا۔ ایشے شعبۂ کیمسٹری میں سب سے سینئر کارکن تھا۔ وہ شعبے کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر ایمیٹ کی بہ وقت ضرورت معاونت کرتا تھا۔ ہر چند کہ پروفیسر اس کا اسے کم ہی موقع دیتا تھا۔ جب وہ لیبارٹری میں بند ہوتا تو سوائے

میرے کسی کو اپنے کام میں مخل نہیں ہونے دیتا تھا۔ میں اس کے ماتحت تھا۔ میری حیثیت اس کے دستِ راست اور دوست کی تھی۔

"کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" میں نے ازخود رفتہ ایشے کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔

چند ثانیے وہ بے حس و حرکت میرے چہرے کو دیکھتا رہا پھر جھرجھری لے کر مری ہوئی آواز میں بولا۔ "تمہیں سائنس فکشن پر وہ فلم یاد ہے جس میں چھ فٹ لمبا خرگوش دکھایا گیا تھا؟"

میں نے ذہن پر تھوڑا سا زور دیا تو ہالی وڈ کی وہ فلم یاد آگئی۔ میں نے کہا۔ "ہاں، اس کا نام ہاروے رکھا گیا تھا۔" پھر کہا۔ "وہ دیکھتے دیکھتے غائب بھی ہوجاتا تھا۔"

ایشے مرتعش آواز میں بولا۔ "میں نے ابھی ابھی پروفیسر ایمیٹ کی ریسرچ لیبارٹری میں ایک چھ فٹ لمبا جیتا جاگتا خرگوش دیکھا ہے۔"

پہلے تو مجھے اس کے ذہنی توازن پر شبہ ہوا لیکن فوراً رفع ہوگیا۔ وہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا اور اب تک اس میں ذہنی تلاطم کی کوئی علامت پائی نہیں گئی تھی۔ پھر مجھے شک گزرا کہ وہ نشے میں ہے۔ میں نے اس کا منہ سونگھا۔ کوئی بو محسوس نہیں ہوئی۔

"کیا تمہیں میری بات پر یقین نہیں آتا؟" اس نے جھنجلاہٹ سے احتجاجاً کہا۔

میں اسے وہیں چھوڑ کر پروفیسر ایمیٹ کی ذاتی ریسرچ لیبارٹری کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ملک کا منفرد ریسرچ اسکالر تھا۔ یونیورسٹی کی طرف سے اسے کیمپس کے ایک گوشے میں ذاتی لیبارٹری قائم کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ وہ کیمسٹری کی کلاسیں بھی لیتا تھا اور بڑی لیبارٹری میں طلبا کو تجربات بھی سکھاتا تھا لیکن وقت نکال کر اپنی ذاتی لیبارٹری میں جاکر بند ہوجاتا تھا۔ اکثر راتیں بھی وہیں گزارتا تھا۔ میں اشد ضرورت کے علاوہ اس کے پاس نہیں جاتا تھا۔ البتہ وہ مجھے بلا لیتا اور گھنٹوں اپنے ساتھ رکھتا۔ اس لحاظ سے میں اس کا واحد با اعتماد اور رازدار ساتھی تھا۔ اسی لیے مجھے ایشے کی چھ فٹ لمبے خرگوش والی بات سے انتہائی حیرت ہوئی۔ ایمیٹ وہ خرگوش کب اور کیسے لایا؟ پورے کیمپس میں اسے لاتے ہوئے کوئی دیکھ کیوں نہ سکا؟ ایک یہ بھی خیال تھا کہ خرگوش مصنوعی ہوگا۔ ایمیٹ نے اندر ہی اندر اسے کپڑے روئی وغیرہ سے بنایا ہوگا اور اتنا اصلی لگ رہا ہوگا کہ ایشے کی آنکھیں دھوکا کھا گئیں لیکن ایمیٹ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟

میں نے لیبارٹری کے دروازے پر تین بار مخصوص دستک دی اور اس کے پوچھنے پر اپنا نام بتایا تو اس نے دروازہ کھولا اور کہا۔ "اندر آجاؤ لیکن خاموش رہنا۔ میں ایک خاص کام میں مصروف ہوں۔"

اس کی عادت تھی کہ میری مخصوص دستک کے باوجود وہ نام ضرور پوچھتا تھا۔ اسے وہم رہتا تھا کہ کوئی میری نقل کر کے دروازہ نہ کھلوا لے۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔ لیبارٹری کیا تھی، سائنسی آلات، درجنوں کیمیکلز اور تجرباتی اشیا کا چھوٹا سا عجائب گھر تھا۔ الیکٹرونکس سے لے کر کیڑے تک ہر چیز موجود تھی۔ چار فٹ سے لے کر چار انچ تک کے مرتبانوں میں مختلف حیوانات اور نباتات تھیں۔ میری آنکھیں اس محیرالعقل خرگوش کو ڈھونڈ رہی تھیں لیکن وہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ میں ایشے کی بدحواسی پر دل میں ہنسا اور ایک کونے میں اسٹول پر بیٹھ گیا۔ ایمیٹ میز پر جھکا لکھنے میں منہمک تھا۔

"شاید تم اس احمق ایشے سے ٹکرا گئے ہو۔" اس نے اچانک سر میری طرف گھما کر کہا۔

میں اپنا ذہن پڑھے جانے پر حیران رہ گیا۔ یہ اس کی ذہنی استعداد کا ثبوت تھا۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور کہا۔ "وہ مجھے کوریڈور میں ملا تھا۔"

"میں نے اس گدھے کو ایک قطرے اور تار کا سالمہ دکھایا تھا جس کی بنیاد پر ایک جاندار شے کے عضلات بنائے جاسکتے ہیں۔ نہ جانے کیوں وہ خوف زدہ ہوگیا۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔

میں اس کے سفید جھوٹ پر دل میں ہنس دیا اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اس نے کسی چھ فٹ خرگوش کے بارے میں بتایا۔"

ایمیٹ کے ماتھے پر شکنیں آگئیں۔ آنکھوں سے غصہ جھلکنے لگا لیکن اس نے حسب معمول خود پر قابو پالیا اور بولا۔ "اچھا، وہ ایما... تو راز کھل گیا۔ آؤ تمہیں بھی دکھاؤں۔"

لیبارٹری کا بغلی کمرا ہمیشہ بند رہتا تھا۔ اس میں فالتو اشیا پڑی رہتی تھیں۔ ایمیٹ نے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوتے ہی میرے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ آنکھیں دہشت آمیز حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میز پر بڑے سے پنجرے میں ایک چھ فٹ لمبا خرگوش ٹک ٹک ہماری

طرف دیکھ رہا تھا۔

''کیا خیال ہے؟'' ایمیٹ نے کہا۔

میرے منہ سے بات نکل نہیں رہی تھی۔ میں نے گڑبڑا کر کہا۔ ''انتہائی حیرت کی چیز ہے۔''

''مجھ سے حساب کتاب میں تھوڑی سی چوک ہو گئی لیکن اس کی چمک دار آنکھیں اور دودھ جیسی سفید کھال دیکھو۔'' ایمیٹ نے میری کیفیت کو نظر انداز کر کے کہا۔

''جسامت سے قطع نظر بہت خوب صورت ہے۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''اس کے قد و قامت پر مت جاؤ۔ یہ دیکھو کہ میں نے اسے بنایا ہے۔'' اس نے لفظ ''میں'' پر زور دے کر کہا۔

اس کی بات سے مجھے جھرجھری آ گئی۔ ایمیٹ جان داروں کی پیوند کاری اور ان کے تخلیقی نظام پر ریسرچ اور تجربات کر رہا تھا لیکن یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ایک جاندار تخلیق کر لے گا۔

''اس سے تمہارا کیا مطلب ہے کہ تم نے اسے بنایا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہیں شاید علم ہے کہ میرے پاس ایک اپنا بنایا ہوا سالمہ تھا جس میں نشوونما پانے والا زندہ عضلاتی نظام ڈالنے کی کوششوں میں تھا۔ میری یہ تخلیق اسی کا منطقی نتیجہ ہے۔ پہلے میں نے اس کا بلیو پرنٹ تیار کیا۔ پھر اسے عملی شکل دی۔ اب میری آرزو اور کوشش کا پھل تم دیکھ رہے ہو۔'' اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''اور یہ سب تم نے مجھ سے چھپائے رکھا۔'' میں نے دبی زبان میں گلہ کیا۔

''بات ہی ایسی تھی۔'' اس نے سرد مہری سے کہا۔ ''اگر میں ناکام رہتا تو تمہاری نظروں میں میری وقعت نہ رہتی۔ میں اس خرگوش ایما کے منہ سے آواز نکالنے سے پہلے تمہیں بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن برا ہو اس نامعقول ایشبے کا، اس نے کام خراب کر دیا۔ مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کب میرے پیچھے اس کمرے میں آ گیا تھا۔ اب میں اسے لیبارٹری کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دوں گا۔ آج ہی اس کا دوسرے ڈپارٹمنٹ میں ٹرانسفر کرا دوں گا۔''

''لیکن وہ تو سب کو بتاتا پھرے گا جیسا کہ اس نے مجھے بتایا۔'' میں نے کہا۔

''تمہاری بات اور ہے، وہ کسی اور کو بتانے کی جرأت نہیں کرے گا۔ جانتا ہے لوگ اسے اس کے دماغ کا خلل کہیں گے اور یہ تو تم جانتے ہو کہ کوئی میری اجازت کے بغیر لیبارٹری میں قدم نہیں رکھ سکتا۔'' اس نے مجھے مطمئن کر دیا۔

اچانک مجھے خیال آ گیا اور میں نے کہا۔ ''تم نے خرگوش کا نام ایما بتایا۔ یہ مادہ ہے؟''

''اس میں کوئی شک ہے؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔ پھر وضاحت کی۔ ''جنس تانیث پیدائش کا منبع ہوتی ہے۔ میں یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ تولید کے لیے جنس ذکیر لازمی نہیں ہے۔''

''یہ تمہاری پہلی کوشش ہے؟'' مجھے اس کے اس تجربے کے بارے میں اپنی لاعلمی پر ملال تھا۔

''ایما میری پانچویں کوشش کا نتیجہ ہے۔'' اس نے مجھے مزید رنجیدہ کر دیا۔ ''لیکن یہ جاندار بننے والی پہلی شے ہے۔''

''تم نے وہ کام کیا ہے جو آج تک کوئی انسان نہیں کر سکا پروفیسر۔ تم نے اب تک اسے ظاہر کیوں نہیں کیا؟'' میں نے مرعوبیت سے کہا۔

''اس کی کئی وجوہ ہیں اور پھر یہ کہ مجھے کیمسٹری میں ایک بار نوبل پرائز مل چکا ہے۔ دوسری بار ملنے کی توقع نہیں ہے۔'' اس نے مزے سے کہا۔

میں نے جیب سے رومال نکالا اور ماتھے کا پسینا خشک کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کارنامہ زیادہ عرصے چھپا نہیں رہے گا۔''

''فی الحال تو میں اسے خفیہ رکھنے میں کامیاب ہوں۔'' وہ بے فکری سے بولا۔

معاً ایک خیال میرے ذہن میں سرعت سے آیا۔ میں نے کہا۔ ''کیا تم نے اس تجربے کے بعد انسان کی تخلیق کا نہیں سوچا؟''

''سوچا؟'' وہ ڈرامائی انداز میں بولا۔ ''تمہارے آنے سے پہلے میں اس کے ابتدائی مراحل میں تھا۔''

میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ میں نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ ''تم بہت آگے جا چکے ہو۔''

''تھوڑی سی کسر رہ گئی ہے۔'' اس نے میری بات کو سنی ان سنی کر کے کہا۔ ''دو ماہ میں ایک انسانی بچہ وجود میں آ جائے گا۔''

یہ میرے ذہن کو دوسرا جھٹکا تھا۔ میں نے پھر مرتعش آواز میں کہا۔ ''وہ لڑکا ہوگا یا لڑکی اور اس کا رنگ کیا ہوگا؟''

''سفید رنگت کی لڑکی ہوگی۔'' اس نے جواب دیا۔

''پھر تو تم پر نسلی عصبیت کا الزام لگ جائے گا۔'' میں

نے شوشہ چھوڑا۔

''یہ تم نے ٹھیک کہا۔'' وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے سیاہ فام بچہ بنانا چاہیے تھا۔''

''اس پر تم سفید فاموں کی نفرت کا شکار ہو جاتے۔'' میں نے کہا۔

''دونوں طرف مصیبت تھی۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''ایک بات ہو سکتی ہے۔'' میں نے مشورہ دیا۔ ''اس بچے کی نشوونما مت کرو۔ اسے اسی حالت میں رہنے دو اور ایما کو دنیا کے سامنے پیش کر دو۔ تمہاری تحقیقی صلاحیت تسلیم کر لی جائے گی۔''

''تمہارا مطلب ہے نوزائیدہ کو مار ڈالوں؟ نہیں، یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔'' وہ گرم ہو گیا۔

''افوہ!'' میں نے سر پکڑ لیا۔ ''آخر اسقاط حمل بھی تو ہو جاتا ہے یا لوگ پیدائش سے پہلے بچہ ضائع کر دیتے ہیں۔ حالات ہر بات کی اجازت دیتے ہیں۔''

''مجھے نہیں۔'' اس نے تیقن سے کہا۔

میں خاموش رہا۔ مزید بحث فضول تھی۔ ہم دیر تک اپنی اپنی جگہ ساکت بیٹھے رہے۔ پھر ایمیٹ اچانک بول پڑا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دیکھو اور انتظار کرو۔''

''کیا ہنکل کو معلوم ہو گیا؟'' مجھے اچانک یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا خیال آ گیا۔

''ایشبے اور تمہارے سوا کسی کو اب تک علم نہیں ہے۔'' ایمیٹ نے جواب دیا۔ ''مجھے ایشبے کی بے دلچسپی اور تمہاری رازداری سے یقین ہے کہ بات نکلے گی نہیں۔''

''اس سے پہلے کہ ہنکل کو کسی اور ذریعے سے معلوم ہو جائے تم اسے بتا دو اور دیر نہ کرو۔'' میں نے پھر مشورہ دیا۔

ایمیٹ پھر سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یہ قطعاً ناپسند ہے لیکن تم کہتے ہو تو اسے بتا دوں گا، اور آج ہی۔''

☆☆☆

ایمیٹ ہنکل کو فون کر رہا تھا، میں اس کے قریب کھڑا تھا۔ تصور میں، میں ہنکل کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ حیرت، غصہ، بوکھلاہٹ، سراسیمگی، میں ان میں سے ان تاثرات کو کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ جب وہ لیبارٹری میں داخل ہوا تو ایسے ہی تاثرات اس کے چہرے پر تھے۔ اس کی سیکریٹری مائرنا ہمراہ تھی۔ ایما کو دیکھ کر وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ اگر میں لپک کر اسے تھام نہ لیتا تو وہ پختہ فرش پر گر کر گردن کی ہڈی ضرور تڑوا بیٹھتی۔ ایمیٹ ہنکل کو ایما کے بارے میں بتانے لگا تو وہ مسلسل بڑبڑائے جا رہا تھا اور ایما کی طرف سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ صرف کن انکھیوں سے اسے دیکھ لیتا تھا۔ مائرنا پورے حواسوں میں نہیں تھی۔ میری انگلیاں اس کی نبض پر تھیں اور دوسرے ہاتھ سے میں اس کی کنپٹیاں سہلا رہا تھا۔

ایمیٹ ایما کے بارے میں بتا چکا تو رک گیا۔ مجھے خدشہ ہوا کہ اب وہ انسانی وجود کی تخلیق کے بارے میں بتائے گا، لہٰذا میں وہاں سے کھسک گیا۔ گھر جا کر میں نے ٹھنڈی بیئر پی اور ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا۔ باسکٹ بال کا میچ دکھایا جا رہا تھا۔ کھلاڑیوں کا جوش و خروش اور تماشائیوں کا شور و غوغا عروج پر تھا لیکن مجھے اسکرین پر کسی اور چیز کا انتظار تھا۔

انتظار کے لمحے ختم ہوئے۔ اسکرین پر ایمیٹ کے نام کے ساتھ ایک سطر ابھری۔ تخلیق کاری میں سائنس کا معجزہ۔ اس کے ساتھ وائس چانسلر ہنکل کی تقریر شروع ہو گئی۔ مجھ پر ندامت سے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ میں نے ٹی وی بند کیا اور اپنے مربی اور دوست کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کے لیے گھر سے چل پڑا۔ کیمپس پہنچا تو اس کے سامنے سیکڑوں افراد موجود تھے۔ پولیس والوں کی ایک بڑی تعداد انہیں کنٹرول کر رہی تھی لیکن مجمع بے قابو ہو رہا تھا۔ بیشتر طلبا تھے۔ ٹی وی اور اخبارات کے نمائندے کیمپس میں داخل ہونے کے لیے زور لگا رہے تھے۔ مجھے آگے بڑھنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ پولیس والوں کو اپنا شناختی کارڈ دکھانے کے باوجود میں ایک انچ آگے بڑھ نہیں پا رہا تھا۔

معاً عام آمدورفت کے لیے بند سائڈ گیٹ سے لمبا کوٹ پہنے، بڑا سا ہیٹ لگائے ایک کلین شیو شخص جھکا جھکا برآمد ہوا۔ اس کے بغل میں ایک پیکٹ تھا۔ اس نے قریب آ کر میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور تب میں نے داڑھی منڈے ایمیٹ کو پہچان لیا۔ ہم مجمع میں سے بچ بچا کر نکلے اور دور جا کر رک گئے۔

''تم بھاگ کیوں رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارے نزدیک اس سے بہتر کوئی راستہ ہے؟'' وہ بولا۔ ''میں ٹی وی کیمرے میری طرف تھے اور احمقانہ سوالات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ میں نہیں چاہتا کہ کسی کو اس انسانی مخلوق کے بارے میں معلوم ہو۔''

''وہ اس پیکٹ میں ہے؟'' میں نے اس کی بغل میں دبے ہوئے پیکٹ کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تم نے ہنکل کو بھی نہیں بتایا؟''

''میں بتا نہ سکا۔ مجھے یہی بہتر لگا کہ اسے یہاں سے نکال لے جاؤں۔ پروان چڑھاؤں اور پھر کسی سائنسی جریدے میں اس کے بارے میں بتاؤں۔''

''اور خرگوش کے بارے میں کیا فیصلہ کیا؟''

''ہنکل اس کا اچھی طرح خیال رکھے گا۔ جب ایما بڑی ہو جائے گی تو سمجھ جائے گی کہ میں نے اسے خود سے کیوں جدا کیا تھا۔''

''تمہارا یہ فرار ایک بہت بڑی غلطی ہوگی۔ ہوٹلوں سے کھانا، کسی ڈرگ اسٹور سے چھپ کر کیمیکلز خریدنا، فرضی ناموں سے یہاں وہاں رہنا، یہ باتیں دیر تک نہیں چلیں گی۔''

ایمیٹ ہونٹ چباتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔''ایک راستہ دکھائی دیتا ہے۔ میں اس بچے کو لارا کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ اپنے اپارٹمنٹ میں اس کی دیکھ بھال کرے گی۔ یہ بڑھتا جائے گا اور پھر اس میں سے بچہ نکلے گا۔''

''لارا لوک مین؟ تمہاری شاگرد؟ کیا تم نے اسے اس کے بارے میں بتا دیا ہے یا بتادو گے؟''

''میں نے اسے کچھ نہیں بتایا لیکن میرا خیال ہے وہ جانتی ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ میری مدد کرے گی۔ ہمیں اس کے اپارٹمنٹ میں استعمال کے بہت کم آلات رکھنا ہوں گے۔''

اور یہی ہوا۔ لارا نے تنکے کے مانند جھلی دار بیضے کی دیکھ بھال بخوشی قبول کر لی۔ اس نے اس کی پرورش میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ گاہے بگاہے وہ مجھے اس کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر دکھاتی۔

''دیکھو پاؤ انچ کی ہوگئی ہے۔ یہ جو ننھا سا ٹیوب نظر آرہا ہے، یہ اس کا دل ہے، یہ دھڑکتا ہے۔'' اس قسم کی باتیں وہ کرتی رہتی۔ پانچ ہفتے بعد اس نے بچی کا سر دکھایا۔ پپوٹوں اور انگلیوں کا بھی آغاز ہوگیا تھا۔ جسم میں بجلی سی دوڑا دینے والی باتیں تھیں۔ گزرتے ہوئے مہینوں میں یہ جھلی میں ملفوف چھوٹی سی چیز ایک پیدا ہونے والے بچے کی سی ہیئت اختیار کرتی گئی۔ ایمیٹ نے پلاسٹک کی مہین نالی سے اسے غذا کا محلول پہنچانے کا اہتمام کیا تھا۔ میں اس کی تکنیک پر ششدر رہ گیا تھا۔ یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہ تھا کہ موجودہ دور میں اس جیسا سائنس داں روئے زمین پر نہیں ہوگا۔

ایمیٹ اپنی رہائش گاہ میں لوٹ آیا تھا۔ کیمپس کی لیبارٹری میں اس کے شب و روز اسی طرح مصروفیت میں گزر رہے تھے۔ ملاقاتیوں، ٹی وی پر انٹرویو کے لیے دعوت ناموں اور اخباری نمائندوں نے اسے تنگ کر مارا تھا۔ خصوصاً نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ مسلسل اصرار کر رہا تھا کہ وہ تخلیق کاری پر اپنے خیالات، تجربے اور تکنیک کو تحریری شکل دے۔ یہ سب اسی خرگوش کے باعث تھا۔

''میں بڑے عذاب میں ہوں۔'' ایک صبح اس نے بڑے تردد سے کہا۔''یہاں بھی کام کرنا اور چوروں کی طرح چھپ کر لارا کے اپارٹمنٹ میں بھی جانا۔ میری آدھی جان رہ جاتی ہے۔ آج مجھے ایلومنی ڈنر میں تقریر کرنا ہے۔''

''میں ایک لمحے کو تم سے دور نہیں رہوں گا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ بنیاد پرست خواتین کے ایک بڑے گروپ نے ڈنر کے موقع پر تمہارے خلاف مظاہرے کا پروگرام بنایا ہے۔''

''واقعی؟'' وہ بشاشت سے بولا۔''میں چاہتا ہوں کہ وہ ایسا ضرور کریں۔''

کوئی مظاہرہ نہیں ہوا۔ ڈنر خیر و عافیت سے اختتام کو پہنچا۔ ہنکل نے اپنی تعارفی تقریر میں اپنے کیریئر پر روشنی ڈالی اور ایمیٹ کی تخلیقی صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے بتایا کہ وہ یونیورسٹی میں سب سے لائق فائق کیمسٹری کا استاد ہے اور ایک گرلز کالج میں باسکٹ بال کا کوچ ہے۔ ایمیٹ اپنی مکڑی کی ٹانگوں جیسی انگلیوں میں تقریر کے ٹیڑھے میڑھے کاغذ دبوچے کھڑا ہوا تو عین اس وقت ایک پیغام رساں نے آکر اس کے ہاتھ میں ایک پرچی تھمادی۔ اس نے پرچی پڑھی اور ڈائس سے چھلانگ لگادی۔ میں سامنے ہی بیٹھا تھا، اس کے کوٹ کا دامن پکڑ لیا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

''لارا نے فوراً بلایا ہے۔'' وہ سرگوشی سے بولا۔''بے بی پیدا ہو رہی ہے۔'' وہ دروازے کی طرف دوڑا۔

ہنکل بھی ڈائس سے کود پڑا تھا۔ اس نے مجھے پکڑ لیا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔''اسے کیا ہوگیا؟ اس نے سب کچھ اتھل پتھل کر دیا.....''

میں آپے میں نہیں تھا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔''بے بی پیدا ہو رہی ہے۔ اسے فوراً لارا لوک مین کے ہاں پہنچنا ہے۔''

''بے بی؟'' ایمیٹ؟ لارا؟'' ہنکل نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔''یہ اسکینڈل یونیورسٹی کو تباہ کر دے گا۔''

وہ قریبی خالی کرسی پر دھم سے گر گیا۔ ہال میں باتوں کی بھنبھناہٹ دوڑ رہی تھی۔ لوگ ایک دوسرے سے

سوالات کررہے تھے۔ مجھے بھی گھیرنے کی کوشش کی گئی لیکن میں بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں لارا کے اپارٹمنٹ پر جانا چاہتا تھا لیکن چند قدم چل کر میں نے ارادہ بدل دیا۔ ایمیٹ اگر چاہتا تو مجھے ساتھ لے جاتا۔ اس نے مجھے چلنے کو نہیں کہا تھا اور میں اس کی ناراضی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

یونیورسٹی میں اور باہر ہر زبان پر ایمیٹ کا چرچا تھا۔ اخبارات میں اور ٹی وی پر بحث کا سلسلہ چل پڑا تھا۔ روشن خیال اور جدت پسند لوگ مصنوعی طریقے سے بچے کی پیدائش کو سائنس کے ارتقا کا ایک ناقابلِ فراموش کارنامہ قرار دے رہے تھے۔ بنیاد پرستوں اور دقیانوسی خیالات رکھنے والوں کے نزدیک یہ شیطانی چکر تھا۔ ان میں راسخ العقیدہ پادری پیش پیش تھے۔ ایک طرف ایمیٹ کی فقیدالمثال کامیابی کے ڈنکے بج رہے تھے دوسری طرف اس پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ غیرملکی ابلاغِ عامہ میں بھی ایمیٹ کی دھوم مچی ہوئی تھی لیکن وہ ان باتوں سے لاتعلق اپنے کام میں مگن تھا۔ وہ ذاتی طور پر ملنے والوں کے سوالوں کا ایک ہی جواب دیتا۔

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جو ہونا تھا ہوگیا۔'' اب وہ بیشتر وقت اپنی ذاتی لیبارٹری میں گزارتا تھا جہاں میرے سوا کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ مجھے بھی اجازت لینا پڑتی تھی۔ ایشے کا پتا کٹ گیا تھا۔

ایک روز اس نے مجھے بچے کی چھ ضرب آٹھ تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ ''ذرا دیکھو تو میری ہنرمندی کا ریکارڈ۔''

''تمہارا ریکارڈ نہ صرف قابلِ ستائش بلکہ حیرت انگیز ہے۔ مجھے تمہارا ماتحت ہونے پر فخر ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''آج مجھے ایک بہت بڑے سرکاری عہدے دار نے بلایا ہے۔'' وہ کہنے لگا۔ ''میں نے تمہیں ساتھ لیے بغیر اس سے ملنے سے انکار کردیا۔ تمہارے سیکیورٹی پاس کا سوال کھڑا ہوا۔ وہ تمہیں مل نہ سکتا تھا۔ میں اڑ گیا اور مسئلہ حل ہوگیا۔ تم میرے ساتھ چلو گے نا؟''

''یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہوگا۔ لیکن وہاں میں تمہاری کیا مدد کرسکوں گا؟''

''وہاں مجھ سے جو کچھ کہا جائے گا، اس کا مجھے تھوڑا سا اندازہ ہے اور اس سلسلے میں مجھے تمہاری اخلاقی مدد درکار ہوگی۔''

بعد دوپہر ہم وزارتِ دفاع کی بلڈنگ پر پہنچ گئے۔ جملہ کارروائیوں کے بعد ہمیں اندر ایک ہال میں پہنچا دیا گیا۔ ایک لمبی چوڑی میز کے ایک طرف وزارتِ داخلہ کا ایک اہم اور ذمے دار افسر ہبرڈ اپنے نصف درجن مددگاروں کے ساتھ تھا۔ دوسری طرف ہنکل، ایمیٹ، مارٹا اور میں تھے۔ ہبرڈ نے ایک منصوبے کا خاکہ پیش کیا جس سے یونیورسٹی کو کئی ملین ڈالرز مل جانے تھے۔ پھر اس نے ایک نئے کیمیکل ریسرچ سینٹر کے قیام کا پروگرام بتایا جس کا سربراہ ایمیٹ... کو ہونا تھا۔

ایمیٹ نے میری طرف دیکھا اور ہبرڈ سے کہا۔ ''تمہیں یعنی گورنمنٹ کو اس کے عوض کیا ملے گا؟''

ہبرڈ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''شکریہ کہ تم نے اسے میری ذاتی پیشکش نہیں سمجھا۔ گورنمنٹ چاہے گی کہ تم ہمارے لیے مصنوعی طریقے سے نمونے کے طور پر پچاس لڑکے پیدا کرو۔''

ہم چاروں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر ایمیٹ کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ ''پچاس لڑکے؟ لیکن کیوں؟''

ہبرڈ نے گردوپیش پر نظر ڈال کر کہا۔ ''یہاں اور بھی لوگ ہیں...... کیا ممکن نہیں کہ بات صرف میرے اور تمہارے درمیان ہو؟''

اس کا واضح اشارہ میرے، ہنکل اور مارٹا کی طرف تھا۔ ہنکل ماتھے پر بل ڈالے کھڑا ہوگیا۔ اس کی عزتِ نفس مجروح ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ مارٹا بھی کھڑی ہوگئی۔ وہ دونوں اور ہبرڈ کے چھ مددگار ہال سے نکل گئے۔ میں اٹھنے لگا تو ایمیٹ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''یہ یہیں رہے گا۔'' اس نے ہبرڈ سے کہا۔ چند ثانیے تذبذب میں رہ کر ہبرڈ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں اپنی کرسی پر جم گیا۔ ہال میں ہم تین آدمی رہ گئے۔

''میری فائل میں مکمل تفصیلی پروگرام ہے۔'' ہبرڈ نے بات شروع کی۔ ''میں نے اس پر اس وقت سے کام کرنا شروع کیا جب تمہارے چھ فٹ خرگوش کا انکشاف ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بالآخر تم انسانی جسم کو وجود میں لانے میں کامیاب ہوجاؤ گے۔'' اس نے سامنے رکھی ہوئی فائل کھولی۔ ''مجھے اس عرق ریزی پر مہینوں لگ گئے۔''

''اس میں کوئی شک نہیں۔'' ایمیٹ نے اتفاق کیا۔

''مختصراً یہ کہ ہمارا ملک کئی برسوں سے فوجی پالیسی کے معاملے میں پریشانی کا شکار ہے۔'' ہبرڈ کہنے لگا۔

''نوجوان فوج میں بھرتی ہونے میں پس و پیش کرتے ہیں کہ کسی محاذ پر جوانی میں مارے جائیں گے۔ بعض مبصروں کا خیال ہے کہ ہمارے ایک صدر کو اپنا عہدہ اس لیے چھوڑنا پڑا تھا کہ محاذوں پر کام آ جانے والے فوجیوں کی ایک طویل فہرست بن گئی تھی۔ جس عورت کے بھی بیٹے کو میدانِ جنگ میں بھیجا جاتا ہے وہ گورنمنٹ کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیتی ہے۔ اگر عورتوں کو معلوم ہو جائے کہ ان کے بیٹوں کو جنگ پر نہیں بھیجا جائے گا تو وہ مطمئن رہیں گی۔ ان کی زبان حکومت کے خلاف زہر نہیں اگلے گی۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟'' ایمیٹ نے کرسی پر بے چینی سے پہلو بدل کر کہا۔

''میں سمجھاتا ہوں۔'' ہبرڈ نے کہا۔ ''ہمارے پاس نوجوانوں کا ایک ایسا گروپ ہو جائے جن کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو، ماں باپ اور دوسرے رشتوں کے بندھن نہ ہوں تو ان کے میدانِ جنگ میں مارے جانے پر کوئی آنسو بہانے والا نہیں ہوگا۔ گورنمنٹ کے خلاف دیواروں پر پوسٹر لگیں گے نہ احتجاجی مظاہرے ہوں گے۔ ہماری فوجی افرادی قوت کے مسئلے کا کم سے کم خرچ سے حل یہی ہے۔''

میں نے سانس روک لی۔ ایمیٹ نے میری طرف دیکھا اور میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''جہاں تک میں سمجھا ہوں۔'' اس نے درشتی سے کہا۔ ''تم میرے طریقہ کار سے آرمی کے لیے آدمی چاہتے ہو۔''

''آرمی کے علاوہ نیوی اور ایئرفورس کے لیے بھی۔'' ہبرڈ بولا۔ ''تمہارے لیے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ میں تم پر چوٹ نہیں کر رہا ہوں، سچ کہہ رہا ہوں۔''

ایمیٹ کھڑا ہو گیا۔ میں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میرا جواب نفی میں ہے۔ اس بات کو بھول جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ ہرگز تعاون نہیں کروں گا۔''

''شاباش!'' میں نے اس کے کان میں کہا۔

ہبرڈ نے مجھے نظرانداز کر کے گہری نظروں سے ایمیٹ کو دیکھا اور دھیمی آواز میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں تم اخلاقی پابندی کے باعث یہ کہہ رہے ہو۔ لیکن تم غلطی پر ہو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ہمارے اعلیٰ نوجوان جنگ کی بھینٹ چڑھ جائیں؟ ان کی مائیں زندگی بھر انہیں روتی رہیں؟ عزیز و اقارب ان کی جواں مرگی پر آہیں بھرتے رہیں؟''

''میں کسی نوجوان کو اس طرح موت کے گھاٹ اترتا دیکھنا نہیں چاہتا خواہ وہ قدرتی طور پر دنیا میں آیا ہو یا غیر قدرتی۔'' ایمیٹ نے دھڑلے سے کہا۔

''مجھے اندازہ تھا کہ تمہارا ردِعمل ایسا ہی ہوگا۔'' ہبرڈ نے فائل بند کر کے کہا۔ ''اب سمجھ لو کہ ہم تمہارے بغیر بھی اپنا منصوبہ پورا کر سکتے ہیں۔ اس میٹنگ سے پہلے میں نے نیشنل سیکیورٹی ایکٹ کے تحت تمہاری ساری نوٹ بکس اور ورکنگ پیپرز کی ضبطی کے احکام جاری کر دیے تھے۔ ہمیں کوئی نہ کوئی باصلاحیت اور محبِ وطن کیمسٹ، دوسرے لفظوں میں سائنس داں مل جائے گا جو تمہاری ریسرچ اور تحریروں کی بنیاد پر ہمارا مطلوبہ سفر پورا کر دے گا۔ تمہاری ضرورت نہیں رہے گی۔''

''اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہیں ایسے افراد مل جائیں گے لیکن تمہیں اپنا مقصد حاصل کرنے میں طویل عرصہ لگ جائے گا۔'' ایمیٹ نے جواب دیا۔

ہبرڈ مسکرا دیا۔ ''دیکھا جائے گا۔''

ایمیٹ نے آگے جھک کر کہا۔ ''کیا تم عورتوں پر مشتمل آرمی سے کام لے سکتے ہو؟''

''عورتیں کیوں؟'' ہبرڈ نے ابرو اٹھا کر کہا۔

''اس لیے کہ میں اب تک مرد بے بی بنا نہیں سکا ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ میں اس کا فارمولا سمجھ نہیں سکا ہوں۔ جب تک میں اس میں کامیاب نہیں ہوتا، مسئلہ اپنی جگہ موجود رہے گا۔'' ایمیٹ بولا۔

''تم مجھے چکر دے رہے ہو۔'' ہبرڈ نے جز بز ہو کر کہا۔

''تم اپنے کیمسٹوں اور سائنس دانوں سے پوچھ لو۔'' ایمیٹ نے کہا۔ ''اگر وہ دس سال میں بھی اس مسئلے کو حل کر لیں تو میں ہار مان لوں گا۔''

میٹنگ بڑے کشیدہ ماحول میں ختم ہوئی۔ واپسی پر میں نے ایمیٹ سے کہا۔ ''میں تمہیں دلی مبارک باد دیتا ہوں۔ تم جھکے نہیں اور اپنی آن قائم رکھی۔''

''تم نے ٹھیک کہا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں سخت مشکل میں پھنس گیا ہوں لیکن سائنس برے نتائج پیدا نہیں کرتی، انسان کرتے ہیں۔''

اس شام کو ہم نے سارا وقت لڑکیوں کے چار سو ناموں کی فہرست میں ایمیٹ کی ''بے بی'' کے لیے نام پسند کرنے میں گزارا۔ کسی نام پر میں اعتراض کرتا، کوئی نام اسے پسند نہ آتا۔

چاند گہن

مرزا امجد بیگ

زندگی کو اتنا خطرہ جنگل میں لہراتے سانپ سے نہیں ہوتا جتنا آستین میں چھپے دشمن سے ہوتا ہے اور دشمن بھی وہ... جو اگر دوست کے روپ میں ہو تو آنے والا پل ہو یا کل کوئی بھروسا نہیں کہ ملے نہ ملے۔ وہ خاندان بھی مکروفریب کے ایک ایسے ہی گرداب میں دھنستا جارہا تھا کہ اچانک بیگ صاحب نے سہارے کی رسّی ڈال کر انہیں زندگی کی جانب کھینچ لیا اور یہ ثابت کردیا کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے... کوئی کسی کو لاکھ ڈبونا چاہے اگر اس رب العزت کی منشا نہیں تو تنکے کا سہارا دے کر بھی کنارے پر لگا دیتا ہے لیکن یہ ادراک باضمیروں کے دلوں پر اثر کرتا ہے... ضمیرفروش اس آگاہی کو کیا جانیں... وہ بھی اندھے اعتماد میں اپنا سب کچھ لٹا بیٹھے تھے۔

شیریں لب و لہجے اور دوستانہ رویوں میں چھپے زہریلے خلوص کی روداد

منگل کے روز جو شخص سب سے آخر میں مجھ سے ملنے آیا وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت نوجوان تھا۔ اس کی عمر بیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ خاصا مضطرب اور حواس باختہ نظر آتا تھا۔ میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لیے کہا۔

وہ اضطراری انداز میں ایک کری کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''جی فرمائیے...... میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''وکیل صاحب! میں بہت پریشان ہوں۔'' وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے بڑی رسان سے کہا۔''وہ تو آپ کی صورت ہی سے دکھائی دے رہا ہے۔ اپنی پریشانی کے بارے میں کچھ بتائیں؟''

''میری پریشانی کا نام ہے مراد خان۔'' اس نے سراسیمہ لہجے میں جواب دیا۔

''مراد خان۔'' میں نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے دہرایا۔''یہ کون صاحب ہیں؟''

''یہ صاحب نہیں، ایک شیطان ہے۔'' وہ نفرت آمیز انداز میں بولا۔''اگر میرا بس چلے تو میں اسے زندہ دفن کردوں......'' آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس نوجوان کے چہرے اور آنکھوں میں مراد خان کے لیے ناپسندیدگی کی چنگاریاں سی چھوٹنے لگی تھیں جس سے واضح ہوگیا تھا کہ وہ مراد خان کے لیے اپنے دل و دماغ میں کس نوعیت کے خیالات و جذبات رکھتا تھا۔ میں نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے اور اس کے مسئلے کو سمجھنے کی غرض سے نہایت ہی دوستانہ انداز میں سوال کیا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟''

''عمران۔'' اس نے جواب دیا۔''عمران علی۔''

''عمران صاحب۔'' میں نے اسے اس کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔'' اگر کوئی مراد خان آپ کو

پریشان کر رہا ہے تو بتائیں، اس سلسلے میں، میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟''

''میرا جو بھی مسئلہ ہے اسے کوئی تجربہ کار وکیل ہی حل کرسکتا ہے۔'' وہ امید بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میرے ایک مخلص دوست نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بجائے کسی وکیل سے جا کر ملوں۔ سو، میں آپ کے پاس آگیا ہوں۔''

''بہت اچھا کیا جو تم میرے پاس آگئے۔'' میں نے اس کی ہمت بڑھانے کے لیے قدرے بے تکلفی سے کہا۔ ''لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس طرح تمہارا مسئلہ حل نہیں کرسکتا۔''

''جی..... کیا مطلب ہے وکیل صاحب؟'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

''بھئی عمران میاں!'' میں نے کہا۔ ''جب تک مجھے یہ معلوم نہیں ہوگا کہ تمہارے ساتھ دراصل کون سا مسئلہ ہے اس وقت تک میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکوں گا۔ ابھی تو میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ کسی مراد خان کی وجہ سے تم پریشان ہو اور اس شخص سے تمہیں شدید نفرت بھی ہے۔''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے وکیل صاحب۔'' وہ خاصے اطمینان بھرے انداز میں بولا۔ ''آپ میرے مسئلے کو سمجھ گئے ہیں تو مجھے یقین ہے، آپ اسے حل بھی کرلیں گے۔''

میرا آپ سے تم پر آنا خاصا سود مند ثابت ہوا تھا۔ میں نے عمران علی کی پریشانی میں واضح کمی محسوس کی۔ ابھی اس نے میرے اندازہ لگانے اور مسئلہ سمجھنے کی جو بات کی تھی اس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ میں نے ابھی تک کوئی اندازہ قائم نہیں کیا تھا، جو کچھ بھی تھا اس نے مجھے بتایا تھا اور مسئلہ جب تک وہ اپنی زبان سے بیان نہ کرتا، میں بھلا سمجھ کیسے سکتا تھا۔ خیر، میں نے اس حوالے سے اسے چھیڑنا مناسب نہ جانا اور اس کے جواب میں کہا۔

''عمران! مجھے بتاؤ، یہ مراد خان ہے کون؟''

''مراد خان میرے ڈیڈی کا دوست ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''ڈیڈی کا دوست.....'' میں نے حیرت بھری نظر سے اسے دیکھا۔

''جی وکیل صاحب۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ میری بات کا یقین کریں۔''

''لیکن..... تمہارے ڈیڈی کا دوست تمہیں کیوں پریشان کر رہا ہے؟'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''وہ بڑا کمینہ شخص ہے جناب۔'' وہ بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''ایک نمبر کا لچا لفنگا، غنڈا بدمعاش..... وہ مجھے قتل کرانا چاہتا ہے اور..... وہ بھی اس طرح کہ اس کا کہیں نام نہ آئے۔ وہ کرائے کے قاتلوں سے میرا پتا صاف کروانا چاہتا تھا۔ مجھ پر ایک دو قاتلانہ حملے بھی ہوچکے ہیں۔ وہ تو اللہ کا کرم اور میری قسمت اچھی تھی کہ آپ کو زندہ نظر آرہا ہوں۔''

میرے سامنے بیٹھا ہوا وہ دبلا پتلا دراز قد نوجوان عمران علی اپنی پریشانی کی جو کہانی سنا رہا تھا وہ خاصی دلچسپی کی حامل اور سنسنی خیز تھی لیکن میرے لیے یہ جاننا بہت ضروری تھا کہ مراد خان اس کے باپ کا دوست ہوتے ہوئے اس کی جان کا دشمن کیوں بنا ہوا تھا۔ اسی سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے میں نے عمران علی سے پوچھا۔

''یہ مراد خان بھی کیسا شخص ہے۔ تمہارے ڈیڈی کا دوست ہے اور تم سے دشمنی کر رہا ہے۔ یہ عجیب سی بات نہیں؟''

''ہاں..... یہ بات بہ ظاہر بڑی عجیب اور ناقابلِ یقین ہی لگتی ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن حقیقت یہی ہے۔''

''تمہارے خیال میں.....'' میں نے اس کا ذہن پڑھنے کی غرض سے پوچھا۔ ''میں ان حالات میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟''

''آپ اس بدذات، ذلیل انسان مراد خان کا کوئی علاج کریں۔'' وہ نفرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''اس پر کوئی ایسا قانونی پھندا ڈالیں کہ وہ خطرناک ارادوں سے باز آجائے اور میرا پیچھا چھوڑ دے۔''

''ایسا ہو تو سکتا ہے مگر.....'' میں نے دانستہ توقف کیا۔

''مگر کیا وکیل صاحب؟'' وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔

''مگر یہ کہ.....'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک تو مجھے مراد خان کی مکمل ہسٹری معلوم ہونا چاہیے اور دوسرے اس امر کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ وہ ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے کیوں پڑا ہوا ہے؟''

''اس مقصد کے لیے آپ کو میری پوری کہانی سننا پڑے گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میں یہاں پر لوگوں کے مسائل اور مصائب بھری

کہانیاں سننے کے لیے ہی تو بیٹھا ہوں۔''
''پھر وعدہ کریں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میری پتا سننے کے بعد آپ میرا مسئلہ حل کر دیں گے۔''
''میں قبل از وقت ایسا کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہاری کہانی سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس سلسلے میں کسی نوعیت کی قانونی چارہ جوئی کر کے مراد خان کو خطرناک عزائم سے باز رکھا جا سکتا ہے تو میں تم سے مکمل تعاون کروں گا۔''
''اچھا جی ٹھیک ہے۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔
آئندہ آدھے گھنٹے میں عمران علی نے مجھے ایک حیرت انگیز اور انکشافات سے بھرپور کہانی سنائی جس کے نتیجے میں اس کی مدد کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گیا تھا۔ میں اس داستان عجیب میں سے غیر ضروری امور کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آگے بڑھنے سے پہلے آپ اس کیس کے پس منظر سے آگاہ ہو جائیں۔

☆☆☆

لگ بھگ ایک سال پہلے عمران علی اپنے والدین اور چھوٹی بہن لبنیٰ کے ساتھ نرسری کے علاقے میں رہتا تھا۔ اس کے ڈیڈی وحید علی کی اردو بازار کے نزدیک گاڑیوں کے ٹائرز کی ایک دکان تھی۔ وحید علی کا کام ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا لہٰذا گھر میں ہر طرف خوش حالی دکھائی دیتی تھی۔ یہ چار افراد کا کنبہ بڑے امن و سکون کے ساتھ پی ای سی ایچ ایس کے علاقے میں دو سو گز کے ایک بنگلے میں رہ رہا تھا۔ اس وقت عمران بی اے کا اسٹوڈنٹ تھا اور اس کی بہن لبنیٰ نویں میں تھی۔ لبنیٰ کی عمر کم و بیش سولہ سال تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ ان کی خوشیوں کو کسی بدنگاہ کی نظر لگ گئی۔
ایک روز لبنیٰ اسکول سے گھر نہیں پہنچی تو گھر میں افراتفری مچ گئی۔ تحقیق اور تفتیش پر پتا چلا کہ وہ اسکول سے چھٹی کے وقت صحیح سلامت گھر کے لیے روانہ ہوئی تھی مگر گھر پہنچنے سے پہلے ہی وہ کہیں غائب ہو گئی۔ یہ صورتِ حال گھر کے ہر فرد کے لیے یقیناً نہایت ہی تکلیف دہ اور ہوش اڑا دینے والی تھی۔ لبنیٰ کی تلاش کے لیے کوششیں جاری ہی تھیں کہ شام سے کچھ دیر پہلے انہیں ایک فون کال موصول ہوئی۔ یہ فون گھر کے نمبر پر کیا گیا تھا۔
''ہیلو۔'' فون عمران کے ڈیڈی وحید علی نے ریسیو کیا کیونکہ وہ فون کے قریب بیٹھا تھا۔ ایک نامانوس آواز سن کر وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''کون......؟''
''کیا تم لبنیٰ کے باپ ہو؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔
''ہاں، ہاں...... میں وحید بول رہا ہوں۔'' وحید علی نے جلدی سے کہا۔ ''تم کون ہو اور میری بیٹی کو کیسے جانتے ہو؟''
''تمہاری بیٹی لبنیٰ اس وقت میرے پاس ہے۔'' دوسری جانب بولنے والے نے بتایا۔ ''تم اس چکر میں نہ پڑو کہ میں کون ہوں۔ صرف اس پوائنٹ پر فوکس کرو کہ میں چاہتا کیا ہوں۔''
''تم کیا چاہتے ہو؟'' وحید علی نے پوچھا۔
''دس لاکھ روپے۔'' اس نامعلوم بھاری آواز والے شخص نے بتایا۔
''اوہ......!'' وحید علی ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔
''میں تمہیں زیادہ مہلت نہیں دے سکتا۔'' وحید علی کی سماعت میں دھمکی آمیز انداز میں کہا گیا۔ ''اس وقت شام کے چھ بجے ہیں۔ بس کل شام چھ بجے تک کا وقت ہے تمہارے پاس...... یعنی چوبیس گھنٹے۔''
''رقم بہت زیادہ اور وقت بہت کم ہے۔'' وحید علی نے بوکھلاہٹ آمیز انداز میں کہا۔ ''میں اتنی جلدی دس لاکھ روپے کا بندوبست نہیں کر سکتا۔''
''اور...... میں تمہیں اس سے زیادہ مہلت نہیں دے سکتا۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ ''میں ایک گھنٹے کے بعد دوبارہ فون کروں گا۔ جب تک تم فیصلہ کر لینا کہ تمہارے لیے دس لاکھ روپے زیادہ اہم ہیں یا بیٹی کی زندگی۔''
''ایک منٹ......!'' وحید علی نے اضطراری انداز میں کہا۔ ''میں کیسے یقین کر لوں کہ میری بیٹی تمہارے قبضے میں ہے؟''
''میں تمہیں ابھی یقین دلاتا ہوں۔'' وہ شخص مخصوص بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ''ایک منٹ ٹھہرو۔''
وحید علی اور عمران علی ٹیلی فون سیٹ کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ ریسیور وحید کے کان سے لگا تھا تاہم عمران بھی وہاں سے ابھرنے والی آواز کو بہ آسانی سن سکتا تھا۔ عمران کی والدہ حسینہ بیگم دوسرے کمرے میں تھی۔ وہ بیٹی کی گمشدگی سے تو باخبر تھی تاہم اس فون کال کا ابھی اسے پتا نہیں تھا۔ حسینہ دل کی مریضہ تھی۔
''ڈیڈی۔'' ریسیور میں لبنیٰ کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری تو وحید تڑپ اٹھا۔ ''یہ لوگ بہت ظالم ہیں۔ آپ مجھے

گھر لے جائیں۔"

"بیٹی، تم ٹھیک تو ہو نا؟" وحید کی سمجھ میں نہ آیا وہ کیا کہے۔

"ابھی تک تو ٹھیک ہے۔" ریسیور میں دوبارہ وہی بھاری بھرکم آواز ابھری۔ "اور جب تک تم چاہو گے، یہ ٹھیک رہے گی۔"

لبنیٰ کی آواز سنانے کے بعد اسے فون سے دور ہٹا دیا گیا تھا اور دوبارہ وہی شخص وحید سے ہم کلام ہو گیا۔ وحید نے منت ریز لہجے میں کہا۔

"دیکھو...... تم جو کوئی بھی ہو، میری بیٹی کو ایک ذرا تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔ میں تمہارا مطالبہ پورا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"کوشش نہیں، یہ کام تمہیں ہر قیمت پر کرنا ہے۔" وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ "اور وہ بھی کل شام چھ بجے سے پہلے ورنہ......"

"میں نے کہا نا، میں کوشش کرتا ہوں۔" وحید نے بے بسی سے کہا۔ "تم ایک گھنٹے کے بعد فون کرو پھر بات کرتے ہیں۔"

"اور ہاں، ایک بات کا خاص طور پر خیال رکھنا وحید علی۔" اسے پورے نام سے مخاطب کر کے دھمکی آمیز لہجے میں کہا گیا۔ "یہ معاملہ ہم دونوں پارٹیوں کے بیچ ہی رہنا چاہیے۔ اگر اس سلسلے میں تم نے کسی اور کو شامل کرنے کی کوشش کی یا بیٹی کی گمشدگی کی پولیس کو اطلاع دی تو پھر تمہیں لبنیٰ کی لاش ہی دیکھنے کو ملے گی۔"

"نن، نہیں...... نہیں نہیں۔" وحید نے اتنا ہی کہا تھا کہ دوسری طرف بات کرنے والے نے ٹیلی فونک رابطہ منقطع کر دیا۔ وحید بے جان ریسیور کو تکنے لگا۔

"ڈیڈی! ہمیں اس واقعے کی پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔" عمران علی نے باپ سے کہا۔ "ہمیں اس شخص کا مطالبہ نہیں ماننا چاہیے۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔" وحید علی نے بیٹے کو جھڑک دیا۔ "یہ امریکا یا انگلینڈ کی پولیس نہیں ہے جو مغوی کا بال بھی بیکا نہ ہونے دے گی اور اسے اغوا کنندگان کے قبضے سے نکال لائے گی۔ ہمارے ملک میں جرائم پیشہ افراد قانون سے بالاتر ہو کر وارداتیں کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر کو تو پولیس کی پشت پناہی بھی حاصل ہوتی ہے۔ میں اس واقعے کی رپورٹ درج کروا کے لبنیٰ کی زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتا۔"

"تو اس کا مطلب ہے، آپ نے اغوا کنندگان کو دس لاکھ روپے دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" عمران علی نے شاکی نظروں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔

وحید، بیٹے کے سوال میں پوشیدہ شکوے کو بہ خوبی سمجھ رہا تھا لیکن اس نازک موقع پر وحید نے وہ موضوع چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔

"بیٹا! دس لاکھ روپے لبنیٰ کی زندگی سے زیادہ اہم تو نہیں ہیں۔"

"مگر آپ کے پاس اتنی بڑی رقم تو ہے نہیں۔" عمران نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ چوبیس گھنٹے کے اندر کیسے بندوبست کریں گے؟"

پچھلے دنوں عمران علی نے گاڑی لینے کے لیے وحید علی سے کچھ رقم مانگی تھی اور عمران کے ڈیڈی نے پیسے نہ ہونے کا کہہ کر فی الحال اس کی خواہش کو ٹال دیا تھا۔ گھر میں ایک کار موجود تھی اور وہ زیادہ تر وحید علی کے استعمال میں رہتی تھی۔ عمران نے الگ گاڑی لینے کی فرمائش کی تھی۔ ابھی عمران جو شکایت بھری گفتگو کر رہا تھا، وہ اسی تناظر میں تھی۔

"ابھی فوری طور پر تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ رقم کا بندوبست کیسے ہوگا۔" وحید علی نے بیٹے کے سوال کے جواب میں کہا۔ "ذرا مجھے سوچنے دو۔"

یہ آج سے لگ بھگ چالیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ مجھے سن تو یاد نہیں، آپ...... کچھ سمجھ لیں۔ اس زمانے میں دس لاکھ روپے یقیناً ایک بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔ اگر آج کل کی کرنسی ویلیو سے اس کا موازنہ کریں تو کم از کم ایک کروڑ سے اوپر کی رقم بنے گی۔

"مجھے نہیں لگتا کہ یہ مسئلہ صرف سوچنے سے حل ہو جائے گا۔" عمران نے مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "ڈیڈی! دس لاکھ ارینج کرنے کے لیے آپ کو سر توڑ کوشش کرنا پڑے گی۔"

"میں کوشش کروں گا۔" وحید علی جذباتی ہو گیا۔ "میں اپنا سارا بزنس فروخت کر دوں گا مگر لبنیٰ پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔"

ادھر وحید کی بات ختم ہوئی، ادھر ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وحید نے چونک کر دیوار گیر کلاک کی جانب دیکھا۔ اغوا کنندہ نے ایک گھنٹے کے بعد فون کرنے کو کہا تھا اور ابھی صرف دس منٹ ہی گزرے تھے لہٰذا یہ اس شیطان کا فون تو ہو نہیں سکتا تھا۔ دوسری گھنٹی پر وحید نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا اور سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہیلو......!''

''یار وحید، کہاں غائب ہیں آپ؟'' ایک جانی پہچانی آواز وحید کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''میں آپ کی دکان پر بھی گیا تھا۔ دکان کیوں بند کر رکھی ہے؟''

''دکان صبح تو میں نے کھولی تھی۔'' وحید نے بتایا۔ ''بس، دوپہر کے بعد مجبوراً بند کرنا پڑی۔''

''مجبوراً بند کرنا پڑی..... میں کچھ سمجھا نہیں؟'' دوسری جانب سے بولنے والے نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یار! سب خیریت تو ہے نا؟''

''خیریت نہیں ہے مراد خان۔'' وحید روہانسا ہو گیا۔ ''میں بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔''

مراد خان نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔ ''کیسی مصیبت وحید صاحب؟''

''یار خان صاحب! معاملہ بہت نازک ہے۔'' وحید نے محتاط لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کو فون پر تفصیل نہیں بتا سکتا۔''

''ٹھیک ہے، میں آپ کے گھر آ رہا ہوں۔'' مراد خان جلدی سے بولا۔ ''یہ تو اچھا ہوا، میں نے آپ کے گھر فون کر لیا۔ میں آپ کی دکان بند دیکھ کر واپس جا رہا تھا تو خیال آیا، گھر پر فون کر لوں۔''

''پہلی فرصت میں آپ میرے پاس آ جائیں۔'' وحید نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس وقت میں بڑی شدت سے کسی ہمدرد اور غم گسار دوست کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں..... خان صاحب! پلیز جلدی آ جائیں۔''

''اس کا مطلب ہے، مسئلہ زیادہ ہی سیریس ہے۔'' مراد خان زیر لب بڑبڑایا پھر تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''آپ فکر نہیں کریں وحید صاحب! میں بس، بیس پچیس منٹ میں آپ کے پاس پہنچ رہا ہوں۔''

وحید علی نے ریسیور کریڈل کرنے کے بعد عمران سے کہا۔ ''بیٹا! تم ماں کے قریب ہی رہو۔ تم جانتے ہو، وہ دل کی مریضہ ہے۔ اگر اسے لبنیٰ کے اغوا کے بارے میں پتا چل گیا تو اس کی طبیعت بگڑ بھی سکتی ہے۔''

''ممی کو لبنیٰ کی گمشدگی کی خبر ہے ڈیڈی اور وہ اس کی واپسی کے لیے بہت بے چین بھی ہیں۔'' عمران نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''ڈاکٹر نے انہیں مکمل بیڈ ریسٹ کی تاکید کر رکھی ہے اس لیے وہ بیڈ روم سے باہر نہیں آ رہیں۔ میرا خیال ہے، انہیں سچائی سے آگاہ کر دینا چاہیے۔''

''تم سمجھ نہیں رہے ہو عمران۔'' وحید علی نے بے چارگی سے کہا۔ ''تمہاری ماں کا دل بہت کمزور ہو چکا ہے..... کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''کچھ بھی نہیں ہوگا ڈیڈی۔'' عمران نے اصراری لہجے میں کہا۔ ''بے شک ممی کا دل کمزور ہو چکا ہے مگر میں سمجھتا ہوں، ان کا دماغ بہت مضبوط ہے، ورنہ جب انہیں پتا چلا تھا کہ لبنیٰ اسکول سے واپس نہیں آئی تو انہیں اس غم سے شدید قسم کا اٹیک ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ لبنیٰ کی گمشدگی سے بے حد فکرمند ضرور ہیں مگر میں سمجھتا ہوں، خطرے والی کوئی بات نہیں اس لیے.....'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا۔ ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اس لیے اگر ممی کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا جائے تو میرے خیال میں زیادہ مناسب ہوگا۔ آگے آپ کی مرضی ہے.....''

''ٹھیک ہے۔'' وحید علی ہتھیار پھینکتے ہوئے بولا۔ ''یہ کام تم ہی انجام دو۔ ابھی مراد خان یہاں پہنچنے والا ہے۔ میں ان کے ساتھ مصروف ہو جاؤں گا۔ اسی دوران میں تم اپنی ممی کو حالات سے باخبر کر دینا۔''

عمران اٹھا اور خاموشی کے ساتھ اپنی ممی کے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد مراد خان، وحید علی کے پاس پہنچ گیا۔ وحید نے نہایت ہی پریشانی کے عالم میں اسے خود پر ٹوٹنے والی مصیبت کے بارے میں آگاہ کیا۔ مراد خان نے پوری توجہ اور سنجیدگی سے اس کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''یہ آپ نے عقل مندی کا فیصلہ کیا کہ اس معاملے میں پولیس کو نہیں ڈالا۔''

''عمران خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔'' وحید علی نے کہا۔ ''جوان خون ہے، وہ لبنیٰ سے بہت زیادہ محبت بھی کرتا ہے۔''

''آپ جانتے ہیں، محبت اندھی ہوتی ہے۔'' مراد خان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''محبت سے مغلوب ہو کر جوشِ جذبات میں جو بھی فیصلے کیے جاتے ہیں ان کے نتائج بڑے بھیانک دیکھنے کو ملتے ہیں۔ آپ کو اپنے ملک کی پولیس کے کردار اور کارکردگی کا بھی بہ خوبی اندازہ ہے۔ پولیس میں رپورٹ درج کروانے کا مطلب ہے، بچی کی زندگی سے کھیلنا۔ روزانہ کے اخبارات میں تین چار ایسی خبریں بھی ہوتی ہیں کہ اغوا کنندگان نے تاوان کی رقم نہ ملنے

پر مغوی کو قتل کر ڈالا یا پولیس کے متحرک ہوتے ہی اغوا کاروں نے مغوی کو ٹھکانے لگا کر اس کی لاش گندے نالے میں پھینک دی۔''

''ہاں...... یہ سب میں بھی سنتا اور پڑھتا رہتا ہوں۔'' وحید علی نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے تو میں نے عمران کی بات نہیں مانی لیکن خان صاحب......'' اس نے لحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر تشویش ناک لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''دس لاکھ بہت بڑی رقم ہے۔ میں ایک دن میں اتنے پیسے کا بندوبست نہیں کر سکوں گا۔''

''ہوں۔'' مراد خان گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''وہ آدمی دوبارہ کب فون کرے گا جس نے بیٹی کو اغوا کیا ہے؟''

''اس نے پہلے چھ بجے فون کیا تھا۔'' وحید علی نے بتایا۔ ''اور ایک گھنٹے بعد دوبارہ فون کرنے کو کہا تھا یعنی اب وہ سات بجے فون کرے گا۔''

''سات بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی ہیں۔'' مراد خان نے دیوار گیر کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب جو وہ فون کرے تو بارگیننگ کی کوشش کریں۔ اس سے کہیں کہ آپ دس لاکھ ارینج نہیں کر سکتے۔''

''میں کوشش کرتا ہوں۔'' وحید علی مردہ سی آواز میں بولا۔ ''ویسے مجھے نہیں امید کہ وہ اپنے مطالبے میں کسی لچک کا مظاہرہ کرے گا۔ آواز سے وہ کوئی بہت ہی ظالم اور شقی القلب لگتا ہے۔''

''ٹھیک ہے...... مگر کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔'' مراد خان نے کہا۔

''کوئی حرج نہیں ہے۔'' وحید علی نے جواب دیا۔

مراد خان نے پوچھا۔ ''وحید صاحب! آپ نے اس شخص کی آواز پر غور کیا تھا۔ وہ آپ کے کسی جاننے والے یا کسی دشمن کی آواز تو نہیں تھی؟''

''خان صاحب! یہ بات تو آپ بھی بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرا کوئی دشمن نہیں ہے۔'' وحید علی نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''اور جہاں تک اس آدمی کی آواز کا تعلق ہے تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں، وہ آواز میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ سنی ہے۔''

''ہوں......'' مراد خان نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، وہ کوئی بہت ہی خطرناک اور پیشہ ور اغوا کار ہے۔''

وحید علی کی پریشانی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ اسی لمحے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس زمانے میں نہ تو اسپیکر فون ایجاد ہوا تھا اور نہ ہی ابھی تک سی ایل آئی کی سہولت میسر تھی۔ میں یہ بات پاکستان میں حاصل الیکٹرونک سہولیات کی فراہمی کے پیش نظر کہہ رہا ہوں لہٰذا یہ پتا نہیں چل سکتا تھا کہ کال کرنے والا کون سا نمبر استعمال کر رہا تھا۔ دوسری گھنٹی پر وحید نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ اس کے ہیلو کہنے سے پہلے ہی دوسری جانب سے استفسار آ گیا۔

''ہاں...... تو تم نے دس لاکھ ادا کرنے کے بارے میں کیا فیصلہ ہے؟''

وحید نے فوراً اس کی آواز کو پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جس سے وحید کی پہلے بھی بات ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے کہنے کے عین مطابق ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد فون کیا تھا۔ وحید نے مراد خان کو مخصوص اشارہ کرنے کے بعد اغوا کار کو جواب دیا۔ اس کا انداز گھگیائے والا تھا۔

''بھائی...... دس لاکھ بہت بڑی رقم ہے۔ میں اس کا انتظام نہیں کر سکوں گا۔ تم رقم کم کرو۔''

''اس کا مطلب ہے تمہیں اپنی بیٹی کی زندگی سے پیار نہیں ہے؟'' اس شخص نے پوری سفاکی سے کہا۔

''زندگی پیاری ہے اس کی اور میں تمہارا مطالبہ پورا کرنا چاہتا ہوں۔'' وحید نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ رقم میں کمی کر دو تا کہ میں تمہاری دی ہوئی مہلت کے اندر اس کا بندوبست کر سکوں۔''

''دس لاکھ تمہارے جیسے کاروباری آدمی کے لیے کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔'' اغوا کار ٹس سے مس ہونے کو تیار نہیں تھا۔

اس دوران میں مراد خان بھی وحید علی کے ساتھ جڑا بیٹھا تھا اور کان ریسیور کے انتہائی قریب کر رکھا تھا۔ مراد خان نے ایک پرچی پر لکھ کر وحید کی طرف بڑھا دی۔ وحید نے مراد خان کی تحریر کی روشنی میں اغوا کار سے کہا۔

''دیکھو...... تم ایک باپ کی مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ یقین کرو، میں واقعی دس لاکھ کا انتظام کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ سوچو، اگر میری جگہ تم ہوتے اور کوئی شخص تمہاری بیٹی کو اغوا کر لیتا تو تم......''

''بس، بس......!'' دوسری جانب بولنے والے نے اضطراری انداز میں کہا۔ چند لحات خاموشی سے دبے پاؤں گزر گئے۔ وحید کو تشویش ہوئی کہ وہ بندہ کہاں غائب ہو گیا۔ اس نے الجھن زدہ نظر سے مراد خان کی طرف

دیکھا پھر ماؤتھ پیس میں کہا۔

''کیا ہوا..... تم کہاں چلے گئے؟''

''تم نے میری بیٹی کا ذکر کر کے اپنے لیے میرے دل میں اپنی کائی گنجائش پیدا کرلی ہے۔'' وہ قدرے نرمی سے بولا۔ ''بتاؤ، کتنی رعایت کردوں؟''

مراد خان بھی برابر یہ گفتگو سن رہا تھا۔ وحید نے سوالیہ نظروں سے مراد خان کی طرف دیکھا تو اس نے ایک ہاتھ کی پانچ انگلیاں کھڑی کردیں۔

''بس پانچ لاکھ ٹھیک ہیں۔'' وحید علی نے اغوا کار سے کہا۔

''یہ تو بہت ہی کم ہیں۔'' اغوا کار بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''نہ تمہارے پانچ لاکھ اور نہ میرے دس۔ بس ایک ہی نمبر بول رہا ہوں...... ساتھ لاکھ روپے۔ ایک پیسا کم نہ ایک پیسا زیادہ۔ تم رقم کے بندوبست میں لگ جاؤ۔ میں کل صبح تمہیں ٹھیک نو بجے فون کروں گا۔''

اس سے پہلے کہ وحید علی، اغوا کار کی بات کے جواب میں کچھ کہتا اس خبیث شخص نے فون بند کردیا۔ وحید علی نے پریشان نظر سے اپنے دوست مراد خان کی طرف دیکھا۔ مراد نے بھی یہ تمام تر گفتگو سنی تھی۔ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تو اس کا مطلب ہے، بیٹی کی بہ حفاظت واپسی کے لیے آپ کو ساتھ لاکھ روپے کا بندوبست کرنا ہوگا۔''

''مراد خان! سات لاکھ اچھی خاصی رقم ہے۔'' وحید علی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں راتوں رات اتنی رقم کا انتظام نہیں کرسکوں گا۔ مجبوراً مجھے......'' وہ کہتے کہتے رک گیا تو مراد خان نے پوچھا۔

''مجبوراً کیا وحید علی؟''

''مجھے اگر اپنا کاروبار اور گاڑی بھی بیچنا پڑی تو میں دیر نہیں کروں گا۔'' وحید نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''لبنیٰ سے بڑھ کر میرے لیے کیا ہوسکتا ہے۔''

''وحید صاحب! اس مصیبت کی گھڑی میں آپ کو اپنا گھر اور گاڑی فروخت کرنا پڑے تو پھر لعنت ہے مجھ جیسے دوستوں پر۔'' مراد خان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''پھر......'' وحید نے الجھن زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''پھر یہ مسئلہ کیسے حل ہوگا مراد خان؟''

''آپ آسانی سے کتنی رقم جمع کرسکتے ہیں؟'' مراد خان سوچتی ہوئی نظروں سے وحید علی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میرا مطلب ہے، اپنی سی کوشش کر کے..... کوئی چیز فروخت کیے بغیر؟''

وحید نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''زیادہ سے زیادہ دو لاکھ روپے۔''

''ٹھیک ہے، آپ دو لاکھ کا بندوبست کرلیں۔''

''اور باقی کے پانچ لاکھ؟'' وحید علی کے لہجے میں گہرا تذبذب تھا۔

''پانچ لاکھ کے لیے میں کوشش کرتا ہوں۔'' مراد خان گہری سنجیدگی سے بولا۔

''آپ کرسکیں گے؟'' وحید خان نے بے یقینی سے اپنے دوست کی جانب دیکھا۔

''ہمتِ مرداں، مددِ خدا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں اپنے تعلقات کی ڈوریاں ہلاتا ہوں۔ اللہ بہت مہربان اور کرم کرنے والا ہے۔''

مراد خان پراپرٹی کا کام کرتا تھا۔ جوبلی کے علاقے میں اس کی ایک خوب چلتی ہوئی اسٹیٹ ایجنسی تھی۔ یہ تو وحید علی کو معلوم تھا کہ مراد خان کے تعلقات کا دائرہ خاصا وسیع تھا۔ وہ دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ مراد خان کو اس کی کوشش میں کامیابی حاصل ہو۔

''اگر ایسا ہوجائے تو یہ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا مراد خان۔'' وحید علی نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں بعد میں آپ کی رقم پائی پائی ادا کردوں گا۔''

''بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی وحید صاحب۔'' مراد نے سرسری انداز میں کہا۔ ''اور آپ یہ احسان وحسان کی بات نہ کریں۔ اس وقت آپ پر بڑا مشکل وقت ہے۔ میں ایک سچا دوست ہونے کے ناتے آپ کے کام آنے کی کوشش کررہا ہوں۔ اگر کبھی خدانخواستہ مجھ پر بھی بُرا وقت پڑا تو آپ دوستی نبھا دیجیے گا اور جہاں تک اس پانچ لاکھ کی رقم کا تعلق ہے تو یہ یقیناً آپ مجھے واپس کریں گے کیونکہ میں بھی کہیں سے لے کر ہی آپ کو دوں گا۔ اگر میرے پاس ہوتے تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔''

''مراد خان! میں آپ کی رقم ضرور واپس کردوں گا۔'' وحید علی نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس کے لیے مجھے تھوڑا وقت درکار ہوگا۔''

''مل جائے گا وقت بھی۔'' مراد خان کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں اب چلتا ہوں تاکہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے چارہ جوئی کرسکوں۔''

پھر مراد خان، وحید علی کو تسلی تشفی دینے کے بعد اس کے گھر سے رخصت ہوگیا۔ وہ رات وحید علی، عمران علی اور

حسینہ بیگم کے لیے قیامت کی رات تھی۔ حسینہ بیگم کو تو چپ سی لگ گئی تھی۔ عمران علی کا اندازہ بالکل درست تھا۔ اس کی والدہ مضبوط دماغ کی مالک تھی۔ صورتِ حال کی سنگینی سے اسے باخبر کر دیا گیا تھا۔ وہ چپ چاپ لیٹی خاموشی سے آنسو بہائے جا رہی تھی۔ ان لوگوں نے کوشش کر کے اس خبر کو گھر سے باہر نہیں جانے دیا تھا کہ لبنیٰ کو اغوا کر لیا گیا تھا۔

وحید علی کی کوششوں نے اس امر کو یقینی بنا دیا تھا کہ وہ اگلی صبح دو لاکھ کا بندوبست کر سکے گا۔ اب اسے اپنے بےلوث دوست مراد خان کے فون کا انتظار تھا۔ مراد خان نے علی الصباح فون کیا اور یہ نوید سنائی کہ وہ دوپہر تک پانچ لاکھ کا انتظام کرنے میں کامیاب ہو جائے گا لہٰذا اگر اغواکار فون کرے تو اسے دوپہر کے بعد کا کوئی وقت دیا جائے۔

''مراد خان! میں چاہتا ہوں کہ تم آج کا دن میرے ساتھ ہی رہو۔'' وحید علی نے تشکر اور منت کے ملے جلے انداز میں کہا۔ ''جب تک لبنیٰ گھر نہیں پہنچ جاتی، مجھے سکون نہیں آئے گا۔''

''میں دن میں رقم لے کر آ رہا ہوں۔'' مراد نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''حوصلہ نہیں ہارو...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جب تک یہ معاملہ نمٹ نہیں جاتا، میں تمہارے ہی پاس رہوں گا۔'' وحید علی نے اپنے دوست کا شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔

ٹھیک نو بجے اغواکار کا فون آ گیا۔ اس نے وحید کے ہیلو کے جواب میں سوال کیا۔

''رقم کا انتظام ہو گیا؟''

''دوپہر تک ہو جائے گا۔''

''پکا یا...... ڈانواں ڈول؟''

''پکا......!'' وحید نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، میں سہ پہر میں تین بجے فون کروں گا۔'' وہ تحکمانہ انداز میں بولا۔ ''پھر طے کریں گے کہ تم نے رقم لے کر کہاں پہنچنا ہے اور ہاں......'' لحاتی توقف کر کے اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تم نے کہیں اسمارٹ بننے کی کوشش تو نہیں کی؟''

''نہیں بالکل نہیں۔'' وحید علی نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تم نے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔'' وہ سراہنے والے انداز میں بولا۔ ''میرا ایک آدمی مسلسل تمہاری اور تمہارے گھر کی نگرانی کر رہا ہے۔ ادھر تم نے ہوشیاری دکھائی ادھر تمہاری بیٹی کی زندگی کا چراغ پھُو...... مطلب، گل۔''

''نہیں، نہیں۔'' وحید علی تڑپ کر بولا۔ ''میں نے ایسی غلطی اب تک نہیں کی اور نہ ہی کروں گا۔''

''مجھے تمہاری بات کا یقین ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''میرا آدمی تمہاری رپورٹنگ کر رہا ہے۔ ابھی تک تم نے میری ہدایت پر عمل کیا ہے اور مجھے امید ہے آئندہ بھی تم اسی معقولیت کا مظاہرہ کرو گے۔''

''میں تمہیں کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔'' وحید نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''اور تم بھی میری بیٹی کو ذرا سی تکلیف نہیں پہنچاؤ گے۔''

''میں اپنے وعدے کا پاس کروں گا۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولا۔ ''تم تعاون کر رہے ہو تو میں بھی تمہاری بیٹی کے کھانے پینے، سونے جاگنے کا خیال رکھے ہوئے ہوں۔ اس حوالے سے تم بالکل مطمئن رہو۔''

''میری لبنیٰ سے بات کروا دو گے؟'' وحید نے گھگیائے ہوئے انداز میں کہا۔

''سہ پہر تین بجے بات کرواؤں گا۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔ ''ابھی نہیں۔''

''پلیز۔'' وحید علی کی آواز لجاجت سے لبریز تھی۔

''سوری۔'' اغواکار نے کھردرے انداز میں کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

وحید نے اس روز بھی دکان نہیں کھولی۔ مارکیٹ والوں اور پڑوسی دکان داروں سے اس نے کہہ دیا تھا کہ حیدرآباد میں کسی عزیز کا انتقال ہو گیا ہے لہٰذا دکان بند ہی رہے گی۔ مختلف زاویوں میں بھاگ دوڑ کر کے اس نے دو لاکھ کیش کا بندوبست کر لیا تھا۔ دوپہر کے وقت مراد خان بھی پانچ لاکھ کے کرنسی نوٹ لے کر اس کے گھر آ گیا۔

''وحید صاحب! آپ کی قسمت اچھی ہے جو رقم کا انتظام ہو گیا۔'' مراد خان نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ورنہ میں تو مایوس ہونے کے قریب تھا۔ بس، اللہ نے مہربانی کی اور ایک جگہ بات بن گئی۔''

''مایوسی کو اسی لیے گناہِ عظیم کہا گیا ہے کہ اس کیفیت میں گرفتار ہو کر انسان اپنے اللہ سے دور ہو جاتا ہے۔'' وحید نے رقم کا انتظام ہو جانے پر قدرے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ ''اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ میری لبنیٰ شام سے پہلے صحیح سلامت گھر آ جائے گی۔''

''ان شاء اللہ۔'' مراد خان نے پُریقین انداز میں کہا پھر

رقم والا لفافہ وحید کی جانب بڑھاتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''آپ رقم گن لیں۔''

''آپ گن کر لائے ہیں، میرے لیے یہی کافی ہے۔''

''میں تو گن کر ہی لایا ہوں۔'' مراد خان نے اثبات میں گردن ہلائی۔'' اور اس رقم کی گنتی تو ویسے بھی بہت آسان ہے۔ سیدھے سیدھے لاکھ والے پانچ پیکٹ بنے ہوئے ہیں اور نوٹ بالکل نئے ہیں۔'' باتوں کے دوران ہی میں مراد خان نے براؤن لفافے میں سے کرارے نوٹوں کے پانچ پیکٹ نکال کر وحید علی سے کہا۔'' یہ اپنے پاس رکھ لیں۔''

وحید نے نوٹوں کو ہاتھ نہیں لگایا اور یہ کہتے ہوئے گھر کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔'' ایک منٹ مراد خان میں ابھی آتا ہوں۔''

مراد خان اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

وحید علی ایک منٹ سے پہلے ہی واپس آ گیا اور قدرے استعمال شدہ نوٹوں کے دو پیکٹ بھی ساتھ لایا۔ وہ دو لاکھ کی رقم اپنے دوست کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''خان صاحب! ان کو بھی بھورے لفافے میں رکھ لیں۔ سات لاکھ ایک ہی جگہ رہیں تو اچھی بات ہے۔''

مراد خان نے مذکورہ دو لاکھ روپے بھی اسی لفافے میں ڈال لیے جس میں وہ اپنے پانچ لاکھ رکھ کر لایا تھا۔ لفافے پر ربر بینڈ چڑھانے کے بعد اس نے وحید علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کوئی چمڑے یا ریگزین کا چھوٹا سا ہینڈ بیگ چاہیے ہوگا۔ اتنی بڑی رقم کو لفافے میں رکھ کر گھومنا خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔''

''ایسا بیگ ہے میرے پاس۔'' وحید نے کہا۔'' میں ابھی لے کر آتا ہوں۔''

وہ ایک بار پھر گھر کے اندرونی حصے کی طرف گیا اور مذکورہ بیگ لے کر آ گیا۔ سات لاکھ کی خطیر رقم (اس وقت کے حساب سے) کو بیگ میں ڈال کر ایک الماری میں محفوظ کر دیا گیا۔ دن کے کھانے کے نام پر انہوں نے تھوڑا زہر مار کیا پھر اغوا کنندہ کے فون کا انتظار کرنے لگے۔ فون سیٹ ان کے قریب ہی رکھا ہوا تھا۔

اغوا کار وقت اور وعدے کا بہت پابند ثابت ہو رہا تھا۔ ٹھیک تین بجے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ آخری ٹیلی فونک گفتگو میں اغوا کار نے تین بجے سہ پہر ہی فون کرنے کو کہا تھا۔ مراد خان بھی وحید کے نزدیک آ گیا۔ وحید نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور اضطراری لہجے میں کہا۔

''ہیلو......!''

''ہاں وحید علی۔'' دوسری جانب سے اسی مخصوص آواز میں پوچھا گیا۔'' رقم کا بندوبست ہو گیا ہے؟''

''جی......رقم تیار ہے۔'' وحید نے جلدی سے کہا۔'' اب تم وعدے کے مطابق لبنیٰ سے میری بات کرواؤ۔''

''ٹھیک ہے۔'' اغوا کار نے سرسری انداز میں کہا۔

اگلے ہی لمحے لبنیٰ کی مطمئن آواز وحید علی کی سماعت سے ٹکرائی۔'' ڈیڈی! مجھے بتایا گیا ہے، آپ نے مجھے چھڑانے کے لیے رقم کا انتظام کر لیا ہے؟''

''ہاں......میری جان۔'' وحید نے جذباتی انداز میں کہا۔'' تم پریشان نہیں ہونا۔ آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے تم میری نظر کے سامنے اپنے گھر میں ہوگی۔''

''تھینک یوڈیڈی۔'' وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

''ان لوگوں نے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی؟'' وحید علی نے بڑے دلار سے پوچھا۔

لبنیٰ کے بجائے اغوا کار کی آواز سنائی دی۔ ''مجھے ٹھیک پانچ بجے رقم چاہیے۔''

یقیناً اس شخص نے لبنیٰ کے ہاتھ سے ریسیور چھین لیا تھا۔ وحید علی نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ ''مل جائے گی..... بتاؤ رقم کہاں پہنچانا ہوگی؟''

''میں تمہیں زیادہ دور بلا کر زحمت نہیں دوں گا۔'' اغوا کار نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ جگہ تمہارے گھر سے بہ مشکل پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔ تم ٹھیک پانچ بجے میری بتائی ہوئی جگہ پر، رقم کے ساتھ موجود ہوگے۔''

''ٹھیک ہے۔'' وحید علی نے جلدی سے کہا۔ ''مگر وہ جگہ کون سی ہے؟''

''ملاقات کے مقام کے بارے میں، میں تمہیں ساڑھے چار بجے بتاؤں گا۔'' اس شخص نے کہا۔ ''اس کے بعد تم دس پندرہ منٹ کے اندر اپنے گھر سے نکل پڑو گے۔ میرا وہ آدمی جو تمہاری نگرانی پر مامور ہے، وہ مذکورہ مقام تک تمہارا تعاقب کرے گا۔ جب تم میرے بتائے ہوئے مقام تک پہنچ جاؤ گے تو میرا ایک دوسرا آدمی تمہارے پاس آئے گا اور تم سے رقم لے لے گا۔''

''مگر میں تمہارے آدمی کو پہچانوں گا کیسے؟'' وحید علی نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی سوال کر دیا۔

''تم اس کے لیے اور وہ تمہارے لیے اجنبی ہے۔'' اس شخص نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''یہ پہچان کوڈ ورڈز کے تبادلے سے ہوگی۔ میرا جو آدمی تمہاری نگرانی کے فرائض انجام دے رہا ہے وہ تمہارے پاس آنے والے آدمی سے بہ خوبی واقف ہے۔ وہ اسے تمہارے بارے میں بتا دے گا۔ میرا آدمی سیدھا تمہارے پاس پہنچے گا۔ کسی غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

''کوڈ ورڈز کیا ہوں گے؟'' وحید علی نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''میرا آدمی تمہارے پاس آ کر کہے گا..... تمہیں جس چیز کی تلاش ہے، وہ میرے پاس ہے۔ بولو، خریدو گے؟ تم کہو گے، ہاں خریدوں گا۔ کتنے کی دو گے؟ وہ کہے گا، سات لاکھ کی۔ تم کہو گے ٹھیک ہے، وہ کہے گا نکالو سات لاکھ۔ تم رقم اس کے حوالے کر دو گے۔ اللہ اللہ، خیر سلا۔''

''ایسے کیسے خیر سلا.....؟'' وحید علی نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم نے میری بیٹی کا تو کہیں ذکر ہی نہیں کیا۔ لبنیٰ کو تم کس طرح میرے حوالے کرو گے؟''

''جب تم سات لاکھ کی رقم میرے آدمی کو دے دو گے تو وہ ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہے گا وہ دیکھو، تمہاری بیٹی۔ تم جب اس سمت دیکھو گے تو اپنی بیٹی کو فوراً پہچان لو گے۔ تمہاری بیٹی لبنیٰ کو میں تمہارے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں پہنچا دوں گا مگر تم رقم ادا کیے بغیر اسے حاصل نہیں کر سکو گے۔ میرا آدمی رقم لے کر تم سے رخصت ہو جائے گا اور تم اپنی بیٹی کو لے کر گھر چلے جانا۔ اب تو میں کہہ سکتا ہوں نا..... اللہ اللہ، خیر سلا۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔'' وحید نے اضطراری انداز میں کہا۔ ''لیکن دیکھ لو..... کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے۔''

''کیا تمہارا کوئی گڑبڑ کرنے کا ارادہ ہے؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''نن..... نہیں۔'' وحید جلدی سے بولا۔ ''بالکل نہیں۔''

''جب تم کوئی گڑبڑ نہیں کرو گے تو مجھے پاگل کتے نے نہیں کاٹا کہ گڑبڑ کروں۔'' وہ برہمی سے بولا۔ ''میں ایک اصول پسند کاروباری ہوں۔''

''ٹھیک ہے، تم نے جیسا کہا ہے، میں بالکل ویسا ہی کروں گا۔'' وحید علی نے مصلحت آمیز انداز میں کہا۔ ''مجھے اپنی بیٹی صحیح سلامت واپس چاہیے۔''

''تم نے کسی حماقت کے بارے میں تو نہیں سوچا؟''

''بالکل نہیں۔''

''تمہاری نگرانی پر مامور شخص نے مجھے بتایا ہے کہ کل رات سانولے رنگ کا ایک پستہ قامت آدمی تم سے ملنے آیا تھا۔'' اغوا کار نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''اور میری تازہ ترین معلومات کے مطابق، وہ بندہ آج دوپہر سے تمہارے گھر میں موجود ہے۔ وہ کون ہے اور کیا کرتا پھر رہا ہے؟''

''وہ میرا ایک مخلص دوست ہے۔'' وحید نے جواب دیا۔ ''مراد خان۔''

''کیا اس بندے نے تمہیں کسی مہم جوئی کے لیے اکسایا؟''

''نہیں..... مراد خان بہت ہی معقول شخص ہے۔'' وحید علی نے جلدی سے جواب دیا۔ ''میں اسی کے تعاون سے لاکھوں روپے کا بندوبست کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ اس کا بھی یہی مشورہ ہے کہ ایسے نازک معاملات میں پولیس کو ملوث نہیں کرنا چاہیے۔''

''اوہ...... یہ تو خاصا عقل مند اور سمجھ دار انسان ہے۔'' اغوا کار نے تعریفی لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، اب میں ساڑھے چار بجے تمہیں فون کروں گا۔ تم ذہنی اور جسمانی طور پر تیار رہنا۔''

''ایک منٹ......'' وحید کو یوں محسوس ہوا تھا کہ اغوا کار فوراً فون بند کردے گا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اپنے دوست مراد خان کو بھی ساتھ لے آؤں؟'' وحید نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''مورل سپورٹ؟''

''یہی سمجھ لو۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ دریا دلی سے بولا۔ ''مگر کسی شیطانی خیال کو ذہن میں جگہ نہیں دینا۔ کسی بھی نوعیت کی مہم جوئی تمہاری بیٹی کی زندگی کے لیے انتہائی مہلک ثابت ہوگی۔''

''تم مطمئن رہو۔'' وحید نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ''میں ایسی کوئی حماقت کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''شاباش۔'' یہ کہتے ہوئے اغوا کار نے رابطہ منقطع کردیا۔

وحید نے ریسیور کریڈل کرنے کے بعد مراد خان کی طرف دیکھا اور حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''اس آدمی نے بڑا مربوط نیٹ ورک قائم کررکھا ہے۔ اسے میرے پاس آنے جانے والوں کی پوری خبر ہے۔''

''جو لوگ پیشہ ور مجرم ہوتے ہیں وہ کچے کام نہیں کرتے۔'' مراد خان نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہم نے بہت عقل مندی کی جو لبنیٰ کے اغوا کی رپورٹ درج نہیں کروائی ورنہ جیسے ہی اغوا کار کو خبر ہوتی کہ ہم پولیس کی مدد لینے کا ارادہ رکھتے ہیں، وہ لبنیٰ کی جان سے کھیل سکتا تھا۔''

''ہوں......!'' وحید کے چہرے پر تفکر کی پرچھائیں نمودار ہوئی۔ ''میرے ذہن میں ایک بات آرہی ہے......'' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیسی بات؟'' مراد خان نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''لبنیٰ کو اغوا کرنے والا آپ پر بھروسا کررہا ہے۔''

وحید علی نے بات ادھوری چھوڑی تو مراد خان نے پوچھا۔ ''پھر؟''

''آپ میرے ساتھ تو جا ہی رہے ہیں۔'' وحید وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ اغوا کے بتائے ہوئے مقام سے کچھ فاصلے پر آپ سے الگ ہوجاؤں اور رقم لے کر آپ مذکورہ مقام تک جائیں...... میں دور کھڑا دیکھتا رہوں گا۔ اس کے آدمی کے رخصت ہونے کے بعد ہم دونوں لبنیٰ کو لے کر گھر آجائیں گے۔''

''آپ نروس ہورہے ہیں نا...؟'' مراد خان نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

''ہاں خان صاحب۔'' وحید بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میرے اعصاب پر بہت زیادہ دباؤ ہے۔ میں لبنیٰ کے لیے بہت جذباتی ہوجاتا ہوں۔ یہ نہ ہو کہ رقم کی ادائیگی کے وقت مجھ سے کوئی ایسی غلطی ہوجائے اور لبنیٰ......''

وحید کی ادھوری بات کے نتیجے میں مراد خان اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر اس کے نزدیک بیٹھ کر، اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ''حوصلہ رکھیں وحید صاحب۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''گویا آپ میری بات ماننے کے لیے تیار ہیں؟'' وحید نے استفساریہ نظروں سے اپنے دوست کی جانب دیکھا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' مراد خان جلدی سے بولا۔ ''لیکن ظاہر ہے، اس فیصلے کا اختیار مجھے نہیں ہے۔ جب اغوا کار کا فون آئے تو آپ اس سے بات کر کے دیکھ لیجیے گا۔ اگر وہ اس بات پر راضی ہوجاتا ہے تو ٹھیک ہے۔''

مراد خان کے ساتھ وحید علی کی دوستی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن اس مختصر سی مدت کے دوران میں وحید اس پر اندھا اعتماد کرنے لگا تھا۔ جبھی اس مصیبت کی گھڑی میں مراد خان ہی اسے سب سے زیادہ قابل بھروسا نظر آرہا تھا اور مراد خان نے راتوں رات اپنے دوست کے لیے پانچ لاکھ کی بھاری رقم کا انتظام کر کے دوستی نبھا دیا تھا۔

اغوا کار کی اگلی کال سے پہلے دونوں دوستوں میں اس موضوع پر مختلف زاویوں سے گفتگو ہونے لگی۔ عمران علی کو وحید نے حسینہ بیگم کی دیکھ بھال کے لیے مختص کردیا تھا اور اس نوجوان نے بڑے سلیقے اور ذمے داری سے اپنی ماں کو سنبھال رکھا تھا۔ اس گھر پر جو اچانک افتاد ٹوٹی تھی اسے کسی نہ کسی طرح بڑی خوبی سے ہینڈل کرلیا گیا تھا۔ بس، ایک آخری مرحلہ باقی تھا جس کے بعد سب ٹھیک ہوجانا تھا۔

ساڑھے چار بجے اغوا کنندہ کا فون آگیا۔ وحید علی کے ہیلو کے جواب میں اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک پانچ بجے......ل پارک میں سب سے بڑی

پہاڑی کی چوٹی پر تمہیں موجود رہنا چاہیے جہاں بچوں کے کھیلنے کودنے کے لیے جھولے وغیرہ بنے ہوئے ہیں۔ تم آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا کر آؤ گے...... ایسا کوئی چشمہ ہے تمہارے پاس؟''

''جی ہے۔ سن گلاسز ہیں میرے پاس۔'' وحید نے جلدی سے جواب دیا۔ ''میں وہ گلاسز پہن لوں گا۔''

''رقم کس چیز میں رکھ کر لاؤ گے؟'' اغوا کار نے پوچھا۔

''ریگزین کے بیگ میں۔'' وحید علی نے جواب دیا۔ ''سات لاکھ کے کرنسی نوٹ ایک بھورے رنگ کے لفافے میں ہوں گے اور وہ لفافہ ریگزین کے بیگ کے اندر۔ پانچ لاکھ کے نئے نوٹ ہیں اور دو لاکھ کے استعمال شدہ۔''

''نئے اور استعمال شدہ نوٹ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''بس اصلی ہونے چاہئیں۔ میرا آدمی نوٹ چیک کرنے کے بعد ہی لبنیٰ کو تمہارے حوالے کرے گا۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر عجیب سے لہجے میں بولا۔

''نئے نوٹوں کا تو ایسے بتا رہے ہو جیسے ایک نیا نوٹ، دو کے برابر ہوتا ہے۔''

''تم بے فکر رہو۔'' وحید نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تمام نوٹ ایک دم اصلی ہیں۔''

''بس...... تو پھر تم بھی بے فکر ہو جاؤ۔'' وہ حتمی فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''تمہاری بیٹی صحیح و سالم تم تک پہنچ جائے گی۔''

اس کے بعد وحید علی نے نہایت ہی منت ریز انداز میں وہ بات کی جس کا تھوڑی دیر پہلے وہ مراد خان سے ذکر کر چکا تھا لیکن اغوا کار نے بڑی شدت سے انکار کر دیا۔

''تمہارا وہ پستہ قامت دوست صرف پارکنگ تک تمہارے ساتھ آسکتا ہے۔'' وحید کی سماعت پر اغوا کار کی کرخت آواز نے ہتھوڑا برسایا۔ ''اس سے آگے نہیں۔ تم رقم والے بیگ کے ساتھ اکیلے ہی پہاڑی کی چوٹی پر پہنچو گے۔ میرا وہ آدمی پارکنگ ہی سے تمہارے تعاقب میں لگ جائے گا جو تم سے رقم لے گا۔ فکر نہیں کرو، تمہیں پہاڑی پر زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔''

اس کے بعد کسی سوال یا اعتراض کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اغوا کار نے ٹیلی فونک سلسلہ موقوف کیا تو مراد خان اور وحید علی تیاری کے ساتھ گھر سے نکل کر ہل پارک کی جانب روانہ ہو گئے۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر تمام مراحل بہ خیر و خوبی طے پا گئے۔ وحید علی نے اغوا کار کی ہدایات پر من و عن عمل کیا اور اس جرم زادے نے بھی اپنا کہا نبھا کر دکھا دیا تھا جس کے نتیجے میں ٹھیک ساڑھے پانچ بجے لبنیٰ اپنے گھر کے اندر موجود تھی۔ اس گھر کے مکینوں نے پچھلے لگ بھگ تیس گھنٹے جس اعصاب شکن اور اذیت ناک فضا میں گزارے تھے یہ صرف انہی کے دل و دماغ جانتے تھے۔ لبنیٰ کے اغوا کے واقعے کو ایسا صیغۂ راز میں رکھا گیا تھا کہ آس پڑوس میں بھی کسی کو اس سانحے کی خبر نہیں تھی حتیٰ کہ کسی کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وحید علی کے گھر میں کچھ غیر معمولی ہو چکا ہے۔

مراد خان نصف شب تک وحید علی کے ساتھ رہا تھا۔ آئندہ روز بیماری کا بہانہ کر کے لبنیٰ کے اسکول سے چند یوم کی چھٹی منظور کروا لی گئی تھی۔ وحید علی چاہتا تھا کہ وہ مکمل آرام کرے۔ عمران نے بھی گھر سے نکلنا موقوف کر دیا تھا البتہ ایک آدھ روز کے بعد وحید علی دکان پر جانے لگا تھا۔ چند روز میں تمام معاملات معمول پر آگئے اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

وحید علی کو سب سے زیادہ فکر ان پانچ لاکھ روپے کی تھی جو مراد خان نے اسے دیے تھے۔ بہرحال، یہ قرض کی رقم تو اسے واپس کرنا ہی تھی لیکن فوری طور پر یہ ممکن نہیں تھا۔ اس کی بیوی دل کی مریضہ تھی اور ہارٹ اٹیک کے بعد تو وہ مکمل طور پر بستر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا علاج بھی خاصا مہنگا تھا جو ہر حال میں جاری رکھنا ضروری تھا۔

وحید علی بیک وقت کئی محاذوں پر لڑ رہا تھا کہ اس پر ایک اور قیامت ٹوٹ پڑی۔ ایک روز پتا چلا کہ حسینہ بیگم کو کسی علاج کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ بیوی کی موت نے وحید علی کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ عمران اور لبنیٰ کو بھی یقیناً دلی اور ذہنی صدمہ پہنچا تھا۔ کہا جاتا ہے، وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ گزرتے ہوئے شب و روز کے ساتھ رفتہ رفتہ ان تینوں کو بھی صبر آ ہی گیا۔ ان کے دل و دماغ نے بہرحال اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ جانے والی جا چکی تھی۔ رونے دھونے اور ٹھنڈی آہیں بھرنے سے کسی بھی قیمت پر اس خلا کو پُر نہیں کیا جا سکتا۔

وحید علی کی اصل مشکلات کا آغاز اس وقت ہوا جب حسینہ بیگم کی موت کو ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے۔ ایک روز مراد خان اس کی دکان پر آیا۔ وہ خاصا تھکا ہوا اور پریشان دکھائی دیتا تھا۔ وحید علی نے اس سے پوچھا۔

''کیا بات ہے خان صاحب! آج آپ خاصے ڈاؤن نظر آ رہے ہیں؟''

''بات پریشانی کی ہے لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا کیسے

کہوں۔'' وہ مبہم سے انداز میں بولا۔

''بس، ایسے ہی کہہ دیں جیسے آپ بات کررہے ہیں۔'' وحید پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔'' مجھ سے کچھ کہنے کے لیے آپ کو اتنا زیادہ متذبذب ہونے کی کیا ضرورت ہے۔''

''وحید صاحب!'' مراد خان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔'' مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔''

وحید علی نے ایک افسردہ سی سانس خارج کی اور پوچھا۔'' خان صاحب! آپ کا کام کتنے پیسوں سے چل جائے گا؟''

''بات کام چلانے کی نہیں ہے وحید صاحب۔''

''پھر......؟'' وحید علی کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔

مراد خان گمبھیر انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔'' وحید صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ میں نے جس شخص سے وہ رقم لے کر آپ کو دی تھی، میں اسے اب مزید نہیں بھگت سکتا۔''

''نہیں بھگت سکتا......'' وحید علی نے اس کے الفاظ دہراتے ہوئے پوچھا۔'' اس کا کیا مطلب ہے خان صاحب؟''

''میں نے آج تک آپ سے ذکر نہیں کیا اور ایک سال گزر گیا۔'' مراد خان وضاحت کرتے ہوئے بولا۔'' دراصل میں نے وہ پانچ لاکھ ایک پارٹی سے سود پر لے کر آپ کو دیے تھے۔''

''سود پر......؟'' وحید علی اچھل پڑا۔'' اتنی بڑی غلطی آپ نے کیوں کی؟''

''اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔'' مراد خان اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔'' آپ پر بہت بڑی مصیبت نازل ہوگئی تھی۔ میں نے ہر جگہ کوشش کر کے دیکھ لی تھی لیکن رقم کا انتظام نہیں ہوسکا تھا۔ میں آپ کو بے یارومددگار بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یہی ایک راستہ نظر آیا تو میں نے آپ کا مسئلہ حل کرنے کے لیے سود پر پانچ لاکھ قرض اٹھالیے۔''

''اوہ میرے خدایا......!'' وحید علی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔'' ایک سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد تو وہ رقم دگنی ہوگئی ہوگی۔''

''نہیں۔'' مراد خان نے مضبوط لہجے میں کہا۔'' میں نے اصل رقم کا ایک پیسا بھی آگے بڑھنے نہیں دیا۔ وہ اب بھی پانچ لاکھ روپے ہی ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے......'' وحید علی نے ہیجانی انداز میں کہا۔'' آپ اس رقم پر باقاعدہ ہر ماہ سود ادا کرتے رہے ہیں؟''

''جی وحید صاحب! آپ کا اندازہ درست ہے۔'' مراد خان اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔'' لیکن اب میری ہمت جواب دے گئی ہے۔''

''اوہ......!'' وحید علی تشویش بھرے انداز میں اپنے دوست کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔'' آپ پچھلے ایک سال سے، کس شرح کے حساب سے سود ادا کرتے رہے ہیں؟''

''دس فی صد کے حساب سے۔'' مراد خان نے جواب دیا۔

''دس فی صد۔'' وحید علی کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

''یعنی سو پر دس روپے، ہزار پر سو روپے، لاکھ پر دس ہزار روپے اور پانچ لاکھ پر پچاس ہزار روپے ماہانہ......اوہ مائی گاڈ۔''

''جی......آپ نے بالکل درست حساب لگایا ہے۔''

''پچھلے ایک سال میں آپ اس سود خور پارٹی کو پانچ لاکھ کی اصل رقم پر چھ لاکھ روپے سود ادا کر چکے ہیں؟'' وحید علی پر گویا حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔

''اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا وحید صاحب۔'' مراد خان نے گہری سنجیدگی سے کہا۔'' میرا خیال تھا، آپ دو تین ماہ میں رقم واپس کردیں گے مگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوسکا اور میں سود کی دلدل میں پھنستا چلا گیا لیکن اب میری ہمت جواب دے گئی ہے۔'' لمحاتی توقف کر کے مراد خان نے ہمدردی بھری نظروں سے اپنے دوست کی طرف دیکھا۔ وحید علی عقیدت و احترام سے لبریز انداز میں اسی کو تک رہا تھا۔ مراد خان نے بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے جو کچھ اب تک کیا وہ دوستی نبھائی ہے وحید صاحب۔ میں آپ سے ایک پیسے کا تقاضا نہیں کروں گا۔ بس، اتنی سی عرض ہے کہ یہ معاملہ اب آپ اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ چاہیں تو پانچ لاکھ یکمشت ادا کر کے اس کے سود کے اس شیطانی چکر سے جان چھڑالیں یا پھر جب تک رقم کا بندوبست نہیں ہوتا، آپ ہر ماہ اپنی جیب سے پچاس ہزار سود ادا کرتے جائیں۔''

وحید علی کے پاس پانچ لاکھ کی رقم موجود نہیں تھی اور نہ ہی دکان سے اتنی آمدنی تھی کہ وہ ہر ماہ پچاس ہزار ادا کر پاتا۔ چند لمحات سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔

''مراد خان! آپ جانتے ہیں، میرے گھر پر کتنی بڑی قیامت ٹوٹی ہے۔ اس وقت میری ایسی پوزیشن نہیں کہ یکمشت یا ماہانہ سود والی ادائیگی کے طریقے پر عمل کرسکوں۔''

''مجھے سب معلوم ہے وحید صاحب۔'' مراد خان نے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔ ''لیکن میں مجبور ہوں۔ اس سلسلے کو مزید جاری رکھنا میرے بس میں نہیں۔''

''ٹھیک ہے دوست۔'' وحید نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''قدرت نے ہم دونوں کو کڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے...... مجھے ایک دن سوچنے کے لیے دے دیں۔ میں کل آپ کو جواب دوں گا۔''

''آپ دو تین دن اچھی طرح غور و فکر کرلیں وحید صاحب۔'' مراد خان ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن جو بھی فیصلہ کریں اس سے یہ مسئلہ حل ہونا چاہیے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔'' وحید نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''آپ نے میری خاطر پہلے ہی بہت قربانی دی ہے۔ میں آپ کو مزید پریشان نہیں ہونے دوں گا۔ انشاءاللہ میں اس مسئلے کو حل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

مراد خان امید لے کر وحید کی دکان سے رخصت ہوگیا۔ اسی رات وحید علی نے عمران اور لبنیٰ کے ساتھ ایک سنجیدہ میٹنگ کی اور انہیں صورتِ حال کی سنگینی سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس اس بحران سے نکلنے کے صرف دو طریقے ہیں۔ آپ لوگ مشورہ دو کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''وہ دو طریقے کون سے ہیں؟'' عمران نے سوال اٹھایا۔

''نمبر ایک، میں اپنی دکان کو مال سمیت فروخت کردوں۔'' وحید علی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''نمبر دو اس بنگلے کو فروخت کرکے ہم کسی چھوٹے گھر میں شفٹ ہو جائیں۔ اللہ نے مہربانی فرمائی تو دوبارہ بنگلا...... اس سے بھی بڑا بنگلا بن جائے گا۔''

''میرا خیال ہے، بنگلے کو فروخت کردینا چاہیے۔'' لبنیٰ نے کہا۔ ''جمے جمائے بزنس کو فروخت کرنا عقل مندی نہیں ہوگی۔ اگر دکان آپ کے ہاتھ میں رہی تو آپ اس سے کما کر دوبارہ بنگلا بنالیں گے۔''

''تم کیا کہتے ہو عمران؟'' وحید نے سوالیہ نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

''میں لبنیٰ کی تجویز سے متفق ہوں ڈیڈی۔'' عمران نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''سود والے عذاب سے اسی صورت نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔''

چنانچہ اس رات فیصلہ ہوگیا کہ وحید علی اپنا بنگلا فروخت کردے گا۔ اگلی صبح اس نے دکان پر پہنچتے ہی مراد خان کو فون کیا۔ مراد خان ایک منجھا ہوا پراپرٹی ڈیلر تھا۔ بنگلے کی فروخت کا کام اس سے زیادہ موزوں انداز میں اور کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اپنے دوست پر اندھا اعتماد کرتا تھا۔

''ہیلو وحید صاحب۔'' مراد خان نے فون اٹینڈ کیا۔

''مراد خان! میں نے مسئلے کا حل ڈھونڈ لیا ہے۔'' وحید نے ٹھوس انداز میں کہا۔

مراد خان کی حیرت بھری آواز سنائی دی۔ ''ایک ہی رات میں......؟''

''ہاں دوست، میں نے اپنا بنگلا فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' وحید علی نے بتایا۔ ''اب یہ پروجیکٹ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ آپ جتنی جلدی میرا بنگلا بکوادیں گے، اتنی ہی جلدی یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

''آپ بنگلا فروخت کردیں گے تو پھر رہیں گے کہاں؟'' مراد خان نے پوچھا۔

''آپ ہمارے لیے کوئی چھوٹا گھر یا مناسب سا فلیٹ خرید دیں گے؟'' وحید علی نے کہا۔ ''میرا خیال ہے، اس بنگلے کی فروخت سے اتنی رقم تو مل ہی جائے گی کہ قرض کے پانچ لاکھ ادا کرنے کے بعد ہم کسی معقول رہائش گاہ کو خرید سکیں؟''

''جی ہاں، آپ کا خیال درست ہے وحید صاحب۔'' مراد خان نے جلدی سے کہا۔ ''مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ آپ کو بنگلا فروخت کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔''

''اب آپ افسوس وغیرہ میں وقت برباد نہ کریں خان صاحب۔'' وحید نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بس پہلی فرصت میں یہ کام کرڈالیں۔ اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔''

آئندہ چند روز میں تمام معاملات بہ خوبی طے پاگئے۔ وحید علی کے بنگلے کی اس وقت مارکیٹ ویلیو پندرہ لاکھ کے آس پاس تھی لیکن جلدی اور افراتفری کے باعث وہ بارہ لاکھ میں فروخت ہوگیا۔ مراد خان نے بہادر آباد کے علاقے میں، پانچ لاکھ کا ایک لگژری فلیٹ وحید علی کو دلوادیا۔ آج کل ویسا فلیٹ ساٹھ ستر لاکھ بلکہ بعض پروجیکٹس میں تو ایک کروڑ سے کم کا نہیں ملتا۔ مراد خان کو پانچ لاکھ ادا کرنے کے بعد جو دو لاکھ باقی بچے تھے وہ وحید علی نے اپنے بزنس کو وسعت دینے کے لیے لگا دیے تاکہ دکان کی آمدنی میں اضافہ ہوسکے۔ دکان میں ٹائروں کی تعداد اور ورائٹی بڑھی تو ظاہر ہے، اس کی سیل اور پرافٹ میں بھی نمایاں بہتری دیکھنے میں آئی اور اس کے ساتھ ہی وحید علی کی مصروفیت میں

بھی اضافہ ہو گیا۔

☆☆☆

''عمران......!'' میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے دراز قامت دبلے پتلے نوجوان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری بیان کردہ کہانی میں تو کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مراد خان کوئی بُرا انسان ہے پھر وہ تم سے دشمنی کیوں کر رہا ہے؟''

''اس لیے کہ میں مراد خان کی اصلیت کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''وہ بہت ہی خطرناک اور تیز دھار میٹھی چھری ہے جناب۔''

''میں سمجھا نہیں؟'' میں نے الجھن زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''سب سمجھ جائیں گے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''آپ آگے تو سنیں......!''

میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ وہ گفتگو کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''وکیل صاحب! ہمیں بہادر آباد والے فلیٹ میں شفٹ ہوئے تین چار ماہ ہی ہوئے تھے کہ مراد خان نے ایک اور خطرناک چال چلی۔ اس دوران میں وہ مسلسل ہمارے گھر میں آمدورفت جاری رکھے ہوئے تھا۔ وہ ڈیڈی کا دوست ہے اس لیے ہم دونوں بھائی بہن اس کی عزت کرتے ہیں لیکن اب میں نے اس کا اصل اور بھیانک چہرہ دیکھ لیا ہے لہٰذا عزت و احترام کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ شیطان بھی اس بات سے بہ خوبی آگاہ ہے کہ میں اس کی اصلیت سے واقف ہو گیا ہوں اسی لیے وہ مجھے راستے سے ہٹانے کی کوشش میں ہے۔ اس چالباز نے ڈیڈی کو مجھ سے اتنا بدگمان اور متنفر کر دیا ہے کہ میں گھر چھوڑ کر اپنے چچا کے پاس رہ رہا ہوں۔''

''تم مراد خان کی کسی خطرناک چال کا ذکر کر رہے تھے۔'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ ''جو اس نے تم لوگوں کے بہادر آباد شفٹ ہونے کے بعد چلی تھی؟''

''جی، میں وہی بتانے لگا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مراد خان کو ڈیڈی کی یہ کمزوری خوب معلوم ہے کہ ڈیڈی اس پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ پتا نہیں اس کمینے نے کس طرح ڈیڈی کو شیشے میں اتارا کہ وہ دوسری شادی پر تیار ہو گئے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر عمران کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں وکیل صاحب۔'' وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''نہ صرف یہ کہ ڈیڈی دوسری شادی کے لیے تیار ہو گئے بلکہ مراد خان نے روبی نامی ایک عورت سے ڈیڈی کی شادی بھی کروا دی۔ پچھلے چند ماہ سے روبی ہماری سوتیلی ماں کی حیثیت سے فلیٹ پر رہ رہی ہے۔ ڈیڈی کی وہ چونکہ نئی نئی بیوی ہے اس لیے وہ روبی کے گرویدہ ہیں۔ جب ہم دونوں بہن بھائی پر سے ان کی توجہ ہٹی تو مجھے تشویش ہوئی اور میں روبی کی تفتیش میں لگ گیا اور اس تفتیش کے نتیجے میں نہایت ہی بھیانک حقائق سامنے آئے۔ وکیل صاحب، آپ سنیں گے تو حیرت زدہ رہ جائیں گے۔''

''میں ضرور سنوں گا۔'' میں نے گہری دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''سر! میں یہ پتا چلانے میں کامیاب ہو گیا ہوں کہ روبی کردار کی کوئی اچھی عورت نہیں اور مراد خان کے ساتھ بھی اس کے دیرینہ مراسم ہیں۔ مراد نے ایک گہری سازش کے تحت روبی کی ڈیڈی سے شادی کروائی ہے۔ وہ منحوس شخص ڈیڈی کو بالکل تباہ و برباد کر دینا چاہتا ہے اور ڈیڈی اس کی چال کو سمجھ نہیں رہے۔ وہ پوری طرح مراد خان کی مٹھی میں ہیں اور اسی کے کہنے میں آ کر وہ مجھ سے بدظن ہو گئے ہیں۔ مراد خان کا ہمارے یہاں آنا مجھے بہت کھلتا ہے۔ مجھے اس شخص کی شکل ہی سے نفرت ہے۔ اس کی آمدورفت کے پیشِ نظر جب میں نے گھر کے معاملات میں مداخلت کی تو انہوں نے اپنے دوست کی حمایت کرتے ہوئے مجھے بری طرح جھڑک دیا۔ میں نے دکان کے معاملات میں دلچسپی لینا شروع کی تو انہوں نے مجھے وہاں سے بھی بھگا دیا۔ ڈیڈی کا خیال ہے کہ میں آوارہ لڑکوں کی صحبت میں رہتے ہوئے بگڑ گیا ہوں۔ مراد خان نے ڈیڈی کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ میں اپنی سوتیلی ماں روبی سے نفرت کرتا ہوں اور کوئی چکر چلا کر ان کے کاروبار پر قابض ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں جبھی وہ مجھے دکان کے معاملات میں ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتے۔''

''میں نے تمہاری بات پر یقین کر لیا۔ تم جیسا بیان کر رہے ہو حالات بالکل ویسے رہے ہوں گے۔'' میں نے اس کے خاموش ہونے پر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا تمہارے پاس ایسا کوئی ثبوت ہے جس سے واضح ہو سکے کہ مراد خان دوستی کی آڑ میں تمہارے ڈیڈی سے دشمنی کر رہا ہے اور انہیں تباہ و برباد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟''

''کوئی تحریری یا کاغذی ثبوت تو نہیں ہے جناب۔'' وہ متاملانہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جو بھی ہے،

بس زبانی ہی زبانی ہے۔''

''مثلاً.....زبانی ہی زبانی کیا ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''میں نے چند روز پہلے روبی اور مراد خان کو تنہائی میں باتیں کرتے ہوئے سن لیا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس وقت ڈیڈی گھر میں نہیں تھے۔ ان دونوں کی گفتگو بہت ہی خوف ناک تھی۔ مراد خان اپنے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے روبی کو بتا رہا تھا کہ کس طرح اس نے اپنے آدمیوں کی مدد سے لبنیٰ کو اغوا کروا کے ڈیڈی کو چونا لگایا تھا۔ اس نے ڈیڈی کو جو پانچ لاکھ دیے وہ ایک دم نقلی نوٹ تھے۔ ڈیڈی اس وقت سخت پریشان تھے لہٰذا نوٹوں کی چیکنگ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مراد خان کے نقلی پانچ لاکھ کے ساتھ ڈیڈی کے اصلی دو لاکھ بھی گئے پھر سود خور پارٹی کا ڈراما رچا کر اس نامراد نے ڈیڈی سے مزید پانچ لاکھ ہتھیا لیے۔ اس کی کمینگی یہاں تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ ہمارا پندرہ سولہ لاکھ کا بنگلا بارہ لاکھ میں بکوا کر بھی اس نے اچھی خاصی کمائی کر لی ہے اور انہیں بہادر آباد والا جو فلیٹ پانچ لاکھ میں دلوایا ہے اس میں بھی یقیناً مراد نے کچھ نہ کچھ ضرور کمایا ہوگا۔''

''اوہ...... یہ تو بہت ہی خطرناک صورتِ حال ہے۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''یہ مراد خان تو بہت ہی ماسٹر مائنڈ آدمی ہے۔''

''اسے شک ہے کہ میں اس کے عزائم کو اچھی طرح بھانپ چکا ہوں۔'' وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''روبی اس کی خاص بندی ہے۔ وہ نامراد، مراد خان روبی سے ڈیڈی کی شادی کروا کے اب ڈیڈی کے فلیٹ اور کاروبار پر بھی قبضہ کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ دولت، جائداد اور کاروبار تو گیا جہنم میں...... میں کسی اور وجہ سے بھی سخت پریشان ہوں وکیل صاحب۔''

''کسی اور وجہ سے......'' میں نے الجھن زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''تم کس وجہ کا ذکر کر رہے ہو عمران؟''

''اس وجہ کا نام لبنیٰ ہے......'' وہ بے حد جذباتی لہجے میں بولا۔ ''روبی بہت ہی گندی عورت ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ میری معصوم بہن کو کسی بری راہ پر نہ ڈال دے۔ میں اپنا گھر چھوڑ کر چچا حمید علی کے پاس فیڈرل بی ایریا والے گھر میں تو چلا گیا ہوں لیکن میرا دل اور ذہن لبنیٰ میں اٹکا ہوا ہے۔''

''کیا تمہارے چچا حمید علی کو ان تمام حالات کا علم ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ایک ایک بات پوری تفصیل کے ساتھ انہیں بتائی ہے۔''

''پھر وہ کیا کہتے ہیں بیچ اس مسئلے کے؟''

''انہیں ڈیڈی کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''جی، میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''بھائی کو بھائی کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ عجیب سی بات نہیں ہے۔''

''اصل میں چچا حمید اور ڈیڈی میں سالہا سال سے شدید نوعیت کے اختلافات چلے آ رہے ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''بات چیت اور ملنا جلنا بالکل ختم ہے بلکہ یوں سمجھیں کہ مرنا جینا ختم ہے۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''چچا نے مجھے اپنے گھر میں رکھ لیا ہے اور کہا ہے۔ میں جب تک چاہوں وہاں رہ سکتا ہوں مگر وہ ڈیڈی کے معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کریں گے۔ میرے چچا کے یہاں آ جانے سے ایک اور گڑبڑ ہو گئی ہے وکیل صاحب؟''

''کیسی گڑبڑ؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مراد خان نے ڈیڈی کو یقین دلا دیا ہے کہ میں چچا کے ساتھ مل کر ڈیڈی کے خلاف کوئی سازش تیار کر رہا ہوں۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے بتایا۔ ''وہ کمینہ ایک طرف ڈیڈی کو میرے خلاف اکسا رہا ہے، دوسری جانب مجھے کرانے کے قاتلوں کے ذریعے صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کر رہا ہے اور تیسری سمت وہ روبی کی مدد سے ڈیڈی اور لبنیٰ کو شکار کرنے کا منصوبہ بنائے بیٹھا ہے۔ ان باتوں سے آپ اس کی شیطانی ذہنیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں وکیل صاحب۔''

''ہاں..... مجھے بخوبی اندازہ ہو رہا ہے۔'' میں نے گہری نظروں سے عمران کی آنکھوں میں جھانکا پھر پوچھا۔ ''ان تمام تر گمبھیر اور سنگین حالات میں، میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''جناب! آپ اپنی وکالت کے زور پر کوئی ایسا چکر چلائیں کہ مراد خان اپنے مذموم عزائم سے باز آ جائے اور......'' وہ امید بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اور ہم سب لوگ راضی خوشی رہنے لگیں۔ ڈیڈی روبی

کو اپنی زندگی سے نکال باہر کریں تاکہ ہمارے گھر کا سکون اور چین لوٹ آئے۔''

''برخوردار......!'' میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''میں وکیل ہوں کوئی جادوگر نہیں۔ تم نے جو کچھ بتایا ہے اسے عملاً بروئے کار لانا ممکن نہیں۔''

''جادو کے ذکر پر یاد آیا ہے کہ کہیں روبی نے ڈیڈی کو الو کا گوشت تو نہیں کھلا دیا۔'' وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا۔''یا ہوسکتا ہے مراد خان کے ڈیڈی پر کسی قسم کا سفلی وغیرہ کروا دیا ہو؟''

''قانون کی کتابوں اور عدالت کے کمرے میں جادو ٹونا اور سفلی وغیرہ کی کوئی اہمیت نہیں عمران میاں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔''میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ تمہارے معاملے میں اگر کچھ ہوسکتا ہے تو وہ پولیس کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے۔ تم متعلقہ تھانے جاکر اپنے مسائل کی رپورٹ درج کرواؤ تو زیادہ بہتر نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔''

''آپ بھی کمال کرتے ہیں وکیل صاحب۔'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔''کیا آپ اپنے ملک کی پولیس کا حال نہیں جانتے...... یہ چوروں اچکوں، جرائم پیشہ افراد اور پیسے والے طاقتور لوگوں کی مدد کرتی ہے۔ اگر میں اپنا معاملہ پولیس کے پاس لے گیا تو مراد خان بڑی آسانی سے پولیس والوں کی مٹھی گرم کر کے انہیں اپنی راہ میں ہموار کر لے گا۔''
اس نے ذرا توقف کر کے مایوسی سے گردن ہلائی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میری جیب میں تو پولیس کو دینے کے لیے سو روپے بھی نہیں ہیں اور چچا بھی اس معاملے میں میرے ساتھ ایک قدم چلنے کو تیار نہیں......''

''تمہارے چچا حمید علی کرتے کیا ہیں؟'' میں نے اپنی معلومات کی غرض سے پوچھ لیا۔

''ادھر واٹر پمپ پر ان کا جنرل اسٹور ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔''تم اپنے چچا کو ایک آدھ روز میں میرے پاس بھیج دو۔ میں ان سے بات کرنے کے بعد کوئی لائحہ عمل بناتا ہوں۔''

''جی، میں چچا کو آپ کے پاس بھیجنے یا خود ساتھ لے کر آنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔''میرا مسئلہ حل تو ہوجائے گا نا وکیل صاحب؟''

''میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا۔'' میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ اس کے چہرے پر رونق ابھر آئی۔

''بہت بہت شکریہ جناب۔''

''اس دوران میں تمہیں ایک اور کام بھی کرنا ہے۔'' میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

وہ جلدی سے بولا۔''آپ جو بھی کہیں گے، میں کروں گا۔''

''تم نے مجھے اپنی سوتیلی ماں روبی اور لبنیٰ کے حوالے سے جو کچھ بتایا ہے وہ خاصا تشویش ناک ہے۔ کسی وقت کوئی بھی ناخوش گوار واقعہ رونما ہوسکتا ہے۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں گہری سنجیدگی سے کہا۔''اس لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ ادھر ادھر بھٹکنے کے بجائے تمہیں زیادہ وقت اپنے گھر پر گزارنا چاہیے۔ تم اسی گھر میں زیادہ محفوظ رہ سکتے ہو اور اپنی بہن کی بھی بھرپور انداز میں حفاظت کر سکتے ہو۔''

میری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ میری ہدایت پر من وعن عمل کرے گا۔ وہ جانے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہوا تو میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اسے رکھ لو، اگر کوئی بھی ہنگامی صورتِ حال پیدا ہوجائے تو مجھے فون کرلینا۔ کارڈ پر میرے آفس اور گھر دونوں کا فون نمبر درج ہے۔ میں تمہارے کام آنے کی اپنی سی کوشش کروں گا۔''

اس نے وزیٹنگ کارڈ کو اپنی جیب میں رکھتے ہوئے میرا شکریہ ادا کیا پھر مجھے سلام کر کے دفتر سے رخصت ہوگیا۔

عمران علی کی کہانی نہایت ہی سنسنی خیز اور اہمیت کی حامل تھی لیکن میں سرِدست اس معاملے میں ہاتھ ڈالنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اگر عمران کا چچا اس سلسلے میں سنجیدگی سے کھڑا ہوجاتا تو پھر ان مسائل کو حل کرنے کے لیے کوئی کارگر حکمتِ عملی بنائی جاسکتی تھی۔ اب سارا دارومدار عمران کے چچا حمید علی کی اس کیس میں دلچسپی پر تھا۔

☆☆☆

حمید علی مجھ سے ملنے ضرور آیا مگر ایک آدھ روز میں نہیں بلکہ ایک ہفتے کے بعد۔ وہ اکیلا ہی تھا اور بڑی سنسنی خیز خبر لے کر آیا تھا۔ میں نے فوراً حمید علی کو اپنے چیمبر میں بلا لیا۔

حمید علی کی عمر پینتالیس کے اریب قریب رہی ہوگی۔ وہ متناسب البدن اور دراز قامت تھا اور اس نے گھنی داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ میں توقع کر رہا تھا کہ عمران بھی اس کے ساتھ ہوگا مگر میری یہ توقع پوری نہیں ہوسکی تھی۔ حمید علی ان

لحات میں خاصا بوکھلایا ہوا تھا اور پریشان نظر آتا تھا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا۔ اس سے پہلے وہ اپنا مکمل تعارف کروا چکا تھا۔

''وکیل صاحب! عمران بڑی مشکل میں پھنس گیا ہے۔ اسی نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔''

''آپ کو تو کافی دن پہلے مجھ سے ملنے آنا تھا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''خیر...... یہ بتائیں، عمران کے ساتھ کیا ہو گیا ہے؟''

''پولیس نے عمران کو گرفتار کر لیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کس جرم میں؟''

''قتل کے الزام میں!'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

''قتل......'' میں چونک اٹھا۔ ''عمران پر کس کے قتل کا الزام ہے۔''

''آپ اندازہ لگائیں۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''آپ کو تو اس نے پوری کہانی سنا رکھی ہے۔''

''مراد خان کے قتل کے الزام میں؟''

''نہیں۔'' حمید علی نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''اپنی سوتیلی ماں روبی کے قتل کا الزام ہے اس پر۔''

''اوہ......'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا پھر پوچھا۔ ''یہ کب کا واقعہ ہے؟''

''کل دوپہر کا۔'' اس نے جواب دیا۔

''کل...... یعنی تین مارچ۔'' میں نے ٹیبل کیلنڈر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آج چار مارچ ہے۔ اس کا مطلب ہے، آج صبح پولیس نے عمران کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ لے لیا ہوگا۔''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''وہ اس وقت عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہے۔''

''واقعات کی تفصیل کیا ہے؟''

''مجھے کچھ زیادہ معلوم نہیں...... مطلب یہ ہے کہ وقوعہ کے روز کیا ہوا اس بارے میں، میں زیادہ نہیں جانتا۔'' اس نے کہا۔ ''آج عمران کی گرفتاری کے بارے میں پتا چلا تو میں اس سے ملنے تھانے گیا تھا۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں آپ کو اس واقعے کے بارے میں بتا دوں لہٰذا میں آپ کے پاس آ گیا ہوں۔''

''عمران کا کیا موقف ہے؟''

''وہ اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ روبی کے قتل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔'' حمید علی گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ خود حوالات جا کر عمران سے ملاقات کر لیں۔''

''ٹھیک ہے، وہ تو میں کروں گا ہی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''عمران کے باپ اور آپ کے بڑے بھائی وحید علی کا اس واقعے کے حوالے سے کیا اسٹینڈ ہے؟''

''وہ عمران کی مخالفت میں کھڑا ہے۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''اور اپنی چہیتی بیوی روبی کے قاتل کو قرار واقعی سزا دلوانے کے حق میں ہے۔''

''یہ تو عجیب بات ہے۔'' میں نے کندھے اچکائے۔ ''آپ نے اپنے بھائی کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی؟''

''سمجھانے کی کوشش......'' اس کے لہجے میں تلخی اتر آئی۔ ''وکیل صاحب! وحید علی اس قابل نہیں کہ میں اس کے کسی معاملے میں کودنے کے بارے میں سوچوں۔ حسینہ بیگم بہت ہی نیک خاتون تھیں۔ اس کی موت کے فوراً بعد وحید نے ایک بازاری عورت سے شادی کر کے گھر کو جائے عذاب بنا دیا تھا۔'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما پھر نہایت ہی زہریلے انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو اچھا ہوا روبی مر گئی۔ اس کا زندہ رہنا لبنیٰ اور عمران کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہوتا۔''

''مگر اس کی موت بھی تو عمران کے لیے انتہائی خطرناک اور پریشان کن ثابت ہو رہی ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''پولیس نے عمران کو روبی کے قتل کے الزام ہی میں تو گرفتار کیا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مگر مجھے یقین ہے، عمران نے روبی کو قتل نہیں کیا۔ وہ ایک جذباتی نوجوان ضرور ہے مگر وہ قتل ایسا سنگین جرم نہیں کر سکتا۔ وہ بے گناہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں، عمران کو کسی گہری سازش کے تحت اس جھمیلے میں پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے لہٰذا آپ کی کوششیں بہ آسانی عمران کو باعزت بری کروا لیں گی۔''

اگر یہ کیس ابھی ابھی میرے پاس آیا ہوتا تو شاید حمید علی کی بات پر یقین کرنے کے لیے میں اس سے درجنوں سوال کرتا لیکن میں عمران اور اس کی فیملی ہسٹری سے پہلے ہی اچھی طرح آگاہ تھا۔ اگر عمران کو کسی کے خون میں ہاتھ رنگنا ہی ہوتے تو وہ شخص مراد خان کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ میں بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ روبی کے قتل میں عمران کو ملوث کرنا کسی سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ تھا۔ بہ قول عمران، اس سے پہلے اسے جان سے مارنے کی بھی کوشش کی گئی تھی۔

میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے عمران کے چچا سے کہا۔

''ٹھیک ہے حمید صاحب۔ میں یہ کیس لینے کے لیے تیار ہوں کیونکہ میں عمران کے حالات سے اچھی طرح واقف ہوں لیکن اس سلسلے میں آپ کو نہایت ہی اہم کردار ادا کرنا ہوگا۔''

''کیسا کردار وکیل صاحب؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''عمران کے ایک مضبوط حمایتی کا کردار۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اصولی طور پر یہ کردار عمران کے باپ وحید علی کا بنتا ہے مگر وہ چونکہ اپنی بیوی کے مبینہ قاتل کو عبرت ناک سزا دلوانے کے لیے کھڑا ہے اس لیے اس سے عمران کی حمایت کی توقع رکھنا فضول ہی ہوگا۔''

''آپ نے جو کچھ بیان کیا، میں اس سے سو فی صد اتفاق کرتا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''لیکن میں کھل کر اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہتا۔ یہ تو وحید علی کو شرم آنا چاہیے کہ وہ اپنی بدکردار بیوی کی خاطر اپنے بیٹے سے دشمنی کر رہا ہے۔''

''اسے شرم نہیں آرہی نا........ اور اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے۔'' میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''مراد خان اور روبی نے اپنے مختلف ہتھکنڈوں کی مدد سے وحید کو عمران کی طرف سے بری طرح بدظن اور متنفر کر رکھا ہے۔ اس موقع پر آپ سے زیادہ اور کوئی عمران کا خیر خواہ نہیں ہوسکتا۔''

''میں عمران کی خیر خواہی کے لیے تیار ہوں وکیل صاحب۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کیس پر جو بھی اخراجات آئیں گے وہ میں دوں گا۔ میں آپ کی فیس اور ہر قسم کے عدالتی اخراجات اٹھاؤں گا مگر کھل کر سامنے کھڑا نہیں ہوں گا۔ یہ معاملہ آپ کو خود ہی حل کرنا ہوگا۔''

''ہو جائے گا یہ معاملہ بھی حل۔'' میں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ ''میں آج رات کسی وقت حوالات جا کر عمران سے ملاقات کرلوں گا۔ آپ کل اسی وقت میرے پاس آجائیں پھر فیس اور دیگر مالی معاملات طے کرلیں گے۔''

''آپ کے ذہن میں کیا آئیڈیا ہے؟'' اس نے استفسار کیا۔

''بس..... آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں عمران سے مل کر پہلے یہ جان لوں کہ وقوعہ کے روز فلیٹ پر کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس کے بعد ہی کوئی حکمتِ عملی ترتیب دوں گا۔'' میں نے حمید علی کے سوال کے جواب میں کہا۔ ''عمران کی عمرِ بلوغت کو عبور کرچکی ہے۔ وہ اپنا مقدمہ خود بھی لڑسکتا ہے۔ بس، اس سلسلے میں جہاں جہاں رقم خرچ کرنے کا وقت آئے گا، وہ زحمت آپ کو کرنا ہوگی۔''

''مجھے منظور ہے۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولا پھر پوچھا۔ ''وکیل صاحب! آپ کی فیس کتنی ہوگی؟''

میں نے اسے اپنی فیس کے بارے میں بتادیا۔ اس نے مجھے خدا حافظ کہا اور کل دوبارہ آنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوگیا۔

اسی روز دفتر سے فارغ ہونے کے بعد میں نے متعلقہ تھانے جا کر عمران سے ایک بھرپور اور تفصیلی ملاقات کی۔ اس بات کا تو مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ وہ روبی کے قتل میں ملوث نہیں ہوگا۔ بہرحال، اس کی زبانی پتا چلنے والے حالات و واقعات کی روشنی میں میرا اندازہ یقین میں بدل گیا۔ عمران کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قتل کے اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کی گئی تھی۔ عمران سے ہونے والی اہم باتوں کا ذکر آگے چل کر عدالتی کارروائی کے دوران میں آئے گا۔

میں نے عمران کو تسلی دلاسا دیتے ہوئے پولیس والوں کے تفتیشی ہتھکنڈوں سے محفوظ رہنے کے طریقے بتائے۔ وکالت نامے، درخواستِ ضمانت اور دیگر اہم قانونی کاغذات پر اس کے دستخط لینے کے بعد میں نے اس سے عدالت میں ملنے کا وعدہ کیا اور تھانے سے نکل آیا۔

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کردیا۔ اسی روز میں نے اپنے مؤکل کی درخواستِ ضمانت اور اپنا وکالت نامہ بھی دائر کردیا تھا لیکن مجھے یہ بتانے میں کوئی باک نہیں کہ میں عمران کی ضمانت کروانے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ یہ بات پہلے بھی کئی بار وضاحت کے ساتھ بیان کی جاچکی ہے کہ قتل کے ملزم کی ضمانت ناممکن حد تک مشکل ہوتی ہے۔

آگے بڑھنے سے قبل میں استغاثہ کی رپورٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کا ذکر کرنا نہایت ہی ضروری سمجھتا ہوں۔ میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم عمران علی کو عدالت نے جوڈیشل ریمانڈ پر عدالت سے سیدھا جیل بھجوا دیا تھا۔ اگلی پیشی پندرہ روز بعد کی تھی۔ مختلف نوعیت کی تحقیق اور تفتیش کے لیے میری نظر میں یہ پندرہ دن کافی تھے۔ حمید علی کھل کر اس کیس میں کوئی کردار ادا نہیں کررہا تھا تاہم اس کی مالی، اخلاقی اور جسمانی ہر قسم کا تعاون مجھے حاصل

تھا۔ اس کی مدد اور تعاون ہی سے میں اس کیس سے متعلق نہایت ہی اہم پوائنٹس تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ ان تمام باتوں کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مقامات پر کیا جائے گا۔

واقعات کے مطابق، تین مارچ کی دوپہر وحید علی کی بیوی روبی اپنی خواب گاہ میں مردہ پائی گئی تھی۔ مذکورہ دن لبنیٰ جب اسکول سے گھر آئی تو گھر کے اندر طاری سناٹے سے اسے عجیب سا محسوس ہوا۔ ان دنوں اس کے ...... امتحانات چل رہے تھے۔ جب وہ ...... واپس آتی تھی تو اس کی سوتیلی ماں روبی گھر کے اندر موجود ہوتی تھی اور وہی لبنیٰ کے لیے فلیٹ کا دروازہ کھولا کرتی تھی لیکن آج اسے داخلی دروازہ کھلا ملا تو وہ چونک اٹھی پھر فلیٹ کی اندرونی خاموشی نے اسے روبی کی خواب گاہ کی سمت قدم بڑھانے پر مجبور کر دیا اور اگلے ہی لمحے اس کی نگاہ روبی کے بے ترتیب بدن پر پڑی تو وہ ششدر رہ گئی۔

روبی کا لباس جابجا پھٹا ہوا تھا اور وہ بڑے بے ڈھنگے انداز میں اپنے بستر پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس افراتفری شدہ حالت میں روبی کو جامد و ساکت پڑے دیکھ کر لبنیٰ کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ اس کی سوتیلی ماں اس دارِفانی سے کوچ کر چکی ہے۔

اس نے فوری طور پر اپنے باپ کو فون کیا اور نہایت ہی وحشت زدہ انداز میں وحید علی کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وحید علی اپنے فلیٹ پر تھا۔ اس کے بعد ہی پولیس کو اس اندوہناک واقعے کی اطلاع دی گئی تھی۔ کچھ ہی دیر کے بعد پولیس موقع پر پہنچ گئی اور اسی روز لگ بھگ سات بجے شام پولیس نے عمران علی کو اپنی سوتیلی ماں کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔

واقعاتی شہادتوں کے مطابق، جائے وقوعہ یعنی مقتول کے بیڈروم میں اچھی خاصی افراتفری کے آثار پائے گئے تھے۔ ...... استغاثہ کے مطابق، ملزم عمران اپنی سوتیلی ماں روبی سے سخت نفرت کرتا تھا لہٰذا وقوعہ کے روز اس نے مقتول کی عصمت کو تار تار کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن مقتول کی جان دار مزاحمت نے ملزم کے منصوبے کی ایسی کم تیسی پھیر دی۔ اسی مزاحمت اور چھینا جھپٹی کے دوران میں مقتول کا لباس جگہ جگہ سے پھٹتا چلا گیا۔ جب ملزم کو یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنے شیطانی مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا تو اس نے اپنے شکار کا گلا گھونٹ کر اسے موت کی نیند سلا دیا اور چپکے سے فلیٹ سے نکل گیا۔ اگر مقتول روبی ملزم کے ناپاک منصوبے کے سامنے زیر ہو کر مزاحمت ترک کر دیتی تو پھر شاید ملزم اس کی جان لینے کی کوشش نہ کرتا۔ اس کے جذبۂ انتقام کو قرار آ جاتا لیکن مقتول نے اس کی مذموم کوشش کو بری طرح ناکام بنا کر اسے ایک ہیجان، ایک جنون میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسی وحشیانہ کیفیت میں اس نے مقتول کا گلا دبا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق، مقتول روبی کی موت دم گھٹنے کے سبب واقع ہوئی تھی۔ موت کا وقت بارہ اور دو بجے کے درمیان کا تھا۔ مقتول کی گردن کو قاتل کے مضبوط ہاتھوں نے اتنی شدت اور قوت سے دبایا تھا کہ اس کی سانس کی آمد و شد کا سلسلہ منقطع ہو کر رہ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں بھی حلقوں سے باہر ابل پڑی تھیں جیسا کہ پھانسی لگنے والے یا لٹک کر خودکشی کرنے والے شخص کی آنکھیں باہر نکل آتی ہیں۔ مقتول کے نازک بدن پر نوچنے اور کھسوٹنے کے نشانات بھی پائے گئے تھے۔ اسی رپورٹ کی ایک لائن میرے موکل کے حق میں جاتی تھی اور وہ یہ کہ اس حملے کے دوران میں مقتول کے ساتھ مجرمانہ زیادتی نہیں کی گئی تھی۔ اس کی عصمت داغ دار نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ملزم کا بیان ریکارڈ کیا گیا پھر وکیل استغاثہ جج کی اجازت کے بعد اکیوزڈ باکس (ملزموں والے کٹہرے) کے نزدیک پہنچا اور ملزم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جرح شروع کر دی۔

''کیا یہ درست ہے کہ تم اپنی سوتیلی ماں یعنی مقتول سے شدید نفرت کرتے تھے؟''

''اس کے جو کرتوت تھے ان کی روشنی میں اس سے محبت کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔'' ملزم نے تلخی بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ عورت ہم دونوں بھائی بہن پر کسی دردناک عذاب کے مانند نازل ہوئی تھی۔''

''کیا تمہاری بہن لبنیٰ بھی مقتول سے اتنی ہی نفرت کرتی تھی؟''

''اتنی اور جتنی یا کتنی کا تو مجھے پتا نہیں۔'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔ ''ہاں، یہ جانتا ہوں کہ اس عورت کے ظالمانہ سلوک کی بدولت لبنیٰ بھی اسے سخت ناپسند کرتی تھی۔''

وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ وقوعہ سے ایک روز قبل رات کے

وقت تمہارا مقتول کے ساتھ شدید نوعیت کا جھگڑا ہوا تھا؟''
''ہاں، یہ سچ ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔'' ملزم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔'' وہ کون سا دن اور کون سی رات تھی جب ہمارے گھر میں بدامنی اور بدمزگی کی فضا قائم نہیں ہوتی تھی۔''
''میں وقوعہ سے ایک روز پہلے والے جھگڑے کی بات کر رہا ہوں۔'' وکیلِ استغاثہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔'' جب تم نے مقتول کو جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی اور اس پر ہاتھ اٹھانے کی بھی کوشش کی تھی لیکن خوش قسمتی سے اس وقت تمہارا باپ گھر میں موجود تھا اور اس نے بیچ میں پڑ کر یہ معاملہ رفع دفع کروا دیا تھا؟''
''جی ہاں۔'' ملزم نے ایک بار پھر اثبات میں گردن ہلائی۔'' ایسا ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تھا اور میں بتا چکا ہوں کہ اس تمام تر فساد کی جڑ وہی فتنہ پرور عورت تھی جو بدقسمتی سے میری سوتیلی ماں بن کر ہمارے گھر میں آئی تھی۔''
''چنانچہ تم نے پودا بننے سے پہلے ہی فساد کی اس جڑ کو تلف کر دیا؟''
''روبی کے قتل سے میرا دور کا بھی واسطہ نہیں۔'' ملزم نے احتجاجی انداز میں کہا۔'' مجھے خوامخواہ اس دلدل میں پھینک دیا گیا ہے۔''
''تم یہ تو تسلیم کرتے ہو نا کہ...... وقوعہ سے ایک روز قبل تم نے مقتول کو جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی؟'' وکیلِ استغاثہ نے تیکھے انداز میں سوال کیا۔
''ہاں...... وہ میرا وقتی اشتعال تھا۔'' ملزم صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔
''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی۔'' وکیلِ استغاثہ نے یہ کہتے ہوئے جرح کا سلسلہ موقوف کر دیا۔
وکیلِ استغاثہ نے ملزم کو فارغ کیا تو میں سوالات کے لیے اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے نہایت ہی نرم لہجے میں دریافت کیا۔
''وقوعہ کے وقت تم کہاں تھے...... میرا مطلب ہے، دوپہر بارہ اور دو بجے کے درمیان؟''
''میں گھر میں نہیں تھا۔'' اس نے جواب دیا۔
''یہی تو عدالت جاننا چاہتی ہے کہ جب تمہاری سوتیلی ماں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا، تم اس وقت کہاں تھے؟''
''میں اپنے دوستوں کے ساتھ تھا۔'' اس نے بتایا۔
''محمود آباد میں۔''
''وقوعہ کے روز تم اپنے گھر سے کتنے بجے نکلے تھے؟''
''لگ بھگ گیارہ بجے صبح۔''
''اور واپسی کتنے بجے ہوئی تھی؟'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے استفسار کیا۔
اس نے جواب دیا۔'' شام سات بجے۔''
''یعنی تم اس روز صبح گیارہ بجے سے شام سات بجے تک اپنے گھر کے اندر موجود نہیں تھے؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔'' اور دوپہر بارہ بجے سے دو بجے تک تم اپنے دوستوں کے ساتھ محمود آباد میں تھے؟''
''جی ہاں، یہی حقیقت ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔'' ویسے تو میں یہ سارا وقت اپنے انہی دوستوں کے ساتھ رہا تھا لیکن چونکہ آپ نے خاص طور پر دوپہر بارہ بجے سے دو بجے تک کا ذکر کیا ہے اس لیے میں نے تصدیق کر دی کہ میں ان اوقات میں اپنے دوستوں کے ساتھ محمود آباد میں تھا۔''
''تم نے تو تصدیق کر دی۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔'' کیا تمہارے وہ دوست بھی اپنے ساتھ تمہاری موجودگی کی تصدیق کر سکتے ہیں؟''
''کیوں نہیں جناب...... ضرور۔'' وہ بڑے یقین کے ساتھ بولا۔
''کیا تم اپنے ان دوستوں کے نام بتاؤ گے؟''
''عارف اور وسیم۔'' اس نے جواب دیا۔
''کیا عارف اور وسیم محمود آباد ہی کے رہنے والے ہیں؟''
اس نے اثبات میں گردن ہلائی، میں نے پوچھا۔
''اگر ضرورت محسوس ہوئی تو کیا عارف اور وسیم تمہارے حق میں گواہی دینے عدالت تک آ سکیں گے؟''
''بالکل آئیں گے جناب۔'' وہ پُراعتماد انداز میں بولا۔'' جو سچ ہے، وہ سچ ہے اور سچ کا ساتھ دینے کے لیے ہر کسی کو تیار رہنا چاہیے۔''
''مگر ہر کوئی تیار نہیں رہتا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔'' جب تم وقوعہ کے روز دوپہر بارہ اور دو بجے کے درمیان جائے وقوعہ سے سات آٹھ کلومیٹر دور محمود آباد میں عارف اور وسیم کے ساتھ موجود تھے تو پھر استغاثہ کو اس بات پر اصرار کیوں ہے کہ انہی اوقات میں تم نے اپنی سوتیلی ماں کا گلا گھونٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا ہے؟''
اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا۔
''جناب! یہ سوال تو آپ کو استغاثہ سے کرنا چاہیے۔''

''ویل سیڈ۔'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔''وقت آنے پر یہ سوال استغاثہ سے ضرور کیا جائے گا۔'' وہ خاموش نظروں سے مجھے تکنے لگا۔
میں نے پوچھا۔''تم نے ابھی بتایا کہ وقوعہ کے روز تمہاری واپسی شام سات بجے ہوئی تھی۔ کیا تم روزانہ شام سات بجے ہی واپس لوٹا کرتے تھے؟''
''میری واپسی کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا جناب۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔''گھر میں موجود کشیدگی کی وجہ سے میرا زیادہ وقت گھر سے باہر ہی گزرتا تھا۔ عموماً رات دس کے بعد ہی میری واپسی ہوا کرتی تھی۔''
''پھر وقوعہ کے روز شام سات بجے واپسی کیوں ہوئی؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔''اس کا کوئی خاص سبب تھا؟''
''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔
میں نے پوچھا۔''ایسا کیا خاص سبب تھا؟''
''دراصل، ہم دوستوں میں اس روز ایک سنیما میں فلم دیکھنے کا پروگرام بن گیا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔''اور ہم نے رات کا کھانا بھی باہر ہوٹل ہی میں کھانا تھا۔ اس کھانے اور فلم دیکھنے کے ٹکٹ وغیرہ کے اخراجات میرے ذمے آگئے تھے مگر اتفاق سے اس روز میں اپنا بٹوا گھر بھول گیا تھا۔ پچھلی رات مقتول کے ساتھ جو بدمزگی ہوئی تھی اس نے میرے حواس پر برے اثرات مرتب کیے تھے بہرحال......'' اس نے تھوڑا توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنے بیان کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔
''جب میں نے عارف اور وسیم کو بتایا کہ میں انہیں کھانا کھلانے اور فلم دکھانے کے لیے تو تیار ہوں مگر میرا بٹوا گھر پر رہ گیا ہے تو انہوں نے اسے میری کوئی چال سمجھا اور اس امر پر زور دیا کہ میں گھر سے بٹوا لے کر آؤں۔ ہم نے سنیما کا آخری شو دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا اور شو شروع ہونے میں ابھی اچھا خاصا وقت باقی تھا لہٰذا میں شام سات بجے اپنا بٹوا لینے گھر آیا تھا۔''
''بہت خوب۔'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا اور پوچھا۔''اس رات آپ تینوں دوستوں نے کس پکچر ہاؤس میں کون سی فلم دیکھی تھی؟''
''آپ بھی کمال کرتے ہیں جناب......'' وہ حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔
''کیوں؟'' میں نے بھی جواباً حیرت کا اظہار کیا۔
''اس میں کمال والی کون سی بات ہے؟''
''جناب! اس رات فلم دیکھنے کی تو نوبت ہی نہیں آئی تھی۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔''میں نے جیسے ہی بلڈنگ میں قدم رکھا دو پولیس والوں نے مجھے گھیر لیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ وہاں کافی دیر سے گھات لگائے میرا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے فوراً گرفتار کر لیا۔''
''تم نے وکیلِ استغاثہ کے سوالات کے جواب میں تسلیم کیا ہے کہ وقوعہ سے ایک روز پہلے، رات میں تمہارا مقتول یعنی سوتیلی ماں روبی سے شدید نوعیت کا جھگڑا ہوا تھا۔'' میں نے سوالات کا زاویہ تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔''معزز عدالت جاننا چاہتی ہے کہ اس جھگڑے کی بنیادی وجہ کیا تھی؟''
''روبی کا کردار۔'' وہ نفرت انگیز انداز میں بولا۔
''کیا مطلب؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
''مجھے اس عورت کے کردار پر شک تھا بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ مجھے اس کے بدکردار ہونے کا یقین تھا تو یہ غلط نہیں ہوگا۔'' وہ خاصے جوشیلے اور کینیلے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔''وہ ڈیڈی سے بے وفائی کی مرتکب ہو رہی تھی۔ وہ ڈیڈی کے ایک بااعتماد دوست مگر میری نظر میں ایک فراڈ شخص مراد خان کے ساتھ غلط قسم کے تعلقات رکھتی تھی۔ مراد خان کا ہمارے گھر میں آنا جانا تھا۔ ڈیڈی مراد خان پر اندھا بھروسا کرتے تھے۔ روبی سے ڈیڈی کی شادی بھی اسی نامراد، مراد خان نے کروائی تھی۔ وہ پہلے بھی دوستی کی آڑ میں ڈیڈی کو بے تحاشا مالی نقصان پہنچا چکا تھا لیکن ڈیڈی کی زبان پر اسی شخص کا کلمہ رہتا تھا۔ وہ روبی سے شادی کے بعد ہم دونوں بہن بھائی کو یکسر فراموش کر بیٹھے تھے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے ڈیڈی کی غیر موجودگی میں روبی اور مراد خان کو نازیبا اور مخربِ اخلاق حرکتیں کرتے دیکھا تھا......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر بیان کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔
''جناب! وقوعہ سے ایک روز پہلے میں روبی کی انہی بے حیائی کی حرکتوں پر اسے لعن طعن کر رہا تھا کہ معاملہ بڑھ گیا۔ ہمارے درمیان جھگڑا اتنی شدت اختیار کر گیا کہ ڈیڈی کو بیچ... بچاؤ کرنا پڑا تھا۔ میں نے طیش کے عالم میں یہاں تک بھی کہہ دیا کہ اگر وہ اپنے کرتوتوں سے باز نہ آئی تو میں اس کی جان بھی لے سکتا ہوں لیکن میری دھمکی وقتی ابال کا نتیجہ تھی۔ اس کا حقیقت سے یا میرے ارادے سے کوئی

تعلق نہیں تھا۔''

ان سوالات کے نتیجے میں، میں نے ابتدائی طور پر عدالت کے سامنے مقتول روبی کا کردار رجسٹر کروا دیا تھا۔ علاوہ ازیں مراد خان کی انٹری بھی ڈال دی گئی تھی۔ یہ ایک طرح سے گملے کی نم مٹی میں کوئی بیج دبانا تھا۔ آئندہ پیشیوں پر میں نے ان دونوں بیجوں کی آبیاری کر کے انہیں سطح زمین سے باہر لانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جب یہ دونوں پودے عدالت اور انصاف کی نظروں میں آتے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جانا تھا۔

مزید چند سوالات کے بعد میں نے جرح ختم کر دی۔

اگلی گواہی ملزم کی بہن لبنیٰ کی تھی۔ لبنیٰ لگ بھگ سولہ سال کی ایک گول مٹول اور گوری چٹی لڑکی تھی۔ اس کے گال کھلونا گڑیاؤں کی طرح پھولے ہوئے تھے۔ دیکھنے میں وہ خاموش طبع اور کم گو نظر آتی تھی۔ اس نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کروا دیا تو وکیل استغاثہ اس کے پاس چلا گیا۔

''لبنیٰ جی۔'' اس نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا یہ بات درست ہے کہ تمہارا بھائی عمران مقتول روبی سے شدید نفرت کرتا تھا؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''اور تم بھی مقتول کو سخت ناپسند کرتی تھیں؟''

''جی۔'' لبنیٰ نے نہایت ہی مختصر جواب دیا۔

''کیا یہ بھی سچ ہے کہ عمران کا اکثر و بیشتر مقتول روبی کے ساتھ جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔'' وکیل استغاثہ نے گواہ کو اپنی مرضی کے مطابق گھسنے کی کوشش کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''اور وقوعہ سے ایک روز قبل تو اتنی شدت کا جھگڑا ہوا تھا کہ عمران نے اپنی سوتیلی ماں کو جان سے مارنے کی دھمکی بھی دے ڈالی تھی؟''

''جی ایسا ہی ہوا تھا۔'' لبنیٰ نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

''تمہارے ڈیڈی کا مقتول کے ساتھ رویہ کیسا تھا؟''

''بالکل نارمل۔''

''اور مقتول کا تمہارے ڈیڈی کے ساتھ کیسا سلوک تھا؟''

''بالکل ٹھیک تھا۔''

''یعنی تمہارے ڈیڈی اور تمہاری سوتیلی ماں روبی کے درمیان کسی نوعیت کا تنازع نہیں تھا۔'' وکیل استغاثہ نے چالاکی سے پوچھا۔ ''وہ دونوں امن و سکون سے ازدواجی زندگی گزار رہے تھے؟''

''جی ہاں۔''

''اور ان دونوں کو گھر میں کسی مراد خان کی آمد و شد پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا؟'' وکیل استغاثہ نے ہوشیاری سے سوال کیا۔

''جی..... نہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔'' لبنیٰ نے جواب دیا۔

وکیل استغاثہ نے فاتحانہ انداز میں جج کی طرف دیکھا اور جرح کا سلسلہ ختم کر دیا۔ میں اپنی باری پر وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا اور گواہوں والے کٹہرے میں کھڑی لبنیٰ سے پوچھا۔

''جن دنوں تمہارے گھر میں یہ افسوس ناک واقعہ پیش آیا، تمہارے میٹرک کے امتحانات چل رہے تھے۔ سارے پرچے تو گڑبڑ ہو گئے ہوں گے؟''

''جی..... صرف پرچے ہی نہیں، زندگی کا ہر معاملہ گڑبڑ ہو گیا تھا۔'' اس نے دکھ بھرے لہجے میں بتایا۔ ''میں جبھی سے بہت ڈسٹرب ہوں۔''

''ٹھیک ہے، بیٹی! میں تمہاری ذہنی کیفیت کو سمجھ سکتا ہوں۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''لیکن یہ سوالات بھی ضروری ہیں۔''

''جی..... میں سمجھ سکتی ہوں۔'' وہ میری بات کی تہ تک رسائی حاصل کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

میں نے پوچھا۔ ''تم روزانہ اسکول کے لیے کتنے بجے گھر سے نکلتی تھیں؟''

''پونے آٹھ بجے.....'' اس نے بتایا۔

''اور تمہاری واپسی کب ہوتی تھی؟'' میں نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، تم اپنے گھر کتنے بجے پہنچ جاتی تھیں؟''

''کم و بیش دو بجے دوپہر۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا وقوعہ کے روز بھی تم دو بجے ہی گھر پہنچی تھیں؟''

''نہیں.....'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''ان دنوں پیپرز ہو رہے تھے جس کی وجہ سے جلدی چھٹی ہو جاتی تھی۔ اس روز میں ایک بجے دوپہر گھر آ گئی تھی۔''

''جب تم گھر پہنچیں تو تمہاری سوتیلی ماں اپنے بیڈ روم میں مردہ پڑی تھی۔'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول روبی کی موت دوپہر بارہ بجے سے لے کر دو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ تمہارے بیان کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ مقتول کو بارہ اور ایک بجے کے بیچ کسی وقت موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا کیونکہ اس روز جب تم ایک بجے دوپہر گھر پہنچیں تو تمہاری سوتیلی ماں زندگی

کی بازی ہار چکی تھی......!''

لبنیٰ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ خاموش نظر سے مجھے تکتی چلی گئی۔

میں نے پوچھا۔ ''وقوعہ کے روز جب تم صبح اسکول جارہی تھیں تو اس وقت گھر میں کون کون موجود تھا؟''

''ابو تھے...... امی تھیں...... اور عمران تھا......'' اس نے جواب دیا۔

''امی...... مطلب مقتول روبی؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''ابو کے رشتے کے حوالے سے میں انہیں امی ہی کہا کرتی تھی۔''

''کیا عمران بھی مقتول کو امی ہی کہا کرتا تھا؟''

''نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولی۔ ''وہ ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ میں اس عورت کی حقیقت سے واقف ہو چکا ہوں لہٰذا اسے امی کہنا خود کو گالی دینے کے مترادف ہے۔''

''وقوعہ کے روز جب تم اسکول کے لیے گھر سے نکلیں تو اس وقت عمران کیا کر رہا تھا؟'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''وہ اس وقت سو رہا تھا۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''کیا یہ درست ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تمہیں اغوا کرلیا گیا تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''اس وقت تمہاری سگی ماں زندہ تھیں؟''

''جی یہ درست ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''اور پھر اغوا کار کو مبلغ سات لاکھ روپے دے کر تمہیں رہا کرایا گیا تھا؟''

''جی بالکل، ایسا ہی ہوا تھا۔''

''تمہارے والد کے پاس اتنی بڑی رقم موجود نہیں تھی، اور نہ ہی وہ اغوا کار کے دیے ہوئے وقت کے اندر یہ رقم ارینج کر سکتے تھے لہٰذا اس موقع پر ان کے ایک دوست مراد خان نے ان کی مدد کی تھی۔''

''جی۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''دو لاکھ ابو نے اور پانچ لاکھ مراد انکل نے ملائے تھے اور مجھے اغوا کار سے چھڑایا گیا تھا۔''

''کیا یہ وہی مراد خان ہے جس نے آپ کی امی حسینہ بیگم کے انتقال کے فوراً بعد مقتول سے آپ کے باپ کی شادی کرائی تھی؟''

''جی...... وہی مراد خان۔'' اس نے بتایا۔

''کیا مراد خان روبی اور آپ کے والد کی شادی سے پہلے بھی آپ کے گھر آیا کرتا تھا؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔

''جی نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''پہلی مرتبہ میں نے مراد خان کو اپنے گھر میں اس وقت دیکھا جب میں اغوا کار کے چنگل سے نکل کر گھر واپس آئی تھی۔ جبھی مجھے پتا چلا تھا کہ مراد نے میری رہائی کے سلسلے میں ایک بڑی رقم ابو کو دی تھی۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ''اس سے پہلے میں نے صرف مراد خان کا نام سنا تھا اور یہ پتا تھا کہ وہ ابو کا دوست ہے۔''

''پھر جب تمہاری امی کے انتقال کے بعد تمہارے ابو اور مقتول کی شادی ہوگئی تو یہی مراد خان اکثر و بیشتر آپ کے گھر آنے لگا تھا؟''

''جی..... ایسا ہی تھا۔''

''اور عمران کو اس شخص پر گہرا شک تھا؟''

''جی.....'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی۔'' میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مزید جرح ملزم عمران پر ہوگی۔''

لبنیٰ عدالت کے کمرے سے باہر گئی تو میں اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم عمران کی جانب متوجہ ہوگیا۔ عمران سے پہلے بھی میری دو تین ملاقاتیں ہو چکی تھیں تاہم اس وقت وہ ایک آزاد شہری تھا۔

''تمہاری بہن نے ابھی معزز عدالت کو بتایا ہے کہ تمہیں مراد خان پر گہرا شک تھا۔'' میں نے ملزم کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''ذرا اپنے شک کی وضاحت تو کرو.....''

''اس شخص پر مجھے کئی حوالوں سے شک تھا..... شک نہیں بلکہ یقین تھا کہ یہ شیطان میرے ابو کو تباہ و برباد کرنے کے منصوبے پر عمل پیرا تھا۔'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''روبی سے ابو کی شادی تو بہت بعد کی بات ہے۔ مراد کا گھناؤنا منصوبہ تو اسی وقت شروع ہوگیا تھا جب لبنیٰ کو اغوا کیا گیا تھا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا.....؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

یہ تمام معاملات عمران کی زبانی پہلے ہی مجھ تک پہنچ چکے تھے لیکن عدالت کے ریکارڈ پر لانا ضروری تھا اس لیے میں ایک مخصوص انداز میں جرح کر رہا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں عمران نے بڑے اعتماد سے بتایا۔

''مجھے یقین ہے کہ ابو کو تباہ و برباد کرنے کے منصوبے کا آغاز لبنیٰ کے اغوا سے ہوا تھا۔ مراد خان نے بڑی چالاکی سے پہلے لبنیٰ کو اغوا کرایا پھر ابو کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے پانچ لاکھ روپے کے نقلی نوٹ مہیا کیے۔''

''تم یہ بات اتنے وثوق سے کس طرح کہہ سکتے ہو کہ پانچ لاکھ کے وہ نوٹ جو مراد خان نے تمہارے والد کو دیے وہ نقلی تھے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''اور یہ کہ لبنیٰ کو مراد ہی نے اغوا کرایا تھا.....؟''

''ثبوت.....'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''میں یہ بات اتنے وثوق سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں نے خود اپنے کانوں سے یہ زہریلا سچ سنا تھا اور اسی دن سے مراد خان میرا دشمن ہوگیا تھا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے انجان بننے کی اداکاری کرتے ہوئے پوچھا۔

''روبی سے ابو کی شادی کے بعد مراد خان نے اکثر و بیشتر ہمارے گھر آنا شروع کر دیا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور یہ کمینہ شخص ابو کی غیر موجودگی میں بھی ہمارے گھر آجایا کرتا تھا اور..... روبی سے گپ شپ کر کے واپس چلا جاتا تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر میں نے ان دونوں کی گفتگو سن لی تھی جب وہ روبی کو بتا رہا تھا کہ اس نے کس طرح خود ہی لبنیٰ کو اغوا کرایا اور پھر نقلی نوٹوں سے ابو کو بے وقوف بنایا۔ بعد میں سود کی بھاری رقم کا ناٹک کر کے اس شیطان نے ہمارا بنگلا اونے پونے بکوا دیا اور ہم بہادر آباد کے اس فلیٹ میں آگئے۔ اس شیطان نے اسی پر بھی بس نہیں کی اور روبی سے ابو کی شادی کرا دی۔ میری تحقیق کے مطابق، روبی ایک بدکردار عورت تھی اور مراد خان نے ایک گہری سازش کے تحت ابو سے اس کی شادی کرائی تھی۔ میں چونکہ اس کے شیطانی منصوبے کو بھانپ گیا تھا اس لیے وہ میرا دشمن ہوگیا تھا۔ اس نے کرائے کے غنڈوں سے مجھے قتل کرانے کی کوشش بھی کی لیکن میری خوش قسمتی کہ میں بچ گیا ورنہ اس نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی.....''

''اوہ.....'' میں نے ایک مصنوعی جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو بہت ہی خطرناک شخص ہے.....'' پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''جناب عالی! معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ مراد خان نامی اس شخص کو عدالت میں پیش کرنے کا بندوبست کیا جائے۔ میں اس بندے سے چند اہم سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

جج نے گہری سنجیدگی سے مجھے دیکھا اور اثبات میں گردن ہلا دی۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر مراد خان عدالت میں حاضر نہیں ہوا۔ اس کی طرف سے بیماری کا سرٹیفکیٹ داخل کر دیا گیا تھا۔ اس پیشی پر میں نے ملزم عمران کے دونوں دوستوں کو ارینج کر رکھا تھا لہٰذا جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد میں نے عارف اینڈ وسیم محمود آبادی کو گواہی کے لیے کمرے میں

بلا لیا۔ وہ دونوں صفائی کے گواہوں کی حیثیت سے میری جانب سے عدالت میں پیش ہوئے تھے۔

عارف اور وسیم کے بیانات میں ایسی سنسنی خیزی نہیں تھی کہ میں ان پر ہونے والی جرح کو لفظ بہ لفظ یہاں تحریر کروں تاہم ان کے بیانات کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم تھی۔ وہ دونوں اس امر کے مضبوط گواہ تھے کہ وقوعہ کے روز یعنی تین مارچ کو ملزم عمران علی نے دوپہر ساڑھے گیارہ بجے سے شام سات بجے تک کا وقت ان کی معیت میں گزارا تھا اور اس دوران میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوا تھا جبکہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق، مقتول روبی کو وقوعہ کے روز دوپہر بارہ بجے سے دو بجے کے دوران میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ ملزم کی چھوٹی بہن لبنیٰ کا بیان اس بات کی تصدیق کرتا تھا کہ جب وہ لگ بھگ ایک بجے گھر پہنچی تو مقتول روبی اس دارِ فانی سے کوچ کر چکی تھی۔ ان حقائق کی روشنی میں میرا موکل اور اس مقدمے کا ملزم عمران علی بے گناہ نظر آتا تھا لیکن ابھی اس کی بے گناہی کو عدالت کی نظر میں ثابت کرنے اور اس کی باعزت رہائی کو یقینی بنانے کے لیے مجھے ایک دو مزید زاویوں پر طبع آزمائی کرنا تھی لہٰذا میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یور آنر...... میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

کسی بھی کیس کا انکوائری آفیسر ہر پیشی پہ عدالت میں موجود ہوتا ہے اور اس کی حیثیت استغاثہ کے گواہ ایسی ہوتی ہے۔ میری فرمائش پر جج کی اجازت سے آئی او وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ عہدے کے اعتبار سے وہ ایک سب انسپکٹر تھا جو اپنے ڈیل ڈول اور جثے کے مطابق ایک سست الوجود شخص نظر آتا تھا۔

''آئی او صاحب!'' میں نے ڈھیلے ڈھالے تفتیشی افسر کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے سوالات کا آغاز کیا۔ ''آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب اور کس نے دی تھی؟''

اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اپنے ہیوی ڈیوٹی وجود کے برعکس نہایت ہی مہین اور مسکین سی آواز میں جواب دیا۔

''لگ بھگ دو، سوا دو بجے ہمیں اس واقعے کی اطلاع دی گئی تھی اور فون مقتول کے شوہر وحید علی نے کیا تھا۔''

یہ بات عدالت کے علم میں آ چکی تھی کہ لبنیٰ نے اسکول سے گھر پہنچنے کے بعد سب سے پہلے روبی کی لاش کو دیکھا تھا اور فوراً اس واقعے کی اطلاع اپنے والد کو دی تھی جو تھوڑی ہی دیر میں گھر پہنچ گیا تھا، اس کے بعد ہی پولیس کو فون کیا گیا تھا۔

''آپ نے جائے وقوعہ کا نقشہ خاصی تفصیل سے تیار کیا تھا لیکن حیرت مجھے اس بات پر ہے کہ جائے واردات کے کسی بھی حصے سے ملزم کے فنگر پرنٹس اٹھانے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی......'' میں نے قدرے تیز لہجے میں سوال کیا۔ ''اس کوتاہی کا کوئی خاص سبب؟''

''یہ کوتاہی نہیں تھی۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''ہم نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مقتول کے بیڈروم کی حالت چیخ چیخ کر اس امر کی گواہی دے رہی تھی کہ اس شقی القلب شخص نے کتنی بے دردی سے اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔''

''آپ کا مطلب ہے، مقتول کے بیڈروم کی دیواریں اور وہاں موجود ہر شے ملزم کا نام پکار رہی تھی۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''یہ تو آپ بہت ہی حیرت انگیز بات بتا رہے ہیں۔''

''آپ بالکل غلط سمجھے ہیں وکیل صاحب۔'' وہ خود کو خاصا عقل مند ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''میرا اشارہ مقتول کی لاش کی جانب تھا۔ اس کے لباس کو جس انداز میں تار تار کیا گیا تھا، اس کے بدن کو جس طرح نوچا اور کھسوٹا گیا تھا وہ ملزم کی درندگی کا منہ بولتا ثبوت تھا......'' ایک لمحے کو وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر عجیب سے لہجے میں بولا۔

''اب آپ یہ سوال نہیں کیجیے گا کہ کیا میں نے اپنی آنکھوں سے ملزم کو یہ کارروائی کرتے دیکھا تھا...... اس معاملے کو سمجھنے کے لیے ملزم کی ایک روز پہلے والی دھمکی ہی کافی تھی جب اس نے بڑے جلال میں مقتول کو قتل کرنے کی وارننگ دی تھی۔''

''ٹھیک ہے آئی او صاحب! آپ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے میں یہ سوال نہیں کروں گا۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''لیکن اس کے علاوہ دوسرے سوال تو کر سکتا ہوں نا......!''

وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ یک ٹک مجھے دیکھتا چلا گیا۔

''آپ جائے وقوعہ پر گئے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ مقتول کی رہائش کراچی کے کس علاقے میں واقع تھی؟''

''بہادر آباد میں۔'' اس نے جواب دیا۔

''بنگلا یا فلیٹ......؟''

''فلیٹ!''

''کیا مقتول کا فلیٹ بہادر آباد کے کسی الگ تھلگ حصے میں واقع تھا یا کسی بھری پری بلڈنگ میں؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''بھری پری بلڈنگ میں۔'' اس نے الجھن زدہ انداز میں جواب دیا۔

آئی او کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس نوعیت کے سوالات کس مقصد سے کررہا ہوں۔ میں نے اس کی الجھن کی پروا کیے بغیر ایک سنسناتا ہوا استفسار کیا۔

''آئی او صاحب! آپ نے جائے وقوعہ کا جتنا دردناک نقشہ تیار کیا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مقتول نے اپنی عزت اور جان بچانے کے لیے سرتوڑ کوشش کی تھی اور اسی کوشش میں اس کا لباس بھی تار تار ہوگیا تھا لیکن ایک بات کی مجھے حیرت ہے کہ وہ چیخی چلائی نہیں...... اس نے کسی کو مدد کے لیے نہیں پکارا...... کہیں وہ گونگی تو نہیں تھی؟''

''نہیں جناب، وہ گونگی نہیں تھی۔'' وہ معاندانہ نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''مقتول بھی یقیناً اپنی مدد کے لیے چیخی چلائی ہوگی لیکن ملزم نے اس کی پیش نہیں چلنے دی۔''

''اگر وہ چیخی چلائی تھی تو آس پڑوس والوں کو اس واقعے کی خبر کیوں نہیں ہوئی؟'' میں نے ایک اہم نکتہ اٹھایا۔ ''وہ اس کی مدد کو کیوں نہیں لپکے؟ استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں مقتول کے کسی ایک بھی پڑوسی کا نام درج نہیں...... یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی نے کچھ نہ سنا ہو، کچھ نہ دیکھا ہو...... جب کہ وہ اپارٹمنٹ بلڈنگ بہادر آباد کے گنجان آباد علاقے میں واقع ہے...... اور مکینوں سے پوری طرح بھری ہوئی بھی ہے؟''

میرے ان سوالات کا آئی او کے پاس کوئی جواب نہیں تھا لہٰذا وہ آئیں بائیں شائیں کرتے ہوئے بغلیں جھانکنے لگا۔ میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! صفائی کے گواہان عارف اور وسیم کے بیانات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ میرا موکل اور اس مقدمے کا نامزد ملزم عمران علی بے گناہ ہے۔ وہ وقوعہ کے روز دوپہر گیارہ بجے سے شام سات بجے تک اپنے گھر سے دور، دوستوں کے ساتھ موجود رہا ہے لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ مقتول روبی کی موت میں اس کا کوئی ہاتھ ہو۔ میرے موکل کو کسی گہری سازش کے تحت اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ سازش اسی شخص کی تیار کردہ ہے جس نے مقتول کی شادی وحید علی سے کرائی تھی

چنانچہ......'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''چنانچہ، میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ آئندہ پیشی پر مراد خان کی عدالت میں حاضری کو یقینی بنایا جائے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کیا جاسکے......''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔ جج نے آئندہ پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کا اعلان کردیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ......!''

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں مراد خان موجود تھا۔ وہ ہوشیار آنکھوں کا مالک ایک کائیاں اور شاطر شخص نظر آتا تھا۔ گزشتہ پیشی پر میں اپنے موکل کی جائے وقوعہ سے عدم موجودگی ظاہر کرکے یہ ثابت کرچکا تھا کہ روبی کے قتل میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں عارف اور وسیم کی گواہی نے عمران کے دامن اور ہاتھ کو صاف ثابت کردیا تھا۔

وکیلِ استغاثہ نے مراد خان کو فارغ کیا تو میں جج کی اجازت سے اس کے کٹہرے کے نزدیک چلا گیا۔ اس پیشی پر مجھے ان اہم معلومات کو استعمال کرنا تھا جو عمران کے چچا حمید علی کی بھاگ دوڑ کے نتیجے میں مجھ تک پہنچی تھیں۔

''مراد صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''میرے علم کے مطابق، آپ مقتول کے شوہر وحید علی کے بہت گہرے دوست ہیں؟''

''جی، آپ کی معلومات بالکل درست ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ ہر مشکل وقت میں اپنے دوست کے کام آتے رہے ہیں۔'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جب آپ کے دوست کی بیٹی لبنیٰ کو اغوا کرلیا گیا تو اس کی بازیابی کے لیے آپ نے ایک خطیر رقم اپنے دوست کو دی تھی!''

''جی، ان لمحات میں وحید بہت پریشان تھا۔ اس کی پریشانی مجھ سے دیکھی نہ گئی اور میں نے اس کے لیے پانچ لاکھ کا بندوبست کردیا۔'' اس نے بتایا۔ ''اگر ایک دوست دوسرے دوست کی مصیبت میں کام نہیں آئے گا تو پھر ایسی دوستی کا فائدہ کیا......!''

''بالکل درست فرمایا آپ نے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''وحید علی کافی عرصے تک یہی سمجھتا رہا تھا کہ آپ نے وہ رقم اسے اپنے پاس سے دی تھی لیکن کچھ عرصے کے بعد جب یہ انکشاف ہوا کہ آپ نے کسی

پارٹی سے سود پر وہ رقم لے کر اسے دی تھی اور ماہانہ پچاس ہزار روپے آپ اس رقم پر سود اپنی جیب سے سود خور کو دے رہے تھے تو یہ سن کر وحید ہکا بکا رہ گیا تھا۔''

''میں نے وحید پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔'' وہ ایک خاص انداز میں بولا۔ ''جب تک میں افورڈ کر سکتا تھا اپنی جیب سے سود کی رقم ادا کرتا رہا اور جب مجبور ہو گیا تو میں نے وحید کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔''

''یقیناً آپ نے اپنے دوست وحید پر تو کوئی احسان نہیں کیا تھا لیکن اس معزز عدالت پر آپ کو ایک احسان ضرور کرنا ہوگا......'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''عدالت پر احسان......'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''کیسا احسان؟''

''آپ معزز عدالت کو بتائیں گے کہ آپ نے کس پارٹی سے سود پر پانچ لاکھ روپے لے کر اپنے دوست کو دیے تھے۔'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''عدالت اس شخص کا نام جاننا چاہتی ہے۔''

''کک...... کیوں......؟'' وہ ایک دم پریشان ہو گیا۔ ''میں کیوں بتاؤں اس شخص کا نام......؟''

''آپ کو اس شخص کا نام اس لیے بتانا ہوگا کہ عدالت کو آپ کے بیان کی تصدیق کرنا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ ملزم نے عدالت میں بیان دیا ہے کہ آپ نے کسی پارٹی سے سود پر ایک روپیا بھی نہیں لیا تھا۔ وہ سب نقلی نوٹ تھے اور...... ملزم کی بہن کے اغوا کا ڈراما بھی آپ ہی نے رچایا تھا۔''

''وہ جھوٹ بولتا ہے...... بکواس کرتا ہے......'' وہ غصیلی نظر سے ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں بھلا اپنے دوست کے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کیوں کروں گا۔''

''اسے تباہ و برباد کرنے کے لیے...... اس کی دولت اور کاروبار ہتھیانے کے لیے۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''ملزم کا بیان ہے کہ اس نے خود اپنے کانوں سے آپ کی اور مقتول کی گفتگو سنی تھی جس میں آپ نے مقتول کو اپنے اس کارنامے سے تفصیلاً آگاہ کیا تھا کہ آپ نے کس طرح وحید علی کو الو بنا کر اس کے بنگلے کو اونے پونے بکوا دیا۔ آپ ایک پراپرٹی ایجنٹ ہیں۔ یہ بات آپ کو اچھی طرح معلوم تھی کہ پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی والے اس بنگلے کی مارکیٹ ویلیو کسی بھی طرح پندرہ لاکھ سے کم نہیں تھی جبکہ آپ نے وہ بنگلا صرف بارہ لاکھ میں فروخت کرنے کا ڈراما رچا کر تین لاکھ یہاں سے کما لیے اور پانچ لاکھ وحید سے ویسے لے لیے اس طرح یہ چھوٹی سی ڈیل آپ کو راتوں رات آٹھ لاکھ کا منافع دے گئی...... اس کے بعد آپ نے روبی کے ذریعے......''

''میں نے کہا نا ملزم کے ان الزامات میں ذرہ برابر بھی حقیقت نہیں ہے۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

''میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ آپ ملزم کی جانب سے لگائے گئے ان الزامات کو غلط ثابت کر دیں۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''آپ اس سود خور پارٹی کا نام بتا دیں جس سے بھاری شرح پر آپ نے سود لے کر وحید علی کو پانچ لاکھ دیے تھے۔ عدالت متعلقہ شخص کو یہاں بلا کر آپ کے بیان کی تصدیق کرے گی اور آپ کی ذات ہر شک و شبے سے بالاتر ہو جائے گی۔''

''نہیں...... میں اس شخص کا نام نہیں بتا سکتا۔'' وہ قطعیت سے بولا۔

''مسٹر مراد! آپ کو اس پارٹی کا نام پتا بتانا پڑے گا۔'' جج نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ ''تاکہ آپ کے بیان کی تصدیق ہو سکے۔''

اب مراد خان کی حالت دیدنی تھی۔ وہ جج کے سامنے اکڑ نہیں دکھا سکتا تھا لہٰذا جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

''اس بندے کا نام سلطان خان ہے اور......'' وہ تھوک نگل کر حلق تر کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ بندہ ادھر سہراب گوٹھ میں رہتا ہے لیکن...... میری درخواست ہے کہ اس شخص کو عدالتی چکروں میں نہ ڈالا جائے۔''

''یہ فیصلہ کرنے کا اختیار عدالت کو ہے کہ کس شخص کو کس چکر میں ڈالنا ہے اور کس بندے کو کس چکر سے نکالنا ہے۔'' جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس کے لیے آپ کی کسی درخواست یا مشورے کی ضرورت نہیں......'' پھر جج نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔''

''کیا یہ درست ہے کہ وحید علی کی روبی سے شادی آپ ہی نے کرائی تھی؟'' میں نے مراد خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

''جی یہ بات درست ہے۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اور اس میں بھی آپ کو میری کوئی بدنیتی نظر آ رہی ہوگی...... ہیں نا؟''

''میرے نظر آنے یا نظر نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ کتنے بدنیت ہیں یا کتنے صاف نیت ہیں اس کا فیصلہ کرنے کے

لیے ہی یہ عدالت لگی ہوئی ہے۔‘‘

وہ ناپسندیدہ نظر سے مجھے گھورنے لگا۔

میں نے اس کے انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ’’یہ بات طے ہے کہ جب کوئی شخص دو افراد کی شادی کراتا ہے تو وہ ان دونوں افراد سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے...... آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟‘‘

’’جی...... یہ تو ایک اصولی بات ہے۔‘‘ وہ گول مول لہجے میں بولا۔

’’اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ وحید علی اور مقتول روبی سے بہت اچھی طرح آگاہ تھے؟‘‘

’’جی...... جی ہاں۔‘‘ وہ متذبذب انداز میں بولا۔

’’وحید علی سے تو آپ کی پرانی دوستی ہے لہٰذا میں اس کے بارے میں آپ سے کوئی سوال نہیں کروں گا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’صرف اتنا بتا دیں کہ آپ مقتول کو کب سے جانتے ہیں؟‘‘

’’لگ بھگ دس سال سے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’کس حوالے سے تھی یہ جان کاری؟‘‘

’’میں نے دس سال پہلے روبی کو ایک مکان دلوایا تھا۔ اس کے بعد ہمارے بیچ علیک سلیک شروع ہو گئی تھی اور کبھی کبھار ہماری ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔‘‘ اس نے بتایا۔

’’صرف علیک سلیک اور ملاقات یا...... اس سے زیادہ بھی آپ لوگوں میں کوئی ربط ضبط تھا؟‘‘ میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھا۔

وہ نگاہ چراتے ہوئے بولا۔ ’’صرف علیک سلیک!‘‘

’’میری ٹھوس معلومات کے مطابق، مقتول روبی کا تعلق حیدرآباد کے ایک مخصوص علاقے سے تھا اور وہ تین سال پہلے ہی کراچی شفٹ ہوئی تھی۔‘‘ میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ ’’پھر اس نے آپ کی مدد سے دس سال پہلے کراچی میں ایک مکان کیسے لے لیا تھا؟‘‘

’’مم...... میں بھول گیا ہوں گا......‘‘ وہ جلدی سے صورت حال کو سنبھالا دیتے ہوئے بولا۔ ’’میں نے تین سال پہلے ہی اسے مکان دلوایا ہو گا۔‘‘

’’تین اور دس سال میں پورے سات سال کا فرق ہے۔‘‘ میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ’’کوئی بھی پراپرٹی ایجنٹ اتنے بڑے فرق کو بھول نہیں سکتا۔ اس کا مطلب ہے، تم جھوٹ بول کر معزز عدالت کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر رہے ہو......‘‘

’’وکیل کے بچے......‘‘ وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔ ’’تم مجھے تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو...... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا......‘‘

’’یور آنر...... پوائنٹ ٹو بی نوٹیڈ......‘‘ میں نے فاتحانہ نظر سے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’مراد خان بھری عدالت میں مجھے قتل کرنے کی دھمکی دے رہا ہے...... ممکن ہے، اس نے روبی کو بھی موت کے گھاٹ اتارا ہو......‘‘

مراد خان کی برداشت جواب دے گئی۔ وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو کر کٹہرے سے نکلا اور میری جانب بڑھتے ہوئے وحشیانہ انداز میں چلایا۔ ’’وہ تو گئی جہنم میں...... اب تمہاری بھی خیر نہیں ہے......‘‘

عدالت کے کمرے میں اچانک ہی سنسنی خیز صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ میں مراد خان کی دھمکی سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ تک پہنچتا، متعلقہ عدالتی عملے نے اسے قابو کر کے ہتھکڑی پہنا دی۔ وہ پولیس کی حراست میں پھنکارتے ہوئے غصیلی نظر سے مجھے گھورنے لگا۔

☆☆☆

گزشتہ پیشی پر مراد خان کے رویے نے تمام حقائق پر سے پردہ اٹھا دیا تھا۔ اس کا عمل گویا اس کا اقبالِ جرم تھا۔ عدالت کی ہدایت پر جب اسے پولیس کسٹڈی میں دیا گیا تو پھر پولیس کو اس کی زبان کھلوانے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

روبی اور مراد خان ایک ہی قماش کے لوگ تھے اور پچھلے تین سال سے وہ مل کر کام کر رہے تھے۔ وحید علی ان کا آٹھ واں شکار تھا۔ روبی ایک پیشہ ور عورت تھی اس لیے ان کی گاڑی بڑی ہموار چل رہی تھی لیکن اس کیس میں روبی نے سب کچھ اکیلے ہی ہڑپ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا چنانچہ مراد خان اسے اپنے راستے سے ہٹانے پر مجبور ہو گیا۔ مراد نے کچھ اس انداز میں روبی کو موت کے گھاٹ اتارا کہ قربانی کے بکرے کے طور پر عمران علی کی گردن پھنس جائے اور تقریباً ایسا ہوا بھی تھا لیکن عمران کی خوش قسمتی کہ یہ کیس میرے پاس آ گیا تھا۔

برائی کا انجام کبھی خوش گوار نہیں ہوتا چاہے اس کا ذمے دار کوئی بھی ہو حتیٰ کہ اگر چاند سے بھی کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو وہ بھی گہنا جاتا ہے۔ وہی چاند جس سے سب محبت کرتے ہیں اور اسے محبوب سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن جب اسی چاند کو گرہن لگتا ہے تو اس گہنائے ہوئے چاند سے سب خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔

(تحریر: حُسام بٹ)

انتظار

ڈاکٹر ساجد امجد

دشمن اگر مجسم ہو تو انسان لڑ سکتا ہے مگر تقدیر... اس جیسا نہ دوست کوئی نہ دشمن کوئی۔ نہ نظر آئے نہ سانہ چھوڑے... نہ امید بنے نہ آس توڑے۔ وہ بھی اچھے دنوں کی آس لیے حسرتوں میں ڈھلتی رہی اور زندگی اپنے رنگ بدلتی رہی۔ ایک ایک لمحہ گنتے گنتے جب موسم نے چولا بدلا تو آنکھیں اس منظر میں اپنا کوئی بھی رنگ نہ تلاش کرسکیں۔ بس یہی غم کسی کی زندگی کا روگ بن گیا... انتظار، انتظار ہی رہ گیا حتیٰ کہ زندگی نے بھی روٹھ کر دروازہ بند کرلیا۔

امید و ناامیدی کے درمیان بے کیف لمحات کی
ازجرن کا دلگداز ماجرا

راشد نسیم ہمیشہ کا روگی اور ایک سرکاری دفتر میں کلرک تھا۔ اس کی نوکری محض اس لیے بچی ہوئی تھی کہ ملازمت سرکاری تھی۔ اگر نوکری پرائیویٹ ہوتی تو کب کا فارغ کردیا جاتا کیونکہ کوئی ادارہ اس کی طرف سے کی جانے والی چھٹیوں کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ڈاکٹروں کی نذر ہوجاتا تھا۔ اسی لیے گھر کا خرچ چلانے کے لیے تھوڑی بہت رشوت لے لینے کو وہ اپنا حق سمجھتا تھا۔ ویسے وہ نہایت نیک اور عام زندگی میں ایماندار تھا۔ اس کی شادی کو ابھی صرف دو سال ہوئے تھے۔ اولاد کوئی ہوئی نہیں تھی، کرائے کا گھر تھا۔ محدود آمدنی اور تھوڑی بہت رشوت سے گھر کا کرایہ نکالنے کے بعد اتنی ہی رقم باقی بچ جاتی تھی کہ بہ مشکل گزارہ ہو پاتا تھا۔ غریبوں کے رشتہ دار بھی غریب ہی ہوتے ہیں یا کم از کم اس کے ساتھ ایسا ہی تھا۔ اس کے یا اس کی بیوی کے خاندان میں کوئی ایسا نہیں تھا جو اس کی

مدد کر سکتا۔ بعض رشتہ دار جو نسبتاً فارغ البال تھے محض اس لیے اس سے نہیں ملتے تھے کہ وہ غریب ہے۔

مہینے کے آخری دنوں میں اسے اپنے مرحوم والدین بہت یاد آتے تھے۔ یہ یادیں خوشگوار نہیں تھیں۔ وہ سوچتا تھا اگر میرے والدین کم از کم ایک مکان ہی میرے لیے چھوڑ جاتے تو آج میں کرایہ دینے سے تو بچ جاتا پھر یہ سوچ کر اسے ہنسی آجاتی کہ مکان تو مکان دو چار بھائی بھی میرے لیے چھوڑ کر نہیں گئے کہ ہم سب مل کر ایک گھر بنا لیتے۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے مجھے لاڈ پیار تو بہت ملا لیکن اس لاڈ پیار سے زندگی تو نہیں گزرتی۔ وہ ایمانداری کی راہ پر چلے' اپنی آخرت سنوار لی لیکن میری دنیا تو خراب کر دی۔ میرے تابوت میں آخری کیل یہ ٹھونک دی کہ میری شادی بھی کرادی اور وہ بھی اپنے سے زیادہ غریب گھرانے میں۔ پیسے دھیلے کا آسرا وہاں سے بھی نہیں ہو سکتا۔ نوکری بھی دلائی تو ایسے محکمے میں جہاں لمبی رشوت کا آسرا بھی نہیں۔ پھر وہ اپنے قصور کا بھی جائزہ لیتا۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں کوئی اور نوکری ڈھونڈ لیتا۔ یہ میری کاہلی نہیں تو کیا ہے کہ اسی نوکری اور اسی تنخواہ میں گزارہ کر رہا ہوں۔ چاہتا تو اس بڑے شہر میں اور بہت سی نوکریاں ہیں۔ اپنی کاہلی کا جواز بھی وہ ماں باپ کی محبت ہی میں ڈھونڈ لیتا تھا۔ انہوں نے مجھے اتنی محبت دی کہ اٹھ کر پانی تک نہیں پینے دیا۔ مجھے محنت کا عادی بناتے تو میں کچھ کرتا۔

اس کی بیوی فرحت غریب گھر کی لڑکی تھی اور پھر ایسی گھریلو ناچاقیوں میں گھری ہوئی تھی کہ اکیلی رہ گئی تھی لہٰذا بڑی خوش اسلوبی سے گزر بسر کر رہی تھی۔ اسے اگر دکھ تھا تو یہ کہ شادی کے دو سال بعد بھی اس کی کوکھ خالی تھی۔ شوہر کے دفتر چلے جانے کے بعد وہ بالکل اکیلی رہ جاتی تھی۔ سوچتی تھی اگر اس کی گود میں ننھا کھلونا ہوتا تو اس کی تنہائی دور ہو جاتی۔ اس کے ساتھ کھیلتی، اس سے باتیں کرتی۔ پھر یہ سوچ کر دہل سی جاتی کہ وہ اپنی ماں کی شادی کے دس سال بعد پیدا ہوئی تھی۔ یہ کہانی کہیں اس کے ساتھ بھی تو نہیں دہرائی جائے گی۔ سوچتے سوچتے جب تھک جاتی تو نماز کے لیے کھڑی ہو جاتی کہ اولاد دینے والی وہی ذات ہے۔ اسی سے مانگنا چاہیے۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اس کی دعاؤں اور فکر میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایک سال اور گزر گیا تو راشد بھی اپنی زندگی کو خالی برتن سے تعبیر کرنے لگا۔ دونوں میاں بیوی خالی برتن بنے ہوئے تھے لہٰذا ٹکرانا لازمی تھا۔ دونوں میں چھوٹے چھوٹے جھگڑے ہونے لگے تھے۔ راشد نیم کھانسی کے وقفوں کے دوران اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا تو فرحت اولاد کے طعنے دے کر اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیتی۔

عورت پر روپ تو اولاد ہونے کے بعد آتا ہے۔ اولاد کے بغیر تو عورت بنجر زمین کی طرح ہوتی ہے۔ جگہ جگہ سے چٹخی ہوئی۔ دراڑیں پڑی ہوئی۔ بے آب، بے رونق، فرحت کا حال بھی یہی ہو گیا تھا۔ راشد مرد ہونے کے باوجود پیروں فقیروں کے پاس جانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ فرحت یہ سوچ کر کانپ جاتی کہ راشد کہیں دوسری شادی نہ کر لے۔

شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے اور ان کا آنگن سونا تھا۔

فرحت تقریباً مایوس ہو چکی تھی کہ قدرت کو اس پر رحم آگیا۔ وہ امید سے ہوئی تو بیمار راشد کی رگوں میں بھی توانائی سی آگئی۔ مذہب کی طرف اس کا رجحان بڑھ گیا۔ قریب ہی مسجد تھی۔ وہ باقاعدگی سے نماز پڑھنے لگا۔ انہی دنوں پلاٹوں کی ایک اسکیم نکلی۔ اس نے بھی فارم بھر دیا۔ ایک پلاٹ اس کے نام نکل آیا۔ اسے بھی اس نے خدا کا ایک انعام سمجھا۔ زمین ہو تو مکان کبھی نہ کبھی بن ہی جاتا ہے، اس نے سوچا۔

اب اسی محدود تنخواہ میں اسے پلاٹ کی قسطیں بھی ادا کرنی تھیں لیکن اپنے مکان کا خواب ایسا تھا کہ فرحت نے بھی اس کا ساتھ دینے کا عزم کیا۔ گھر میں ایک اور جان کا اضافہ ہونے والا تھا لیکن فرحت نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ روکھی سوکھی کھا لے گی لیکن پلاٹ کی قسط باقاعدگی سے ادا کرے گی۔

پیدائش کے آخری مہینوں میں دونوں کے درمیان بحث ہونے لگی تھی۔ فرحت کو لڑکیاں پسند تھیں اس لیے اس کا خیال تھا لڑکی ہوگی۔ راشد چاہتا تھا لڑکا ہو۔ ”لڑکا ہوگا تو میرے ریٹائر ہونے تک کمانے کے قابل ہو جائے گا۔ میرا سہارا بنے گا۔“

”یہ کیوں نہیں سوچتے کہ پہلے بیٹی ہوئی تو آپ اپنی ریٹائرمنٹ سے پہلے اس کی شادی کر سکیں گے۔ بیٹی پہلی ہونی چاہیے لڑکے تو کسی نہ کسی طرح پل ہی جاتے ہیں۔“

آج کل وہ زمانہ نہیں ہے کہ لڑکوں کو کسی نہ کسی طرح پال لیا جائے۔ اس کی تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ میں نوکری پر رہوں۔“

”اللہ سب کا پالنے والا ہے۔ ہم اور تم کیا پالیں گے۔“

”جب تمہارا ایمان یہ ہے تو بیٹے اور بیٹی کے لیے بحث کیوں کرتی ہو؟“

”میں اللہ کے کاموں میں دخل تھوڑی دے رہی

ہوں۔ میں تو اپنی خواہش کا اظہار کر رہی ہوں۔ باقی ان کی مرضی۔ جو دے گا مجھے قبول۔"

"میں بھی تو اپنی خواہش ہی کا اظہار کر رہا ہوں۔"

"دیکھو اللہ کس کی تمنا پوری کرتا ہے۔"

آخر وہ دن آ گیا۔ اللہ نے راشد کی سن لی۔ فرحت نے بیٹے کو جنم دیا۔ راشد نے نام پہلے ہی طے کر لیا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام سلیم راشد رکھا۔

یہ بچہ صورت شکل میں بالکل اپنے باپ کی تصویر تھا۔ کمزور بھی اسی کی طرح تھا۔ پیدائش کے ایک مہینے بعد ہی اسے سخت نمونیہ ہو گیا۔ پسلیاں چلنے لگیں۔ ایک مہینے کی جان ہی کتنی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھوں میں آ گیا۔ شادی کے پانچ سال بعد ہوا تھا۔ منتوں مرادوں سے ہوا تھا۔ فرحت کا تو رو رو کر برا حال ہو گیا۔

خاندان میں کئی گھر ایسے تھے جن سے سلیم کی پیدائش کے بعد تعلقات بحال ہو گئے تھے۔ انہوں نے سنا تو دوڑے چلے آئے۔ فرحت کی کچھ ڈھارس بندھی۔ ساتھ دینے والے ہوں تو آدمی اپنا غم بھول جاتا ہے۔ کچھ لوگوں نے مالی مدد بھی کی۔ سلیم کو اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ اس کے ساتھ فرحت کو بھی رکنا تھا۔

راشد نسیم پر یہ دن بہت بھاری تھے۔ نوکری بھی کرنی تھی، گھر بھی دیکھنا تھا اور اسپتال کے چکر بھی کاٹنے تھے۔ وہ بڑی پامردی سے ان محاذوں پر لڑ رہا تھا لیکن جن پر تکیہ ہو اگر وہی پتے ہوا دینے لگیں تو آدمی کہاں جائے۔ ایک دن وہ اسپتال گیا تو اس نے فرحت کو ایک رشتے دار کے سامنے یہ کہتے سنا۔

"مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے راشد کی تمام بیماریاں اس بچے میں منتقل ہو گئی ہیں۔ باپ صحت مند ہو تو بچے بھی صحت مند ہوتے ہیں۔ شادی سے پہلے بھی راشد کے بدن میں کئی بیماریاں پل رہی تھیں۔ میری ماں نے نہ جانے کیا دیکھ کر میری شادی ان سے کر دی۔ خود تو مر کے چلی گئیں اب میرے بچے بھی ان بیماریوں سے لڑتے رہیں گے۔"

راشد نے اس کے بعد کچھ سننے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ الٹے قدموں لوٹ آیا لیکن گھر جانے کے بجائے ایک پارک میں جا کر بیٹھ گیا۔ ہوا بند تھی لیکن لگتا تھا وہ آندھیوں کے درمیان بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا نرم و نازک بدن ہچکولے کھا رہا تھا۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔ فرحت سے مجھے یہ امید نہیں تھی۔ وہ رشتے دار جو آج سے پہلے اسے منہ نہیں لگاتے تھے اور اس کی زبان پر ہر وقت ان کی برائیاں رہتی تھیں، آج وہ اتنے عزیز ہو گئے کہ ان سے میری برائیاں کر رہی تھی۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ میری وجہ سے میرا بیٹا بیمار ہوا ہے۔ جتنے بچے اسپتال میں داخل ہیں کیا ان سب کے باپ بیمار ہیں۔ اگر یہ سچ بھی ہے تو وہ دوسروں کے سامنے تو نہ کہے۔ جب اپنے کہیں گے تو دوسروں کی بھی ہمت ہو گی۔ میرے بچے زندگی بھر طعنے سنیں گے کہ ان کے باپ کی بیماریاں انہیں ورثے میں ملی ہیں۔

اس نے ایک مرتبہ پھر ہمت کی کہ وہ اسپتال جا کر اپنے بچے کو دیکھ آئے لیکن ابھی غصہ ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ پارک سے اٹھا اور گھر پہنچ گیا۔ فرحت کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ اب بھی اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ گھر میں تنہائی تھی۔ سوچوں نے اپنے پاؤں پھر دراز کر لیے مگر اب ان سوچوں کا رخ تبدیل ہو گیا تھا۔ اب اسے اپنی بیوی درست نظر آ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا بعض بیماریاں واقعی ایسی ہوتی ہیں جو بچے کو ورثے میں ملتی ہیں۔ میرے بچے ان بیماریوں کا شکار ہوتے رہیں گے۔ ان کے کمزور ہاتھ مشکلوں کی چٹانیں کاٹنے سے قاصر رہیں گے، اس سے بہتر ہے وہ دنیا میں آنا ہی چھوڑ دیں۔

دوسرے دن وہ ایک کلینک میں بیٹھا ہوا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب میں چاہتا ہوں میرے ہاں اب کوئی اولاد نہ ہو۔"

"فیملی پلاننگ کے کئی طریقے ہیں جنہیں استعمال کر کے آپ بچوں کی پیدائش میں وقفہ دے سکتے ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"یہ سب عارضی طریقے ہوتے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ میں کوئی مستقل حل چاہتا ہوں۔ میری بیوی بھی بیمار رہتی ہے۔ میری آمدنی بھی اتنی نہیں کہ زیادہ بچوں کا بوجھ اٹھا سکوں۔"

"کتنے بچے ہیں آپ کے۔"

"پانچ۔" راشد نے کچھ سوچ کر جھوٹ بولا۔

"ایک معمولی سا آپریشن ہو گا آپ کا۔ اس کے بعد آپ بچے پیدا کرنے کے لائق نہیں رہیں گے۔"

"میں تیار ہوں آپ آپریشن کر دیں۔"

"اس کے لیے آپ کو اسپتال آنا پڑے گا جہاں میں جاب کرتا ہوں۔ کلینک پر اس کا انتظام نہیں۔"

"کہیے کب آ جاؤں؟"

"کل ٹھیک نو بجے پہنچ جایئے گا۔ میں آپ کو وہیں ملوں گا۔"

"ڈاکٹر صاحب، ابھی کچھ نہیں ہو سکتا۔"

''آپ کو اتنی جلدی کیوں ہے؟''

''کہیں رات بھر میں میرا ارادہ نہ بدل جائے۔''

''اسی لیے میں آپ کو مشورہ دے رہا ہوں کہ عارضی طریقہ ہی استعمال کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں آپ پچھتائیں۔ ایک مرتبہ آپریشن ہو گیا تو پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔''

''نہیں، میں عارضی طریقے کا قائل نہیں۔ میں کل صبح اسپتال پہنچ جاؤں گا۔''

وہ جان بوجھ کر فرحت اور اپنے بچے سے ملنے اسپتال نہیں گیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں فرحت کو دیکھ کر اس کا ارادہ نہ بدل جائے۔ فرحت کو بیٹی کی آرزو ہے لیکن اب وہ بھی بیٹی کی ماں نہیں بن سکے گی۔ وہ ایک مرتبہ پھر سوچنے لگا۔ وہ نادانستگی میں فرحت کے حق پر ڈاکا تو نہیں ڈال رہا ہے۔ کسی جرم کا مرتکب تو نہیں ہو رہا ہے۔ نہیں، اس نے پھر خود کو تسلی دی۔ اگر سلیم کی طرح وہ لڑکی بھی امراض میں گھری ہوئی پیدا ہوئی تو فرحت کو کتنا دکھ ہوگا۔ لڑکے تو کسی نہ کسی طرح چل ہی جاتے ہیں۔ ہمیشہ کی بیمار لڑکی سے شادی کون کرے گا۔ فرحت کے حق میں یہی بہتر ہے کہ وہ لڑکی پیدا نہ کرے۔

یہ دلیل اتنی مضبوط تھی کہ اسے قائل ہونا پڑا۔

وہ اسپتال پہنچ گیا۔ آپریشن واقعی بہت معمولی تھا۔ ایک گھنٹے سے بھی کم مدت میں اس کی نس بندی کر دی گئی اور وہ گھر آ گیا۔ کچھ دن اسے احتیاطاً آرام کرنا تھا اور بس۔

آرام کا موقع اسے خود بخود مل گیا۔ اسی دن سلیم کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا اور فرحت اسے لے کر گھر آ گئی۔ دیکھا تو اس کا شوہر بستر پر دراز تھا۔ فرحت نے اس کی خیریت دریافت کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ یہ تو ہر وقت کے بیمار ہیں کوئی کب تک پوچھتا رہے۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی اور سلیم کو اچھی طرح روئی کے گدوں میں ڈھانپ کر نسیم کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''کیسا ہے سلیم؟''

''ابھی تو وہ ٹھیک ہو گیا ہے لیکن ڈاکٹر کہتے ہیں کہ بچہ اتنا کمزور ہے کہ اسے پھر اٹیک ہو سکتا ہے۔ سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہ سردیاں اس پر بہت بھاری ہوں گی۔''

''کمزوری ہے اور کچھ نہیں۔ میں کسی اچھے ڈاکٹر سے ٹانک لکھوا لوں گا۔ پھر ہمارا سلیم بالکل تندرست ہو جائے گا۔''

''صرف کمزور نہیں ہے۔ کئی پیدائشی بیماریاں ہیں جو اسے زندگی بھر بیمار رکھیں گی۔''

''تمہارے دودھ میں تو کوئی خرابی نہیں۔ اکثر بچے اس لیے بھی بیمار ہو جاتے ہیں کہ انہیں دودھ راس نہیں آتا۔''

''میرے دودھ میں نہیں میری قسمت میں خرابی ہے جو تم سے شادی ہو گئی۔ تم ہر وقت کے بیمار ہو، اولاد کیسے تندرست ہو گی۔''

''فرحت! ذرا سوچو۔ بیماری میرے اختیار میں تھوڑی ہے۔ علاج کراتا تو رہتا ہوں۔ تمہارا یہ رویہ تو مجھے اور بیمار ڈال دے گا۔''

''پندرہ دن بعد اسپتال سے آئی تو میاں بستر پر پڑے ہیں اور پھر کچھ کہوں بھی نہیں۔''

''میں نے دفتر سے دو دن کی چھٹی لے لی ہے۔ دو دن آرام کروں گا۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

''کتنے دن کے لیے؟''

بچے کے رونے کی آواز کانوں میں آئی تو وہ گفتگو ادھوری چھوڑ کر اٹھ گئی۔ اس کے چلے جانے کے بعد راشد کو اپنے فیصلے کی درستگی کا مزید احساس ہونے لگا۔ فرحت ٹھیک ہی کہتی ہے۔ جتنے بچے ہوتے کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا ہوتے۔ اب وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔ رفتہ رفتہ فرحت کا غصہ بھی اتر جائے گا۔ ایک بیمار بچہ ہے اسے مزید کی زحمت اٹھانی نہیں پڑے گی۔

دو دن کے آرام کے بعد اس نے دفتر جانا شروع کر دیا۔ زندگی معمول پر آنے لگی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ فرحت کے رویے میں بھی اب تبدیلی آنے لگی ہے۔

اس نے خود کو صحت مند ثابت کرنے کے لیے ایک جگہ پارٹ ٹائم کام کر لیا۔ اب وہ صبح گھر سے نکلتا اور رات میں گھر میں گھستا تھا۔ فرحت اس کی غیر حاضری سے بہت خوش تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ واقعی اس سے بے زار ہو گئی تھی بلکہ اس لیے کہ اب اسے اپنے شوہر کے صحت مند ہونے کا یقین ہونے لگا تھا اور اس لیے بھی کہ آمدنی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

ایک دو مہینے گزرے تھے کہ سلیم پھر بیمار پڑ گیا۔ دوا دارو پھر شروع ہو گئی۔ راشد کے پاس تو اب وقت ہی نہیں تھا فرحت ہی ڈاکٹروں کے پاس لے کر بھاگ رہی تھی۔ پھر کسی حکیم نے نہایت بدبودار تیل دے دیا کہ بچے کے سینے پر ملتی رہو۔ رات کو راشد آیا تو پورے گھر میں تیل کی مہک بلکہ بدبو پھیلی ہوئی تھی۔

''یہ بدبو کیسی ہے؟''

''سلیم کے سینے پر ملنے کے لیے تیل لائی تھی۔ اس کی بدبو ہے۔''

''یہ تو بہت ناگوار ہے۔ گھر میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔''

''بیمار باپ کی بیمار اولاد کو پالنے کے لیے بہت کچھ

کرنا پڑتا ہے۔" فرحت نے کہا اور اس کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی۔ یہ بدبو کتنے ہی دن تک گھر کا حصہ بنی رہی۔

سخت محنت نے راشد کی صحت پر بھی برے اثرات مرتب کیے تھے لیکن وہ برابر دونوں نوکریاں کیے جا رہا تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ سلیم ایک سال کا ہو گیا تھا لیکن چھ مہینے سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ گھٹنوں تک چلنے کی ہمت نہیں تھی۔ چوبیس گھنٹے تیل میں بھیگا رہتا تھا۔ بساند ایسی تھی کہ گھر میں بس گئی تھی۔ راشد بھی اسے اٹھانا بھی چاہتا تو گھبرا کر چھوڑ دیتا تھا۔ یہ فرحت ہی کی ہمت تھی کہ اسے سنبھالے ہوئے تھی۔ طرح طرح کے ٹانک میز پر سجے رہتے تھے۔ اس عمر کے بچے تو کھلونوں سے کھیلتے ہیں اسے دواؤں سے فرصت نہیں تھی۔

فرحت کے دل میں اب بیٹی کی آرزو مچلنے لگی تھی۔ اپنی ممتا کی تسلی کے لیے سلیم کو اس نے سلیمہ بنا دیا تھا۔ کبھی کبھی لڑکیوں کے کپڑے پہنا کر اس کے ساتھ کھیلتی رہتی تھی۔ اس کے ننھے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی تہیں جما کر خوش ہوتی تھی۔ وہ تو قدرتی طور پر اس کے بال کم تھے ورنہ دو پونیاں بھی باندھ دیتی۔ سلیم کو اس کی ان حرکتوں پر غصہ آنے لگا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ نرمی سے سمجھایا اور پھر اس کے گھر سے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ "کیوں اس غریب کے مستقبل کو خراب کرنے پر تلی ہوئی ہو۔"

"اس میں مستقبل کی بات کہاں سے آ گئی؟"

"خدا نے اسے لڑکا بنا کر بھیجا ہے۔ تم اسے لڑکی بنانے پر تل گئی ہو۔ اسی کو تربیت کہتے ہیں۔ جب یہ بڑا ہو کر لڑکیوں والی ادائیں دکھائے گا تو تمہیں برا لگے گا۔"

"مجھے بیٹی کی آرزو تھی۔ میں تو اپنا شوق پورا کر رہی ہوں۔"

"انتظار کرو۔ شاید بیٹی بھی ہو جائے۔"

"جب ہو گی تب دیکھا جائے گا۔"

"میں آج سے اسے لڑکیوں کے لباس میں نہ دیکھوں۔"

اس جھڑپ کے بعد فرحت بھی سوچنے لگی تھی کہ لڑکے کو لڑکی بنانے سے کیا فائدہ۔ مجھے تو چاہیے اللہ سے لڑکی مانگوں۔ جس طرح اللہ نے میری سنی اور بیٹا دے دیا اسی طرح بیٹی بھی دے دے گا۔ اس کے خزانے میں کیا کمی ہے۔

"راشد! اللہ نے ہمیں بیٹا دے دیا اب ایک بیٹی بھی دے دے تو فیملی مکمل ہو جائے۔"

"وہ ہمارے حق میں جو بہتر سمجھے گا کرے گا۔"

"راشد سچ بتاؤ کیا تمہیں بیٹی اچھی نہیں لگتی؟"

"بیٹیاں تو خدا کی رحمت ہوتی ہیں لیکن سوچتا ہوں وہ بھی سلیم کی طرح بیمار پیدا ہوئی تو دو دو بچوں کو تمہارے لیے سنبھالنا کتنا مشکل ہو جائے گا۔"

"میں نے سلیم کی دفعہ صرف یہ دعا مانگی تھی کہ مجھے بیٹا دے۔ اس مرتبہ خدا سے کہوں گی بیٹی دے اور صحت مند دے۔ میرا خدا میری مراد ضرور پوری کرے گا۔"

اس دن کے بعد سے وہ دیکھ رہا تھا کہ فرحت پابندی سے نمازیں پڑھ رہی تھی۔ سجدہ ریز ہو کر دیر تک دعائیں مانگتی تھی۔ اسے ہاتھ پھیلائے دیکھ کر راشد کے دل پر گھونسے برسنے لگتے تھے۔ اسے کیا معلوم کہ اب میں باپ نہیں بن سکتا۔ ایک دن یہ سوچ کر وہ کانپ اٹھا کہ سلیم بیمار رہتا ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں دوسرا بیٹا کہاں سے لاؤں گا۔ اب اسے احساس ہونے لگا تھا کہ وہ کیا نادانی کر بیٹھا ہے۔ اب پچھتانے کے سوا وہ کیا کر سکتا تھا۔ وہ خود کو فرحت کا مجرم سمجھنے لگا تھا۔ وہ اسے کبھی بیٹی نہیں دے سکتا۔ یہ احساس اسے مارے ڈال رہا تھا۔

بیماریوں سے تو وہ لڑ ہی رہا تھا لیکن اس احساس جرم نے اسے اندر ہی اندر گھلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ بیوی کو دعائیں مانگتے گڑگڑاتا دیکھتا تو اس کے دل پر چھریاں چلنے لگتی تھیں۔ اب وہ فرحت کے ساتھ ساتھ خود کو خدا کا بھی گناہ گار سمجھنے لگا تھا۔ میں نے وہ پیڑ ہی کاٹ دیا جس پر پھل آ سکتے تھے۔ فرحت کی بہن کبھی کبھی آ جاتی تھی۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ انہیں دیکھ کر فرحت کا جو حال ہوتا تھا وہ دیدنی تھا۔ جب تک وہ بچیاں وہاں رہتیں فرحت ان کی خاطر داری میں لگی رہتی۔ ان کے جانے کے بعد اس کی اداسی بھی دیدنی ہوتی تھی۔ اب تو راشد کو یہ شک ہونے لگا تھا کہ اس کی بیوی اس غم میں کہیں پاگل نہ ہو جائے کہ اس کی کوئی بیٹی نہیں ہے۔

☆☆☆

وہ شہر کی ہماہمی سے دور ایک مضافاتی بستی سے کم از کم آٹھ نو کلومیٹر دور ایک چٹیل میدان تھا۔ اس میدان میں چند گھر تعمیر ہو چکے تھے کچھ ہو رہے تھے۔ ایک دو مکان آباد بھی ہو گئے تھے۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ یہاں جتنے لوگ بھی آباد ہو گئے ہیں، ضروریات زندگی کے حصول کے لیے شہر تک کیسے پہنچتے ہوں گے۔ ہر طرف مردنی چھائی ہوئی تھی۔ زندگی کے آثار تک نہیں تھے۔ قریب ہی ریلوے لائن گزرتی تھی۔ یہاں سے ریلیں گزرتی ضرور تھیں لیکن انہیں بھی یہاں رکنا گوارا نہیں تھا۔ ابھی کوئی ٹرانسپورٹ بھی یہاں تک نہیں پہنچی تھی۔

سناٹے اور دھوپ کی اس چھتری تلے دسترخوان کی طرح بچھے ہوئے میدان میں راشد کا پلاٹ تھا جس کی قسطیں ادا ہو چکی تھیں اور اب وہ اس کے نام تھا۔ وہ اپنا پلاٹ دیکھنے ہی اپنے چند دوستوں کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ ایک دوست کے پاس گاڑی تھی ورنہ وہ شاید راستے ہی سے لوٹ جاتا۔

''میری جان، یہاں تو تم اگلے دس برسوں تک رہنے کا خواب نہیں دیکھ سکتے۔''

''دو چار گھر جو آباد ہیں وہ بھی تو رہ ہی رہے ہیں۔''

''یہ لوگ واقعی مجاہد ہیں۔ تم اتنے بڑے مجاہد ہو نہیں۔''

''یار، میری صحت اس قابل نہیں ورنہ میں یہاں رہ کر دکھا دیتا۔''

''ایک بات ہے اگر یہاں رہ سکو تو آکسیجن فری کی ملے گی۔ نہ دھواں، نہ شور نہ غل۔ ایک مرتبہ گھر پہنچ جاؤ تو پھر آرام ہی آرام۔''

راشد وہاں سے آیا تو اس خوشی سے سرشار تھا کہ اگر وہ ذرا ہمت کرلے تو اپنا گھر ہو سکتا ہے۔ کرائے کی لعنت سے نجات مل جائے گی۔ وہ کئی دن تک مکان کی تعمیر کے منصوبے بناتا رہا۔ مکان تعمیر ہونے میں سال ڈیڑھ سال تو لگ ہی جائے گا۔ اس وقت تک مزید آبادی ہو جائے گی۔ اس نے فرحت سے بھی مشورہ کیا۔ اس کی رائے بھی یہی تھی کہ مکان تو بنوا لیا جائے۔ اگر نہیں بھی رہ سکے تو مکان کرائے پر دے دیں گے۔

اس کا ایک دوست ہاؤس بلڈنگ میں تھا۔ اس کے ذریعے اس نے مکان کی تعمیر کے لیے قرض لیا اور تعمیر شروع کرادی۔ اسے دوسرے تیسرے دن نگرانی کے لیے پلاٹ پر جانا پڑ رہا تھا۔ اس نے اپنے جی پی فنڈ سے پیسے نکلوائے اور ایک موٹر سائیکل خرید لی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ یہ خیال اسے پہلے کیوں نہیں آیا۔ بے چاری فرحت کو لے کر بسوں میں دھکے کھاتا رہا۔ موٹر سائیکل ہوتی تو کتنی سہولت ہو جاتی۔ شادی کے ابتدائی دن یونہی گزر گئے نہ کہیں گھومے نہ پھرے۔

اس کا مکان تیزی سے تعمیر ہو رہا تھا۔ قرض اتنا نہیں ملا تھا کہ کوئی شاندار تعمیر ہو سکتی۔ اس نے جان بوجھ کر قرض کم لیا تھا کہ کون قسطیں اتارتا پھرے گا۔ تین کمرے بن گئے۔ باؤنڈری کھینچ کر صحن نکل آیا۔ کچھ رقم بچ گئی جو اس نے اپنے پاس رکھ لی۔

چھ مہینے میں مکان مکمل ہو گیا۔

مکان مکمل ہونے کے بعد دونوں میاں بیوی یہ سوچنے بیٹھ گئے کہ شفٹ ہوا جائے یا مکان کرائے پر دے دیا جائے۔ کرائے پر دینے میں ایک قباحت تھی۔ شہر سے اتنی دور تھا کہ کرایہ داروں کی نگرانی نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہ ڈر لگ رہا تھا کہ کوئی قبضہ ہی نہ کرلے۔ کرایہ بھی وہاں اتنا کم مل رہا تھا کہ کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کم از کم اتنا کرایہ تو ملتا کہ کچھ پیسے ملا کر وہاں کا کرایہ ادا ہو جاتا جہاں وہ اب رہ رہا تھا۔ فرحت نے یہی مشورہ دیا کہ ہم خود وہاں جا کر رہ لیتے ہیں۔ اس مکان کا کرایہ بھی بچے گا۔ موٹر سائیکل تو آہی گئی ہے۔ دفتر آنے جانے میں دشواری نہیں ہوگی۔ واپسی میں گھر کا سودا سلف بھی لیتے آیا کرنا۔

''سلیم آئے دن بیمار رہتا ہے۔ اس کی دوا دارو کا کیا ہوگا؟'' راشد نے کہا۔

''وہ تو تم بھی رہتے ہو۔ جس طرح اپنا علاج کراؤ گے اس کا بھی کرا لینا۔ اب تو میری بہن سے بھی میرے تعلقات اچھے ہو گئے ہیں۔ کبھی ڈاکٹر کو دکھانا ہوا کرے گا تو تمہارے ساتھ آجایا کروں گی۔ ڈاکٹر کو دکھانے کے بعد نزہت کے گھر بیٹھ جایا کروں گی۔''

دونوں نے خوب اچھی طرح سوچنے کے بعد مکان شفٹ کرلیا اور اس ویرانے میں جا کر رہنے لگے۔ لائٹ بھی آگئی تھی، گیس بھی تھی صرف تنہائی تھی۔ آس پڑوس میں کوئی نہیں تھا۔ سلیم اب پانچ سال کا ہو گیا تھا۔ خشک چہرہ، آنکھیں زرد، ہاتھ پاؤں دبلے، پیٹ پھولا ہوا۔ ماں نے بیمار سمجھ کر بستر سے ہلنے نہیں دیا تھا۔ وہ چلنے لگا تھا لیکن بچوں جیسی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ بھاگنے دوڑنے کی نہ اسے اجازت تھی نہ اسے شوق تھا۔ سست اور کاہل ہو کر رہ گیا تھا۔ ماں کی بے جا ممتا اور لاڈ پیار نے اسے مٹی کا بت بنا دیا تھا۔ وہ اٹھ کر پانی بھی پینا چاہتا تو ماں اسے ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیتی اور خود پانی لا کر پلا دیتی۔ کچھ دنوں میں یہ اس کی عادت بن گئی۔ اسے نیچے گری ہوئی کوئی چیز بھی اٹھانی ہوتی تو ماں کو آواز دیتا۔ اس کی ہڈیاں جیسے جم سی گئی تھیں۔

راشد کے مکان کے برابر والا پلاٹ خالی پڑا تھا۔ اس نے پلاٹ کے مالک کو تلاش کیا اور اس سے یہ اجازت لے لی کہ جب تک پلاٹ خالی پڑا ہے وہ وہاں گارڈننگ کرلے۔ اس کے پلاٹ کی حفاظت بھی ہو جائے گی اور راشد کا شوق بھی پورا ہو جائے گا۔ مالک مکان کوئی شریف آدمی تھا۔ اس نے اجازت دے دی۔ راشد نے اپنے ہاتھ سے کیاریاں کھودیں اور پھولوں کے چھوٹے چھوٹے پودے لگائے۔ کچھ حصے میں گھاس بھی لگالی۔ اپنے مکان سے

ایک دروازہ اس پلاٹ کی طرف کھول دیا۔

اس کے نئے باغیچے میں دن بھر تو دھوپ پہرا دیتی تھی۔ رات کو دونوں میاں بیوی وہاں بیٹھتے تھے۔ سلیم بھی ان پھولوں میں مگن کھیلتا رہتا تھا۔

فرحت کے دل میں ایک مرتبہ پھر ہوک اٹھنے لگی تھی کہ اب مکان بھی اچھا مل گیا ہے۔ گھومنے پھرنے کے لیے باغیچہ بھی میسر آ گیا ہے۔ اللہ بس ایک بیٹی اور دے دے۔ پانچ سال بعد بیٹا ہوا تھا۔ اب پانچ سال اور گزر گئے ہیں۔ ایک بیٹی مل جائے۔ چند سالوں بعد وہ میرا ہاتھ بٹانے کے قابل ہو جائے گی۔ ایک بہن مل جائے گی تو سلیم کا دل بھی بہل جائے گا۔

راشد ایک مرتبہ پھر امتحان میں پڑ گیا تھا۔ اس کی بیوی دن رات ایک بیٹی کی خواہش کرتی رہتی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کا شوہر کیا کر بیٹھا ہے۔ وہ اب بھی باپ نہیں بن سکتا۔ راشد نے اپنے اس گناہ کی معافی مانگنے کے لیے ڈاڑھی رکھ لی۔ ہر نماز میں توبہ کرتا تھا۔ دعا مانگتا تھا کہ اللہ اس کے گناہ کو معاف کر دے۔

فرحت کا بھی یہی حال تھا۔ راشد کی جب بھی آنکھ کھلتی تھی وہ فرحت کو سجدے میں گرا ہوا دیکھتا تھا۔ وہ گڑگڑا کر دعا مانگ رہی ہوتی۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ کیا دعا مانگ رہی ہوگی۔

☆☆☆

راشد کئی دن سے دیکھ رہا تھا کہ فرحت اس سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اس کا موڈ بہت خوشگوار تھا اس لیے یہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کوئی بری خبر ہوگی لیکن کوئی خبر تھی ضرور۔ راشد پوچھ سکتا تھا لیکن وہ چاہتا تھا فرحت خود اسے بتائے۔

اس روز دفتر سے نکلنے کے بعد وہ ایک دوست کی طرف چلا گیا تھا۔ واپسی میں گھر پہنچتے پہنچتے اچھی خاصی دیر ہو گئی تھی۔ اس علاقے میں ابھی آبادی اتنی نہیں ہوئی تھی کہ رونقیں راستے میں کھڑی ہوں۔ پھر بھی کچھ گھر آباد ہو گئے تھے۔ اس کے مکان کے سامنے بھی لوگ آ گئے تھے۔ دو تین گھر چھوڑ کر کچھ لوگ کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ اس نے دروازے میں چابی گھمائی۔ موٹر سائیکل پارک کی۔ آواز سن کر فرحت بھی دروازے پر آ گئی تھی۔

''آج بہت دیر کر دی؟''

''ایک دوست کی طرف چلا گیا تھا۔ تمہیں ڈر تو نہیں لگا؟''

''ڈرنے کی کیا بات ہے۔ سلیم ابھی ابھی سویا ہے۔ اس سے باتیں کر رہی تھی۔ اب تو ارد گرد آبادی بھی ہو گئی ہے۔ اب مجھے ڈر نہیں لگتا۔'' فرحت نے کہا اور اس کے لیے کھانا نکالنے چلی گئی۔

راشد کھانے سے فارغ ہوا اور سگریٹ جلا کر بستر پر لیٹا تو فرحت اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ''آپ سے ایک بات پوچھوں؟''

''تم تو اس طرح اجازت لے رہی ہو جیسے میں کوئی غیر ہوں۔''

''آپ کو بیٹیاں پسند نہیں ہیں نا..؟''

''یہ کس نے کہہ دیا۔''

''سلیم کی دفعہ آپ مجھ سے کتنا جھگڑے تھے کہ بیٹا ہونا چاہیے۔ مجھے بیٹی کی آرزو تھی۔ میں آپ کو یہ بتا رہی تھی کہ اللہ نے میری سن لی ہے۔ آپ کے لیے خوش خبری ہے، میں امید سے ہوں اور مجھے اللہ کی ذات سے امید ہے کہ اس مرتبہ بیٹی ہوگی۔''

راشد اس طرح تڑپ کر اٹھ گیا جیسے فرحت نے کسی عزیز کے مرنے کی خبر سنا دی ہو۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے، میرا مطلب ہے یہ تم یقین سے کہہ رہی ہو؟''

''یہ بھی آپ نے خوب کہی۔ مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔''

''دھوکا بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''ہو سکتا ہے اس مرتبہ بھی بیٹا ہو۔ اب تو آپ خوش ہو جائیں۔''

''بات بیٹے یا بیٹی کی نہیں ہے۔ یہ سب ہو کیسے گیا۔ ناممکن۔ ناممکن۔'' آخری الفاظ اس نے آہستگی سے ادا کیے تھے لیکن فرحت کے کانوں تک پہنچ گئے۔

''میری عمر کیا اتنی ہو گئی ہے کہ آپ کو ناممکن نظر آ رہا ہے؟''

''ارے نہیں۔ میں تو مایوس ہو گیا تھا۔ میرا وہم یہ تھا کہ میرا ابھی کوئی بھائی یا بہن نہیں تھی سلیم بھی اس سے محروم ہی رہے گا۔''

''اللہ کی ذات سے مایوس نہیں ہوتے۔ مجھے ایک کھلونا اور چاہیے تھا اللہ مجھے دے رہا ہے۔ اگلے مہینے کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس مجھے لے جانا۔ آپ کو اور تسلی ہو جائے گی۔''

راشد کے پاس اب کہنے کے لیے ایک لفظ بھی نہیں تھا۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا رہا۔ فرحت کچھ دیر اس کی بدلتی ہوئی حالت کو دیکھتی رہی اور پھر اپنے بستر پر آ گئی۔

''یہ کیسا آدمی ہے۔ خوشی اور غم کے احساس سے

عاری۔ میں پانچ سال بعد اسے کوئی خوش خبری دے رہی تھی' کوئی اور ہوتا تو خوشی سے جھوم اٹھتا۔ اعلان کرتا کہ کل سے تم کوئی کام نہیں کرو گی۔ میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ انہیں بیٹیاں پسند ہی نہیں۔ اسی لیے بیٹی کا سن کر اداس پڑ گئی۔"

راشد کی سوچیں زیادہ تکلیف دہ تھیں۔

"میں نے تو نس بندی کرائی تھی۔ ڈاکٹر کہتا تھا اب میرے ہاں اولاد نہیں ہو سکتی۔ پھر یہ عورت خوش خبری کیسے سنا رہی ہے؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "اولاد کے لیے اس نے کہیں کوئی غلط قدم تو نہیں اٹھا لیا۔ اپنی بہن کے گھر یہ بہت جانے لگی ہے۔ ایک آدھ دن کے لیے وہاں رک بھی جاتی ہے۔ کہیں وہاں کوئی ایسا آدمی تو نہیں جس کے کہنے میں وہ آ گئی ہو۔ اف میرے خدا! اب میں اس کی چوری کیسے پکڑوں؟ اگر یہ کہتا ہوں کہ میں نے "نس بندی" کرائی تھی تو وہ راز کھل جائے گا جو اب تک میں نے چھپایا ہوا ہے۔ اس کے بعد بھی کون میری بات پر یقین کرے گا، وہ کون ہے؟ وہ کون ہے؟" اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ کر کولر تک گیا۔ ایک پھر دو پھر تین گلاس پی کر بھی اس کی پیاس نہیں بجھی تھی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے بستر تک آیا۔ اسے لگا کہ فرحت بھی جاگ رہی ہے۔ اس نے بہت چاہا کہ فرحت کو اپنی نس بندی کے بارے میں بتا کر چونکا دے لیکن وہ ڈر گیا۔ ابھی ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو گا۔ وہ اپنی غلطی کیوں ماننے لگی تھی۔ یہی کہے گی کہ میں اس پر الزام رکھنے کے لیے بہانہ کر رہا ہوں۔ پھر کیا کروں؟ خاموش ہو جاؤں؟ اس کے دل میں آگ سی جل رہی تھی۔ اس وقت کون دیکھ رہا ہے۔ اس عورت کا گلا گھونٹ دوں؟ بڑا آسان ہے لیکن اس کے بعد سلیم کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ اس نے گناہ کیا ہے، اللہ کے گھر وہ خود جوابدہ ہو گی۔ تو کیا میں بے غیرت بن کر جیتا رہوں؟ اس عورت کی سزا یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ میں اسے منہ لگانا چھوڑ دوں۔ پڑی رہے میرے گھر میں۔ کسی اور کی اولاد کو پیدا کرے۔ عقل مند ہو گی تو خود سمجھ جائے گی کہ مجھے اس پر شک ہے۔ ذرا سا بھی ایمان دل میں ہو گا تو میرے پاؤں پکڑ کر خود معافی مانگے گی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ خبر ہی غلط ہو۔ لیڈی ڈاکٹر جب تک معائنہ نہیں کر لیتی مجھے خاموش رہنا چاہیے۔

وہ دفتر جانے کے لیے وقت سے پہلے اٹھ گیا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ سویا ہی کب تھا جو اٹھتا۔ فرحت ابھی سو رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی تیار ہوا۔ نکل ہی رہا تھا کہ فرحت کی آنکھ کھل گئی۔

"رات کو دیر سے سوئی تھی۔ آنکھ ہی نہیں کھلی۔ آپ دس منٹ ٹھہر جائیں تو میں ناشتا تیار کر لوں۔"

"میں ناشتا دفتر جا کر کر لوں گا۔ تمہارے لیے نیند ضروری ہے سوتی رہو۔"

راشد نے یہ بات طنز کے طور پر کی تھی لیکن فرحت کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ انہیں میرا کتنا خیال ہے، کہہ رہے ہیں تمہارے لیے نیند ضروری ہے۔

راشد نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور گھر سے نکل گیا۔

وہ دفتر پہنچ ضرور گیا تھا لیکن دفتر کی عمارت اسے گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ رات بھر کے سوچے ہوئے خیالات پھر ایک ایک کر کے اس کے سامنے آ رہے تھے۔ خود ہی سوال کر رہا تھا خود ہی جواب دے رہا تھا۔ وہ بہ مشکل چند گھنٹے ہی دفتر میں گزار سکا اور پھر طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے دفتر سے نکل گیا لیکن اب وہ گھر کی طرف نہیں فرحت کی بہن کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔

نزہت اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ تو کبھی فرحت کے ساتھ بھی اس کے گھر نہیں آیا تھا اور اس وقت اکیلا!

"بھائی صاحب، خیریت تو ہے؟"

"ہاں سب خیریت ہے۔ ادھر سے گزر رہا تھا سوچا تم سے ملتا چلوں۔"

"باجی کو بھی لے آتے۔"

"میں تو دفتر سے آ رہا ہوں اور پھر وہ تو آتی ہی رہتی ہے۔ اس کا بہت دل لگتا ہے یہاں۔"

"آپ نے بھی تو اسے جنگل میں جا کر بسا دیا۔ یہاں آتی ہیں تو دل لگ جاتا ہے۔"

"کچھ زیادہ ہی دل لگتا ہے۔" راشد نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"باجی کی طبیعت کیسی ہے۔ دو تین دن پہلے فون آیا تھا تو کہہ رہی تھیں سر میں درد ہے۔"

راشد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے اور کیا پوچھنا چاہتا ہے۔ وہ بہن ہے کوئی بات بتائے گی؟ وہ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اٹھنے ہی والا تھا کہ نزہت کا دیور آ گیا۔ کمال یہ تھا کہ راشد اسے جانتا ہی نہیں تھا۔ نزہت نے تعارف کرایا تو اسے معلوم ہوا۔

"راشد بھائی، آپ نے تو ہمیں اپنا گھر ہی نہیں دکھایا بلکہ آپ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ فرحت باجی یہاں آتی ہیں تو ان سے ملاقات ہو جاتی ہے۔"

"یہی کیا کم ہے کہ ان سے ملاقات ہو جاتی ہے۔"

اس نے کچھ اس انداز سے کہا کہ نوجوان جھینپ کر رہ گیا۔ راشد نے بھی مزید بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔ نزہت چائے کے لیے پوچھتی رہ گئی اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے اپنی دانست میں چور پکڑ لیا تھا۔ فرحت اس لیے دوڑ دوڑ کے یہاں آتی ہے کہ یہاں نزہت کا نوجوان دیور رہتا ہے۔ فرحت نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ اس نے بچی کے حصول کے لیے کتنا گھٹیا طریقہ اختیار کیا ہے۔ یہی سوچتا ہوا وہ گھر تک پہنچ گیا۔

وہ گھر میں پہنچا تو فرحت فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ وہ بے اختیار کسی بات پر ہنس پڑی۔ راشد کا خون کھول گیا۔ اس نے فرحت کے ہاتھ سے ریسیور چھین لیا۔ اپنے کان سے لگایا۔ ہیلو ہیلو کرتا رہا لیکن دوسری طرف سے کوئی آواز نہیں آئی۔ اس نے ریسیور زمین پر پٹخ دیا۔

''اب تم کسی کو فون نہیں کرو گی۔ میں ٹیلی فون کٹوا رہا ہوں۔''

''یہ کیا وحشت ہے۔ یہ بھی تو پوچھو کس کا فون تھا۔ میں نے فون نہیں کیا تھا، فون آیا تھا۔''

''کسی کا بھی ہو۔ تم نے کیا ہو یا آیا ہو۔ ٹیلی فون کا بل ادا کرنے کی اب مجھ میں سکت نہیں ہے۔ میں فون کٹوا رہا ہوں۔'' اس نے کہا اور کمرے میں جا کر اندر سے کمرا بند کر لیا۔

اس نے اپنے دل میں شک کو جگہ دی تو زندگی جہنم بن کر رہ گئی۔ فرحت ہر بات سے بے خبر تھی۔ وہ تو بس اس کا رویہ دیکھ رہی تھی۔ زیادہ سے زیادہ سمجھ رہی تھی کہ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے ہاں لڑکی پیدا ہو۔ وہ بھی اس کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں میں بول چال بالکل بند ہو گئی۔

اسی تناتنی میں دو مہینے گزر گئے لیکن اب مجبوری ایسی آ گئی کہ فرحت کو بولنا پڑا۔

''مجھے معائنے کے لیے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ وقت نکال کر مجھے کسی وقت لے جائیں۔''

''نزہت کے گھر چلی جانا۔ اس کے دیور کے ساتھ ڈاکٹر کو دکھا دینا۔''

''کسی غیر مرد کے ساتھ جاتی اچھی لگوں گی۔''

''تمہارے لیے غیر کہاں ہے بھئی۔ تمہاری بہن کا دیور ہے۔''

''کچھ بھی ہے غیر تو ہے۔ میں کوئی نزلہ بخار کا معائنہ کرانے نہیں جا رہی ہوں۔ یہ آپ کا کام ہے اس کا نہیں۔''

''نزہت کو بھی ساتھ لے جانا۔ وہ تو تمہاری بہت سی باتوں کی رازدار ہو گی۔''

''آپ کے پاس وقت نہیں ہے تو میں اکیلی چلی جاؤں گی۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔''

اس نے انکار کر دیا تھا لیکن پھر یہ بھی سوچا کہ اسے جانا چاہیے۔ وہ بھی تو سنے ڈاکٹر معائنے کے بعد کیا کہتی ہے۔ کچھ دیر بعد ہی وہ تیار ہو کر آ گیا اور اسے ڈاکٹر کے پاس چلنے کو کہا۔ فرحت ذرا ذرا سی بات پر خوش ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی خوش ہو گئی کہ اس کے شوہر کو اس کا خیال تو آیا۔

وہ اسے اور سلیم کو لے کر اسی ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا جس اسپتال میں سلیم کی ڈلیوری ہوئی تھی۔

معائنے کے بعد اس خبر کی تصدیق ہو گئی جس کی نوید فرحت نے سنائی تھی۔

''یہاں سے نزہت کے ہاں ہوتے ہوئے چلیں گے۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آج سے تم اس کے گھر نہیں جاؤ گی۔ ہاں وہ خود آنا چاہے تو ہمارے گھر آ سکتی ہے۔''

''یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ اس بے چاری نے کیا قصور کر دیا۔ اتنے دنوں میں تو ہمارے تعلقات بحال ہوئے ہیں۔ آپ اسے پھر ملیامیٹ کر رہے ہیں۔''

''اسے تم بھی سمجھ گئی ہو گی کہ میں کیوں منع کر رہا ہوں۔''

''میں کچھ نہیں سمجھی اور نہ سمجھنا چاہتی ہوں۔ آپ نے اگر اپنے دل میں کچھ خیال باندھ لیے ہیں تو میں نجومی نہیں ہوں کہ ان تک پہنچوں۔ میں نزہت سے کہہ دوں گی کہ وہ خود سے ملنے آ جایا کرے۔ پوچھے گی تو کہ میں نے کیوں منع کر دیا۔ خیر وہ بھی بچی نہیں ہے خود سمجھ جائے گی۔''

نزہت تو کیا سمجھتی فرحت کی بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اتنا ہوا کہ اس نے طے کر لیا کہ اگر اس کا شوہر نہیں چاہتا تو وہ بہن کے گھر نہیں جائے گی۔ اسے ملنا ہو گا تو وہ خود آ جایا کرے گی۔

راشد دیکھنا چاہتا تھا کہ بہن کے گھر جانے کے لیے وہ کتنا مچلتی ہے لیکن جب اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا تو اسے سخت مایوسی ہوئی۔ اس نے اسے بھی فرحت کی ہوشیاری سمجھا۔ وہ سمجھ گئی ہے لیکن میرے شک کو تقویت دینا نہیں چاہتی اسی لیے خاموش ہو گئی ہے۔ مجھے بھی خاموش ہو جانا چاہیے۔

وہ خاموش ہو گیا تھا لیکن شک کی آندھی جو ایک مرتبہ چل پڑی تھی وہ تھمنے میں نہیں آ رہی تھی۔ اس نے ہوا میں معبد تعمیر کر لیا تھا۔ اسے شک ہو گیا تھا کہ نزہت کے دیور کے ساتھ فرحت کے تعلقات ہیں۔ یہ ایسا شک تھا جس کی وہ کبھی کبھی خود بھی تکذیب کرتا رہتا تھا۔ میرے پاس کوئی ثبوت تو

ہے نہیں پھر میں کیسے بات آگے بڑھاؤں۔ یہ خیال اپنی جگہ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہا تھا اور اس کے گھر اولاد پیدا ہو رہی تھی۔ اس نے پھر سوچا کہ وہ فرحت کو حقیقت بتا کر لاجواب کر دے لیکن پھر خیال آیا کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرے گی۔ میں ثبوت تلاش کرلوں پھر اسے لاجواب کروں گا۔

وہ اپنی آگ میں خود جل رہا تھا۔ سکون سے فرحت بھی نہیں تھی۔ وہ اس کے رویے پر حیران تھی۔ کبھی کبھی تو وہ سوچتی تھی اس کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی وہ اس سے قبل از وقت ہی نجات حاصل کرلے تاکہ گھر کا ماحول تو ٹھیک ہو لیکن وہ یہ سوچ کر کانپ جاتی تھی کہ یہ تو قتل ہے، گھر کا ماحول ٹھیک کرلوں گی لیکن خدا کو کیا جواب دوں گی۔

اس نے تنگ آکر کشتی کو دریا کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

راشد کوشش کے باوجود فرحت کے خلاف کوئی ثبوت تلاش نہ کرسکا۔ اس کا دل پھر بھی صاف نہ ہوسکا۔ اس کا بدن بیمار تھا اب اس کا ذہن بھی بیمار ہوگیا۔ رات کو کئی کئی مرتبہ اٹھ کر فرحت کو دیکھ لیا کرتا تھا کہ وہ بستر پر ہے یا نہیں۔ دفتر کے لیے کہہ کر نکلتا تھا اور گھر کے قریب کسی ایسی جگہ چھپ کر بیٹھ جاتا جہاں سے گھر نظر آتا رہے۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں کون آتا ہے۔ کبھی کبھی دفتر سے نکل کر اچانک اپنی سالی نزہت کے گھر پہنچ جاتا تھا کہ کہیں فرحت وہاں تو نہیں آئی ہوئی۔

ایک دن وہ نزہت کے گھر گیا تو معلوم ہوا اس کا دیور آسٹریلیا جا رہا ہے۔ وہ دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ ہے کیسا ہوشیار سمجھ گیا ہے کہ میں اس کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔ کسی دن پکڑا جائے گا لہٰذا فرار ہو رہا ہے۔

ایک دن معلوم ہوا وہ آسٹریلیا چلا گیا ہے۔ اس نے فرحت کو نزہت کے گھر جانے کی اجازت دے دی تاکہ وہ سمجھ جائے کہ نزہت کے دیور کی وجہ سے وہ اسے وہاں نہیں جانے دے رہا تھا۔

''ولادت کے دن قریب ہیں۔ کسی وقت بھی اسپتال جانا پڑ سکتا ہے۔ مجھے آپ نزہت کے گھر چھوڑ آئیں۔ ڈلیوری تک میں وہیں رہوں گی۔''

''وہاں اب نزہت کا دیور تو ہے نہیں تمہیں اسپتال لے کر کون جائے گا؟''

''یہ ذمے داری آپ کی ہے۔ آپ وقت بے وقت نہیں بھی ہوئے تو نزہت کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔''

''میری موٹر سائیکل تمہارے لائق نہیں رہی ہے۔ سامنے والے لڑکے سے ٹیکسی منگا کر چلی جانا۔''

فرحت بڑا سخت جواب دے سکتی تھی لیکن اس نے سوچا یہ آدمی لڑنے کے بہانے ڈھونڈ رہا ہے۔ اگر اس وقت میں اس سے الجھ گئی تو یہ مجھے نزہت کے گھر سے کبھی نہیں لانے گا۔ اس وقت یہ جو کہہ رہا ہے اس پر عمل کرنا چاہیے۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں کسی نہ کسی طرح چلی جاؤں گی۔ آپ دفتر سے واپسی میں ادھر ہی آجایئے گا۔''

''ٹھیک ہے، کوشش کروں گا۔''

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ نزہت کے گھر نہیں جائے گا۔ اتنا ہی بہت ہے کہ میں نے فرحت کو زندہ چھوڑ دیا ہے۔ اب وہ اپنا گناہ خود سمیٹے۔ وہ دفتر پہنچ کر بھی یہی سوچتا رہا۔ لیکن دفتر سے چھٹی ہوئی تو اس نے موٹر سائیکل کا رخ نزہت کے گھر کی طرف موڑ دیا۔ دیکھوں تو سہی وہ وہاں آئی بھی ہے یا نہیں۔ فرحت اسے دیکھ کر نہال ہوگئی۔ ورنہ وہ تو یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ اب وہ پلٹ کر آئے گا ہی نہیں۔

فرحت کو وہاں رہتے ہوئے دس دن ہوگئے تھے اور وہ وہاں صرف ایک مرتبہ گیا تھا۔ ایک دن نزہت کا شوہر اس کے دفتر آیا اور اسے خبر دی کہ فرحت اسپتال میں ایڈمٹ ہوگئی ہے۔ اسے سمجھایا بھی کہ میاں بیوی میں لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں لیکن اس نازک وقت میں اسے اپنی بیوی کے پاس ہونا چاہیے۔ اس کے سمجھانے پر وہ اسپتال چلا گیا۔ اس کے وہاں جانے کے فوراً بعد اسے یہ خوش خبری مل گئی کہ وہ بیٹی کا باپ بن گیا ہے۔ کچھ دیر بعد اسے بچی کو دیکھنے کے لیے اندر جانا تھا۔ اسی وقت وہ خاموشی سے اسپتال سے نکل آیا۔ وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پا رہا تھا کہ ہونے والی بچی کو دیکھتا۔ گھر پہنچ کر وہ آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے بیٹھ گیا۔ سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس طرح تو وہ تماشا بن کر رہ جائے گا۔ اسے جواب دینا مشکل ہوجائے گا۔ باتیں نکلیں گی اور اسے حقیقت بتانی پڑ جائے گی۔ اس سے تو بہتر ہے معاملات جس طرح چل رہے تھے اسی طرح چلنے دے۔ اب جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اس معصوم بچی کا کیا قصور جو اس دنیا میں پہنچا دی گئی ہے۔ وہ اسے اپنے گھر لے آئے۔ لوگ دوسروں کے بچے بھی پال لیتے ہیں۔ میں بھی اسے پال لوں گا۔ میری گناہ گار فرحت ہے میں اس سے بات نہیں کروں گا۔

وہ تین چار دن مزید سوچتا رہا اور پھر فرحت کو اپنے گھر لے آیا۔ اس نے دیکھا کہ سنیم کی خوشی کا ٹھکانا نہیں

ہے۔ وہ ہر وقت اپنی بہن کے پاس بیٹھا رہتا ہے۔ اس نے بھی سوچا کہ وہ سب باتیں بھلا دے اور بچی کو گلے سے لگالے۔ وہ اس کے قریب گیا بھی لیکن پھر نفرت سے منہ پھیر کر پلٹ آیا۔ فرحت اس وقت سو رہی تھی اس لیے وہ یہ کریہہ منظر دیکھ نہ سکی۔

فرحت کو اسپتال سے آئے ایک ہفتے سے زیادہ ہوگیا تھا لیکن وہ دیکھ رہی تھی کہ راشد نے بچی کو دیکھنا تک گوارا نہیں کیا تھا۔ اس نے راشد کو بڑے پیار سے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''راشد، تمہیں بیٹیوں سے نفرت سہی لیکن یہ ہماری بیٹی..... ہم دونوں کی بیٹی ہے۔ اگر میں تمہیں اچھی نہیں لگتی تو مجھ سے بات نہ کرو لیکن اپنی بیٹی کو نظرانداز مت کرو۔ بیٹیاں تو باپ کی ہوتی ہیں۔ یہ بڑی ہوگی تو سب سے زیادہ یہی تمہارا خیال رکھے گی۔ اس کے دل میں نفرت بیٹھ گئی تو اس کی پوری زندگی نفرت کی نذر ہو جائے گی۔''

راشد اس کے جواب میں صرف یہی کہہ سکا کہ وہ اپنے آپ کو آمادہ کرے گا کہ اس سے محبت کرسکے۔

اس نے سوچا بھی یہی تھا لیکن وہ مجبور تھا۔ جب بھی بچی کے قریب جاتا... نفرت سے منہ پھیر کر لوٹ آتا تھا۔ کوشش کے باوجود وہ اسے گود میں اٹھانے کی جرأت نہ کرسکا بلکہ وہ تو اس وقت بھی نفرت کی آگ میں جلنے لگتا تھا جب فرحت اسے گود میں لے کر بیٹھتی تھی یا سلیم اس کے ساتھ کھیل رہا ہوتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اسے گود سے لے کر زمین پر پٹخ دے۔ وہ خود سے ڈرنے لگا تھا کہ کسی روز وہ اس جرم کا ارتکاب کر ہی نہ بیٹھے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ وہ ان سب کی نظروں سے دور چلا جائے۔ کہاں چلا جائے، یہ خود اس کی سمجھ میں بھی نہ آتا تھا۔

پھر اس نے ایک فیصلہ کر ہی لیا۔

اس نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ کے لیے درخواست دے دی اور کوشش کرکرا کے منظور بھی کرالیا۔ اس میں اسے دو تین مہینے لگ گئے۔ فرحت اس طوفان سے بے خبر تھی جو اس کی زندگی میں آنے والا تھا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد اتنی رقم اسے مل گئی تھی کہ وہ کسی اور نوکری کا بندوبست ہونے تک بہ آسانی گزارہ کرسکتا تھا۔ یہ رقم ہاتھ میں آتے ہی اس نے شہر چھوڑ دیا۔

☆☆☆

وہ اب جس نئے شہر میں تھا، وہ بھی اس کے سابقہ شہر کی طرح بڑا شہر تھا۔ نوکری کے مواقع تو تھے لیکن اسے معلوم تھا کہ اس بڑے شہر میں قدم جمانے کے لیے اسے سخت محنت کرنی ہوگی۔

اس نے کچھ دن ہوٹل میں گزارے اور پھر ایک مکان کرائے پر لے کر نوکری کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ صبح نکل جاتا اور شام کو مایوس لوٹ آتا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اگر اس کے ہاتھ میں کوئی ہنر ہوتا یا اس کی صحت محنت مزدوری کے لائق ہوتی تو بہ آسانی اسے نوکری مل سکتی تھی۔ وائٹ کالر جاب ملنا بہت مشکل ہے۔ پھر بھی وہ کوشش میں لگا ہوا تھا۔

ایک دن وہ ایک فیکٹری میں داخل ہو رہا تھا کہ اندر داخل ہونے والی ایک گاڑی نے اسے ٹکر ماردی۔ گاڑی آہستہ تھی اور پھر وہ اچھل کر گاڑی سے دور جا گرا تھا اس لیے گاڑی کے نیچے آنے سے بچ گیا۔ وہ اچھل کر زمین پر گرا تھا اس لیے معمولی چوٹیں ضرور آئی تھیں۔ یہ گاڑی اس فیکٹری کے مالک کی تھی جو اس کا ڈرائیور چلا رہا تھا۔ فیکٹری کا مالک فوراً گاڑی سے اترا۔ پہلے تو اسے اندھا ہونے کا طعنہ دیا پھر اس کی شریف صورت کو دیکھ کر نرم پڑ گیا۔ اس کی کہنی اور ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ شخص اسے زخمی دیکھ کر گھبرا گیا۔ راشد کے گھٹنوں میں بھی چوٹ آئی تھی جس کی وجہ سے وہ اٹھنے میں دقت محسوس کر رہا تھا۔ اس شخص نے اسے اپنی گاڑی میں ڈالا اور اسپتال لے گیا۔ راشد کی ہڈیاں سلامت تھیں، کچھ زخم آئے تھے۔ مرہم پٹی کردی گئی۔

یہ کھلونے بنانے کی چھوٹی سی فیکٹری تھی۔ اس کے مالک حاجی عبدالقیوم تھے جن کی غریب پروری اور رحم دلی مشہور تھی۔ اس کا مظاہرہ راشد بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ نہ صرف اسے لے کر خود اسپتال آئے تھے بلکہ جب مرہم پٹی ہوچکی تو چند نوٹ بھی اس کے ہاتھ پر رکھے۔

''میرے ڈرائیور کی غلطی کی وجہ سے آپ کو یہ زحمت اٹھانی پڑی۔ یہ پیسے رکھ لو اور اسے معاف کردینا۔''

''جناب! میں ان پیسوں کا کیا کروں گا۔ اگر ہوسکے تو مجھے اپنی فیکٹری میں کوئی کام دلادیں۔''

''کیا کام کرسکتے ہو؟''

''جناب میری تعلیم بی اے ہے۔ ایک سرکاری دفتر میں ملازمت کرتا رہا ہوں۔ اکاؤنٹس کا تجربہ ہے۔ ویسے آپ جو کام کہیں گے کرنے کو تیار ہوں۔ بعض حالات مجھے اس شہر میں لے آئے ہیں۔ نوکری مل جائے تو اچھا ہے۔''

''اچھا بیٹھو گاڑی میں۔'' حاجی صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ حاجی صاحب اسے فیکٹری لے آئے۔

''پتا نہیں تمہاری قسمت اچھی ہے یا میری۔ فیکٹری کا اکاؤنٹ کلرک کل ہی نوکری چھوڑ کر گیا ہے۔ میں تمہیں اس کی جگہ رکھ رہا ہوں، فیکٹری کے جتنے مالی معاملات اور ورکروں کی تنخواہیں وغیرہ ہیں وہ سب تمہیں دیکھنے ہوں گے۔''

چلتے وقت حاجی صاحب نے اس کے ہاتھ پر دو سو روپے رکھ دیے۔

''نوکری مل جانے کی خوشی میں میری طرف سے بچوں کے لیے مٹھائی لے جانا۔''

''میں نے ابھی شادی نہیں کی ہے۔''

''ارے چالیس سال تو ہوگی تمہاری عمر۔''

''بیالیس سال کا ہو گیا ہوں جناب۔''

''ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟''

''کی تھی، بیوی ساتھ نہیں دے سکی۔''

''اوہ! سن کر بڑا افسوس ہوا۔''

وہ دوسرے دن سے نوکری پر جانے لگا۔ کام اس کے مطلب کا تھا۔ تنخواہ بھی اتنی تھی کہ اس اکیلے کے لیے ضرورت سے بہت زیادہ تھی۔ وہ دل لگا کر کام کرتا رہا۔ یہ نوکری بھی تھی اور وقت گزاری کا مشغلہ بھی۔ فیکٹری کا ٹائم ختم ہو جانے کے بعد بھی وہ دفتر میں بیٹھا رہتا۔

حاجی صاحب اس کے کام سے بہت خوش تھے۔ روز بروز ان کی مہربانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ دو ایک مرتبہ اسے ضد کر کے اپنے گھر بھی لے گئے تھے۔ مالک اور ملازموں والا کوئی برتاؤ ہی نہیں تھا۔ فیکٹری بھی آتے تو اسے اپنے کمرے میں بلا لیتے اور اس کے بارے میں معلومات لیتے رہتے۔ جتنا ضروری ہوتا راشد انہیں بتا دیتا۔ اس نے یہ تو بتا دیا تھا کہ اس کی بیوی مرگئی ہے لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کے بچے بھی ہیں ورنہ وہ یہ ضرور پوچھتے کہ بچوں کو اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھتے۔ اس نے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ ناپسندیدہ بیٹی کی وجہ سے گھر چھوڑنے پر مجبور ہوا ہے۔

اسے اس فیکٹری میں کام کرتے ہوئے چھ ماہ ہوئے ہوں گے کہ حاجی صاحب نے اسے اپنے گھر بلایا۔ اس سے پہلے بھی وہ دو تین مرتبہ ان کے گھر جا چکا تھا۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آج انہوں نے جس مقصد کے لیے اسے بلایا ہے، وہ اس کی زندگی کا رخ ہی موڑ دے گا۔

وہ شہر کے بیچوں بیچ نہایت سادہ لیکن شاندار مکان تھا۔ اس میں رہنے والے اس سے بھی زیادہ شاندار تھے۔ حاجی صاحب... ان کی بیوی ایک بیٹی اور دو بہوئیں تھیں۔ کم از کم راشد انہی لوگوں کو جانتا تھا۔ ان کے بیٹوں سے اس

آملیٹ

ایک بے وقوف دوسرے سے۔ ''تمہیں پتا ہے آملیٹ کسے کہتے ہیں؟''

دوسرا۔ ''ارے بدھو تمہیں اتنا بھی پتا نہیں کہ آملیٹ کسے کہتے ہیں۔ ابے جو آم دیر سے پکے اسے آملیٹ (آم لیٹ) کہتے ہیں۔''

مزاحیہ قطعہ

کرائے کا مکان ہے کیا کھلا کھلا سا
ہوا در و دیوار سے جھانکتی ہے
یہ چمنا پھینکیے بیگم خدارا
پڑوسن اپنے گھر سے جھانکتی ہے

بدحواسی

''اوہ۔ میں استری کا سوئچ آف کرنا تو بھول ہی گئی تھی۔'' گھر سے سو میل دور آنے کے بعد نئی نویلی دلہن نے شوہر کو بتایا۔

شوہر نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ ''کوئی بات نہیں، آگ لگنے کا کوئی امکان نہیں کیونکہ میں باتھ روم کا نلکا اور دروازہ کھلا چھوڑ آیا ہوں۔''

کاروبار

کسٹم آفیسر۔ ٹرک ڈرائیور سے۔ ''میں نے بہت دفعہ تمہارے ٹرک کی تلاشی لی۔ مگر کچھ برآمد نہیں ہوا۔ تم کاروبار کیا کرتے ہو۔''

ٹرک ڈرائیور۔ ''جناب میں اسمگلنگ کرتا ہوں۔''

کسٹم آفیسر۔ ''مگر کچھ برآمد نہیں ہوتا۔ تم اسمگل کیا کرتے ہو؟''

''ٹرک۔'' ٹرک ڈرائیور نے جواب دیا۔

ذہین بیوی

شوہر بیوی سے۔ ''اس ماہ پھر تمہارے اخراجات ماہانہ بجٹ سے تجاوز کر گئے ہیں۔''

بیوی۔ ''تم فکر نہ کرو میں نے حکومت کے بجٹ کا بغور مطالعہ کیا ہے۔''

شوہر۔ ''حکومت کا بھلا یہاں کیا ذکر۔ وہ تو نئے ٹیکس لگا کر اخراجات پورے کر لیتی ہے۔''

بیوی۔ ''ہاں۔ مگر وہ قرضے بھی تو لیتی ہے۔''

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

کی ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔

وہ اس دن ان کے گھر گیا تو ایک نئے فرد سے اس کی ملاقات ہوئی۔ یہ ایک لڑکی تھی جو اس وقت ڈرائنگ روم میں کچھ دیر کے لیے آئی تھی جب وہ چائے پی رہا تھا۔ حاجی صاحب نے اپنی بڑی بیٹی کی حیثیت سے اس کا تعارف کرایا تھا۔

''یہ میری بڑی بیٹی ہے پروین۔ اسے تم نے پہلے نہیں دیکھا ہوگا۔ بہت کم کسی کے سامنے آتی ہے۔ تم سے ملوانے کے لیے میں نے اسے خاص طور پر تاکید کی تھی۔''

راشد اس کے استقبال کے لیے کھڑا ہوا۔ حاجی صاحب نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور بس اتنی دیر میں پروین کمرے سے باہر نکل گئی۔

''تم کچھ خیال مت کرنا۔'' حاجی صاحب نے راشد سے کہا۔ ''یہ لوگوں کے سامنے بہت کم آتی ہے۔ اس وقت آگئی یہی بہت ہے۔''

''جی ہاں، بعض لڑکیاں کچھ زیادہ ہی شرماتی ہیں۔'' راشد نے کہا۔

''بس یہی سمجھ لو۔ بے چاری۔'' حاجی صاحب نے کہا اور باتوں میں مشغول ہوگئے۔ اچانک انہوں نے گفتگو کا رخ موڑ دیا۔

''میاں تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ پہلی بیوی کے مرنے کے بعد کیا لوگ دوسری شادی نہیں کرتے۔''

''میں نے قسم تو نہیں کھائی ہے لیکن مجھے بیٹی دے گا کون۔''

''یہ بات نہیں ہے تم ہاں بھرو تو لڑکی میں بتاؤں۔''

''آپ کی کوئی بات میں نے ٹالی ہے؟''

''تم مجھے اتنے اچھے لگے ہو کہ تم تیار ہو جاؤ میں اپنی بیٹی سے تمہاری شادی کرنے کو تیار ہوں۔''

''جی؟ میں اس لائق کہاں۔''

''میاں تمہاری قیمت تو ہم جانتے ہیں۔ میری بیٹی جو ابھی کمرے میں آئی تھی تم اس سے شادی کر لو۔ اس کی عمر تیس سال ہوگئی ہے لیکن تمہاری عمر کے حساب سے تمہارے لائق ہے۔''

راشد کا سر چکرانے لگا۔ یہ عمر کا معاملہ نہیں ہے معاملہ کچھ اور ہے۔ بڑے میاں نہ جانے کیوں اپنی بیٹی مجھے بھڑا رہے ہیں۔ اصل بات تو بتائیں گے نہیں۔ میں انکار کروں یا اقرار۔ اس لڑکی کو خوب صورت کہا جا سکتا ہے۔ اس کی شادی کہیں بھی ہو سکتی ہے انہوں نے میرا انتخاب کیوں کیا جبکہ میں انہیں یہ بھی بتا چکا ہوں کہ میں کنوارا نہیں۔

حاجی صاحب زمانہ شناس تھے۔ سمجھ گئے ہوں گے کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔

''تم یقیناً پروین کے بارے میں سوچ رہے ہوگے۔''

''جی نہیں، میں اپنے بارے میں سوچ رہا ہوں کہ مجھ میں ایسی کیا خوبی ہے کہ آپ مجھ پر یہ مہربانی کر رہے ہیں۔''

''میں تم سے کوئی بات چھپاؤں گا نہیں۔ پروین کے دل میں سوراخ ہے۔ اس کا خوش رہنا ضروری ہے اور مجھے امید ہے تم اسے خوش رکھو گے۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے اس کی اولاد نہیں ہونی چاہیے ورنہ اس کا زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا۔ اگر ان دونوں شرائط کے ساتھ اسے قبول کر سکتے ہو تو مجھے بتا دو۔''

اس نے سوچا اولاد تو وہ چاہے بھی تو پیدا نہیں کر سکتا۔ کیوں نہ اس لڑکی کو اپنا لے اور اسے خوش رکھ کر اس کے باپ کی دولت کا بھی حق دار بنا رہے اور خدا کی نظروں میں بھی سرخرو رہے۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے پروین کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

''تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اولاد کے لیے ضد نہیں کرو گے بلکہ ایک کاغذ پر مجھے لکھ کر دے دو۔''

''جب مجھے معلوم ہوگا کہ اس میں میری بیوی کی جان کو خطرہ ہے تو میں اولاد کے لیے کیوں اصرار کروں گا۔''

''اولاد کی خاطر بیوی کی جان کی کون پروا کرتا ہے۔ اس لیے تم مجھے تحریر دے دو۔''

راشد نے ذرا سی کہانی بدلنے کے بعد حاجی صاحب کو اپنے آپریشن کے بارے میں بتا دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ وہ چاہے بھی تو اولاد پیدا نہیں کرا سکتا۔ اس نے فرحت کی کہانی بیان نہیں کی تھی بلکہ صرف یہ بتایا تھا کہ وہ ابتدا ہی سے اولاد کا قائل نہیں تھا اس لیے اس نے اپنا آپریشن کرا لیا تھا۔

حاجی صاحب کو اور کیا چاہیے تھا۔ انہوں نے فوراً پروین کے ساتھ اس کی شادی کر دی۔

شادی کے موقع پر اس کی ملاقات حاجی صاحب کے بیٹوں سے ہوئی اور پہلی مرتبہ معلوم ہوا وہ دونوں امریکا ہی میں سیٹ ہیں اس نے جن دو بہوؤں کو دیکھا تھا وہ عارضی طور پر آئی ہوئی تھیں۔ حاجی صاحب صرف دو بیٹیوں کے ساتھ رہتے تھے جن میں سے ایک وہ تھی جس کے ساتھ راشد کی شادی ہوئی۔ بعد میں دوسری بیٹی کی بھی شادی ہوگئی۔

شادی ہو جانے کے بعد حاجی صاحب کے دونوں بیٹے اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ امریکا چلے گئے۔ حاجی

صاحب کی چھوٹی بیٹی کی منگنی ہو چکی تھی۔ صرف یہ انتظار تھا کہ بڑی کی شادی ہو جائے تو اس کی بھی شادی کر دی جائے لہٰذا چند ماہ بعد اس کی بھی شادی ہو گئی۔ راشد کرائے کا مکان چھوڑ کر اسی کوٹھی میں آ گیا تھا۔

حاجی صاحب کا داماد اکاؤنٹ کلرک کیسے رہ سکتا تھا۔ اس کی جگہ دوسرا آدمی رکھ لیا گیا اور راشد ایم ڈی کی حیثیت سے حاجی صاحب کی جگہ بیٹھنے لگا۔ حاجی صاحب بھی کبھی فیکٹری آ جاتے تھے ورنہ فیکٹری کے تمام معاملات راشد چلا رہا تھا۔ جب اس کا ڈرائیور اسے دیکھ کر سیلوٹ مارتا تھا اور اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولتا تھا تو اسے فرحت یاد آ جاتی تھی۔ اس نے کس غربت میں اس کے ساتھ گزارہ کیا تھا۔ پھر اس کی بے وفائی یاد کر کے وہ اداس ہو جاتا تھا۔ اس نے مجھے دھوکا دیا۔ اب نہ جانے کس حال میں ہو گی۔ اپنے بیٹے سلیم کو یاد کر کے وہ گھنٹوں روتا تھا لیکن اب وہ وہاں جا نہیں سکتا تھا۔ نہ اسے یہاں بلا سکتا تھا۔ حاجی صاحب سے کہہ چکا تھا کہ اس کی کوئی اولاد نہیں۔ وہ اپنے اس جھوٹ پر اب پشیمان ہوتا تھا۔ اگر وہ حاجی صاحب سے کہہ دیتا کہ اس کا ایک بیٹا ہے تو وہ شاید اسے ساتھ رکھنے کی اجازت دے دیتے۔ وہ فرحت کو طلاق دے کر سلیم کو اپنے پاس بلا لیتا۔ پھر وہ وقت کا انتظار کرنے لگا کہ کچھ وقت اور گزر جائے۔ حاجی صاحب کے دل میں جگہ بنا لے پھر وہ سلیم کو یہاں بلا لے گا۔

وقت گزرتا رہا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا ماضی بھی اس کی نظروں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔ وہ بھول ہی گیا کہ اس کی کوئی بیوی بھی تھی، کوئی بیٹا بھی تھا۔ پروین نے اپنی خدمت گزاری سے اسے سرشار کیے رکھا۔ حاجی صاحب کی دولت نے اسے خرید لیا۔ وہ ان کی دولت کے سہارے آدھی دنیا گھوم چکا تھا۔ وہ ہمیشہ بیمار رہتا تھا لیکن حالات کی تبدیلی نے اسے بھلا چنگا کر دیا۔ اس کی شادی کو چھ سال گزر گئے تھے کہ اچانک پروین کے انکشاف نے اسے حیران کر دیا۔ وہ امید سے تھی۔ وہ فوراً اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا۔ معلوم ہوا پروین کی بے خبری نے تین مہینے گزار دیے ہیں۔

وہ ایک مرتبہ پھر اسی مقام پر کھڑا تھا جب فرحت نے اسے ماں بننے کی خوش خبری سنائی تھی۔ تو کیا پروین نے بھی اسے دھوکا دیا ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے، کیوں نہیں ہو سکتا۔ ہو سکتا ہے اس کا کردار اچھا نہ ہو۔ حاجی صاحب نے اسی لیے اس کی شادی مجھ سے کر دی ہو۔ وہ اگر خراب تھی تو چھ سال تک یہ حادثہ کیوں پیش نہیں آیا۔

حاجی صاحب کو معلوم ہوا تو وہ طیش میں بھرے ہوئے فیکٹری پہنچ گئے اور سیدھے اس کے کمرے میں گھستے چلے گئے۔

"تم نے اپنی خوشی کی خاطر میری بیٹی کی زندگی خطرے میں ڈال دی۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"حاجی صاحب! میں خود حیران ہوں کہ یہ کیسے ہو گیا۔"

"تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ تم آپریشن کرا چکے ہو۔ میری دولت پر عیش کرنے کے لیے جھوٹ بولا تھا۔"

"حاجی صاحب! آپ میرا یقین کریں، میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔"

"اگر تم سچے ہو تو میں تمہارا میڈیکل چیک اپ کراؤں گا۔ تم اپنی صفائی پیش کر کے میری معصوم بیٹی پر الزام رکھ رہے ہو۔"

"حاجی صاحب آپ میرا میڈیکل کرا لیں۔ ثابت ہو جائے گا کہ میں سچا ہوں۔"

حاجی صاحب اسے اپنے فیملی ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ اس نے معائنے کے بعد رپورٹ دی کہ آپریشن ہوا ضرور تھا لیکن صحیح نہیں ہوا۔ دس فیصد امکانات ہیں کہ یہ اولاد پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ بہت کم امکان ہے لیکن یہ خدا کی قدرت کہ پھر بھی اولاد ہو گئی۔

راشد سچا ثابت ہو گیا تھا لیکن رپورٹ سنتے ہی اس پر غشی طاری ہو گئی۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کی یہ حالت کیوں ہوئی۔ اسے گھر لے ضرور آئے لیکن وہ بستر سے لگ کر رہ گیا۔ جو زخم مندمل ہو گئے تھے پھر سے ہرے ہو گئے۔ اس نے فرحت پر شک کیا تھا لیکن وہ بے قصور تھی۔ وہ بیٹی جسے وہ چھوڑ کر چلا آیا اسی کے خون کا حصہ تھی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ یہ قدم اس نے پانچ سال پہلے کیوں نہیں اٹھا لیا۔ وہ اگر اس وقت ڈاکٹر کے پاس چلا جاتا تو یہ حقیقت اس کے سامنے آ جاتی۔ اس کے چھ سال ضائع نہ ہوتے۔ وہ اپنے بیوی بچوں کا مجرم ہے۔ وہ انہیں بے یار و مددگار چھوڑ آیا اور خود یہاں عیش کر رہا ہے۔ اسے حاجی صاحب کی دولت سے نفرت ہونے لگی۔ میں ان کی دولت کو لات مار کر اپنے بیوی بچوں میں چلا جاؤں گا لیکن پروین؟ وہ بھی تو اب میری بیوی ہے۔ اس کی کوکھ میں جو بچہ پرورش پا رہا ہے وہ بھی تو میرا ہے۔ یہاں سے چلا گیا تو کیا اسی جرم کو پھر نہیں دہراؤں گا جو

پہلے سرزد ہو چکا۔ وہ تو ویسے بھی مرجائے گی کیا خبر نہ مرے یا وہ مرجائے، اس کا بچہ زندہ بچ جائے۔ حاجی صاحب کے پاس اتنی دولت ہے کہ پروین کسی مصیبت کا شکار نہیں ہوسکے گی۔ فرحت تو فاقے کررہی ہوگی۔ میرے بچے کسی کا جھوٹا کھارہے ہوں گے۔

وہ اپنے آپ سے لڑ رہا تھا کہ حاجی صاحب آگئے۔

''بیٹا، تم نے اپنی کیا حالت بنالی ہے۔ تمہارا کیا قصور۔ پروین کی زندگی ہوگی تو بچ جائے گی۔ مجھے تو یہ اطمینان ہے کہ تم نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔''

''میں نے ایک جھوٹ نہیں بولا تھا لیکن دوسرا جھوٹ ضرور بولا تھا۔ میری بیوی مری نہیں ہے، زندہ ہے اور میرے دو بچے بھی ہیں۔'' راشد نے اب کچھ نہیں چھپایا، جن حالات سے وہ گزرا تھا وہ سب انہیں بتادیے۔

''بیٹا، تم نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ تم نے اپنی معصوم بیوی پر شک کیا اور کسی تصدیق کے بغیر اسے بے آسرا چھوڑ کر چلے آئے۔ اب اس کا ازالہ یہ ہے کہ تم جاؤ اور اپنے بیوی بچوں کو لے آؤ۔ مجھے یہ نیکی کرنے دو۔ میں انہیں اپنے پاس رکھوں گا۔ پروین اگر زندہ رہتی ہے، تب بھی اور اگر خدا اسے اپنے پاس بلالیتا ہے تب بھی۔ پروین کے بعد اس کے بچے کی دیکھ بھال کے لیے ایک عورت کی ضرورت ہوگی اور وہ ہوگی تمہاری بیوی۔ دیر مت کرو۔ اسے میرا حکم سمجھو۔''

راشد کی رگوں میں جیسے جان آگئی۔

وہ پہلی فرصت میں روانہ ہوا اور اپنے گھر پہنچ گیا۔ ان چھ برسوں میں یہ علاقہ بالکل ہی بدل گیا تھا۔ تقریباً تمام مکان تعمیر ہوگئے تھے، دکانیں بھی کھل گئی تھیں۔ وہ اپنے گھر کے سامنے پہنچا تو برابر کا مکان بھی آباد ہوگیا تھا۔ یہ وہی پلاٹ تھا جس پر اس نے پھول پودے لگالیے تھے۔ اسے یاد آیا کہ اس باغیچے میں بیٹھ کر وہ اور فرحت چائے پیا کرتے تھے۔

اس نے ڈرتے ڈرتے دروازے پر لگی بیل کا بٹن دبایا۔ جواب میں ایک عورت دروازے پر آئی جو یقیناً اس کی بیوی نہیں تھی، وہ عورت اس کے لیے اجنبی تھی۔ اس کی زبانی معلوم ہوا فرحت نے یہ مکان کرائے پر دے دیا ہے اور وہ خود اپنی بہن کے گھر منتقل ہوگئی ہے۔ بے چاری اور کیا کرتی، اس نے اپنے دل میں کہا اور دروازہ چھوڑ کر ہٹ گیا۔

وہ نزہت کے گھر پہنچا۔ دروازے پر چھ سات سال کی ایک بچی آئی۔ یہ یقیناً میری بیٹی ہے۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔

''آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

''مجھے آپ سے ملنا ہے۔'' وہ اکڑوں بیٹھ گیا۔

''مجھ سے کیوں ملنا ہے؟ میں تو آپ کو جانتی بھی نہیں۔''

''لیکن میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ کا نام مریم ہے۔''

''وہ تو ہے لیکن میں پھر بھی آپ کو نہیں جانتی۔ ٹھہرو میں بھائی کو بلاتی ہوں۔ بھائی، دیکھو کون آیا ہے۔'' وہ چلائی۔ جواب میں سلیم بھاگتا ہوا آیا۔ راشد کو اسے پہچاننے میں ذرا دقت نہیں ہوئی۔ گیارہ بارہ سال کا یہ بچہ سلیم ہی ہوسکتا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی۔ گال زرد، کمزور اور نحیف۔ بچہ اسے پہچاننے کی کوشش کررہا تھا۔

''سلیم تم نے مجھے پہچانا؟''

''انکل! میں نے آپ کو کہیں دیکھا ضرور ہے۔''

''بیٹا میں تمہارا ابو ہوں، راشد۔ مجھے پہچانو۔''

''ہاں آپ لگتے تو ابو ہیں، ٹھہرو نزہت خالہ سے اور پوچھ لوں۔'' وہ وہیں سے چیخا اور راشد کی آمد کی اطلاع دی۔ اب نزہت اس کے سامنے تھی۔

''بھائی صاحب، آپ؟ بہت جلدی آگئے۔ یہ تو سوچا ہوتا کہ ہم سب پر کیا گزر گئی ہوگی۔''

''نزہت! مجھے اندر تو آنے دو۔ سب بتاتا ہوں۔ میں کہاں تھا اور کیوں نہ آسکا اور اب کیوں آگیا۔''

وہ اندر آگیا۔ اس کی آنکھیں فرحت کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس کا دل کسی اندیشے سے دھڑک رہا تھا۔ سب ہیں فرحت نہیں ہے، جبکہ اسے تو سب سے پہلے ہونا چاہیے تھا۔

''فرحت نظر نہیں آرہی ہے۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''اس کمرے میں چلے جاؤ اور اس کی بربادی کا تماشا دیکھ لو۔''

وہ اندر گیا۔ وہاں ایک اجاڑ عورت سب سے بے نیاز بیٹھی دیواروں کو تک رہی تھی۔ یہ فرحت تھی۔ راشد نے اسے آواز دی۔ تھوڑی دیر کے لیے اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں حرکت ہوئی اور پھر پہلی حالت پر واپس آگئیں۔

''دیکھو فرحت، میں آگیا ہوں۔ مریم مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی ہے۔ اٹھو میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ میرے ساتھ چلوگی نا۔'' وہ بولتا رہا اور فرحت دیواروں کو تکتی رہی۔ کبھی کبھی چونک کر دروازے کی طرف دیکھ لیتی تھی۔

''بہت دنوں سے اس کی یہی حالت ہے۔ اس کی قوتِ گویائی سلب ہوچکی ہے۔ اپنے بچوں تک کو نہیں پہچانتی۔ اپنے ہوش میں کب ہے جو آپ کو پہچانے۔''

''اب میں آگیا ہوں۔ اس کا علاج کراؤں گا۔

ٹھیک ہو جائے گی یہ۔"

"آپ کیا سمجھتے ہیں۔ علاج ہم نے نہیں کرایا ہوگا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں ان کا کوئی علاج نہیں۔ یہ خود ہی ہوش میں آجائیں تو آجائیں۔"

راشد نے مناسب سمجھا کہ وہ کچھ دن یہاں رہ کر بچوں کو خود سے مانوس کرلے۔ سلیم تو اسے کچھ نہ کچھ پہچان چکا تھا لیکن مریم کے لیے وہ اجنبی تھا اس نے "رینٹ اے کار" سے گاڑی لے لی۔ صبح ہوتے ہی بچوں کو لے کر نکل جاتا۔ لنچ بھی باہر ہی کرتا۔ مختلف تفریح گاہوں میں بچوں کو گھماتا رہتا۔ آہستہ آہستہ مریم اس سے مانوس ہوگئی۔ اسے یقین آگیا کہ یہ اس کے ابو ہیں۔ ملک سے باہر گئے ہوئے تھے اب واپس آگئے ہیں۔ اس دوران وہ ڈاکٹروں سے بھی مشورے کرتا رہا۔ سب کا یہی خیال تھا کہ مریضہ کسی صدمے سے دوچار ہوئی ہے۔ یہ اس کیفیت سے خود ہی باہر آئے گی۔

فرحت کو پاگل نہیں کہا جاسکتا تھا۔ وہ بولنا بھول گئی تھی۔ چپ چاپ دیواروں کو تکتی رہتی تھی۔

وہ اسے اور بچوں کو لے کر شہر سے نکلا لیکن راستے میں اس نے سوچا کہ اسے حاجی صاحب کے گھر نہ ٹھہرایا جائے۔ پروین کو دیکھ کر اس کی حالت بگڑ سکتی ہے۔

وہ اسے اور بچوں کو لے کر ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا اور پھر کرائے کا ایک مکان لے کر اس میں شفٹ ہوگیا۔ حاجی صاحب کو اس نے اپنی مجبوری بتادی حاجی صاحب نے اسے پھر تاکید کی کہ وہ بیوی بچوں کو جتنی سہولتیں پہنچا سکتا ہے پہنچائے۔

فرحت کی طرح پروین کو بھی ان تمام حالات سے بے خبر رکھا گیا تھا۔

پروین کے ہاں ولادت کے دن قریب آتے جارہے تھے۔ وہ مسلسل ڈاکٹروں کی نگرانی میں تھی۔

پروین نے ایک بچی کو جنم دیا اور خلافِ توقع اس کے دل کی حالت نارمل رہی۔ ڈاکٹروں نے نوید سنادی تھی کہ اب اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں۔ ایک ہفتے تک وہ واقعی نارمل رہی لیکن پھر اس کی حالت بگڑ گئی اور پھر صرف دو دن زندگی سے جنگ کرنے کے بعد دنیا سے رخصت ہوگئی۔

ایک ماہ بعد نومولود بچی بھی دم توڑ گئی۔

اب حاجی صاحب کا اس سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا لیکن حاجی صاحب بضد تھے کہ وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ یہاں رہے۔

"میرے بیٹے تو نالائق نکلے۔ مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اب تم ہی میرے بیٹے ہو اور تمہاری بیوی میری بہو۔ میں تمہیں مجبور نہیں کرسکتا لیکن اگر تم میرے بڑھاپے کا سہارا بننا پسند کرو تو یہاں آکر رہ لو۔ میں نے یہ مکان پروین کے نام کردیا تھا۔ اس کے بعد اب تم ہی اس کے مالک ہو۔"

"مجھ پر آپ کے بہت سے احسانات ہیں۔ مجھے نہ مکان کا لالچ ہے نہ فیکٹری کا۔ میں آپ کا ادنیٰ ملازم ہوں۔ اگر آپ مجھے اپنا بیٹا سمجھتے ہیں تو یہ میرے لیے اعزاز ہے۔"

اس نے دیوار سے باتیں کرتی فرحت سے کہا کہ وہ اسے یہاں سے نئے گھر میں لے جانا چاہتا ہے۔ حاجی صاحب کے بارے میں بھی بتایا۔ وہ یوں سنتی رہی جیسے کوئی آواز نہ آرہی ہو۔

اس نے بچوں کو بتایا۔ "اب ہم تمہارے دادا کے پاس رہیں گے۔"

وہ فرحت کو لے کر حاجی صاحب کے گھر آگیا۔ فرحت کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی البتہ اتنا اچھا گھر دیکھ کر بچے بہت خوش تھے۔ یہاں فرحت کا مستقل علاج شروع ہوگیا۔ ہر ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ جس طرح انسان "کوما" میں چلا جاتا ہے یہی حالت فرحت کی ہے۔ وہ کسی وقت خود ہی اس "بے ہوشی" سے باہر آجائے گی۔

راشد چاہتا تو یہی تھا کہ وہ فرحت کے ساتھ اسی مکان میں جا کر رہے جو فرحت نے اس کے شانہ بشانہ کھڑے ہوکر بنایا تھا۔ اس باغیچے میں بیٹھ کر اس کے ساتھ چائے پیا کرے جو اس نے برابر کے پلاٹ پر لگایا تھا۔ شاید اس طرح فرحت کی یادداشت لوٹ آئے لیکن حاجی صاحب دو عظیم صدموں کے بعد گھر میں بیٹھ گئے تھے۔ فیکٹری کے تمام معاملات اس کے ہاتھ میں تھے۔ وہ فیکٹری چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ وہ انتظار کررہا تھا کہ فرحت کب ٹھیک ہو۔

فرحت کو بھی انتظار تھا۔ اس آدمی کا انتظار جو صبح اپنی موٹر سائیکل پر جاتا تھا اور شام کو گھر آتا تھا۔ اسے یہ یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ راشد کے پاس پہنچ چکی ہے۔ شاندار گاڑی میں آنے والا اسی کا شوہر ہے۔

وہ اب بھی دیواروں کو تکتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی چونک کر دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ ایک لہر شناسائی کی ابھرتی ہے اور پھر آنکھوں میں ویرانی اور اجنبیت ڈیرا جما لیتی ہے۔ راشد یہ حالت دیکھ کر ایک گہری سانس لے کر حسبِ معمول دل میں ایک جملہ دہراتا ہے۔ میں تمہارا مجرم ہوں...... کب مجھے معاف کرو گی؟

محفلِ شعر و سخن

✽ صوبیہ اقبال + ایس......راولپنڈی
کوئی لمحہ ہو تیرے ساتھ کا میری عمر بھر کو سمیٹ لے
میں فنا بقا کے سبھی سفر اسی ایک پل میں گزار دوں

✽ مہرین ناز......حیدرآباد
نگاہ عیب گری سے جو دیکھا اہلِ عالم کو
کوئی کافر کوئی فاسق کوئی صدیقِ اکبر تھا
مگر جب ہوگیا دل احتساب نفس پر مائل
ہوا ثابت کہ ہر فرد آدم مجھ سے بہتر تھا

✽ ملک محمد رمضان ساحل، حاجی احمد یار ساحل......پشاور
بدلا نہ میرے بعد بھی موضوع گفتگو
میں جاچکا ہوں پھر بھی تیری محفلوں میں ہوں

✽ سید اکبر شاہ......عیسیٰ شاہ
تیری یادوں سے بچ نکلوں
مجھے ترکیب دے کوئی
میری جانب سے ہر رشتہ
تیری جانب نکلتا ہے

✽ البیلی......کراچی
بغیر مطلب کے دلاسے بھی نہیں ملتے
یہاں لوگ دل میں بھی دماغ لیے پھرتے ہیں

✽ سوہا جی......کراچی
رواج تو یہی ہے دنیا کا، مل جانا بچھڑ جانا
تم سے یہ کیسا رشتہ ہے ملتے ہو نہ بچھڑتے ہو

✽ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ......خانیوال
مار ہی ڈالے جو بے موت یہ دنیا وہ ہے
ہم جو زندہ ہیں تو جینے کا ہنر رکھتے ہیں

✽ تفسیر عباس بابر......اوکاڑہ
دامن چاک لیے بیٹھا ہوں
آنکھ نمناک لیے بیٹھا ہوں
کل تجھے جتنی ضرورت ہوگی
اتنی ہی خاک لیے بیٹھا ہوں

✽ قاضی عرفان احمد عاجز......آزہ، چوآسیدن شاہ
عشقِ یار طلوع ہوا جب سے
دنیا میری نگاہ میں غروب ہوگئی

✽ عثمان انصاری......نیو سینٹرل جیل ملتان
تصور میں ہی چلے آؤ کہ میں دیدار ہی کرلوں
تمنا تم سے ملنے کی تو پوری ہو نہیں سکتی

✽ عون عباس بابر......اوکاڑہ
کیا کیا نظارے نہ یہاں تھے پہلے
پھول کلیاں و گلستاں تھے پہلے
اب وہاں خاک اور خون نظر آتا ہے
پھول ہی پھول جہاں تھے پہلے

✽ انجم ریاض......نیول کالونی، ڈالریاں کراچی
انہی راستوں پہ جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا تیرا ہمسفر کہاں ہے

❁ محمد اصغر علی ساجد......لاہور
موت آئے تو دن پھریں غالب
زندگی نے تو مار ہی ڈالا ہے

❁ احمد خان توحیدی......کراچی
ماہ ناز ہیں وہ پیکرِ اخلاص نوجوان
ہیں جو سرگرمِ عمل تن کی نہ دھن کی خاطر
ہم فقط جان چھڑکتے ہیں وطن پہ بھائی
اور وہ جان لٹاتے ہیں وطن کی خاطر

❁ طالب حسین طلحہ......نیو سینٹرل جیل ملتان
اے راہِ روانِ راہِ وفا ہم تم سے بہت شرمندہ ہیں
تم جان پہ اپنی کھیل گئے اور ہم سے ہوئی تاخیر بہت
اے شمعِ یقیں کے پروانو! اس دور سے تم کو کیا نسبت
یہ دورِ نمائش کا اس میں اخلاص ہے کم تشہیر بہت

❁ عثمان اشرف پنجرا......سینٹرل جیل کوٹ لکھپت
یوں تو میرے قتل کا تھا تیرگی میں اہتمام
برقِ خنجر کی جو چمکی دوست پہچانے گئے

❁ محمد بنارس خان تھوی......اٹک
دیکھنے والے یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں تجھے
پھر یہ وعدہ حشر کا صبر آزما کیونکر ہوا
پرسشِ اعمال سے مقصد تھا رسوائی میری
ورنہ ظاہر تھا سبھی کچھ کیا ہوا کیونکر ہوا

❁ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر......نئی منڈی سکھیکی
وفا میں بھی یہ ہنر اختیار کرنا ہے
وہ سچ کہے نہ کہے اعتبار کرنا ہے
یہ تجھ کو جاگتے رہنے کا شوق کب سے ہوا
مجھ کو تو خیر تیرا انتظار کرنا ہے

❁ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن، خانیوال
فرصت کبھی ملے تو ذرا یہ سوچنا
میں بھی ہوں تمہارا؟ یا تمہی صرف میرے ہو

❁ محمد اشفاق سیال......شورکوٹ سٹی
میں تو خود پر بھی کفایت سے اسے خرچ کروں
وہ ہے مہنگائی میں مشکل سے کمایا ہوا شخص

❁ سید محی الدین......اشفاق فتح پور، لیہ
اس نے پوچھا کہ اب بھی کرتے ہو محبت مجھ سے
میں بولا کہ لوگ آج بھی مجھے تیری قسم دیتے ہیں

❁ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان......فورٹ عباس
سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے
ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے
کتنا آسان تھا ترے ہجر میں مرنا جاناں
پھر بھی اک عمر لگی جان سے جاتے جاتے

❁ بشیر احمد بھٹی......فوجی بستی بہاولپور
خوشبو تیری باتوں کی بس ہے گلاب میں
تیری الفت کا نشہ نہیں ملتا شراب میں
ساری عمر نہ جاگیں گے ہم نیند سے
اگر تو وعدہ کر آنے کا خواب میں

❁ انیلہ رشید سیال......خیرپور (میرس)
شعلوں میں گھر گیا ہوں شاید
دعووں سے پھر گیا ہوں شاید
بھٹک رہا ہوں جابجا آوارہ
ترے دل سے اتر گیا ہوں شاید

❁ فیصل ربانی......سرگودھا
ترکِ تعلق کے سارے ہی مرحلے
میں سوچتا ہی رہا وہ پار کر گیا

❁ ریاض بٹ......حسن ابدال
سنگ باری ہے یہاں شیشہ گری کی اجرت
کیسے اس شہر میں آئینہ بنائے کوئی

❁ محمد اقبال......کورنگی، کراچی
تنکوں کی طرح بکھرا تھا میں زمانے میں
اک شخص نے یکجا کیا اور آگ لگا دی

❁ فرحان شیخ......پاک کالونی، کراچی
دل کے دورے سے ایک ہی پل میں
مرگ سرمایہ دار ہوتی ہے
اور غربت گزیدہ لوگوں کی
موت بھی قسط وار ہوتی ہے

❁ ادریس احمد......لاہور
ایک شخص ان آنکھوں میں شیش محل سا بنا گیا
دیکھوں میں جس طرح ایک وہی نظر آئے

❁ محمد نعمان ندیم......صدر، کراچی
اس طرح ٹوٹا ہے میرے اعتبار کا وجود
اب کوئی مخلص بھی ہو تو دل نہیں مانتا

❊ محمد عمیر......کراچی
کیسی تنہائیاں اس شخص نے سونپی ہیں مجھے
مجھ سے اب کوئی بھی تنہا نہیں دیکھا جاتا

❊ جبران احمد ملک......گلشن اقبال، کراچی
عید کے بعد وہ ملنے کے لیے آئے ہیں
عید کا چاند پھر نظر آنے لگا عید کے بعد

❊ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
اب تیری وضاحت میں صداقت نہیں لگتی
اب اپنی محبت کی صفائی نہ دیا کر

❊ ولید نت، امجد اقبال پچھی......ساہیوال
چاند دور جب افق میں ڈوبا
ترے لہجے کی تھکن یاد آئی

❊ راجہ ثاقب محمود جنجوعہ......پنڈدادن خان، جہلم
دریا کا دے ثبوت بھی دریا اگر ہے تو
پیاسوں سے مت سلوک مثالِ فرات کر

❊ امتیاز علی للہ......سرگودھا
اب تو تجھ سے رسمِ الفت ہی نبھا رکھی ہے
اس برے دل نے تیری تصویر چھپا رکھی ہے

❊ بشارت علی......ساہیوال
کسی کے دل میں اترنا ہے کارِ لاحاصل
کہ ساری دھوپ تو ہے آفتاب سے باہر

❊ زاہد علی خان......کوئٹہ
ابھی سے مجھ کو بتا دے اگر بچھڑنا ہے
نئی نئی ہے محبت تجھے بھلا دوں گا

❊ رائمہ......کورنگی، کراچی
کس لیے شام سے آبیٹھا ہوں گھر میں اپنے
گر ترے لوٹ کے آنے کا نہیں ہے امکاں

❊ حسان......لانڈھی، کراچی
پھر کوئی قیس کی مانند یہاں لہرائے
موج میں آئے ہوا، رقص کرے ریگِ رواں

❊ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
شام سے پہلے کہیں اپنا ٹھکانا کرلیں
صبح کو نکلیں تھے پھر اور جہانوں میں کہیں

❊ عامر علی......شاہ فیصل کالونی، کراچی
میں اس کا ہو کے رہا سب گمان ہوتے ہوئے
وہ میرے ساتھ رہا بھی تو فاصلے سے رہا

❊ بدر منیر......پشاور
دل بھٹکتا رہا یادوں کے گھنے جنگل میں
درد کے پھول کھلاتی رہی بے درد ہوا

❊ فاطمہ تبسم......حیدرآباد
اتنا غبار واقعی اڑتا ہے شہر میں
یا ہم کو ہی شناس یہ دھندلا دکھائی دے

❊ عذرا وقار......خانیوال
طفلانِ شہر میرے جنوں سے ہیں بے خبر
یا پھر جنوں نہیں ہے سزاوار سنگ بھی

❊ نعمان راحیل......لاہور
منظر میں کھل گئے ہیں دھنک کے تمام رنگ
بے رنگ آئینے سے وہ لمحہ گزر گیا

❊ فیض احمد......میانوالی
تباہ کر گیا اک لمحۂ خراب مجھے
کہ میں نے حلقۂ آوارگاں کو چھوڑ دیا

❊ جمعہ خان......پشاور
ہوا کی ابر کی کوشش تو پوری ہے
مگر دھوئیں کی طرح میں بکھرنے والا نہیں

❊ فرید احمد......فیصل آباد
مت دیکھ میرے چہرے پہ اڑتے ہوئے یہ رنگ
پہلے تو اپنی سرد نگاہی پہ غور کر

❊ مولا بخش......ملتان
مرے نہ ہونے کا قصہ سنا گیا مجھ کو
عجیب شخص تھا رستہ دکھا گیا مجھ کو

کوپن برائے شمارہ اکتوبر 2014

محفلِ شعر و سخن

نام : --

پتا : --

سازشوں کے جال میں پھنسے ایک وطن پسند کا احوال

مقابلہ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
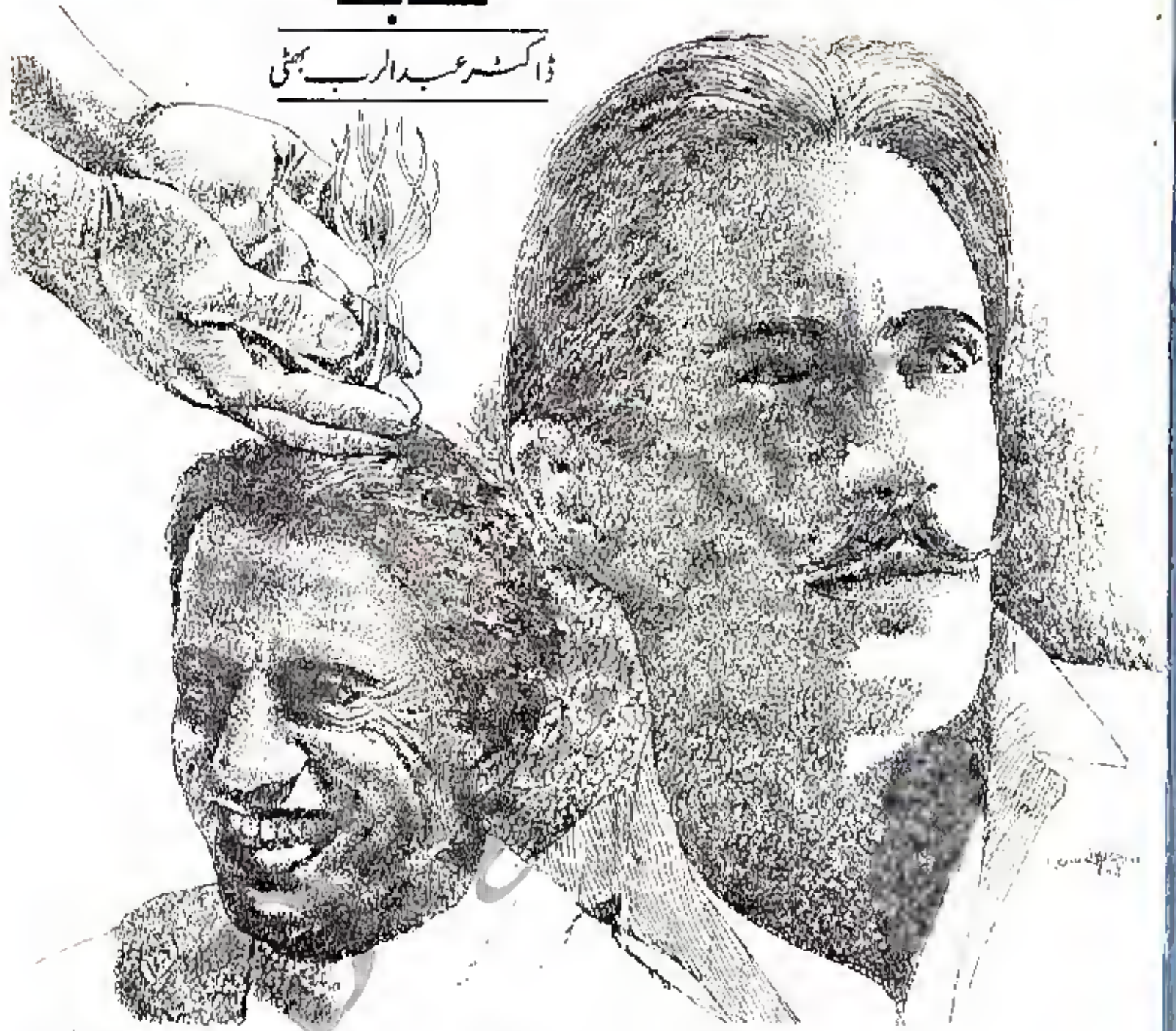
زندگی کا نصاب درسی کتابوں سے بہت مختلف ہوتا ہے جو زندگی گزر جانے کے بعد ضابطہ تحریر میں لایا جاتا ہے اور جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس پر عمل کرنے کا وقت بھی گزر چکا ہوتا ہے بس یہ ہی ایک نقطہ انسان کو بہت دیر بعد سمجھ آتا ہے۔ اسے بھی ایک مدت گزر جانے کے بعد یہ شعور آیا تھا لیکن اس طرح پچھتانے سے بھلا کبھی کچھ ہاتھ آتا ہے۔

کچھ تجربات ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے انسان کی زندگی بدل جاتی ہے اور مجھے یقین تھا کہ اس تجربے سے میری زندگی بھی بدلنے والی تھی۔ شاید میں بھی ایک ایسے ہی تجربے سے دوچار ہوا ہوں۔ اس بات کا احساس مجھے

''سخت گیری'' کے ذریعے فتح نامی کتاب کا آخری صفحہ پڑھتے ہی ہوگیا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد میں نے اسٹیریو کو پورے والیوم کے ساتھ کھول دیا تھا تاکہ من پسند موسیقی سے محظوظ

ہوسکوں پھر جوتے اتار کر میں ایک صوفے پر دراز ہوگیا اور کتاب کا مطالعہ کرنے لگا۔ دس منٹ بعد میں مسحور کن موسیقی کی طرف سے غافل ہوکر کتاب میں ڈوب چکا تھا۔

اس کتاب کا مصنف غیر منقولہ جائداد کا کاروبار کرنے والا ایک کامیاب آدمی تھا۔ اچانک دروازے پر دستک کے دھماکے گونجنے لگے جیسے کسی نے سائلنسر لگے ریوالور سے فائرنگ شروع کردی ہو۔ میں نے کتاب کو بند کر کے میز پر رکھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

فلیٹ نمبر R-7 میں رہنے والا میرا پڑوسی کالوشیدی المعروف شب بجور ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا، غالباً وہ دروازے کو کھٹکھٹانے کے لیے دوسری بار ہاتھ اٹھا رہا تھا کہ میں نے دروازہ کھول دیا اور اس کا ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا...... وہ میرا ہم عمر تھا لیکن جسمانی طور پر مضبوط تھا تاہم چھتیس برس کی عمر میں اس کے بال جھڑ گئے تھے اور وہ ادھیڑ عمر کا ایک موٹا آدمی نظر آنے لگا تھا۔

''تمہارا اسٹیریو......'' اس نے کہا۔ اس کا گول چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ ''اگر تم اس کی آواز کچھ کم کرلو تو میں تمہارا شکر گزار ہوں گا۔ بہت رات ہوگئی ہے اور مجھے کل صبح جلدی اٹھنا ہے۔''

''یقیناً......'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ کتاب کے ابواب میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے اور میں نے دھڑ سے دروازہ گویا یوں بند کیا جیسے کالوشیدی کے منہ پر دے مارا ہو۔

میں اپنے پڑوسیوں کے ساتھ الجھنا پسند نہیں کرتا تھا مگر کالوشیدی کی ان بار بار کی شکایتوں سے تنگ آچکا تھا، بہرطور...... میں اپنے اسٹیریو کے قریب پہنچا۔ چاہتا تھا کہ آواز دھیمی کردوں لیکن میرا ہاتھ اسٹیریو سے چند انچ کے فاصلے پر رک گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہ شخص خود کو دسویں منزل کا مالک سمجھتا ہے؟ میں بھی تو اپنے فلیٹ کا کرایہ دیتا ہوں اور مجھے بھی دوسروں کی طرح حق حاصل ہے کہ اپنی مرضی سے زندگی بسر کروں...... ممکن ہے یہ آدمی اس خیال میں ہو کہ یہاں کا سب سے پرانا کرائے دار ہے۔

بہرطور...... میں نے آواز کم نہیں کی اور پلٹ کر صوفے کی طرف بڑھا، ایک بار پھر کتاب اٹھائی اور مطالعے میں مصروف ہوگیا۔ میں نے کتاب کا تیسرا باب شروع کیا...... بے ہنگم موسیقی کے تیز سروں سے در و دیوار کانپنے لگے تھے، میں کتاب پڑھتا رہا اور کتاب ختم کرنے تک دروازے پر دوبارہ دستک سنائی نہیں دی۔ میرا سینہ پھول گیا۔ سر دھن کے سوچا کہ واقعی سخت گیری کے ذریعے فتح حاصل کی جاسکتی ہے۔

جب میں سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو بہت خوش تھا، اس کتاب نے تو میری کایا ہی پلٹ دی تھی، اس کتاب نے یہ خوشگوار تبدیلی زندگی کے بہت مناسب وقفے میں پیدا کی تھی، درحقیقت میں محکمۂ صحت میں اسٹیبلشمنٹ برانچ میں سینئر کلرک تھا اور آفس سپرنٹنڈنٹ کی سیٹ حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہا تھا اور اس سلسلے میں میر محمد میرا سخت حریف تھا جبکہ انتظامیہ غور کر رہی تھی کہ ہم دونوں میں سے اس سیٹ کے لیے کون موزوں ثابت ہوگا؟ میری کامیابی یقینی نہیں تھی اور میں بڑی حد تک بددل ہوگیا تھا لیکن اس تبدیلی کے بعد میں اپنی کھوئی ہوئی خود اعتمادی کو بحال کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

☆☆☆

''صبح بخیر......'' اس روز میرے حریف میر محمد نے آفس کے کوریڈور میں داخل ہوتے ہوئے کہا مگر میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسے الجھن میں مبتلا رہنے دیا جائے۔ کم ازکم اسے میری اہمیت کا احساس تو ہوجائے گا، جب میں اور وہ کاریڈور کے سرے پر پہنچ کر جدا ہونے لگے تو میں نے اپنے حریف کے چہرے پہ الجھن کے تاثرات دیکھے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں خوشی کا نعرہ لگایا۔ کتاب کے دوسرے باب میں حریف کی پہلی لڑکھڑاہٹ کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا وہ بالکل ایسا ہی تھا۔ دوپہر کے وقت میں کھانے کے لیے فوراً ہی نہیں اٹھا بلکہ اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا حتیٰ کہ میر محمد چلا گیا۔ اس کے بعد میں اس ریسٹورنٹ میں گیا جہاں میر محمد دوپہر کے کھانے کے لیے جاتا تھا۔ میں نے اپنے حریف کے قریب سے گزرتے وقت سرسری انداز میں ہاتھ لہرایا اور آگے بڑھ گیا۔ میرا رخ ریستوران کے اس حصے کی طرف تھا جہاں نسبتاً مہنگا کھانا ملتا تھا اور میر محمد اسے دیکھ بھی سکتا تھا۔

میں نے اپنے لیے مٹن کڑاہی، نان اور چکن بریانی کا آرڈر دیا اور پہلے کولڈ ڈرنک منگوا کر پینے لگا۔ ساتھ ہی میں کن انکھیوں سے میر محمد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے تسلی ہوگئی تھی کہ وہ میری طرف ہی دیکھ رہا تھا پھر میں بار بار اپنی دستی گھڑی کی طرف اس انداز سے دیکھنے لگا جیسے مجھے کسی کا انتظار ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈیڑھ بجے میر محمد نے ٹریژری آفس جانا تھا اور اسے یہ معلوم نہیں ہوسکے گا کہ میں کس کا انتظار کر رہا تھا۔

بہرطور...... میں سوچ رہا تھا کہ جب میر محمد چلا جائے

گا تو میں کم خرچ والے حصے کی طرف جا کر دوپہر کا کھانا زہر مار کرلوں گا۔ وہاں رش زیادہ تھا۔ یہاں کا ویٹر مجھے غائب پا کر خود ہی اپنا سامنہ لے کر رہ جائے گا۔ میں جانتا تھا کہ ہیوی لنچ کے آرڈر کے پورا ہونے میں نصف گھنٹا تو لگتا ہی تھا...... میں یہ بھی جانتا تھا کہ میر محمد نے کم از کم وہ کتاب نہیں پڑھی تھی جس کا مطالعہ میں نے کیا تھا، بہر طور...... وہ اٹھا اور میری طرف بڑھا۔ وہ مسکرا رہا تھا لیکن میں محتاط رہا، میں اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکرا کر نہیں دینا چاہتا تھا۔

''عزیز!'' میر محمد نے کشادہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''تمہیں... کس کا انتظار ہے؟''

''اوہ...... ہاں! ایک دوست کا۔''

''تم نے آج آفس میں مجھ سے بات تک نہیں کی، مجھے امید ہے کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی ہوگی؟''

''نہیں...... غالباً میں آج کچھ مصروف رہا تھا۔''

''یہ کوئی اچھی بات نہیں۔'' میں نے سوچا۔ وہ کھڑا ہے اور میں بیٹھا ہوا ہوں لہٰذا میں بھی کھڑا ہو گیا۔

''کیا تم جا رہے ہو؟''

''غالباً...... تمہارا خیال درست ہے۔''

میں نے دانستہ میر محمد کی ٹائی پہ نگاہ گاڑ دی وہاں سالن کا دھبا لگا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میر محمد کو اس بات کا علم نہیں تھا یا پھر ممکن ہے وہ بے پروائی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

''اور تمہارے اس دوست کا کیا ہوگا...... جس کا تم ابھی بیٹھے انتظار کر رہے تھے؟''

''وہ پھر کسی وقت ملاقات کر سکتا ہے۔'' میں نے کہا اور کولڈ ڈرنک ختم کر کے ہونٹوں کو رومال سے پونچھا اور بولا۔ ''دفتر میں تم سے ملاقات ہوگی۔'' اور میں پھر میر محمد سے پہلے ہی ریستوران سے نکل گیا۔

تاہم ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے پارکنگ کی طرف بڑھے جہاں میں نے اپنی کار میر محمد کی گاڑی کے قریب کھڑی کی تھی۔ میری گاڑی نئی تھی اور میں نے حال ہی میں اس پر رنگ کروایا تھا۔ پالش چمک رہی تھی، میں نے میر محمد سے مخاطب ہوئے بغیر دروازہ کھولا اور اپنی چمکدار سوزوکی مہران میں بیٹھ گیا۔ گیٹ کی طرف ڈرائیو کرتے وقت میں نے میر محمد کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا، میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ کار کے معاملے میں تو میں اپنے حریف سے ممتاز تھا۔

☆☆☆

اس شام جب میں اپنے فلیٹ کے دروازے پر پہنچا تو میرا پڑوسی کالو شیدی المعروف شب دیجور اپنے دروازے سے سلوٹیں پڑے ہوئے کوٹ کے بٹن بند کرتا ہوا باہر نکلا۔ اس نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا اور کچھ کہے بغیر تیز تیز چلتا ہوا لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

اس رات میں نے کتاب مذکورہ کے تیسرے باب کا ایک بار پھر مطالعہ کیا اور اس بار بھی مصنف کی مؤثر اور سادہ بیانی نے مجھے متاثر کیا۔ واقعی اس کتاب کی تو ہر بات قابلِ عمل تھی۔ میں نے کتاب میں دی گئی ہدایات کے مطابق میر محمد کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا تھا وہ یقیناً اثر انداز ہوا تھا۔ کتاب میں یہ بھی لکھا تھا کہ بعض اوقات کسی تکنیک کے اثرات ذرا دیر سے ظاہر ہوتے ہیں لیکن اس لمحے صورتِ حال نے مجھے غصہ دلا دیا۔ میرے کانوں سے اپنے پڑوسی کالو شیدی کی واپسی کی آہٹیں ٹکرا رہی تھیں۔ میں نے اسٹیریو کا والیوم بڑھا دیا اور سوچنے لگا کہ کیا اس کتاب کی تکنیک کالو شیدی جیسے پڑوسیوں پر بھی مؤثر انداز میں آزمائی جا سکتی ہیں؟ میں جانتا تھا کہ ذاتی طور پر سب کے سب یکساں ذہنیت کے مالک ہیں، میں اس رات اطمینان کی نیند سویا کیونکہ ہر طرح سے مطمئن تھا کہ منزلِ مقصود کے قریب تر پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز میں نے دفتر میں کتاب کے چند اصولوں کو آزمانے کی کوشش کی جہاں ای ڈی او ایچ (EDOH) یونیسیف سے ملنے والے ایک نئے ہیلتھ پروجیکٹ سے متعلق ہم دونوں امیدواروں کے لیے ہدایات دینے والا تھا۔ اس پروجیکٹ میں کافی فنڈ ملنے کی توقع تھی اور یہ بات میرے علم میں تھی، ایریا فیجنگ انچارج میٹنگ میں ابھی تک نہیں پہنچا تھا جبکہ میں نے میر محمد کی دعوت کو رد کرتے ہوئے بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں بیٹھنے کے بجائے آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا اور کبھی کبھی کن انکھیوں سے میر محمد کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔

میر محمد پرسکون نظر آ رہا تھا۔ ''میرا خیال ہے......'' میر محمد نے کہنا چاہا۔ ''ہمیں مزید اخراجات بڑھائے بغیر ایسی صورتِ حال پیدا کرنی ہے جس سے......''

''میں کئی امکانی باتوں پر غور کر چکا ہوں۔'' میں نے دانستہ اتنی دھیمی آواز میں کہا کہ میر محمد کو کچھ سنائی نہیں دیا۔

''کیا تم ذرا بلند آواز میں نہیں بول سکتے مسٹر عزیز بیگ؟'' میر محمد نے درخواست کی۔ میرا جسم غصے کی سرد لہر سے کانپ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرا حریف مجھے پاگل کر دینا

چاہتا ہے...... میں جواباً یہ چاہتا تھا کہ میر محمد مجھ سے نفرت کرنے لگے اور اس طرح خوف زدہ ہو جائے کہ میرے سامنے سر اٹھانے کی بھی ہمت نہ کر سکے۔

جب ایریا انچارج دفتر میں داخل ہوا تو میں نے اس کا استقبال کیا، لیکن انداز میرا ایسا ہی تھا جیسے میں خود کو تو وارد کا ہم رتبہ خیال کر رہا ہوں۔ یہ تکنیک کتاب کے نویں باب میں لکھی ہوئی تھی۔ میں نے تکنیک پر عمل کیا لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ایریا انچارج نے میری بات کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

انچارج ہدایات دے رہا تھا تو میری نظریں میر محمد پر جمی ہوئی تھیں جو اب واقعی حیران نظر آ رہا تھا۔ میرے رویّے نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

''عزیر!'' معاً انچارج سہیل احمد نے میری طرف دیکھا۔ ''کیا تم سن رہے ہو؟''

''ہاں جناب...... یقیناً'' میں نے فوراً جواب دیا۔

بیک وقت حریف کو گھورنے اور سننے کے عمل پر توجہ دینا بہت مشکل کام تھا۔ میں سوچنے لگا کہ شاید میں نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر زیادہ محنت نہیں کی ورنہ یہ مشق اس الجھن کو دور کر سکتی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میر محمد مسکرا رہا ہے۔ ناامیدی نے میرے دل کو آہنی پنجے کی طرح مٹھی میں لے لیا، اس دن میں کام نہیں کر سکا اس لیے سارا کام گھر ساتھ لیتا گیا۔

شام کا بیشتر حصہ ضروری مائیکرو پلاننگ پر سوچ بچار کرتے ہوئے گزر گیا۔ جب میری آنکھیں دکھنے لگیں اور سر گھومنے لگا تو میں نے کام اٹھا کر الگ ڈال دیا اور لیٹ کر اپنی پسندیدہ موسیقی سے محظوظ ہونے لگا، اس دوران بھی میرا ذہن مسلسل میر محمد کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ آواز مدھم تھی کیونکہ اسٹیریو والیوم ... کھلا ہوا تھا۔ میں نے ان آوازوں کو نظر انداز کر دیا۔ اسٹیریو کی آواز بھی کم نہیں کی اور اس طرح مجھے عجیب سی طمانیت اور فتح مندی کا احساس ہوا۔

جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں اسے نظر انداز نہ کر سکا۔ دل ہی دل میں فون کو برا بھلا کہتے ہوئے میں صوفے سے اٹھا اور ریسیور اٹھا لیا۔ جب میرے کانوں سے پڑوسی کالوشیدی عرف شب دیجور کی آواز ٹکرائی تو نفرت سے میرا منہ سکڑ گیا۔

''جناب عزیر بیگ صاحب! آپ نے میری دستک کا جواب نہیں دیا۔ براہِ کرم اپنے اسٹیریو کی آواز کم کر دیں، میں شدید کرب کی حالت میں ہوں...... میری پوری فیملی طبیعت کی خرابی میں مبتلا ہے اور میرا بھائی اسپتال میں......''

پڑوسی کالوشیدی کے لہجے میں جو استدعا تھی اس سے مجھے مزید شہ ملی۔ میں نے جرأت مندی سے کہا۔

''مجھے تمہارے خاندانی مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''میں بھی تم سے کوئی توقع نہیں رکھتا، جناب عزیر احمد بیگ صاحب! لیکن اپنے اسٹیریو کی آواز تو کم کر دو۔''

''اوہ ٹھیک ہے شیدی صاحب! میں آواز کم کیے دیتا ہوں۔'' میں نے شریر لہجے میں کہا۔ کتاب کے ساتویں باب میں لکھا تھا کہ اقرار تو کر لیجیے لیکن کیجیے وہی جو جی میں آتا ہو۔ میں اسٹیریو کی طرف آنکھ اٹھائے بغیر صوفے پر لیٹ گیا۔ اسٹیریو سے موسیقی کا شور بلند ہوتا رہا اور میرے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں رہی۔ ان دنوں عمارت کا منیجر بھی کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ کالوشیدی پولیس کو فون کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

میں صوفے پر لیٹے لیٹے سو گیا۔

چار بجے میری آنکھ کھلی تو اسٹیریو سے بے ہنگم موسیقی کا شور مسلسل بلند ہو رہا تھا۔ ٹیپ نہ جانے کتنی بار خود ہی گھوم کر دوبارہ شروع ہوا تھا۔ ایک وحشیانہ رقص کی دھن تھی جس سے کمرے کے در و دیوار کانپ رہے تھے۔ کالوشیدی نے دوبارہ فون نہیں کیا...... ممکن ہے کیا بھی ہو...... اور میں نے نیند کی حالت میں نہ سنا ہو۔

☆☆☆

صبح کے وقت اتفاق سے کالوشیدی اور میں ایک ساتھ لفٹ میں سوار ہوئے۔ میں نے اپنے پڑوسی کی طرف دیکھا وہ چہرے سے بیمار نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے تھے، آنکھیں اداس تھیں اور چہرہ زرد نظر آ رہا تھا۔ میں براہِ راست اس کی طرف دیکھنے لگا لیکن کالوشیدی نے ایک بار بھی نگاہ اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ میں نے نگاہوں میں کالوشیدی کے جسم کو تولنا چاہا اور پھر دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔ کتاب کے آٹھویں باب میں صاف لکھا تھا کہ کسی سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، خوف درحقیقت ایک ایسا وہم ہے جو آدمی کو بزدلی کی موت مار ڈالتا ہے۔ دنیا اس کی ہے جو بے جگری کا مظاہرہ کرے اور میں خود کو ایسا ہی آدمی سمجھنے لگا تھا۔

کالوشیدی کا معاملہ میرے لیے ایک دلچسپ مشق کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اصل اہمیت تو میر محمد کی تھی جسے میں خاص طور سے شکست دینا چاہتا تھا۔ اس نے ذرا سی گھبراہٹ اور الجھن ضرور ظاہر کی تھی لیکن وہ بہت زیادہ خوف زدہ نہیں ہوا

تھا۔ اس پر میری تقریباً ہر تکنیک رائگاں جارہی تھی۔

ہفتے کے آخری دن ہم دونوں کو اپنی اپنی رپورٹ پیش کرنا تھی۔ اس روز میں شام تک دفتر میں رہا حتیٰ کہ ہر آدمی رخصت ہوگیا۔ میں خاموشی سے میر محمد کے آفس روم میں گھس گیا۔ میرے سینے کا تموج طوفانی ہورہا تھا۔ سانس کی آواز خود مجھے سنائی دے رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا کتاب کا مصنف بھی ان حالات میں ایسی ہی حالت کا شکار ہوا ہوگا، یا نہیں؟ وہ ایک پُرسکون آدمی تھا اور گھبرانے کا قائل ہی نہیں تھا۔ یہ بات پانچویں باب میں صاف صاف لکھی ہوئی تھی۔

میری اور میر محمد کی ترقی کا انحصار اس رپورٹ پر تھا۔ اس رپورٹ میں ہمیں یہ ظاہر کرنا تھا کہ کس طرح کم خرچ میں زیادہ پرابلم حل کیے جاسکتے ہیں۔ میں نے میر محمد کی میز پر پھیلے کاغذات کو دیکھا پھر درمیانی دراز میں وہ رپورٹ مل گئی۔ یہ کئی صفحات پر مشتمل رپورٹ تھی۔ میں نے دیکھا اور چونک پڑا۔ میر محمد نے جن اشیا کا ذکر کیا تھا ان پر واقعی کم خرچ سے مسئلہ حل ہوسکتا تھا۔ میرے حلق سے ایک طویل سانس خارج ہوگئی۔

میں اس رپورٹ کو لے کر اپنے کمرے میں واپس آگیا۔

میں نے میر محمد کی رپورٹ میں چند تبدیلیاں کیں اور اسے دوبارہ میر محمد کی دراز میں رکھ آیا۔ اس رات میں واپس گھر آیا تو میرا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ میں نے اپنا مسکراتا ہوا چہرہ آئینے میں دیکھا اور رات کے کھانے کے ارادے سے باہر نکلتے نکلتے اسٹیریو کو پوری آواز میں کھول دیا تاکہ نقب زنوں کی حوصلہ شکنی ہوسکے۔ دروازہ مقفل کرکے میں لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

اگلے دن ایریا انچارج سہیل احمد نے مجھے بتایا کہ ڈائریکٹر آفس میں میرا تقرر کردیا گیا ہے۔ میری رپورٹ اتنی شاندار تھی کہ میر محمد کے بارے میں غور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کیا اور مجھ سے ایسا برتاؤ کیا جیسے میں واقعی اس کا ہم رتبہ تھا۔

کتاب کے تیسرے باب کی تکمیل ہوئی تھی اور سب کچھ سچ ثابت ہوا تھا۔ میں نے میر محمد جیسے ذہین آدمی کو شکست دے دی تھی۔

میر محمد کی حالت دیکھنے والی تھی مگر میرے دل میں اس کے لیے ذرا سا بھی رحم کا جذبہ نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ ترقی کرنے کے لیے زندگی میں بعض اوقات ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔

میں کبھی کبھار پی پلا لیا کرتا تھا لیکن اس رات میں فتح کا جشن منانا چاہتا تھا، گھر سے قریب ہی ایک نیم تاریک سی بیٹھک تھی جہاں میں کبھی کبھی اپنے دوستوں کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ میں وہیں چلا گیا اور خوب چھک کر شراب پی، تنہا تھا اس لیے کچھ زیادہ ہی چڑھا گیا۔ جب میں گھر واپس آیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں نے ضرورت سے کہیں زیادہ پی لی ہے۔

میں نے دیکھا کہ ہال کمرے کے قالین پر کانچ کے کچھ ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں، یہ بات میں نے قفل میں چابی گھماتے ہی محسوس کرلی تھی۔

اندر داخل ہوتے وقت میں لڑکھڑا گیا۔ نشے سے میری حالت تباہ تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کہ میرے اسٹیریو کا قیمتی کیبنٹ تباہ ہوچکا ہے۔ ٹیپ کا فیتہ پورے کمرے میں پھیلا ہوا تھا۔ قیمتی میز کے کئی ٹکڑے ہوچکے تھے اور کمرا کسی کباڑی کی دکان نظر آرہا تھا۔ میرا سارا نشہ ہرن ہوگیا اور میری مٹھیاں سختی سے بھنچ گئیں۔

''میرے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا حل نہیں تھا۔'' معاً عقب سے معذرت خواہانہ آواز سنائی دی۔ میں نے چونک کر پلٹ کے دیکھا۔ دونوں ہاتھ گود میں رکھے میرا پڑوسی کالوشیدی عرف شب دیجور صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔

''میں ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔'' اس نے پھر کہا۔ ''میرا پورا گھر بیمار پڑا ہوا ہے۔ تم نے مجھے مجبور کردیا کہ میں تم سے نفرت کروں۔ تم یہ چاہتے تھے کہ میں تم سے خوف زدہ ہوجاؤں......''

مارے غیظ و غضب کے میرا چہرہ سرخ ہونے لگا، میں گھونسا تان کر آگے بڑھا۔

''تم کو اس نقصان کی رقم ادا کرنی پڑے گی، میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔''

''مجھے افسوس ہے کہ ادائیگی تمہیں کرنا پڑے گی، عزیز بیگ صاحب!''

یہ کہہ کر کالوشیدی کرسی سے اٹھا اور وہی کلہاڑا اٹھالیا جس سے اس نے کمرے کی ایک ایک چیز کو توڑ ڈالا تھا۔ یہ کلہاڑا اس نے گلی میں لگے ہوئے آگ بجھانے کے سامان سے اٹھایا تھا۔ جب کلہاڑا کالوشیدی کے سر سے بلند ہوکر ہوا کو چیرتا ہوا میری کھوپڑی کی طرف گر رہا تھا تو میرے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی کہ کتاب کے مصنف نے فکر و عمل میں تضاد کے مرض پر کچھ لکھا تھا یا نہیں......

ماروی

محی الدین نواب

دسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی
کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی
کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو
یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو
یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوس
قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان
کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا باد و باراں
کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور
کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی
کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ
بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان
کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا
اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں
چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک
دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی
دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا
نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو
کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی
بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس
مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیر اور
لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے
تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ
لمحہ روداد کو سمیٹتی، نئے رنگ و آہنگ کا تحیر خیز سنگم۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمہر داد اور چاچی منشی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا۔ چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ اس رات زلیخا نے اسے ایک قیمتی ہار بھی تحفتاً دیا تھا۔ گاؤں سے فرار ہوکر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کرچکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی بربادکر کے قتل کردیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگادیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا۔ ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف تجلی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مر مٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بطور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد کو شادی کے لیے ایک لاکھ کی ضرورت تھی۔ محبوب نے زلیخا کے دیے ہوئے ہار کو ایک لاکھ میں خریدنے کی پیشکش کی لیکن مراد راضی نہ ہوا۔ اسی دوران مراد کے گھر چوری کی واردات ہوئی اور چور نقد رقم کے ساتھ زلیخا کا وہ ہار بھی لے گئے لیکن پکڑے گئے یوں مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرے باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں راجہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی یہ بات پارٹی کے لیڈر تک پہنچ گئی نتیجتاً چانڈیو استعفا دے کر چلا آیا۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو ہار کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ جو کہ جیلر کی بیٹی ہے دیگر دو ساتھی بہرام اور دارا اکبر کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی اور اس سے شادی اسے ورغلا کر ماروی سے دور کر رہی تھی جبکہ ماروی پر بھی دباؤ تھا کہ وہ محبوب سے شادی کرلے لیکن دونوں اپنے عشق پر قائم تھے۔ مقدمے کو معلوم نہیں کب تک چلنا تھا لیکن محبوب نیک نیتی سے ان کا مددگار تھا اور حتیٰ کہ جب ماروی محبوب کے احسانات سے بچنے کے لیے جان بوجھ کر غائب ہوگئی جس میں سمیرا بھرپور مدد کر رہی تھی تاکہ محبوب ماروی کی مدد سے باز آجائے مگر اس خبر کے بعد وہ دلبرداشتہ ہوکر خود مراد کی جگہ جیل میں قید ہوگیا جبکہ دوسری جانب ماروی کی تلاش کا لالچ دے کر مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ جبکہ دوسری جانب سمیرا اور تجلی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ ایک موقع پر مرینہ مراد کا پیچھا کرتے ہوئے راستے میں ماروی تک پہنچ گئی اور محبوب سے فون پر اپنے باپ کے ذریعے رابطہ کرایا تو اس خبر سے محبوب میں نئی زندگی دوڑ گئی۔ مرینہ اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ مگر قسمت کی دیوی مراد پر مہربان تھی جو مرینہ کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔ اتفاق سے راستے میں ماروی چاچی اور چاچا کے ساتھ اس کے ہاتھ لگ جاتے ہیں لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہوجاتا ہے کہ مرینہ ماروی کو جام تماچی کے چوہدری کے پاس لے جارہی ہے لہٰذا مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے وہ ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگتی ہے جس کے باعث اس کی یادداشت چلی جاتی ہے اور یہ صورت حال محبوب اور مراد دونوں کے لیے پریشان کن ہوتی ہے۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوجاتا ہے مگر یہ بات جیلر یا مرینہ کسی کو کانوں کان پتا نہیں ہوتی۔ البتہ تجلی صاحب اور سمیرا کے علم میں یہ بات آجاتی ہے۔ محبوب اور مراد کے جگہ بدل لینے سے حالات بھی بدلتے جارہے تھے۔ ادھر چوہدری کی بیوی اپنی چال میں کامیاب رہی اور چوہدری وقفہ رفتہ موت کے منہ میں جاتا رہا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جارہا تھا۔ مرینہ کے پالتو غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کر لے جاتے ہیں۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مرجاتا ہے۔ جس کی بہت شہرت ہوتی ہے اور مراد ہیرو ٹھہرتا ہے۔ دوسری جانب ماروی کے علاج کے لیے باہر سے ایک ڈاکٹر عدیلہ کو بلایا جاتا ہے جو خود بھی دوہری شخصیت کا شکار ہے۔ وہ عدیلہ بھی ہے اور عدیل بھی۔ مرد بھی ہے اور عورت بھی۔ عدیلہ کی باتوں میں کچھ ایسی اپنائیت تھی کہ ماروی اس کے قریب ہوتی چلی گئی تاہم اسے علم نہیں تھا کہ وہ دوہری شخصیت کی مالک ہے ادھر عدیلہ بھی ماروی میں دلچسپی محسوس کرنے لگی۔ مراد بھی محبوب کے گھر پہنچ گیا تھا مگر ماروی محبوب اور مراد دونوں کو پہچاننے کی کوشش میں تھی مگر اسے کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ ماروی کو عدیلہ کی حقیقت کا علم ہوگیا اور اس نے عدیلہ کو سختی کے ساتھ خود سے دور رہنے کا کہا۔ عدیلہ لندن چلی گئی۔ ادھر غیر ملکی ایجنٹ نے مراد کو قتل کرنے کا حکم دیا اس پر حملہ ہوا تاہم وہ بچ گیا۔ مراد نے ایک ایجنٹ کو پکڑ لیا اور اب وہ اس کے ساتھ موٹر بائیک پر نامعلوم منزل کی طرف جارہا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہاں اسپتال میں حماد گولی کھا کر گرا تھا۔ اس کے ماتحتوں نے اسے سنبھالنے کے لیے اک ذرا فائرنگ روک دی۔ دشمن کو نظر انداز کر کے دوڑتے ہوئے اپنے افسر کے پاس آگئے تھے۔ ایسے ہی وقت دشمن کو اسپتال سے باہر جانے کا موقع مل گیا تھا۔

زخم گہرا نہیں تھا۔ حماد کو فوراً ہی طبی امداد مل گئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ ہماری فائل میں اس کا نام بلال احمد ہے لیکن وہ بلّے کے نام سے مشہور ہے۔ بڑی کامیاب وارداتیں کرتا آرہا ہے۔ اسی لیے غیر ملکی ایجنسیاں اکثر اس سے کام لیتی رہتی ہیں۔

''کمبخت یہاں بھی ناکام نہیں رہا۔ ملنگا کو گولی مار گیا مگر میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ اسے یہ شہر، یہ ملک چھوڑنے سے پہلے دبوچ لوں گا۔''

وہ فون پر کسی سے رابطہ کرتے ہوئے بولا۔ ''بلال احمد عرف بلّا ابھی پیو ملنگا کو قتل کر کے فرار ہوا ہے۔ فوراً تمام راستوں کی ناکابندی کراؤ۔''

وہ زخم کی تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ ''اسے شہر سے باہر نکلنے نہ دو۔ پلیز مجھے کال کرتے رہو۔ بتاتے رہو کہ اسے کس طرح گھیرا جا رہا ہے۔''

اس نے فون بند کر کے ساتھیوں سے کہا۔ ''باہر ہمارا ایک قیدی ہے۔ وہاں مراد ایک کار کے پاس ہے۔ اسے قیدی کے ساتھ یہاں لے آؤ۔''

اس کے دو ماتحت اسپتال کے باہر گئے پھر تھوڑی دیر بعد قیدی کو اسٹریچر پر لے آئے۔ ایک نے کہا۔ ''وہاں مراد نہیں ہے۔ یہ ایک کار کی اگلی سیٹ پر پڑا ہوا تھا۔''

حماد نے اس سے پوچھا۔ ''مراد کہاں ہے؟''

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ ''میں کیا بتاؤں اس نے میری ایسی حالت کی ہے کہ مجھے اپنا ہوش نہیں ہے۔ آپ کو خدا کا واسطہ مجھ پر اور ظلم نہ کریں۔''

حماد نے ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''جس کے لیے کام کر رہے ہو اس کا نام بتا دو ورنہ اس سے بھی زیادہ بری درگت بنائی جائے گی۔''

وہ قسمیں کھانے لگا کہ کسی واردات کرنے والے بڑے مجرم کو نہیں جانتا۔ موجودہ واردات میں وہ بلّے کا ماتحت تھا۔ اس کے حکم کے مطابق کام کر رہا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ اس سلسلے میں بلّا ہی اصل مجرم کی نشاندہی کر سکتا تھا۔ حماد مجرموں تک پہنچنے میں بری طرح ناکام رہا تھا۔

حماد نے مایوسی سے سر جھکا لیا۔ اس نے جھنجلا کر کہا۔ ''لعنت ہے۔ یہ مراد کہاں مر گیا ہے؟ میں نے اسے ایک ذمے داری سونپی تھی۔ اسے قیدی کے پاس رہنا چاہیے تھا۔''

ایک ماتحت نے کہا۔ ''اسے آپ کی اجازت کے بغیر کہیں نہیں جانا چاہیے تھا۔ پھر بھی وہ قیدی کو ناکارہ بنا کر گیا ہے اسے بھاگنے کے قابل نہیں چھوڑا ہے۔''

حماد نے فون پر نمبر پنچ کیے پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ ''محبوب صاحب! میرا اندیشہ درست ہوا ہے۔ دشمنوں نے پیو ملنگا کو بیان دینے سے پہلے ہلاک کر دیا ہے۔ فی الحال یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ مراد صاحب کو کون اور کیوں قتل کرانا چاہتا ہے؟''

محبوب نے کہا۔ ''میں بہت پریشان ہوں۔ بیٹھے بٹھائے یہ نئے خطرناک دشمن پیدا ہو گئے ہیں۔''

وہ ڈرائنگ روم میں چاچا اور چاچی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے صوفے پر ماروی تشویش بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی کن انکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''وہ خطرناک اس طرح بھی ہیں کہ ان کی دشمنی ایک سے ہوگی لیکن دو ہم شکل ان کے نشانے پر رہیں گے۔''

حماد نے کہا۔ ''یہی تو پریشانی کی بات ہے کہ خوامخواہ آپ سے دشمنی کی جائے گی اور آپ اپنی جان بچاتے پھریں گے۔''

''حماد! کسی طرح ان دشمنوں سے رابطہ کرو۔ بڑی سے بڑی قیمت پر ان سے صلح کرو۔ ان پر یہ اچھی طرح واضح کر دو کہ محبوب اور مراد دو الگ ہستیاں ہیں۔''

''بہت مشکل ہے۔ برنارڈ سے تعلق رکھنے والے مجرم جرائم کی دنیا کے بے لگام حکمراں ہوں گے۔ اوّل تو ان سے رابطہ ہی نہیں ہو سکے گا۔ ہوگا بھی تو وہ سیدھے منہ بات نہیں کریں گے۔

''اب تو مراد آخری سانسوں تک ان کے آگے آگے بھاگتا اور چھپتا رہے گا۔ آپ کو بھی ہمیشہ انتہائی سخت سیکیورٹی میں رہنا ہوگا۔''

پھر اس نے پوچھا۔ ''آپ ابھی کہاں ہیں؟''

''میں ماروی اور چاچی چاچا کے پاس کوٹھی میں ہوں۔''

''کیا مراد وہاں آگیا ہے؟''

''نہیں میں تو اسے تمہارے پاس اسپتال کے احاطے میں چھوڑ کر آیا ہوں۔''

''وہ یہاں تھا پھر اچانک ہی کہیں چلا گیا ہے۔ وہ بہت ہی بے پروا اور غیر ذمے دار ہے۔ یہ جانتا ہے کہ دشمن ملک الموت بنے ہوئے ہیں پھر بھی کہیں گھومتا پھر رہا ہے۔''

"اتنی دیر ہوگئی ہے۔اسے یہاں آجانا چاہیے تھا۔میں ابھی اسے کال کرتا ہوں۔معلوم ہوجائے گا وہ کہاں ہے؟"

اس نے فون کے وائنڈ اسپیکر کو آن رکھا تھا۔اس طرح سب ہی سن رہے تھے اور مراد کے اور دشمنوں کے بارے میں تازہ ترین معلومات حاصل کررہے تھے۔

چاچی نے کہا۔"یہ لڑکا بچپن ہی سے بے فکرا اور بے پروا ہے۔اسے اب تو عقل سے کام لینا چاہیے۔"

ماروی نے کہا۔"وہ پریشان ہوں گے۔ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہوگا کیا کریں؟ کہاں جائیں؟ دشمنوں سے چھپنے کے لیے یہی ایک اچھی محفوظ جگہ ہے۔یہاں سیکیورٹی گارڈز بھی ہیں۔انہیں فوراً یہاں آنا چاہیے۔"

محبوب نے اس کے نمبر پنچ کیے لیکن فون بند جارہا تھا۔

محبوب نے حیرانی اور پریشانی سے ماروی کو اور چاچی کو دیکھا پھر کہا۔"اس نے فون بند کیوں رکھا ہے؟"

چاچی نے تعجب سے پوچھا۔"وہ فون نہیں اٹھا رہا ہے؟ یہ کیا حماقت کررہا ہے؟"

ماروی نے کہا۔"یا اللہ! یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس گئے ہیں؟"

محبوب سر جھکائے سوچ رہا تھا۔زیرلب بڑبڑا رہا تھا۔"خدا نہ کرے۔اس پر کوئی اور مصیبت آئی ہو۔"

وہ چاچی چاچا کو دیکھتے ہوئے بولا۔"وہ اس بات سے پریشان تھا کہ اس کی بلا مجھ پر آنے والی ہے کیونکہ میں ہم شکل ہوں۔دشمن اس کے دھوکے میں میری جان لے سکتے ہیں۔"

ماروی نے کہا۔"ہم بڑی دیر سے یہی باتیں کررہے ہیں۔ہم شکل ہونے کی وجہ سے آپ بھی مصیبت میں پڑ گئے ہیں لیکن وہ گئے کہاں ہیں؟ فون کیوں بند کیا ہوا ہے؟"

محبوب نے کچھ سوچا پھر پورے یقین کے ساتھ کہا۔"وہ میری سلامتی کے لیے کوئی الٹی سیدھی حرکتیں کررہا ہے۔میں اسے اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔"

پھر وہ پریشان ہوکر بولا۔"لیکن وہ کیا کرسکے گا؟ اسے یہاں آنا چاہیے۔یہ اچھی طرح سمجھنا چاہیے کہ تنہا کہیں چھپ کر کچھ نہیں کرسکے گا۔ہم سب مل کر یہاں سیکیورٹی میں رہ کر دشمنوں سے نمٹنے کی تدبیر کرتے رہیں گے۔"

ماروی نے کہا۔"میں ہمیشہ چاچی سے یہ سنتی آرہی ہوں کہ آپ دونوں ایک دوسرے کی سلامتی کے لیے اور بہتری کے لیے کچھ بھی کرگزرتے ہیں۔"

وہ بے چینی سے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے بولی۔"ٹھیک ہے کہ آپ دونوں جان پر کھیل جانے والے گہرے دوست ہیں۔لیکن ابھی کیا کرسکتے ہیں؟"

"ہم گہرے دوست نہیں ہیں ماروی....! یہ عجیب سی بات ہے کہ ہم انوکھے رقیب ہیں۔

"جب تمہاری یادداشت سلامت تھی اور تم ہم دونوں کو چاہتی تھیں۔بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ مراد کو چاہتی تھیں اور میری قدر کرتی تھیں تب سے ہم دونوں یہی چاہتے رہے۔ہماری یہی آرزو رہی کہ تم ہمیشہ ہنستی مسکراتی رہو۔

"اگر مراد کسی مصیبت اور تکلیف میں ہوگا تو تمہیں تکلیف ہوگی اس لیے میں اپنے رقیب کی تکلیفیں دور کرتا ہوں۔

"اسی طرح تم مجھے مصیبتوں میں دیکھ کر ہنستا مسکرانا بھول جاتیں اس لیے مراد بھی مجھے مصیبتوں سے نکالنے کے لیے جان کی بازی لگاتا رہتا ہے۔اور ابھی وہ یہی کررہا ہے۔وہ جلد ہی رابطہ کرے گا۔تب ہی معلوم ہوگا کہ وہ کہاں ہے؟ اور دشمنوں سے نمٹنے کے لیے کیا کرتا پھر رہا ہے؟"

شام کو حماد ملاقات کرنے آیا۔اس نے محبوب سے پوچھا۔"مراد کی کوئی خبر ہے؟"

"نہیں۔وہ اپنا فون بند کرکے اچھا نہیں کررہا ہے۔ہماری پریشانی میں اضافہ کررہا ہے۔"

حماد کے بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔اس نے کہا۔"مقدر سے بچ گیا۔اگر گولی ایک انچ ادھر ہوتی تو سیدھی دل کے پار ہوتی۔محبوب صاحب! یہ لوگ جرائم کے اندھے کھلاڑی ہیں۔کسی کا منہ نہیں دیکھتے۔مراد صاحب! ان کے سامنے ایک نادان بچے ہیں۔

"وہ فون کریں تو انہیں سمجھائیں کہ ہمارا پورا انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ ان کے ساتھ ہے۔ہماری سرپرستی میں رہ کر دشمنوں سے مقابلہ کریں ورنہ بے موت مارے جائیں گے۔"

"میں اسے سمجھاؤں گا۔وہ آئے گا تو اسے چار دیواری سے باہر نہیں جانے دوں گا۔"

"وہ آپ کی بات نہیں مانیں گے۔میرے پاس یہی کہنے آئے تھے کہ آپ سے بہت دور ہوجانا چاہتے ہیں۔"

ماروی یہ سن کر صوفے پر سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔وہ بول رہا تھا۔"مراد صاحب چاہتے تھے کہ دشمنوں کو کسی طرح معلوم ہوجائے کہ وہ یہ شہر چھوڑ کر کسی دوسرے علاقے میں چلے گئے ہیں۔

"اس تدبیر کے نتیجے میں دشمن آپ کو مراد نہیں سمجھیں گے۔آپ کی جان چھوٹ جائے گی۔وہ دوسرے علاقوں

میں ان کے پیچھے بھاگتے پھریں گے۔"

محبوب نے بڑی عقیدت سے کہا۔"ماروی کی خاطر ہی سہی وہ مجھے بہت چاہتا ہے۔ اب سمجھ میں آرہا ہے وہ میری سلامتی کی خاطر یہاں سے کہیں دور کیوں چلا گیا ہے۔"

حماد نے کہا۔"لیکن سلامتی تب ہوگی جب دشمنوں کو معلوم ہوگا کہ وہ اس شہر سے جاچکا ہے۔"

محبوب نے کہا۔"ہاں دشمنوں کو معلوم نہیں ہوگا تو وہ مجھے ہی مراد سمجھتے رہیں گے۔"

"حماد.... ! میرا خیال ہے وہ دشمنوں تک خبر پہنچانے کے لیے کچھ کررہا ہوگا۔ اس سلسلے میں کہیں مصروف ہوگا۔ اسی لیے ہم سے کترا رہا ہے۔ ابھی بات نہیں کررہا ہے۔"

"غلط کررہا ہے۔ اسے ہم سے مشورہ لینا چاہیے۔ کہیں اس سے غلطی ہوسکتی ہے۔ ہم اسے سنبھال سکتے ہیں۔"

"اب کیا کیا جاسکتا ہے۔ جب تک وہ رابطہ نہیں کرے گا ہم اس سے کچھ بول نہیں سکیں گے۔"

ماروی پہلی بار کسی ایک چاہنے والے کے لیے بہت زیادہ بے چین ہوگئی تھی۔ ان لمحات میں بڑی اپنایت سے سوچ رہی تھی۔"یہ کہاں جائے گا؟ تنہا کہاں بھٹکتا رہے گا؟" وہ سوچ رہی تھی اور بڑے اضطراب سے پہلو بدل رہی تھی۔"وہ یہاں کب آئے گا؟ یا اللہ.... ! وہ جلدی آجائے۔"

یادداشت کے گم ہونے کے بعد پہلی بار اس کے دماغ کے اندر تحت الشعور کی تاریکی میں ہلچل سی ہورہی تھی۔ وہ بے اختیار مراد کے لیے اپنایت سے سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

وہ اس کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ موٹر سائیکل تیز رفتاری سے جارہی تھی۔ کچھ دور نکل آنے کے بعد اس نے کہا۔"ہاں تو اب کچھ پیار بھری باتیں ہوجائیں۔"

وہ ریوالور کی نال اس کی پسلیوں سے لگاتے ہوئے بولا۔"بدمعاشوں سے پیار کرنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ اس طرح تم سچا پریم کروگے اور میرے سوالوں کے جواب میں بڑے پریم سے سچ بولتے رہوگے۔"

وہ سہما ہوا خاموش تھا۔ اس نے پوچھا۔"تمہارا نام.... ؟"

"میرا نام بلال احمد ہے۔ مگر سب مجھ کو بلا کہتے ہیں۔"

"اسپتال میں پیو ملنگا کو بیان دینے سے سچ بولنے سے روکنے گئے تھے؟"

وہ چپ رہا۔ مراد نے ریوالور کی نال کو پسلیوں میں چبھوتے ہوئے کہا۔"جواب دو۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔"آں۔ ہاں...."

"تم اسپتال میں انٹیلی جنس والوں سے مقابلہ کرتے ہوئے زندہ سلامت نکل آئے۔ اس کا مطلب ہے اپنے مقصد میں کامیاب رہے ہو۔ تم نے ملنگا کو بیان دینے سے روک دیا ہے۔ اسے ہلاک کردیا ہے۔"

وہ جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ ریوالور کی نال پھر پسلیوں میں چبھنے لگی۔ اس نے کہا۔"ہاں...."

"صرف ہاں نہیں پوری بات کرو۔"

"آں ہاں میں نے ملنگا کو ختم کردیا ہے۔"

"وہ بھی تمہاری طرح قاتل بدمعاش تھا۔ اس لیے کہنا چاہیے خس کم جہاں پاک... بولو کہنا چاہیے یا نہیں؟"

"آں ہاں کہنا چاہیے۔"

"تم بھی ایک کچرا ہو۔ تم سے بھی دنیا کو پاک ہونا چاہیے۔"

وہ عاجزی سے بولا۔"مجھ سے سمجھوتا کرو۔ مجھے گولی نہ مارو۔ میں تمہارے بہت کام آؤں گا۔"

"مثلاً کس طرح کام آؤگے؟"

"آج کے بعد جو بھی تمہیں قتل کرنے آئے گا اس کے آنے سے پہلے ہی تمہیں بتادوں گا کہ وہ کون ہے؟ اور تم پر کب اور کہاں حملہ کرنے والا ہے؟"

"یعنی تم جانتے ہو کہ کون مجھے قتل کرانا چاہتا ہے اور تمہارے جیسے کئی ٹارگٹ شوٹرز اس کے احکامات کی تعمیل کرتے ہیں؟"

"ہاں میں اس کا بہت ہی قابل اعتماد شوٹر ہوں۔ وہ مجھ سے بہت اہم موقع پر کام لیتا ہے۔ تم نے برنارڈ جیسے پہاڑ کو گرا کر بہت اہمیت حاصل کرلی ہے۔"

"وہ کون ہے؟"

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔"وہ حکومت کا ایک اعلیٰ عہدے دار ہے۔ ہم اسے عالی جناب کہتے ہیں۔ وہ حکومت میں نہ رہے تب بھی وسیع ذرائع اور اختیارات کا مالک ہوتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کس ملک کی خفیہ ایجنسی اس کی پشت پناہی کرتی ہے۔"

اس نے ایک پیٹرول پمپ کے پاس گاڑی روکتے ہوئے کہا۔"پیٹرول ختم ہورہا ہے۔"

مراد نے کہا۔"یہ ریوالور میرے لباس کے اندر رہے گا۔ اگر کوئی گڑبڑ کروگے تو مجھے گولی مارنے میں ذرا دیر نہیں لگے گی۔ چلو ٹنکی فل کراؤ۔"

بلے کو اپنی زندگی سے بہت پیار تھا۔ وہ خوامخواہ حرام موت مرنے والی نادانی نہیں کرسکتا تھا۔ اس موقع کا منتظر تھا

کہ سلامتی سے فرار ہونے کی کوئی صورت نکل آئے۔

وہ اس وقت سچ بول کر مراد کا اعتماد حاصل کر رہا تھا۔ جہاں تک ہتھیاروں سے کھیلنے کا تعلق تھا' وہ ایک بہترین شوٹر تھا۔ شکار کو گھیرنے اور شوٹ کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ لیکن ہتھیار کے بغیر اچھا فائٹر نہیں تھا۔ اگر وہ ریوالور کی زد میں نہ رہتا' تب بھی مراد سے خالی ہاتھ مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ اسی لیے بھیگی بلی بنا ہوا تھا۔ البتہ انتظار تھا کہ قسمت پلٹا کھائے اور ریوالور پھر اس کے ہاتھ میں آجائے۔ پھر وہ اپنی مہارت دکھانے میں ذرا دیر نہ کرتا۔

وہ ٹنکی فل کرانے کے بعد آگے بڑھ گئے۔ بلّے نے نیشنل ہائی وے پر گاڑی دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کہاں تک جاؤ گے؟ مجھے کہاں تک لے جاؤ گے؟''

مراد نے پوچھا۔ ''تم گھر جا کر کیا کرو گے؟ وہاں ماں باپ ہیں۔ مگر تم ان کی نیک اولاد نہیں ہو۔ بیوی بچے ہیں تو ایک قابلِ فخر شوہر اور صراطِ مستقیم پر چلانے والے باپ نہیں ہو۔''

وہ بولا۔ ''میرا کوئی نہیں ہے۔''

''اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی ہے۔ آئندہ بھی کنوارے رہو اور کسی دن حرام موت مر جاؤ۔ بدمعاش نسل پیدا نہ کرو۔''

وہ بولا۔ ''میں ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں۔''

وہ حیرانی سے بولا۔ ''تم اور محبت؟ انسانی لہو بہانے والے کسی سے محبت کر ہی نہیں سکتے۔ تم غلط کہہ رہے ہو۔ یہ کہو کہ اس لڑکی کے لیے ہوس میں مبتلا ہو۔''

''نہیں۔ تم یقین نہیں کرو گے۔ اس نے جب پہلی بار مجھے گالیاں دیں' میرے ہاتھ میں گن تھی۔ میں نے اسے گولی نہیں ماری۔ ہوس ہوتی تو گن پوائنٹ پر اس کی عزت لوٹ لیتا۔''

مراد نے قائل ہو کر کہا۔ ''ہاں۔ تم ہوس پرست نہیں ہو۔''

وہ بولا۔ ''پھر ایک دن اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو اس نے سینڈل اتار کر ماری۔ مجھے بہت اچھا لگا۔ اس سے محبت ہوگئی ہے۔ تب ہی تو میں اس کی ہر زیادتی برداشت کرتا ہوں۔''

مراد نے کہا۔ ''عجیب جوتے خور عاشق ہو۔ میں حیران ہوں۔ کیا تم نے کبھی غصہ نہیں دکھایا؟''

''اسے دیکھتے ہی پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے۔ میں غصہ کرنا بھول جاتا ہوں۔''

مراد نے پوچھا۔ ''اگر وہ راضی نہیں ہوگی تو کیا کرو گے؟ تب بھی محبت کرتے رہو گے؟''

''اب راضی ہوگئی ہے۔''

''وہ تو نفرت کرتی تھی۔ راضی کیسے ہوگئی؟''

''ایک بار وہ اپنے منگیتر اور اس کے تین دوستوں کے ساتھ شاپنگ کر رہی تھی۔ میں اسے کسی مرد کے ساتھ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا' میں نے گن نکال لی' وہ غصے سے بولی۔ ''یہ کیا حرکت ہے؟''

میں نے اس کے منگیتر کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ رسید کیا۔ گن کے سامنے اس کے تینوں ساتھی سہمے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی بلی کو اٹھا کر کاندھے پر لاد لیا...''

''بلی....؟'' مراد نے پوچھا۔

''میری معشوق کا نام بشریٰ ہے۔ میں بلّا ہوں اس لیے اسے بلی کہتا ہوں۔''

''آگے بولو۔ پھر کیا ہوا؟''

وہ بولا۔ ''ہتھیار بھی کیا چیز ہے۔ میں بھری مارکیٹ میں اسے اٹھا کر لے جا رہا تھا اور مجھے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ جیپ میں بلی کو ڈال کر کسی روک ٹوک کے بغیر اسے ایک خفیہ اڈے میں لے آیا۔

''وہ تمام راستے غصہ دکھاتی رہی۔ گالیاں بھی دیتی رہی۔ پھر خفیہ اڈے کی تنہائی اور ویرانی دیکھ کر اسے چپ لگ گئی۔''

میں نے کہا۔ ''تو نے دیکھ لیا کہ بھرے بازار میں کوئی تجھے بچانے نہیں آیا۔ تیرے منگیتر نے تجھے میرے ساتھ جانے دیا۔''

میں نے اس کا دوپٹا کھینچ کر کہا۔ ''بول.... یہاں تیری عزت بچانے کون آئے گا؟''

وہ اپنے سینے پر دونوں ہاتھوں کی قینچی بناتی ہوئی سکڑتی ہوئی اکڑوں بیٹھ گئی۔ ہائے.... میں کیا بتاؤں....؟ اس کا سمٹنا' بل کھا کر بیٹھنا' اس کا شرمانا' لجانا کتنا اچھا لگا۔

''وہ اپنے معاملات میں بہت تیز طرار ہے کسی کے دباؤ میں نہیں آتی۔ میں نے پہلی بار اسے کمزور ہوتے دیکھا تو بڑا پیار آیا۔ میں نے دوپٹا اس پر ڈالتے ہوئے کہا۔ اٹھو۔ میری جان....! میں تمہیں لوٹ کا مال بنانا نہیں چاہتا۔ تمہاری ایک ایک ادا پر لٹ جانا چاہتا ہوں۔ میں بدمعاش ہوں۔ مگر تم سے سچے دل کا معاملہ ہے۔ جب تک تم راضی نہیں ہوگی' تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ ہاں مگر یاد رکھو کسی مرد کو تمہارے قریب برداشت نہیں کروں گا۔ ایسے وقت میری کھوپڑی گھوم جائے گی۔

''میں نے اسے واپس گھر پہنچا دیا۔ اس دن سے اس کا

مزاج بدل گیا۔ وہ میری دیوانی ہوگئی ہے۔''

مراد نے کہا۔''تم تو بڑے پکے عاشق نکلے۔ پھر تو تمہیں سوچنا چاہیے کہ اس لہو بہانے والے ہتھیاروں کے کھیل میں کسی دن تم بھی مارے جاؤ گے۔ تب تمہاری بلّی کا کیا ہوگا؟ کیا اسے رونے کے لیے چھوڑ جاؤ گے؟''

وہ بولا۔'' بلّی بھی مجھ سے یہی سوال کرتی ہے' اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے جب تک میں یہ دھندا نہیں چھوڑوں گا' وہ مجھ سے شادی نہیں کرے گی۔''

''اور تم ابھی تک کیا کر رہے ہو؟''

''میں نے بہت سوچا کہ یہ کام چھوڑ دوں لیکن عالی جناب مجھے نہیں چھوڑے گا۔''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ بلّی کو دلہن بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔''

مراد نے کہا۔''سمجھ میں آجائے گا۔ محبت سچی ہے تو ایک دن اس کے لیے عالی جناب سے لڑ پڑو گے۔''

''اس سے لڑنا گویا کہ مرنا ہے اور مرنے کا مطلب ہے بلّی کو نہ پانا۔ اسے دنیا میں چھوڑ کر جانا ہے اور میں اسے چھوڑنے والا کوئی کام نہیں کروں گا۔''

''کر تو رہے ہو۔ وہ تم سے کہہ چکی ہے کہ یہ دھندا نہیں چھوڑو گے تو وہ تم سے شادی نہیں کرے گی۔''

وہ چپ رہا۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے حیدرآباد پہنچ کر پریشان ہوکر کہا۔''میں بلّی سے دور ہو رہا ہوں۔ تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ میرے ساتھ کیا کرنے والے ہو؟''

''تم خود سوچو۔ میں تمہیں بلّی سے دور نہیں کر رہا ہوں۔ تمہاری مجرمانہ زندگی تمہیں اس سے دور کر رہی ہے۔''

''مجھے جانے دو۔ میں اس سے شادی کرلوں گا۔''

''وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ میں اس کی زندگی برباد کرنے نہیں دوں گا۔ پہلے انسان بنو۔''

''تمہیں میرے اور بلّی کے معاملات سے کیا لینا ہے؟ پلیز تم مجھے آزاد کردو۔''

مراد تصور میں ماروی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔''میں بھی کسی سے محبت کرتا ہوں۔ اسے حاصل کرنے کے لیے مجھے اس کے قریب رہنا چاہیے لیکن دور ہو رہا ہوں۔ کیونکہ دوری سے اسے سلامتی اور ایک اچھی محفوظ زندگی ملتی رہے گی۔

''تم بھی بلّی سے دور رہو۔ مجرمانہ زندگی سے توبہ کیے بغیر جاؤ گے تو گویا اس سے دشمنی کرو گے۔''

وہ تھوڑی دیر چپ رہا پھر بولا۔''مانتا ہوں' تم میری بلّی کی بہتری کے لیے ایسا کہہ رہے ہو۔ مگر یہ تو بتاؤ مجھے اور کہاں لے جاؤ گے اور کب مجھے آزاد کرو گے؟''

''میں جیسا کہتا ہوں ویسا کرتے رہو پھر میں اپنے حالات کے مطابق شاید تمہیں جانے دوں گا۔''

''شاید۔۔۔؟'' بلّے نے مایوسی سے پوچھا۔

''ابھی کچھ نہ پوچھو۔ عالی جناب کو کال کرو۔''

''عالی جناب کو۔۔۔؟''

''ہاں وہ تمہارے لیے فکر مند ہوگا کہ تم کہاں گم ہوگئے ہو۔

''ویسے کیا بات ہے اتنی دیر ہوگئی ہے۔ ہم کراچی سے حیدرآباد آگئے ہیں اور تمہاری کوئی کال نہیں آرہی ہے؟''

''میں نے اپنا فون بند رکھا ہے اگر آن رہتا تو اتنی دیر میں بلّی کال کر کرکے ناک میں دم کردیتی۔''

''تمہیں فکر کرنی چاہیے۔ وہ تمہاری فکر کرتی ہے۔ تم سے دیوانہ وار محبت کرتی ہے۔''

''میں بھی دیوانہ ہوں۔ اس کے لیے جان دے سکتا ہوں۔ تم عالی جناب کی بات کر رہے تھے۔''

''ہاں اسے معلوم ہونا چاہیے کہ میں تمہیں گن پوائنٹ پر کہیں لے جا رہا ہوں۔ تم اسے بتاؤ کہ تم مصیبت میں گرفتار ہو۔ مراد تمہیں دوڑاتا ہوا کہیں لے جا رہا ہے' ابھی تم حیدرآباد سے آگے نکل آئے ہو۔''

''تم میری بلّی کے لیے اچھی باتیں کرتے ہو۔ مجھے یقین ہوگیا ہے کہ آگے کہیں جاکر مجھے گولی نہیں مارو گے۔ مجھے بلّی کے پاس جانے دو گے۔''

''ہاں۔ میں تمہاری ماروی کے پاس تمہیں جانے دوں گا۔''

''ماروی۔۔۔؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔ ماروی میری زندگی کا نام ہے۔ اور یہ زندگی مجھے دوڑا رہی ہے۔ آہ۔۔۔!''

بلّے نے کہا۔''ہم زندگی اور موت کا کھیل کھیلنے والے محبت کے گھاٹ پر چل رہے ہیں۔ اب تم جو بولو گے' وہ کروں گا۔''

وہ دونوں ایک چھوٹی سی بستی کے چائے خانے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مراد نے اسے سمجھایا۔''میں عالی جناب کو اور اس کے تمام گن شوٹرز کو اپنے پیچھے لگانا چاہتا ہوں۔

''انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں کراچی سے سیکڑوں میل دور اس طرف آگیا ہوں۔ وہ میرے لہو سے کھیلنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ادھر ضرور آئیں گے۔

”میں آئندہ بھی انہیں اپنے پیچھے دوڑاتا رہوں گا۔ دیکھوں گا کہ مقدر میں میری موت لکھی ہے یا سلامتی؟“

”پھر تو تمہارے پیچھے کئی شوٹرز آئیں گے۔ اس وقت تمہارے پاس ایک ریوالور ہے۔ میں اس میں سے چار گولیاں چلا چکا ہوں۔ صرف چار رہ گئی ہیں۔

”میری جیب میں آٹھ بلٹس ہیں۔ کیا ہم بارہ بلٹس سے آنے والوں کا مقابلہ کرسکیں گے؟“

مراد نے کہا۔ ”اگرچہ ہتھیار ضروری ہے۔ لیکن مقابلہ گن اور گولیوں سے نہیں ذہانت اور حوصلے سے کیا جاتا ہے۔ دشمنوں کو ادھر آنے تو دو۔“

انہوں نے پلاننگ کی کہ عالی جناب سے فون پر کیا کہا جائے گا اور کس طرح اس کے شوٹرز کو اپنے پیچھے دوڑایا جائے گا۔

پھر وہ ہوٹل سے باہر آگئے۔ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اس بستی سے کچھ دور گئے۔ وہاں رک کر بلّے نے اپنا فون آن کیا۔ عالی جناب کے نمبر پنچ کیے پھر اسے کان سے لگا کر انتظار کرنے لگا۔

چند لمحوں کے بعد ہی اس کی گرجتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ سخت لہجے میں بولا۔ ”کہاں مر گئے ہو؟ مجھے دوسرے شوٹر سے معلوم ہوا ہے کہ تم نے ملنگا کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ کیا تم ایک کال کر کے کامیابی کی اطلاع نہیں دے سکتے تھے؟“

بلّا اس کی باتیں سننے کے دوران یوں زور زور سے ہانپ رہا تھا جیسے بہت دور سے دوڑتا ہوا آرہا ہو۔ عالی جناب نے پوچھا۔ ”تم اس طرح کیوں ہانپ رہے ہو؟“

وہ ہانپتے ہوئے سہمے ہوئے انداز میں بولا۔ ”موت میرا پیچھا کررہی ہے۔ جناب عالی....! آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں اس وقت کہاں ہوں؟“

”کہاں ہو تم؟“

”میں حیدرآباد سے بھی سو کلو میٹر آگے ایک کچے راستے سے بہت دور ہوں۔“

”او گاڈ! تم اتنی دور کیسے پہنچ گئے؟ آخر کیا ہورہا ہے تمہارے ساتھ؟“

”میرے ساتھ بہت برا ہورہا ہے۔ میں ملنگا کو گولی مار کر فرار ہورہا تھا۔ پتا نہیں مراد کہاں سے آدھمکا۔ بہت ہی خطرناک فائٹر ہے۔ میں اس کا مقابلہ نہ کرسکا۔ میری گن اور گاڑی اس کے قبضے میں آگئی ہے۔“

وہ پھر ہانپنے لگا۔ عالی جناب پریشان ہوگیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”آگے بولو۔“

”اس نے مجھے گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ حکم دیا کہ نیشنل ہائی وے پر چلوں۔ میں کیا کرتا جناب عالی....! مجھے اپنی سلامتی کے لیے اس کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔

”میں نے سوچ لیا تھا کہ راستے میں کہیں بھی موقع ملے گا تو اس سے اپنی گن چھین لوں گا۔

”آپ دیکھ رہے ہیں' چھ گھنٹے گزر گئے ہیں۔ مجھے کوئی موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ ہم حیدرآباد سے آگے نکل آئے ہیں۔ اب میر پور خاص کی سمت جارہے تھے ایسے وقت موقع مل گیا۔“

”شاباش۔ میں سمجھ گیا' تم نے تو کمال کیا ہوگا۔ مراد کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا ہوگا۔“

”نہیں جناب! وہ آسانی سے مرنے والا نہیں ہے۔ وہ زندہ ہے اور اب بھی میری موت بنا ہوا ہے۔“

وہ جھنجلا کر بولا۔ ”آخر ہو کیا رہا ہے؟ جلدی بتاؤ۔ تم اس کے چنگل سے کیسے نکل آئے؟“

بلّے نے کہا۔ ”وہ مجبور ہوگیا تھا۔ اسے کھیتوں میں جانا پڑا.... آپ سمجھ گئے ہوں گے' کیوں جانا پڑا؟“

وہ جھنجلا کر بولا۔ ”میں گدھا نہیں ہوں کہ مجھے سمجھا رہے ہو۔ آگے بولو؟“

اس نے آگے کہا۔ ”مراد نے موٹر سائیکل کو لاک کر کے چابی اپنی جیب میں رکھ لی تھی۔ مجھے دھمکی دی تھی کہ وہ کھیتوں سے دیکھتا رہے گا۔ میں فرار ہونا چاہوں گا تو وہیں سے مجھے گولی مار دے گا۔

”میں کچے راستے پر گاڑی کے پاس کھڑا تھا۔ وہاں سے ساٹھ ستر قدم آگے کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ پھر وہاں سے اور سو قدم آگے اونچی فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ اسے اتنی دور جانا پڑا۔

”میں انتظار کررہا تھا۔ خطرہ مول لینے کے لیے تیار تھا۔ اس نے فصلوں کے درمیان جا کر پلٹ کر مجھے دیکھا۔ پھر بیٹھ کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ تب میں نے فوراً ہی ایک پہیے کی ہوا نکالی پھر وہاں سے دوڑ لگائی۔ اس نے فصلوں کے پیچھے سے حلق پھاڑ کر مجھے رکنے کو کہا۔ پھر گولی چلائی میں شوٹنگ رینج سے دور نکل آیا تھا۔

”آہ یہ زندگی کتنا دوڑاتی ہے؟ میں نہیں جانتا کہ کب تک دوڑتا رہا ہوں۔ یہاں تھک کر رک گیا ہوں۔“

”یہ تم نے عقلمندی کی پہیے سے ہوا نکال دی۔ وہ بھی پیدل ہوگیا ہے۔ فوراً بتاؤ وہاں سے کہاں جاؤ گے؟ میرے آدمی گن اور گاڑیاں لے کر وہاں پہنچ جائیں گے۔“

"ابھی ہم اُکری نامی ایک چھوٹی سی بستی سے آگے آئے ہیں۔ میرا خیال ہے اگر میں اسی طرح دوڑتا جاؤں گا تو ایک گھنٹے میں عمرکوٹ پہنچ جاؤں گا۔"

پھر وہ گھبرا کر بولا۔ "وہ آرہا ہے۔ بہت دور ہے۔ میں جھاڑیوں کے پیچھے سے دیکھ رہا ہوں۔ کیا مصیبت ہے وہ تو مجھے دیکھتے ہی گولی مار دے گا۔"

"تم تو موت سے کھیلتے رہتے ہو۔ اس سے مت ڈرو۔ میرے آدمیوں کے وہاں پہنچنے تک اسے دوڑاتے رہو۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ تمہاری نظروں سے کہیں گم ہو جائے۔ میں اس کی لاش دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"میں کوشش کروں گا کہ اس کے نشانے پر نہ آؤں اور اسے دوڑاتا رہوں۔ ویسے آپ کے آدمیوں کے آنے تک رات ہو جائے گی۔ پتا نہیں عمرکوٹ میں کہیں چھپنے کی جگہ ملے گی یا نہیں؟"

"میرے دو شوٹر حیدرآباد میں ہیں۔ وہ گھنٹے بھر میں پہنچ جائیں گے۔ اپنے ساتھ اور دو چار کو لے آئیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ایک گھنٹے تک مراد سے چھپتا رہوں گا اور اسے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے فون بند کرتے ہوئے مسکرا کر مراد کو دیکھا۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ دشمنوں کو اس کا در بدر ہونا معلوم ہو جائے۔ اب انہیں یقین ہونے والا تھا کہ وہ کراچی سے سیکڑوں میل دور ہے اور جو ہم شکل اس شہر میں نظر آرہا ہے، وہ ایک بزنس مین محبوب علی چانڈیو ہے۔ مراد اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہا تھا۔

اس نے بلّے کے شانے کو جھپکتے ہوئے کہا۔ "شاباش! تم نے بہت اچھے انداز میں اپنی مظلومیت کا یقین دلایا ہے۔ اب اس کے آدمی یہاں میرے پیچھے آتے رہیں گے۔"

"میں یہی چاہتا تھا کہ اپنوں سے دور رہ کر اسی طرح موت کا کھیل کھیلتا رہوں۔"

پھر اس نے دل میں کہا۔ "سائیں.....! اللہ آپ کو سلامت رکھے آئندہ میرے دشمن آپ کو مراد نہیں سمجھیں گے۔"

☆☆☆

سمیرا اور معروف بہت زیادہ پریشان ہو گئے تھے۔ یہ تو سیدھی سی سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ مراد کی صورت دیکھ کر چلنے والی گولی محبوب کو آ کر لگے گی۔ بعد میں دشمنوں کو غلطی کا علم ہوگا تو وہ سوری بھی نہیں کہیں گے۔ ایک ارب پتی سرمایہ دار اپنی جان سے گیا تو گیا۔ قاتلوں کا کچھ

معصوم فرشتے

ایک اسکول میں نرسری کی ٹیچر اپنی کلاس کے 20 بچوں کو جوتے پہنا رہی تھی، جھک جھک کر اس کی کمر میں درد ہونے لگا۔ بیسواں بچہ شرمیلا اور خاموش طبیعت کا تھا جب ٹیچر اسے بھی جوتے پہنا چکی تو بچہ بڑے سکون سے بولا۔

"یہ میرے جوتے نہیں ہیں۔"

ٹیچر کا دل چاہا وہ رو دے مگر خود پر قابو پا کر بچے کے جوتے اتارنے لگی۔ جوتے اتار کر کمر سیدھی کی ہی تھی کہ بچہ بڑے سکون سے بولا۔ "یہ جوتے میرے بھائی کے ہیں مگر امی نے کہا تھا کہ آج تم یہ پہن لو اور کسی کو بتانا نہیں۔"

عورت

ایک پری نے ساٹھ سال کے شادی شدہ جوڑے سے کہا۔

"میں تم دونوں کی ایک ایک خواہش پوری کر سکتی ہوں۔"

بیوی۔ "میں اپنے شوہر کے ساتھ ساری دنیا کی سیر کرنا چاہتی ہوں۔"

اس نے چھڑی گھمائی دو ٹکٹ آگئے پھر شوہر سے پوچھا۔

"تم بتاؤ کیا چاہتے ہو؟"

شوہر۔ "مجھے اپنے سے تیس سال چھوٹی بیوی چاہیے۔"

پری نے چھڑی گھمائی اور شوہر کو نوے سال کا کر دیا۔

نتیجہ: مرد کو یاد رکھنا چاہیے کہ پری بھی عورت یعنی "صنفِ نازک" ہی ہوتی ہے۔

خاموشی

"خاموشی" ایک زبان ہے۔ جسے ہر کوئی اپنے ڈھنگ سے بولتا ہے۔ خاموشی بولتی ہی نہیں "چیختی" بھی ہے۔ پکارتی اور للکارتی بھی ہے، محبوبہ خاموش رہے تو ناراضی...... محبوب خاموش رہے تو بزدلی! والدین خاموش رہیں تو مجبوری...... اولاد خاموش رہے تو سعادت مندی! انسان خاموش رہے تو بے بس، انسانیت خاموش رہے تو بے حسی! قوم خاموش رہے تو مظلومیت...... اور حکمران خاموش رہے تو خاموش طبع اور سیاستدان۔ یہ خاموشی سکۂ رائج الوقت ہے جب بھی رائج ہو جاتی ہے تو کسی کو خرید لیتی ہے یا کسی کو بیچ دیتی ہے لیکن یہ ہمیشہ نہیں رہ سکتی۔ خاص موقعوں اور خاص وقت پر استعمال کی جاتی ہے۔

مرسلہ: قیصر اعوان، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

نہیں جائے گا۔

معروف نے اسی دن محبوب کے لیے سخت سیکیورٹی کے انتظامات کیے۔ تین مسلح گارڈز اس کے ساتھ گاڑی میں آنے جانے کے لیے تھے۔ دو باڈی گارڈز کوٹھی کے اندر باہر اور دفتر کے اندر بھی سائے کی طرح ساتھ رہنے والے تھے۔

سمیرا معروف کے ساتھ ماروی کی کوٹھی میں آئی تھی۔ اس خوبصورت بلا کو دیکھ رہی تھی جس کی وجہ سے محبوب ایک نئی جان لیوا مصیبت سے دوچار ہونے والا تھا۔

معروف نے سمجھایا۔ ''اسے الزام نہ دو۔ وہ بیچاری خود کو بھولی بیٹھی ہے۔ وہ نہ بھی ہوتی تب بھی مراد کا ہم شکل ہونے کے باعث محبوب پر یہ مصیبت ضرور نازل ہوتی۔''

سمیرا نے کہا۔ ''اگر محبوب صاحب اس کے دیوانے نہ ہوتے' مراد سے کوئی تعلق نہ رکھتے تو ان دونوں ہم شکلوں کی دنیا الگ الگ ہوتی۔ جو گدھا گاڑی چلانے والے کے جانی دشمن ہوتے وہ ارب پتی محبوب کی طرف کبھی رخ نہ کرتے۔''

معروف نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یوں دو ہم شکلوں کی لکھی ہوئی تقدیر تم بدل دینا چاہتی ہو۔''

''میں تو اپنی تقدیر کو رو رہی ہوں۔ یا تو میں پیدا نہ ہوتی یا ماروی پیدا نہ ہوتی۔''

وہ بولا۔ ''کوئی ماروی کوئی سمیرا نہ ہوتی تو دنیا میں یہ کھیل تماشے ہی نہ ہوتے۔''

محبوب اپنی کوٹھی کی طرف گیا تھا۔ اس بار وہ اپنی کار میں تنہا نہیں تھا۔ تین مسلح گارڈز بھی تھے۔ اس نے ماروی کی کوٹھی میں آکر معروف سے کہا۔ ''یہ مسلح گارڈز بہت ضروری ہیں۔ لیکن بوجھ لگتے ہیں۔ اپنی تنہائی اور پرائیویسی نہیں رہتی۔ فون پر کسی سے ذاتی معاملات پر بول نہیں سکتے۔''

معروف نے کہا۔ ''کچھ عرصے کے لیے ذاتی معاملات کو بھول جاؤ۔''

سمیرا نے کہا۔ ''یہ بلائیں مراد کے جیتے جی نہیں ٹلیں گی۔ میں نے بہت سوچا ہے تو یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ آپ دو چار ماہ کے لیے لندن چلے جائیں۔''

معروف نے کہا۔ ''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔''

اسی وقت ماروی چاچی کے ساتھ وہاں آئی۔ محبوب نے اسے بڑے جذبے سے دیکھا۔ دل نے کہا۔ ''ہائے تم کیا ہو..... جان من.....! ذرا سوچو میرے لیے جگنو ہو' نہ جلی ہوئی ہو نہ بجھی ہوئی ہو۔''

سمیرا نے ماروی اور محبوب کو دیکھ کر کہا۔ ''لیکن آپ نہیں جائیں گے۔''

ماروی نے ایک صوفے پر چاچی کے ساتھ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''مراد کی کوئی خبر مل رہی ہے؟''

محبوب نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''نہیں۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ مراد کو ہماری پریشانیوں کا خیال کرنا چاہیے۔''

چاچی نے کہا۔ ''میرا دل گھبرا رہا ہے۔ سوچتی ہوں وہ کسی ایسی جگہ پھنس گیا ہے جہاں سے ہمیں فون کرنے کے قابل نہیں ہے۔ بیٹے محبوب! وہ کہیں دشمنوں کے شکنجے میں تو نہیں آگیا ہے؟''

''میرے دل میں بھی یہی بات آتی ہے لیکن میں دل دکھانے والی باتوں کو ذہن سے جھٹک دیتا ہوں۔''

سب کے سر فکرمندی سے جھک گئے۔ ڈرائنگ روم میں گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ پھر ماروی کی سسکیاں ابھرنے لگیں۔ سب نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے روتے ہوئے دوپٹے سے منہ چھپالیا تھا۔

چاچی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں روتے بیٹی! ہم سب دعائیں مانگ رہے ہیں۔ اللہ سلامتی دینے والا ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔''

وہ بے اختیار رو پڑی تھی۔ اسے پہلی بار کچھ ایسا لگا تھا جیسے سینہ خالی ہوگیا ہے۔

اسی وقت محبوب کا فون بجنے لگا۔ اس نے ننھی سی اسکرین کو پڑھا تو خوشی سے اچھل پڑا۔ ''مراد ہے..... مراد کال کررہا ہے۔''

ماروی رونا بھول گئی اور چونک کر محبوب کی طرف گھوم گئی۔ سب ہی کے چہرے خوشی سے کھل گئے۔ اس نے وائڈ اسپیکر آن کرکے بٹن کو دباتے ہوئے کہا۔ ''مراد! تم خیریت سے ہو؟ جلدی بتاؤ کہاں ہو؟''

اس کی آواز سنائی دی۔ ''خدا کا شکر ہے۔ تم سب کی دعائیں ہیں' میں خیریت سے ہوں۔''

''صبح سے یہ وقت ہوگیا ہے اور تم غائب ہو۔ اپنا فون بھی بند رکھا ہے۔ یہ کیا حماقت ہے؟ یہاں ڈرائنگ روم میں سب ہی بیٹھے ہیں۔ ماروی رو رہی ہے۔ تم اسے رلا رہے ہو۔''

وہ تڑپ کر بولا۔ ''یا خدا..... یہ میں نے کیا کیا اپنی ماروی کو رلا دیا۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے فون کے پاس آئی پھر بولی۔ ''تم نے نہیں رلایا ہے۔ میں بہت خوش ہوں' تم نے تو فون کرکے سب ہی کو خوش کردیا ہے۔''

''ماروی! میں مجبور تھا۔ اب کسی حد تک ایک دشمن سے نمٹنے کے بعد ذرا سہولت سے باتیں کررہا ہوں۔''

محبوب نے پوچھا۔ ''تم کہاں ہو؟''

''اس شہر میں نہیں ہوں۔ ابھی آپ لوگوں سے تقریباً تین سوکلومیٹر دور ہوں۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ اچانک اتنی دور کیوں گئے ہو؟''

''میں دور رہوں گا تو دشمن آپ کو بزنس مین محبوب علی چانڈیو سمجھتے رہیں گے۔ انہیں میری ضرورت ہے وہ میرے پیچھے بھاگتے رہیں گے۔''

معروف نے پوچھا۔ ''دشمنوں کو کیسے معلوم ہوگا کہ اب تم اس شہر میں نہیں ہو؟ وہ تمہارے پیچھے کیسے آئیں گے؟''

''میں نے ایسی چال چلی ہے کہ تمام دشمن مکھیوں کی طرح اڑتے ہوئے مٹھائی کی طرف آرہے ہیں۔ اب آپ کے شہر میں کوئی مجھے تلاش نہیں کرے گا۔ خدا کا شکر ہے' سائیں کو دیکھ کر کوئی دھوکا نہیں کھائے گا۔''

اس کی باتیں سن کر ماروی دنگ رہ گئی تھی' اس کی یہ باتیں ایسی تھیں کہ دوسروں کو بھی تھوڑی دیر کے لیے چپ لگ گئی۔ وہ خوب سوچ سمجھ کر دور چلا گیا تھا۔ دشمن اب محبوب کو دیکھ کر دھوکا نہیں کھا سکتے تھے۔ اور یہ چال خود اسے مہنگی پڑ رہی تھی۔ وہ نامعلوم مدت تک اپنوں سے اور اپنی ماروی سے دور رہنے والا تھا۔ کیا کرتا؟ حالات سے مجبور ہوکر گن اٹھا کر جس راستے پر چل پڑا تھا' اس راستے سے واپسی اکثر ناممکن ہوتی ہے۔

سمیرا نے کہا۔ ''تم کیا ہو مراد؟ تم نے اپنے سائیں کی سلامتی کے لیے گھر چھوڑ دیا۔ شہر چھوڑ دیا' اپنوں سے دور ہوگئے اور تو اور اپنی ماروی سے محروم رہو گے۔ اس کی صورت بھی نہیں دیکھ سکو گے اور ایسا تم نے سائیں کے لیے کیا ہے۔''

وہ فون کے قریب جھکتے ہوئے بولی۔ ''ماروی کے جاں باز مراد...... میں تمہیں سلام کرتی ہوں۔''

معروف نے کہا۔ ''میں بھی مانتا ہوں مراد! تم ہمارے محبوب سے جیسی محبت کرتے ہو ایسی کوئی نہیں کر سکے گا۔''

وہ بولا۔ ''آپ سب سے گزارش ہے کہ مجھ سے فون پر بھی رابطہ نہ رکھیں۔ دشمنوں کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارے درمیان کوئی تعلق ہے۔ معلوم ہوگا تو وہ آپ لوگوں کو میرا رشتے دار سمجھ کر نقصان پہنچائیں گے۔''

محبوب نے کہا۔ ''تم سے رابطہ نہیں رکھیں گے تو تمہاری خیریت کیسے معلوم ہوتی رہے گی؟''

''میں کبھی کبھی آپ کو کال کیا کروں گا۔''

''کیا تمہیں اندازہ ہے کہ ہم سے کب تک جدا رہو گے؟''

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ میرا دشمن بہت طاقتور ہے۔ بہت وسیع ذرائع کا مالک ہے۔ مجھے گھیرنے اور مارنے کے لیے پتا نہیں کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کرے گا۔''

حماد کہہ رہا تھا' بارڈر سے تعلق رکھنے والی ایک غیر ملکی خطرناک تنظیم تمہارے پیچھے پڑ گئی ہے۔ آئندہ تمہارے لیے قدم قدم پر موت ہوگی۔

''میں تمہارے لیے بہت فکر مند ہوں مراد! تم سمندر پار تک پھیلے ہوئے دشمنوں سے کیسے نمٹ سکو گے؟''

ماروی سن رہی تھی اور پریشان ہو رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''یا اللہ! تم اکیلے کیا کرو گے مراد؟ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ یہاں آجاؤ ہم ساتھ جئیں گے ساتھ مریں گے۔''

''تم سلامت رہو ماروی! تمہاری یہ بات مجھے نئی زندگی نیا حوصلہ دے رہی ہے۔ اب تو چاہے کتنی ہی لمبی جنگ ہو' میں جیت کر تمہارے پاس ضرور آؤں گا۔''

''اگر میری بات سے حوصلہ مل رہا ہے تو میری ذات سے اور قوت ملے گی۔ مجھے اپنے پاس بلا لو۔ میں ابھی چلی آؤں گی۔''

ماروی نے یہ چونکا دینے والی بات کی تھی۔ ابتدا سے اب تک دو عاشقوں کے درمیان یہ واضح نہیں ہوا تھا کہ وہ بالآخر کسے قبول کرے گی؟

اگرچہ زیادہ جھکاؤ مراد کی طرف تھا۔ تاہم محبوب بھی اسے اپنی طرف مائل کر چکا تھا۔ ایسے وقت اس کی یادداشت گم ہوگئی تھی۔ دونوں عاشق اس کی دنیا سے گم ہوگئے تھے۔ اب نئے سرے سے یہ تجسس تھا کہ وہ نئی زندگی میں محبوب کو قبول کرے گی یا مراد کو؟

مراد اپنے رقیب کی سلامتی کی خاطر وہ کام کر رہا تھا' جو کوئی نہ کرتا۔ وہ خطرناک دشمنوں کے درمیان موت سے لڑنے گیا تھا اور اس کی واپسی تقریباً ناممکن تھی۔

اس قربانی نے ماروی کے دل کو جکڑ لیا تھا۔ اس نے بے اختیار کہہ دیا تھا کہ وہ مراد کے بدترین حالات میں بھی اس کے ساتھ رہنے کے لیے تیار ہے۔

گویا فیصلہ سنا دیا تھا کہ وہ بچپن سے مراد کی تھی' اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

ادھر مراد اپنی ماروی کی زبان سے پہلی بار ایسی بات سن کر مسرتوں سے سرشار ہوگیا تھا' اس نے کہا۔ ''ماروی! تمہارا اتنا ہی کہنا کافی ہے۔ آئندہ دشمنوں سے لڑتے وقت تمہیں ہر لمحہ اپنے ساتھ دیکھتا رہوں گا۔''

"تمہاری سلامتی اور خوشحالی سے مجھے اطمینان رہے گا۔ تم سائیں کی سرپرستی میں محفوظ رہوگی تو مجھے جیسے ایک اَن دیکھی قوت حاصل ہوتی رہے گی۔"

ماروی نے پوچھا۔ "میں تمہاری سلامتی کی جنگ لڑتے وقت ساتھ رہوں گی تو کیا اطمینان حاصل نہیں ہوگا؟ یہ نہ بولو کہ میں تم پر بوجھ بن جاؤں گی۔"

"تم بوجھ نہیں بنو گی۔ یہاں آؤ گی تو میں تمہاری سلامتی کی فکر میں مبتلا رہوں گا۔"

ماروی نے پوچھا۔ "یہ بتاؤ' کیا دشمن کی کوئی گولی تمہیں آکر نہیں لگے گی؟"

"ہاں لگ سکتی ہے۔"

"تو مجھے بھی لگ سکتی ہے۔ لہو اور بارود کے کھیل میں ہم دونوں ساتھ جئیں گے، ساتھ مریں گے۔"

یہ دلوں کو گرما دینے والی باتیں تھیں لیکن جذباتی تھیں لیکن جذباتی تھی۔

محبوب نے کہا۔ "مراد کے لیے تمہاری محبت تمہارے جذبے سلامت رہیں لیکن وہاں جانے کی بات نہ کرو۔ جب مرد خطرات سے کھیلتا ہے تو عورت کو اس سے دور رہنا چاہیے۔ اس سے دور رہ کر اسے اطمینان دلانا چاہیے کہ وہ محفوظ پناہ گاہ میں اس کی واپسی کا انتظار کر رہی ہے۔"

ماروی نے کہا۔ "واپسی......"

وہ فون کے پاس سے اٹھ گئی۔ ایک طرف جاتے ہوئے پلٹ کر بولی۔ "کوئی بھڑکتی ہوئی آگ میں کود جائے تو کیا وہ زندہ واپس آئے گا؟"

اس کی صاف گوئی پر سب ہی نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بولی۔ "آپ سب کے دماغوں میں یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ دشمن انتہائی خطرناک ہیں۔ ناقابلِ شکست ہیں۔ مراد کو توڑ کر رکھ دیں گے۔ لیکن یہ بات کوئی منہ سے نہیں بول رہا ہے۔"

سمیرا نے کہا۔ "بے شک اللہ سلامتی دینے والا ہے۔"

ماروی نے کہا۔ "تو پھر میرے ساتھ آؤ اور مراد کے میدانِ جنگ میں چلو۔"

سمیرا نے کہا۔ "میں نے یہ تو نہیں کہا کہ جان بوجھ کر ایسی جگہ جانا چاہیے جہاں ہر طرف موت ہی موت ہو۔"

ماروی نے کہا۔ "مراد جان بوجھ کر ایسی جگہ گیا ہے۔"

پھر وہ محبوب کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "محبوب صاحب کو زندہ سلامت رکھنے کے لیے......"

محبوب کو جیسے پتھر آکر لگا۔ یہ کتنے شرم کی بات تھی کہ مراد اُس کی خاطر موت سے لڑنے گیا تھا اور وہ آرام سے ائرکنڈیشنڈ کوٹھی میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ تلملا کر رہ گیا۔ اس نے کہا۔ "میں مراد کے لہو سے نہا کر زندگی اور سلامتی نہیں چاہوں گا۔ ماروی! میں نے اس سے نہیں کہا تھا کہ وہ میری خاطر شہر چھوڑ کر جائے۔ اگر وہ یہاں سے نہ جاتا تب بھی اسے دشمنوں کا سامنا کرنا ہی تھا۔

"وہ ان سے یہاں لڑتا یا وہاں لڑتا۔ میری خاطر یہاں سے جاتا یا نہ جاتا۔ اب اگر چلا گیا ہے تو میں کیا کروں؟

"ماروی اس کے پاس جانا چاہتی ہے کیا میں بھی وہاں جاؤں اور دشمنوں کے لیے سوالیہ نشان بن جاؤں کہ ہم دونوں میں سے مراد کون ہے؟ ان کی سمجھ میں نہ آئے تو وہ دونوں کو گولی ماردیں۔"

سمیرا نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "پھر تو قصہ ہی ختم ہوجائے گا۔ ایک انار رہ جائے گا۔ دو بیمار چلے جائیں گے۔ ماروی اکیلی رہ جائے گی۔ لیکن کوئی بھی عورت کتنے دنوں تک اکیلی رہ سکتی ہے۔ ماروی کو پھر نئے عاشق مل جائیں گے۔"

محبوب نے سخت لہجے میں کہا۔ "واٹ نان سینس۔ سمیرا.... ایسی کیسی باتیں کہہ رہی ہو؟"

وہ بولی۔ "آج میں چپ نہیں رہوں گی۔ یہ سچ سب ہی دیکھتے آرہے ہیں کہ ماروی نے کبھی کسی ایک کے حق میں فیصلہ نہیں سنایا۔ دونوں بیماروں کو امید کے اسپتال میں رکھتی آئی ہے۔

"یہ پہلے ہی دن مراد سے نکاح پڑھوا لیتی تو یہ عشقیہ داستان آج موت کا کھیل نہ بنتی۔ ایک کھیلنے چلا گیا ہے۔ دوسرے سے بھی توقع کی جارہی ہے۔ یہ صاف نظر آرہا ہے کہ محبوب صاحب وہاں جانے کے لیے بھڑک گئے ہیں۔ اب یہ ماروی کی خاطر اپنی زندگی کو داؤ پر لگائیں گے۔"

چاچی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "زیادہ نہ بولو۔ میری بیٹی سائیں سے کہنے نہیں گئی تھی کہ اس پر عاشق ہوجائیں۔ سائیں نے اپنی دولت سے اپنی مہربانیوں سے اور نیکیوں سے اتنے احسانات کیے تھے کہ یہ بیچاری ان کے آگے بے زبان ہوکر رہ گئی تھی۔"

آج دیکھیں کہ اس بے زبان کی زبان کیسے بے اختیار بول پڑی ہے۔ یہ سائیں کو اور مراد کو تو کیا خود کو بھولی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود اس کے اندر کی ماروی اپنے مراد کے لیے تڑپ گئی ہے۔ اس کے حق میں بول رہی ہے۔"

وہ محبوب سے بولی۔ ”سائیں! اب تو یہ کھلی ہوئی کتاب ہے۔ یہ انجانے میں ہی سہی اپنے بچپن کے پیار کی طرف لوٹ گئی ہے۔ کیا اب بھی آپ اسی سے لو لگائے رہیں گے؟“

”سمیرا صاحبہ .. معروف صاحب! ہم غریب ہیں۔ ہماری بچی کو الزام نہ دیں۔ سائیں کو سمجھائیں کہ ماروی کو اب دل سے اور دماغ سے نکال دیں۔

”اب راستے الگ ہو جائیں تو اچھا ہے۔ اب ہم سائیں کا احسان نہیں لیں گے۔ یہاں سے چلے جائیں گے۔ یہ تو ہمارا خدا جانتا ہے۔ یہاں سے جانے کے بعد بھی ہم ساری عمر سائیں کا احسان مانتے رہیں گے۔“

محبوب نے کہا۔ ”خدا کے لیے یہاں سے جانے کی باتیں نہ کریں۔ اگر چہ ہم ایک خاندان کے افراد نہیں ہیں، ہمارا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔ لیکن ہم طویل عرصہ تک ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہے ہیں۔

”میری ایک بات مانو۔ میرے احسانات نہ مانو۔ صرف مجھ سے اپنوں کی طرح محبت کرو۔ ایسی محبت جو آزمائش کی گھڑیوں میں ساتھ نہیں چھوڑتی۔ مجھے چھوڑ کر جانے کی بات نہ کرو۔ ماروی! آج مراد کے لیے تمہارے دل سے آواز نکلی ہے۔

”اپنی ناکامی پر کس کا دل نہیں دکھتا۔ مجھے بھی دکھ ہوا ہے لیکن یہ سب دیکھتے آئے ہیں کہ میں تمہاری خوشی میں خوش رہتا ہوں۔ خدا جانتا ہے کہ میں دکھی ہوں تو خوش بھی ہوں۔ میں جانتا ہوں، تمہارے دونوں ہاتھ میری بہتری چاہنے کے لیے اٹھتے ہیں، لیکن دعا مراد کے لیے مانگتی ہو۔

”جو ہو رہا ہے ہونے دو لیکن خدا کے لیے مجھ سے دور نہ جاؤ۔ کم از کم مراد کے آنے تک میری سرپرستی میں رہو۔ پھر اس کے ساتھ جہاں چاہو چلی جاؤ مگر خدا کے لیے ابھی نہ جاؤ۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں بولوں گا۔ ابھی جا رہا ہوں۔ کہیں تنہا رہ کر وقت گزاروں گا۔“

وہ بولتا ہوا ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا۔ معروف نے ماروی کو دیکھ کر کہا۔ ”آج اس کا دل ٹوٹ گیا ہے۔ ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔ چلو آج قیامت گزر گئی۔ ہم دعا کریں گے کہ محبوب کو جلد ہی صبر آ جائے۔ چلو سمیرا.....!“

سمیرا اندر سے بہت خوش تھی۔ اس نے قریب آ کر ماروی کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میں دعا کروں گی، مراد جلد ہی واپس آئے۔ خدا تمہیں خوشیاں دے۔“

وہ اس کے رخسار کو چوم کر معروف کے ساتھ چلی گئی۔ وہاں صرف چاچی اور ماروی رہ گئیں۔ ماروی نے کہا۔ ”سب اپنی اپنی بولیاں بول کر چلے گئے۔ مراد کے لیے کوئی بولنے والا، سوچنے والا نہیں ہے کہ وہ ابھی ان لمحات میں کیسا تنہا اور بے یار و مددگار ہوگا اور کیسے موت کے خلاف زندگی کے لیے لڑ رہا ہوگا۔“

”چاچی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”تمہیں پچھلی زندگی یاد نہیں آ رہی ہے پھر بھی تم اپنے بچپن کے پیار کے لیے اتنی محبت سے سوچ رہی ہو۔ اس کے لیے پریشان ہو رہی ہو۔ اللہ نے چاہا تو وہ جلد ہی واپس آئے گا۔“

”چاچی! وہ تنہا کہاں موت سے کھیلنے گیا ہے؟ وہ کتنی محبت کرنے والا ہے۔ دوسروں کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا دیتا ہے۔ میرا دل اس کی طرف کھنچا جا رہا ہے۔“

وہ چاچی کے شانے پر سر رکھ کر بولی۔ ”وہ آج کل میں نہ آیا تو میں یہاں نہیں رہوں گی۔ جب تک اس کے پاس نہیں جاؤں گی سکون سے نہیں رہ سکوں گی۔“

”بیٹی! دل کو سنبھالو فی الحال یہاں سے جانے کی نہ سوچو۔ مراد بھی یہی چاہتا ہے۔ تم اس کی بات مانو۔ اس کی واپسی تک یہاں عزت آبرو سے رہو۔“

وہ مراد کو دعائیں دیتے ہوئے بولی۔ ”یہاں تم محفوظ رہو گی تو وہ تمہاری فکر سے آزاد رہ کر پورے حوصلے سے دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہے گا۔“

اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر عاجزی سے کہا۔ ”یا میرے معبود..... تو ہمارے حال سے واقف ہے۔ ہم اور کچھ نہیں چاہتے۔ مراد کی سلامتی اور اس کی واپسی چاہتے ہیں۔ یا میرے پاک پروردگار..... ! ہماری دعائیں قبول فرما..... آمین!“

جب اپنوں کو کہیں سے سلامتی نہ ملتی ہو تو دعائیں مانگنے سے ہی قلبی سکون حاصل ہوتا ہے۔ حالات ایسے تھے کہ صبر کرنے اور انتظار کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ماروی نے چاچی کی دعاؤں کے ساتھ ہم آواز ہو کر آمین کہا پھر سر کو جھکا لیا۔

☆☆☆

مرینہ، آنت کی پرکالہ نے بستر چھوڑ دیا تھا۔ اسپتال سے چھٹی مل گئی تھی۔ وہ بڑی خود اعتمادی کے ساتھ موت سے لڑتی رہی تھی۔ اب چلنے پھرنے اور دوڑنے کے قابل ہو گئی تھی۔

اس نے اسپتال میں رہ کر دو پرائیویٹ سراغ رسانوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ان سے کہا تھا کہ وہ مراد علی منگی پر نظر رکھیں اور اس کی مصروفیات کے بارے میں رپورٹ دیتے رہیں اور وہ جاسوس یہ خدمات انجام دے رہے تھے۔

مراد نے اسے مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی پھر بھی اتنی ہمدردی کی تھی کہ اسے اسپتال جانے اور اپنا علاج کرانے کے لیے زندہ چھوڑ دیا تھا۔

وہ علاج کے دوران قسمیں کھاتی رہی تھی کہ اس ظالم کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔ دل سے بھی مجبور تھی یا شیطانی ہوس کا غلبہ رہتا تھا۔ وہ جنونی ہو کر سوچتی تھی کہ اس کے ساتھ تنہائی میں دو چار راتیں ضرور گزارے گی۔ وہ ڈبل مائنڈڈ ہو کر سوچتی رہتی تھی کہ اسے مار ڈالنے سے پہلے غلام بنا کر حسرتیں پوری کرے گی پھر انتقام تو ضروری ہے۔ اسے تڑپا تڑپا کر مار ڈالے گی۔

یہ دیکھ چکی تھی کہ وہ ایک خطرناک فائٹر بن چکا ہے۔ اسے دشمنوں سے نمٹنا آگیا تھا پھر وہ برنارڈ کو ہلاک کر کے دنیا کی بڑی بڑی جرائم پیشہ تنظیموں کو اپنی طرف متوجہ کر چکا تھا۔ وہ جتنا خطرناک بن رہا تھا' مرینہ اتنی ہی ضدی ہو رہی تھی' اسے اپنے سامنے بے دست و پا بنانے کی قسمیں کھا چکی تھی۔

اس نے برنارڈ سے تعلق رکھنے والی تنظیم ''سنڈیکیٹ ریڈ الرٹ'' سے رابطہ کیا۔ اس تنظیم کے سربراہ سے کہا۔ ''مسٹر میکی! میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کی مرینہ ڈلاور بول رہی ہوں اور کسی تعارف کی محتاج نہیں ہوں۔''

میکی البرٹ نے کہا۔ ''ہائے مرینہ! تم تو ہماری بلیک لسٹ میں تھیں۔ تمہاری غفلت کی وجہ سے برنارڈ مارا گیا ہے۔''

وہ بولی۔ ''میری غفلت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سب جانتے ہیں۔ برنارڈ کے جیل توڑنے سے پہلے میں ہاتھ پاؤں سے معذور ہو کر اسپتال میں پڑی تھی۔''

وہ بولا۔ ''ہاں میں مانتا ہوں۔ مجھے یہ رپورٹ ملی ہے کہ تم بہت پہلے ہی برنارڈ کے معاملے سے الگ ہو گئی تھیں۔ مراد نے تمہیں بھی اسپتال پہنچا دیا تھا۔''

''میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی' چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں گی تو اسے دوڑا دوڑا کر ماروں گی۔''

''اس سے پہلے ہمارے شوٹر اُسے جہنم میں پہنچا دیں گے۔''

وہ نہیں چاہتی تھی کہ مراد اس کا غلام بننے سے پہلے کسی اور کے ہاتھوں مارا جائے۔ اس نے کہا۔ ''مسٹر میکی! ابھی اسے ٹارگٹ نہ بناؤ۔ اسے میرے لیے چھوڑ دو۔''

''تم اپنی خیر مناؤ۔ چونکہ تم برنارڈ کے معاملے سے الگ ہو گئی تھیں اس لیے تمہارا نام بلیک لسٹ سے نکال دیا گیا ہے۔ تم جلد ہی مراد کی موت کی خبر سنو گی۔''

وہ بولی۔ ''میں نے چند دنوں میں مراد کے جو بدلتے ہوئے تیور اور اس کی مہارت دیکھی ہے اس کے پیش نظر کہتی ہوں' تمہارے شوٹروں کی شامت آگئی ہے۔ اسے گولی مارنے کے لیے تمہیں مجھ سے ہی ڈیل کرنی ہو گی۔''

''ایسی کوئی بات ہو گی تو ضرور تمہیں کال کروں گا۔''

میکی نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ فون بند کر دیا۔ وہ اپنے سراغ رسانوں سے بولی۔ ''تم نے کہا تھا کہ اس شہر میں جتنے کرائے کے قاتل ہیں ان میں سے بیشتر کو جانتے ہو۔''

ایک نے کہا۔ ''جی ہاں ہم جانتے ہیں۔''

وہ بولی۔ ''ان میں سے کئی ایسے ہیں جو غیر ملکی ایجنسیوں کے لیے کام کرتے ہیں۔''

''جی ہاں۔ ان ایجنسیوں کے نمائندے کراچی اور اسلام آباد میں رہتے ہیں۔''

''یہ معلوم کرو' سنڈیکیٹ ریڈ الرٹ کا نمائندہ یہاں کون ہے؟ یہاں جو اس کے شوٹر ہیں' وہ مراد کو قتل کرنے والے ہیں۔''

''یہاں ریڈ الرٹ کا نمائندہ کون ہے' یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔ ویسے ہم شوٹروں کو پہچانتے ہیں۔ کسی کو مراد کے قریب آنے نہیں دیں گے۔''

وہ پریشان تھی۔ اس وقت اسپتال میں تھی۔ وہاں سے باہر آنے تک مراد کو صحیح سلامت دیکھنا چاہتی تھی۔ کسی بھی طرح میکی البرٹ کے مقاصد کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔

اس نے سوچا دو بڑی کرمنل تنظیموں کو آپس میں لڑایا جائے تب ہی بات بنے گی۔ ایسے وقت ''سنڈیکیٹ دی ماسٹرز'' کا سربراہ فرانسس کوبوبو یاد آیا۔ میکی البرٹ سے اس کی پرانی دشمنی تھی۔ وہ بہت ہی اہم اور بڑے ہی سنگین معاملات میں ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے سے باز نہیں آتے تھے۔

مرینہ نے فوراً ہی اس کے نمبر پنچ کیے۔ پھر رابطہ ہونے پر بولی۔ ''ہیلو مسٹر کوبوبو! میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کی مرینہ لندن کی میٹ آفیسر بول رہی ہوں۔''

وہ بولا۔ ''ہائے مس مرینہ! سنا ہے تمہیں ملازمت سے فارغ کر دیا گیا ہے۔ اب اسکاٹ لینڈ یارڈ سے اور لندن ایلائٹ ایجنسی فیڈرا اسکواڈ سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''تم نے درست سنا ہے۔ کیا تمہیں یہ سن کر خوشی نہیں ہوئی کہ مراد نامی ایک شخص نے برنارڈ کو جہنم میں پہنچا دیا ہے اور میکی البرٹ اتنے بڑے نقصان پر تلملا رہا ہے۔''

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''جس دن میں نے سنا تھا اس دن خوب جشن منایا تھا۔ ارے یہ مراد کون ہے؟ میں اسے دس لاکھ ڈالرز انعام دوں گا۔ اگر وہ میرے لیے کام کرنا چاہے گا تو وہاں اس کے لیے بڑی بڑی سہولتیں فراہم کروں گا۔''

مرینہ نے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔ ''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ مراد میرا عاشق' میرا دلدار ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے ہیں۔''

''پھر تو میری تلاش ختم ہوگئی۔ میں اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ کیا اس سے بات کرا سکتی ہو؟''

''ابھی نہیں' میں اسپتال میں ہوں اور وہ کہیں پہاڑی علاقے میں گیا ہوا ہے۔''

''اس سے فون پر بات کرا سکتی ہو؟''

''اگر تم اس سے کام لینا چاہتے ہو تو میں اس سے الگ نہیں ہوں۔ ہم دونوں ہی تمہارا کام کریں گے۔''

''تمہاری جیسی نامور تجربہ کار میرے سنڈیکیٹ میں آئے گی' اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔''

''تو پھر ہمارے درمیان پہلے ڈیل ہوگی۔''

''ابھی ڈیل کرو۔''

وہ بولی۔ ''سب سے پہلی بات یہ کہ میں اسپتال سے نکلنے کے بعد پاکستان میں نہیں انڈیا میں رہوں گی۔''

''منظور ہے۔ انڈیا میں ہمارا ایک پروجیکٹ شروع ہونے والا ہے۔ تم اور مراد وہاں بہت کام آؤ گے۔''

''یہ تو میں جانتی ہوں کہ تم ہمارے پاس اسلحہ اور رقم کی کمی نہیں ہونے دو گے لیکن وہاں ہمارے جو ماتحت رکھے جائیں گے ان کا انتخاب ہم کریں گے۔''

''نہیں۔ ففٹی پرسنٹ تمہارے اور ففٹی پرسنٹ ہمارے منتخب کیے ہوئے لوگ تمہارے ماتحت رہیں گے۔''

''تم کبھی میرے اور مراد کے ذاتی معاملات میں مداخلت نہیں کرو گے۔ ہم دونوں آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ تم کبھی اس کی حمایت میں نہیں بولو گے؟''

''میں تم دونوں کے ذاتی معاملات سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں لوں گا۔ بس یہ خیال رہے کہ تمہارے آپس کے جھگڑوں سے مجھے کوئی نقصان نہ پہنچے۔''

''نہیں پہنچے گا۔ تم ہم سے فائدہ حاصل کرتے رہو گے۔''

''بس تو پھر اور کوئی بحث نہیں کروں گا۔''

''ایک بات اور.... ہمیں فوری طور پر رقم کی' شوٹرز کی' اسلحہ اور گاڑیوں کی ضرورت ہے۔''

''اپنا بینک اکاؤنٹ نمبر اور پتا ٹھکانا لکھ کر بھیجو۔ آج ہی یہ سب کچھ تمہیں مل جائے گا۔''

اس کے زخم بھر گئے تھے۔ اسپتال سے اس کی چھٹی ہونے والی تھی۔ اس سے پہلے ہی وہ دور تک اپنے راستے ہموار کر رہی تھی۔

دوسری طرف مراد اکیلا تھا اور مقابلے پر عالمی سطح کے بھانت بھانت کے مجرم تھے۔ اسے زیادہ سے زیادہ اسلحہ' رقم گاڑیوں اور فائٹرز کی ضرورت تھی اور مرینہ بڑی مکاری سے یہ سب چیزیں اس کے نام سے سمیٹ رہی تھی۔

جس دن وہ اسپتال سے صحت یاب ہو کر آئی' اسی دن ریڈ الرٹ کے میکی البرٹ نے اسے کال کی۔ اس نے پوچھا۔ '' میکی! اب کیسے یاد کیا ہے؟''

وہ بولا۔ ''تم نے درست کہا تھا کہ میرے شوٹروں کی شامت آجائے گی۔ وہ واقعی بہت ہی تیز طرار ہے۔''

مرینہ نے پوچھا۔ ''ہوا کیا' یہ تو بولو۔''

وہ بولا۔ ''ہمارا ایک شوٹر اسے قتل کرنے گیا تھا۔ وہ اسپتال پہنچ گیا۔ اس کی زبان بند کرنے کے لیے ہمارے ہی ایک شوٹر نے اسے گولی مار دی۔ وہ اسے گولی مار کر فرار ہو رہا تھا کہ مراد نے اس پر اچانک حملہ کیا۔ اس کی گن چھین لی پھر اسے گن پوائنٹ پر کراچی سے تین سو میل دور لے گیا ہے۔''

مرینہ نے کہا۔ ''اب تمہاری سمجھ میں آیا کہ وہ کیسا پھرتیلا .... اور خطرناک جنگ باز ہے؟''

''ہاں، بولو۔ کیا تم اسے گولی مارو گی؟ جو معاوضہ ہوگا' اس کا ففٹی پرسنٹ ابھی ادا کر دیا جائے گا۔''

''پہلے تو میں یہ معلوم کرنا چاہوں گی کہ وہ کراچی سے تین سو میل دور کس علاقے میں ہے؟''

''مجھے بتایا گیا ہے کہ ابھی وہ عمر کوٹ میں ہوگا۔ میرے شوٹرز وہاں پہنچنے والے ہیں۔''

''اس کا فون نمبر بتاؤ۔''

''میں نہیں جانتا۔ ہمارا ایک بلّا نامی شوٹر جو اس کے شکنجے میں تھا اب نہیں ہے لیکن وہیں عمر کوٹ میں کہیں چھپا ہوا ہے اس کا نمبر نوٹ کرو۔''

مرینہ نے بلّے کا فون نمبر محفوظ کیا پھر کہا۔ ''اب سنو میکی! یو نان سینس! بلڈی فول! مراد اب عمر کوٹ میں اکیلا نہیں رہے گا۔ فار یور انفارمیشن میں اس کے ساتھ رہوں گی اور تمہارے ایک ایک کارندے کو جہنم میں پہنچاؤں گی۔''

وہ غصے سے بولا۔ ''یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟''

''تم نے چار دن پہلے مجھ سے بکواس کی تھی۔ میری

اہمیت کو نظر انداز کیا تھا۔ اب میری اہمیت یہ ہے کہ میں تمہارے جانی دشمن کو بوبو سے ڈیل کر چکی ہوں۔" وہ قہقہہ لگا کر بولی۔ "اب اپنا سر پیٹو۔ تمہارے دشمن سے ڈیلنگ کے مطابق مراد کو سیکیورٹی دوں گی پھر یہاں سے انڈیا تک تمہارے تمام مشن کو ناکام بنانے کی کوششیں کرتی رہوں گی۔"

وہ حقارت سے بولا۔ "اونہہ! کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا۔ بلیک لسٹ میں پھر تمہارا نام آگیا ہے۔ اپنی خیر مناؤ۔ مراد کو سیکیورٹی دینے کی حسرت ہی رہ جائے گی۔"

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ مرینہ نے اپنا فون صوفے پر پھینک کر ایک بھرپور انگڑائی لی۔ انگڑائی کے وقت دونوں بانہیں یوں پھیل گئیں جیسے عمرکوٹ کی سمت پرواز کرنے کے لیے پر تول رہی ہو۔

☆☆☆

دل ٹوٹ جائے تو پیار کرنے والے اندر سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتے ہیں۔ ماروی نے بے اختیار مراد کے لیے اپنی محبت اور اپنایت کا اظہار کر کے محبوب کو محبت کی بلندیوں سے نامرادی کی پستیوں میں گرا دیا تھا۔ اربوں روپے کے کاروبار کو پیچھے چھوڑ کر سب کچھ بھلا کر اس کے پیچھے سحر زدہ سا رہتا تھا۔

پیار میں ایمانداری ایسی تھی کہ مراد کو رقیب نہیں سمجھتا تھا۔

وہ چاہتا تو مراد کو پھانسی کے تختے تک پہنچا سکتا تھا۔ ماروی کو حاصل کرنے کے لیے اسے بڑی آسانی سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک سکتا تھا۔

لیکن یہ اس کی عظمت تھی۔ بڑا پن تھا کہ اس نے مراد کی غربت اور مجبوریوں سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ماروی کے لیے اس کی محبت اور شرافت بے مثال تھی۔ کوئی ایسی مثال پیش نہیں کر سکتا تھا۔ عشق کے امتحان میں اسے سو میں سے سو نمبر ملنے تھے لیکن ماروی کے فیصلے نے اسے صفر کر دیا تھا۔

فی الحال اسے جو دکھ تھا' وہ یہ تھا کہ صفر ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ بات پتھر کی طرح لگ رہی تھی کہ مراد اُسے زندہ سلامت رکھنے کے لیے خود اپنی زندگی ہارنے گیا تھا۔

وہ اپنی کوٹھی میں آ کر بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ کچھ کرنے کے لیے ماروی کی نظروں میں برتر ہونے کے لیے مچل رہا تھا۔ اور بار بار سوچنے کے بعد یہی فیصلہ کر رہا تھا کہ موجودہ حالات میں مراد کا احسان نہیں لے گا۔

بہت سوچنے کے بعد ایک صورت یہ نکل رہی تھی کہ مراد کو وہاں تنہا نہ رہنے دے۔ ہتھیار اور جنگ لڑنے والے لوگوں کو وہاں پہنچایا جائے۔

اسے دشمنوں کے مقابلے میں کمزور اور کمتر نہ ہونے دیا جائے۔ لیکن جہاں جان کا خطرہ ہے وہاں مراد کی طرح نہ جائے۔ پھر تو خود کو چھوٹا بنانے والی بات اپنی جگہ قائم رہے گی۔ ماروی یہی دیکھے گی کہ مراد مردِ میدان ہے اور محبوب اپنی سلامتی کے لیے گھر میں آرام سے بیٹھا ہے۔

اصل بات ماروی کی نظروں میں اہم ہونا تھا۔ وہ دکھانا چاہتا تھا کہ مراد کا احسان نہیں لے رہا ہے۔ گھر میں نہیں بیٹھا ہے۔ بلکہ اس کے شانہ بشانہ دشمنوں سے لڑ رہا ہے۔

تب ماروی سوچے گی کہ وہ محبوب کے نہیں مراد کے دشمن ہیں اور یہ محبوب کا بڑا پن ہے کہ وہ مراد کی جنگ لڑنے گیا ہے۔

عقل یہی سمجھا رہی تھی کہ ماروی کی نظروں میں بازی یکسر بدل جائے گی۔ وہ آج تک ان سب پر بڑے بڑے احسانات کرتا آیا تھا۔ اب پھر مراد کی جنگ لڑتے ہوئے موت کا سامنا کرتے ہوئے ایک اور بڑا احسان کر سکتا تھا۔

وہ تیزی سے سوچ رہا تھا ماروی کو سامنے دیکھتا ہوا بہت ہی جذباتی انداز میں فیصلہ کر رہا تھا' اب کچھ بھی ہو' وہ مراد کا احسان ختم کرنے کے لیے الٹا اس پر احسان کرنے کی خاطر اس کے دشمنوں سے ٹکرانے جائے گا۔

لیکن کہاں جائے گا؟ اس نے کہا تھا کہ وہ کراچی سے تقریباً تین سو میل دور گیا ہے۔ لیکن اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ کس سمت اور کس علاقے میں گیا ہے؟

اس نے کچھ سوچا پھر فون نکال کر مراد کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر اس کی آواز سنائی دی۔ "جی سائیں۔ حکم کریں۔"

اس نے پوچھا۔ "ابھی تم کس علاقے میں ہو؟"

"آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"تم جواب دو۔"

"دیکھیے میں نہیں چاہتا' آپ یہاں آئیں یا کسی کو میری مدد کے لیے بھیجیں۔"

"میں ہتھیار' رقم اور گاڑیاں پہنچاؤں گا۔"

"میرے لیے یہ ضروری نہیں ہیں۔ ان کی ضرورت ہوگی تو آپ سے ضرور کہوں گا۔"

"واہ۔۔۔۔ ادشمنوں سے لڑنے کے لیے ضروری نہیں ہیں۔ کیا تم انہیں پھول پیش کر رہے ہو؟ سچ بولو' کیوں چاہتے ہو کہ میں وہاں نہ آؤں؟ کیا ماروی کو متاثر کر رہے ہو۔ یہ جتا رہے ہو کہ میری سلامتی کی خاطر اس سے دور

ہو گئے ہو؟''

''یہ بات نہیں ہے۔آپ غلط نہ سمجھیں سائیں۔''

''تم صحیح سمجھاؤ۔مجھے غلط سوچنے پر مجبور نہ کرو۔فوراً بتاؤ کس علاقے میں ہو۔میں ابھی آؤں گا۔''

''نہیں سائیں!آپ اِدھر آنے کی ضد نہ کریں۔یہاں موت ہی موت ہے۔''

''میں بچہ ہوں؟ مجھے موت سے ڈرا رہے ہو یا عورت ہوں کہ چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھا ہوا ہوں اور تم میری خاطر جنگ لڑنے گئے ہو۔

''میں تم سے آخری بار پوچھ رہا ہوں۔باتیں نہ بناؤ۔بولو ابھی کس علاقے میں ہو؟''

''سائیں! مجھے تھوڑا سوچنے دیں۔''

''اگر تم نے ایک منٹ میں نہ بتایا تو میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گا اور یہاں ایسی جاؤں بچلوں گا کہ دشمن مجھے مراد سمجھ کر میرے پیچھے چلے آئیں گے۔''

''ٹھیک ہے سائیں! میں' میں ایسا کرتا ہوں کہ.....'' وہ ذرا چپ ہوا۔پھر بولا۔''میں آپ کو سات سو کلو میٹر دور نہیں آنے دوں گا۔میں ہی آپ کے پاس آجاؤں گا۔''

''میں نہیں چاہوں گا کہ یہاں آؤ۔یہاں جو دشمن تمہارے پیچھے ماروی کو اور چاچی چاچا کو بھی نقصان پہنچائیں گے۔ہمیں ان سے دور رہ کر دشمنوں سے نمٹنا ہوگا۔''

''اسی لیے میں دور ہو گیا ہوں۔آپ کو خدا کا واسطہ ان کے سرپرست بن کر رہیں۔''

''آگے کوئی بات کیے بغیر مجھے بتاؤ' کس علاقے میں ہو۔''

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔''ٹھیک ہے۔آپ مجبور کر رہے ہیں تو حیدر آباد آجائیں۔''

''حیدر آباد یہاں سے ایک سو ساٹھ کلو میٹر پر ہے جبکہ تم کہیں سات سو میل دور ہو۔''

''میں نے ایک اندازے سے سات سو میل کہا تھا۔میں اس وقت حیدر آباد کے آس پاس ہوں۔دشمنوں سے مقابلے کے دوران جگہ بدلتا رہتا ہوں۔آپ آئیں گے تو اس وقت جہاں رہوں گا' وہ جگہ آپ کو بتادوں گا۔''

''چلو ٹھیک ہے۔میں آرہا ہوں۔کسی وقت بھی حیدر آباد پہنچ کر تمہیں کال کروں گا۔''

اس نے رابطہ ختم کرکے فون پر لنگڑے جانی کو مخاطب کیا۔اس سے پوچھا۔''میرے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے ابھی کراچی سے بہت دور جانا ہے۔''

''حضور! آپ کا نوکر ہوں۔حکم کریں۔''

''تم اپنے ساتھ کتنے شوٹرز لا سکتے ہو؟''

''میرے چار ساتھی بہترین نشانہ باز ہیں۔''

''ہو سکے تو دو اور لے چلو۔''

''میں کوشش کرتا ہوں۔''

''ہمیں ایک گھنٹے کے اندر یہاں سے نکلنا ہے۔''

''میں آدھے گھنٹے میں مزید دو شوٹرز سے معاملات طے کرکے آرہا ہوں۔''

لنگڑے جانی نے محبوب سے رابطہ ختم کرکے ایک کرائے کے قاتل سے رابطہ کیا۔''ہیلو جمشید! ایک آفر ہے۔تگڑی رقم ملے گی۔ابھی آدھے گھنٹے میں میلوں دور جانا ہے۔''

اس نے کہا۔''سوری جانی! میں عالی جناب سے رقم لے چکا ہوں۔تم جانتے ہو۔سودا ہونے کے بعد ہم رقم واپس نہیں کرتے۔''

''کوئی بات نہیں۔میں بلّے سے بات کرتا ہوں۔''

''بلّا تو پہلے ہی عالی جناب کے کام سے لگا ہوا ہے۔معلوم ہوا ہے کہ ہم جس شخص کو شوٹ کرنے جارہے ہیں' بلّا اس کے چنگل میں پھنس گیا ہے۔''

پھر جمشید نے چونک کر کہا۔''ارے ہاں جانی! ہم جس شخص کو شوٹ کرنے عمر کوٹ جارہے ہیں' وہ تمہارے باس محبوب علی چانڈیو کا ہم شکل ہے۔''

جانی نے حیرت سے پوچھا۔''کیا کہہ رہے ہو؟''

''صحیح کہہ رہا ہوں۔بالکل تمہارے باس کے جیسا ہے' ہمیں اس کی تصویر دکھائی گئی ہے۔''

''تمہیں اس کا نام بھی بتایا ہوگا؟''

''ہاں۔اس کا نام مراد علی منگی ہے۔''

جانی نے دل میں کہا۔''او گاڈ! یہ کیا ہو رہا ہے؟''

اس نے جمشید سے پوچھا۔''تمہارا ٹارگٹ کہاں ہے؟''

''عمر کوٹ میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ہم وہیں جارہے ہیں۔''

جانی نے فوراً ہی لائن کاٹ دی۔بڑی پھرتی سے محبوب کو فون پر مخاطب کرتے ہوئے کہا۔''سر! ایک اہم اطلاع دے رہا ہوں۔مراد صاحب کی جان خطرے میں ہے۔اس وقت وہ جان بچانے کے لیے عمر کوٹ میں کہیں چھپے ہوئے ہیں۔''

محبوب نے حیرانی سے پوچھا۔''تم کیسے جانتے ہو؟''

''مجھے اپنے ایک ساتھی ٹارگٹ کلر سے ابھی معلوم ہوا ہے۔وہ ٹارگٹ کلر مراد صاحب کو شوٹ کرنے جارہا ہے۔''

محبوب نے کہا۔''جانی! ہم ابھی مراد کو ہی سیکیورٹی

دینے جارہے ہیں۔لیکن مجھے یہ اچھی طرح معلوم نہیں ہے کہ وہ ابھی کس علاقے میں ہے۔"

"سر! وہ عمرکوٹ میں ہیں۔ہمیں وہیں جانا چاہیے۔"

"تم فوراً چلے آؤ۔ہم ابھی نکلیں گے۔"

اس نے رابطہ ختم کرتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا۔ مراد اُسے ٹال رہا تھا۔صحیح جگہ نہیں بتا رہا تھا۔یقیناً اسے غیبی مدد کہنا چاہیے۔اب وہ سیدھا عمرکوٹ پہنچنے والا تھا۔

☆☆☆

سورج ڈوب رہا تھا۔عمرکوٹ میں رات روشن ہو رہی تھی۔وہاں اسپتال،بس اڈے اور کئی علاقے ایسے تھے جہاں تمام رات روشنی رہتی تھی اور کئی علاقے ایسے تھے جہاں دشمنوں سے زندگی اور موت کی آنکھ مچولی کھیلی جانے والی تاریکی بھی تھی۔

بلّے نے عالی جناب کو یہ بتایا تھا کہ وہ مراد کی گرفت سے نکل گیا ہے اور مراد اس کا پیچھا کرتا ہوا عمرکوٹ پہنچ گیا ہے۔

عالی جناب نے اسے حکم دیا تھا کہ مراد کو اپنے پیچھے لگائے رکھے۔اس کے کئی ٹارگٹ کلرز جلد ہی وہاں پہنچنے والے ہیں۔

مراد اور بلّے میں دوستی اور اعتماد کا تعلق قائم ہو گیا تھا۔وہ دونوں عمرکوٹ پہنچ کر دشمنوں کا انتظار کر رہے تھے۔

انہوں نے دو چھوٹے سے ہوٹلوں میں الگ الگ کمرے کرائے پر لیے تھے۔آنے والے دشمنوں کو یہ دکھانا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے آگ اور پانی کی طرح دور ہیں۔

عالی جناب کے دو ٹارگٹ کلرز حیدرآباد میں تھے۔انہوں نے دو اور شوٹرز کو کرائے پر حاصل کیا تھا۔پھر وہ اندھیرا ہوتے ہی عمرکوٹ پہنچ گئے تھے۔ان میں سے ایک نے بلّے کو فون پر مخاطب کیا۔"ہیلو۔میں عالی جناب کا خادم بول رہا ہوں۔تم بلّے ہو نا؟"

"ہاں۔میں بھی عالی جناب کا خادم ہوں۔یہ بولو یہاں کب تک پہنچ رہے ہو؟"

"ہم پہنچ گئے ہیں۔تم کہاں ہو؟"

"میں ہوٹل حیات محمد کے ایک کمرے میں ہوں۔یہاں آجاؤ۔لیکن یہ چھوٹا سا ہوٹل ہے۔ہم ہتھیار والے سب کی نظروں میں آجائیں گے۔تم کتنے لوگ ہو؟"

"ہم چار ہیں۔جہاں سے لانگ رُوٹ کی بسیں جاتی ہیں،وہاں کی ایک سرائے میں ہیں۔تم یہاں آجاؤ۔"

"میں ابھی آرہا ہوں۔"

"کیا مراد تمہاری نظروں میں ہے؟"

"ہے۔میں آکر بتاؤں گا۔"

اس نے فون بند کر کے مراد کو دیکھتے ہوئے کہا۔"وہ بس اڈے کی سرائے میں ہیں۔بولو کیا کرنا ہے؟"

"وہی جو ہم نے پلان کیا ہے۔تم ان کے پاس جاؤ۔ میں دور رہ کر انہیں دیکھتا رہوں گا اور نشانہ بنا تا رہوں گا۔"

"اگر پلاننگ سے ہٹ کر سچویشن تبدیل ہوگی تو ہم فون پر ایس ایم ایس کے ذریعے رابطہ رکھیں گے۔"

وہ دونوں ہوٹل سے باہر آئے پھر ایک دوسرے سے الگ ہو کر جانے لگے۔مراد اپنی موٹر سائیکل پر تھا۔ اس سے دور رہ کر پہلے ہی سرائے کے پاس پہنچ کر ایک جگہ چھپ گیا تھا۔

بلّے نے سرائے میں پہنچ کر ان چاروں سے ملاقات کی۔وہ اس کے لیے ایک گن اور بلٹس لے کر آئے تھے کیونکہ وہ نہتا تھا۔

وہ سرائے میں ہتھیار نہیں نکال سکتے تھے۔باہر جا کر ضرورت کے وقت انہیں نکالنے والے تھے۔بلّے نے کہا۔"میں نے مراد کو ایک اسکول کے کمرے میں آتے جاتے دیکھا ہے۔چھٹیوں کے باعث اسکول خالی اور ویران ہے۔میرا خیال ہے' آج رات وہ شاید وہیں رہے گا۔"

ایک نے کہا۔"ہمیں اُدھر جانا چاہیے۔"

بلّے نے کہا۔"میں نے ایک گھنٹا پہلے اسے سنیما ہال میں دیکھا ہے۔وہ وہاں بھی ہو سکتا ہے۔"

"ور تم میں سے کسی ایک کو یہیں بس اڈے میں رہنا چاہیے۔ایسا نہ ہو کہ وہ کسی بس سے کسی دوسرے علاقے کی طرف نکل جائے۔"

پھر اس نے کہا۔"ہم سب کے پاس ایک دوسرے کا فون نمبر ہونا چاہیے۔ہم کبھی بچھڑ جائیں گے تو رابطے میں رہ سکیں گے۔"

انہوں نے اسی وقت ایک دوسرے کے نمبر محفوظ کر لیے۔پھر انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو سنیما کی طرف بھیج دیا۔دوسرے کو وہیں بس اڈے میں چھوڑا۔باقی دو شوٹرز بلّے کے ساتھ اسکول کی طرف آ گئے۔

مراد ان کے پیچھے تھا۔اسکول کے اندر اور باہر تاریکی تھی۔رات کے وقت کوئی اُدھر آتا نہیں تھا۔وہ بلّے کے ساتھ دبے قدموں احاطے میں آ گئے۔اسکول کے اندرونی حصے میں مدھم سی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔اسکول کے چوکیدار نے لالٹین جلائی ہوگی۔

وہ تینوں اسکول کے برآمدے میں آ گئے۔ جہاں لالٹین کی روشنی تھی' وہاں جانے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ دونوں شوٹرز نے اپنی اپنی گن کا رخ ادھر کرتے ہوئے للکارا۔ ''اندر کون ہے.....؟ باہر آؤ۔''

وہ سامنے دیکھ کر للکار رہے تھے۔ انہیں تاریکی میں اپنے پیچھے مراد کی آواز سنائی دی۔ ''میں یہاں ہوں۔''

وہ دونوں سہم کر اچھل پڑے۔ پیچھے پلٹ کر فائر کرنا چاہا۔ اس سے پہلے ہی پہلی گولی ایک کو آ کر لگی۔ دوسرے کو بلّے نے گولی مارتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہاری دی ہوئی گن ہے۔ سوری نہیں کہوں گا۔ تمہارا جوتا تمہارے سر...''

انہوں نے موبائل فون کی ٹارچ روشن کر کے دیکھا وہ دونوں فرش پر مردہ پڑے تھے۔ انہوں نے ان کی گنیں لے کر اپنے بیگ میں رکھ لیں۔ بلّے نے کہا۔ ''یہاں سے سنیما نزدیک ہے۔ ایک شوٹر وہاں ہوگا۔ پہلے وہاں چلو۔''

وہ ٹارچ بجھا کر تیزی سے چلتے ہوئے تاریکی میں گم ہو گئے۔ ان دو مُردوں میں سے ایک ابھی زندہ تھا۔ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس نے جیب سے فون نکال کر نمبر پنچ کیے پھر رابطہ ہوتے ہی اکھڑتی ہوئی سانسوں میں بولا۔ ''بلّے سے دور رہو۔ وہ مراد کا آدمی ہے۔''

وہ جو سنیما میں آیا ہوا تھا۔ اس نے جواب کا انتظار کیا۔ پھر پوچھا۔ ''ہیلو۔ رمزی.....! ہیلو۔ ہیلو۔'' اسے کوئی جواب نہیں ملا۔

اس نے فوراً ہی اس ساتھی کو کال کی جو بس اڈے میں تھا۔ ''ہیلو جیدی.....! ہم دھوکا کھا رہے ہیں۔ بلّا مراد کا آدمی ہے۔ اس نے رمزی اور عبدل کے ساتھ کچھ بُرا کیا ہے۔ شاید مراد کے ساتھ مل کر انہیں ختم کر دیا ہے۔ تم بلّے کو دیکھتے ہی گولی مار دو۔''

جیدی نے غصّے سے کہا۔ ''اگر ہمارے دو ساتھی مارے گئے ہیں تو یہ عالی جناب کی غلطی سے ہو رہا ہے۔ ہم بھی انجانے میں مارے جاتے۔ اس نے بلّے پر اندھا بھروسا کر کے ہمیں یہاں مرنے کے لیے بھیجا ہے۔''

''اب ہم آ ہی گئے ہیں۔ رقم بھی لے چکے ہیں تو مراد کے ساتھ بلّے کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ تم ہوشیار رہو۔ اب وہ ہماری طرف آ رہے ہوں گے۔''

سنیما کے باہر تماشائیوں کی بھیڑ تھی۔ بلّے نے وہاں پہنچ کر کہا۔ ''ہمیں ایک دوسرے سے دور رہنا چاہیے۔''

مراد نے کہا۔ ''ہاں دور تو رہنا چاہیے لیکن میں تمہارے بغیر اس شوٹر کو کیسے پہچانوں گا؟''

''وہ جیسے ہی نظر آئے گا۔ میں تمہیں فون پر بتاؤں گا۔ ویسے اس کا فون نمبر بھی محفوظ کر لو۔''

اس نے دونوں شوٹرز کے نمبر مراد کے فون میں پہنچا دیے۔ پھر اس سے دور جا کر بھیڑ میں گم ہو گیا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ وہ شوٹر مراد کی تصویر دیکھ کر آیا تھا۔ اسے دور ہی سے پہچان لیتا۔ مراد اسے پہچاننے کے لیے بلّا کا محتاج تھا۔ فی الحال وہ اس کی شہ رگ کے قریب بھی پہنچ جاتا تو مراد اسے نہ پہچانتا۔ موت اُسے پہچان کر لے جاتی۔

دوسری بات یہ کہ بلّا یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ شوٹر اس کی دوغلی چال سے آگاہ ہو چکا ہے۔ وہ اس کے فریب میں نہیں آئے گا۔ وہ خود وہاں فریب میں مبتلا ہو کر آیا تھا۔

وہ شوٹر ہوشیار ہو چکا تھا۔ تماشائیوں کی بھیڑ سے دور نیم تاریکی میں آ گیا تھا۔ اس نے چھپ کر بلّے کو دیکھ لیا۔ مراد اس کے ساتھ نہیں تھا۔

اس نے سوچا۔ بلّے کو اپنی طرف بلایا جائے۔ مراد کہیں چھپا ہوگا تو اس کے پیچھے چلا آئے گا۔ اس نے فون پر اس کے نمبر پنچ کیے پھر رابطہ ہونے پر بولا۔ ''بلّے! تم کہاں ہو؟ رمزی اور عبدل میرا فون اٹینڈ نہیں کر رہے ہیں۔ وہ دونوں کہاں ہیں؟''

بلّے نے کہا۔ ''کیا بتاؤں شانی! بہت صدمے کی بات ہے۔ وہ کمبخت مراد پتا نہیں کہاں چھپا ہوا تھا۔ اس ذلیل دشمن نے دونوں کو گولی مار دی ہے۔''

''تم کیسے بچ گئے؟''

''میں ان سے دور تھا۔ فائرنگ ہوتے ہی اندھیرے میں جا کر چھپ گیا تھا۔''

''ہم اس نامراد کو زندہ نہیں چھوڑیں گے تم کہاں ہو؟''

شانی نے دل میں کہا۔ ''مجھ سے مکاری کر رہا ہے میں ابھی اسے جہنم میں پہنچا دوں گا۔''

اس نے فون پر کہا۔ ''میں سنیما ہال سے تھوڑی دور اس دوسرے گیٹ کے پاس ہوں جسے بند رکھا گیا ہے۔ یہاں آ جاؤ۔''

بلّے نے کہا۔ ''ابھی آ رہا ہوں۔''

اس نے رابطہ ختم کر کے مراد کو فون پر کہا۔ ''وہ اس گیٹ کے باہر ہے جسے بند رکھا گیا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ سامنا ہوتے ہی اسے شوٹ کر دوں گا۔''

مراد نے کہا۔ ''جاؤ۔ میں بھی آ رہا ہوں۔''

بلّے نے فون کو جیب میں رکھا۔ پھر سنیما کے احاطے سے باہر آ کر دوسرے گیٹ کی طرف جانے لگا۔ ادھر نیم

تاریکی تھی اسے دور سے دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔قریب جانا ضروری تھا۔

وہ چلتے چلتے اچانک ہی بوکھلا کر لڑکھڑاتے ہوئے گر پڑا۔ٹھائیں کی آواز کے ساتھ ایک گولی اس کے قدموں کے پاس سے مٹی اڑاتی ہوئی گزر گئی۔وہ زمین پر لڑھکتا ہوا احاطے کی دیوار کی تاریکی میں چلا گیا۔

شوٹر شانی نے صحیح نشانہ لگایا تھا۔لیکن عین وقت پر اس کے پیچھے گزرنے والوں میں سے ایک شخص اس سے ٹکرا گیا تھا۔یوں اس کا نشانہ خطا ہو گیا تھا۔اس نے ہوائی فائر کیا تو بھگدڑ مچ گئی۔لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔وہ اس بھیڑ میں بلے کو ڈھونڈنے لگا۔اسے لوگوں کی نظروں میں آنے کے بعد وہاں نہیں رہنا چاہیے تھا۔لیکن بلے کو ہلاک کرنا بھی ضروری سمجھ رہا تھا۔اس کے ہاتھ میں گن تھی کوئی قریب نہیں آسکتا تھا۔ایسے وقت مراد نے اسے دور ہی سے دیکھ لیا۔

اس نے پہلے فائر کی آواز سن کر سمجھا کہ بلے نے شوٹر کو گولی ماری ہے پھر اس نے ایک شخص کو ہوائی فائر کرتے ہوئے اور اِدھر اُدھر جاتے دیکھا تو سمجھ لیا کہ وہی دشمن ہے۔وہ دوڑتا ہوا اس کی طرف جانے لگا۔

اسے گولی مارنے کے لیے قریب جانا ضروری تھا ورنہ بھاگنے والوں میں سے کوئی مارا جاتا۔ایسے ہی وقت شوٹر نے بلے کو دیوار کے پاس پڑا ہوا پایا۔وہ گرنے اور زمین پر لڑھکنے کے باعث زخمی ہو گیا تھا۔اس وقت اپنی مہارت اور پھرتی سے گن استعمال کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

شوٹر نے دونوں ہاتھوں سے اپنی گن کو تھام کر اس کا نشانہ لیا۔ٹھائیں کی آواز کے ساتھ گولی چلی لیکن اس کی گن سے نہیں چلی۔اس سے پہلے ہی مراد نے اسے اُڑا دیا۔

بلا تکلیف سے کراہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔مراد کا سہارا لے کر دوڑتا ہوا موٹر سائیکل کے پاس آگیا۔لوگ دور بھاگنے کے بعد رک کر انہیں دیکھ رہے تھے۔خوف زدہ تھے گن والوں کے قریب کوئی نہیں آرہا تھا۔وہ موٹر سائیکل کی رفتار بڑھاتے ہوئے وہاں سے دور ہوتے چلے گئے۔

اب وہ آخری جیدی نامی شوٹر رہ گیا تھا۔اس نے عالی جناب کو وہاں کے حالات بتائے تھے۔"جناب! آپ کا وفادار کہلانے والا بلا نمک حرام ہے۔وہ مراد کا ساتھ دے رہا ہے۔اس کی وجہ سے ہمارے دو شوٹر رمزی اور عبدل مارے گئے ہیں۔"

وہ بولا۔"میں حیران ہوں۔یقین نہیں آرہا ہے کہ بلا... مجھ سے غداری کر رہا ہے۔تم اس کمینے کو بھی نشانہ بناؤ۔اسے وہاں سے زندہ نہ جانے دو۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔"عالی جناب! ابھی میں نے شانی کو فون کیا تھا۔وہ اٹینڈ نہیں کر رہا ہے۔معلوم ہوتا ہے وہ بھی مشکل میں ہے یا پھر مارا گیا ہے۔

"آپ نے کہا تھا مراد اکیلا ہے ہم اسے آسانی سے گھیر کر ہلاک کر سکیں گے لیکن وہ ہم پر بھاری پڑ رہا ہے۔"

عالی جناب نے کہا۔"میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ اکیلا ہے مگر بہت ہی خطرناک ہے۔برنارڈ جیسے ناقابلِ شکست کو شکست دینے والا کوئی موم کا بنا ہوا نہیں ہوگا۔یہ تم لوگوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے تھا۔"

جیدی نے کہا۔"اب تو یہ سمجھ میں آگیا ہے کہ اگر شانی بھی مارا گیا ہوگا تو میں یہاں ایک منٹ نہیں رہوں گا۔اکیلا اپنی جان کو داؤ پر نہیں لگاؤں گا۔"

"ابھی تم اس پر حملہ نہ کرو۔چھپ کر رہو۔میرے اور تین شوٹرز آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچنے والے ہیں۔پھر تم سب انہیں گھیر کر جہنم میں پہنچا سکو گے۔"

جیدی نے چھپ کر رہنے میں ہی اپنی بہتری سمجھی۔مراد اور بلا وہاں پہنچے تو وہ نظر نہیں آیا۔بلے نے اسے فون پر مخاطب کیا۔پھر پوچھا۔"تم کہاں ہو؟"

جیدی نے جواباً پوچھا۔"شانی کہاں ہے؟ وہ میرا فون کیوں اٹینڈ نہیں کر رہا ہے؟"

"میں کیا جانوں وہ کہاں ہے؟ پتا نہیں کیوں وہ میرا بھی فون اٹینڈ نہیں کر رہا ہے۔"

"تو پھر یہ بھی نہ جانو کہ میں کہاں ہوں؟ اور آئندہ تمہارا فون اٹینڈ... نہیں کروں گا۔"

"کیوں دشمنوں کی طرح بول رہے ہو؟"

"دشمنی تو تم کر چکے ہو۔میں تمہارے جھانسے میں آنے والا نہیں ہوں۔تمہیں تھوڑی دیر بعد معلوم ہوگا کہ میں یہاں تنہا نہیں ہوں۔عالی جناب کی فوج یہاں آرہی ہے۔"

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔وہ بس اڈے میں نہیں تھا۔کہیں چھپا ہوا تھا۔

مراد نے کہا۔"ہمیں کہیں کھلی جگہ نہیں رہنا چاہیے۔تم زخمی ہو۔مرہم پٹی کراؤ۔کسی دوسرے ہوٹل میں کمرا لے کر آرام کرو۔میں معلوم کرتا رہوں گا کہ دشمن کب یہاں پہنچ رہے ہیں اور وہ مجھے کس طرح ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔"

مراد دشمنوں سے پریشان نہیں تھا۔دوست سے پریشان ہو گیا تھا۔ابھی محبوب نے فون پر کہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ دشمنوں سے جنگ لڑنے آرہا ہے۔

یہ سراسر فکر اور پریشانی میں مبتلا کرنے والی بات تھی۔ وہ محبوب کی سلامتی کی خاطر ہی اتنی دور دشمنوں کو اپنے پیچھے دوڑاتا آیا تھا۔ اب اس کی محنت رائگاں جارہی تھی اگر وہ وہاں آتا اور کہیں سے آنے والی اندھی گولی اسے لگ جاتی تو وہ مہربان، وہ محسن بے موت مارا جاتا۔

وہ اپنے محسن کو ہر حال میں وہاں آنے سے روکنا چاہتا تھا۔ اس نے معروف جگی کو فون پر کہا کہ وہ سائیں کو ایسی غلطی کرنے سے روکے۔ انہیں کراچی شہر سے باہر نہ نکلنے دے۔

معروف کے لیے یہ بہت زیادہ پریشانی کی بات تھی اس نے فوراً فون پر محبوب سے رابطہ کیا۔ محبوب نے اس کی نصیحت سن کر کہا۔ ''میں اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کروں گا۔ آپ کی کال آئے گی تو میں فون بند کردیا کروں گا۔''

مراد نے ماروی کو کال کی۔ اس سے کہا۔ ''ماروی! محبوب صاحب بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ وہ میرے منع کرنے کے باوجود دشمنوں کو اپنی طرف للکارنے کے لیے یہاں آرہے ہیں۔''

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ وہ ایسی غلطی کیوں کر رہے ہیں؟''

''میں کیا کہوں۔ وہ میری نہیں سن رہے ہیں۔ معروف صاحب کی بات بھی نہیں مان رہے ہیں۔ میں نے سوچا شاید تم ہی انہیں سمجھا سکو گی۔ وہ تمہاری بات مان لیں گے۔ تم فوراً انہیں کال کرو اور کسی طرح انہیں یہاں آنے سے روک دو۔''

ماروی تو یہ سنتے ہی گھبرا گئی۔ پریشانی سے بولی۔ ''پتا نہیں وہ میری بات مانیں گے یا نہیں؟ وہ دشمنوں کو للکارنے کیوں جارہے ہیں؟ یہ تو پاگل پن ہے۔''

''میں یہاں دشمنوں میں مصروف ہو گیا تھا۔ تم سے پہلے ہی کہنا چاہیے تھا۔ مجھے یقین ہے، تم انہیں روک سکو گی۔ میرا خیال ہے سائیں وہاں سے نکل چکے ہوں گے۔''

''میں ابھی معلوم کرتی ہوں۔''

اس نے مراد سے رابطہ ختم کر کے محبوب کے نمبر پنچ کیے۔ اس نے ماروی کے نمبر پڑھتے ہی بٹن دبا کر فون کو کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ ''ہیلو ماروی! یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے کہ مجھے فون پر یاد کر رہی ہو۔''

''آپ ابھی کہاں ہیں؟''

''بس جہاں بھی ہوں۔ خیریت سے ہوں۔''

''مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ وہاں جارہے ہیں جہاں مراد مصیبتوں سے لڑ رہے ہیں۔''

''تم نے درست سنا ہے۔''

''نہیں۔ خدا کے لیے آپ وہاں نہ جائیں۔''

''میں تو یہاں حیدرآباد پہنچ گیا ہوں۔ ابھی عمرکوٹ کی طرف جانے والا ہوں۔''

''آپ میری بات مانیں واپس آجائیں۔''

''کیوں آجاؤں؟''

''وہ آپ کو دشمنوں سے دور رکھنے کے لیے میلوں دور گیا ہے۔ آپ وہاں جائیں گے آپ کو نقصان پہنچے گا تو اس کی محبت اور محنت رائگاں جائے گی۔''

''اور کیا وہ جان سے جائے گا تو ہم ایک محبت کرنے والے نئے قربانیاں دینے والے سے محروم نہیں ہوں گے؟''

''بے شک مراد کو بھی نہیں جانا چاہیے تھا۔''

''تو پھر اسے واپس بلاؤ۔ میں اس کے ساتھ چلا آؤں گا۔''

''وہ نہیں آئیں گے۔ ان کی بات چھوڑیں۔ خدا کے لیے آپ نہ جائیں۔ واپس آجائیں۔''

''اس کی بات کیوں چھوڑیں؟ کیا تم چاہتی ہو کہ وہ اپنی سلامتی کے لیے لڑتے وقت تنہا رہے؟ میرے ہتھیار میرے فائٹرز اور میری دولت اس کے کام نہ آئے؟''

''یہ تو ہر حال میں چاہتی ہوں کہ اسے مدد ملتی رہے۔ لیکن آپ وہاں نہ جائیں۔''

''کیا میں ہاتھ پاؤں سے کمزور ہوں یا بزدل ہوں؟ یا میں نے چوڑیاں پہن لی ہیں کہ میری جنگ وہ لڑتا رہے گا اور میں گھر میں جھولا جھولتا رہوں گا۔''

''میں نے سنا ہے کہ جب آپ مراد کے بُرے وقت میں کام آتے تھے تو وہ انکار نہیں کرتے تھے۔ آپ کی طرح بحث نہیں کیا کرتے تھے۔ آپ بھی نہ کریں۔''

''اسے حالات نے مجبور کر دیا تھا۔ وہ جیل میں تھا۔ بہت مجبور ہو کر میرے احسانات اٹھاتا تھا۔ اگر وہ آزاد ہوتا تو اس کی غیرت بھی گوارا نہ کرتی کہ تمہارے معاملات میں میرے احسانات اٹھائے۔ میں اس کی طرح مجبور نہیں ہوں۔ اس کا احسان کیوں اٹھاؤں؟ وہ اپنی سلامتی کی خاطر تنہا موت سے لڑ رہا ہے۔ کیا میں تماشا سمجھ کر دور سے دیکھتا رہوں؟''

''میں آپ سے بحث نہیں کر سکوں گی۔ میری عقل کہتی ہے کہ دونوں کو بیک وقت اپنی زندگیاں داؤ پر نہیں لگانی چاہئیں۔''

''ماروی! سیدھی سی بات ہے' وہ مجھ پر احسان کرنے گیا ہے۔ میں اسے زندہ سلامت واپس لا کر احسان کا جواب احسان سے دوں گا۔''

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ فون بند کر کے سوچنے لگی۔ ''چاچی کہتی ہیں' جب میری یادداشت اچھی تھی تو دونوں کے درمیان الجھی رہتی تھی۔ فیصلہ نہیں کر پاتی تھی کہ کس سے زیادہ محبت کرتی ہوں؟''

لیکن اب وہ پلڑے ... برابر نہیں رہے تھے۔ مراد کی طرف جھکاؤ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

عمر کوٹ کے پولیس افسران پریشان ہو گئے تھے۔ انہیں اسکول میں دو لاشیں اور سینما ہال کے قریب ایک لاش ملی تھی۔ لوگوں نے بتایا تھا کہ جو شخص ہلاک ہوا ہے اسی نے پہلے گولی چلائی تھی اور ہوائی فائر کر کے لوگوں کو دہشت زدہ کر رہا تھا۔ بعد میں دوسرے شخص (مراد) نے آ کر اسے ہلاک کیا تھا پھر اپنے ساتھی کو وہاں سے ایک موٹر سائیکل پر کہیں لے گیا تھا۔

اسکول کے برآمدے میں پائی جانے والی لاشوں کے متعلق بھی یہ اندازہ کیا جا رہا تھا کہ وہی موٹر سائیکل والے انہیں ہلاک کر کے کہیں روپوش ہو گئے ہیں۔

پورے شہر میں انہیں تلاش کیا جا رہا تھا۔ مراد اور بلا وہاں سے پچاس کلومیٹر دور ایک چھوٹی سی بستی میں آ گئے تھے۔

وہاں سے بلے نے عالی جناب کو مخاطب کیا۔ ''حضور' عالی جناب! اب ہم فارغ ہو کر کھیتوں سے نکل آئے ہیں۔''

وہ بلے کی آواز سنتے ہی غصے سے بھونکنے کے انداز میں بولا۔ ''کتے' حرام خور! میں تیری غداری کی ایسی سزا دوں گا کہ نمک حرامی کرنے والے تیرا انجام دیکھ کر توبہ کریں گے۔''

مراد نے بلے سے فون لے کر کہا۔ ''بھونکنا بند کرو۔ میں تمہارے کھٹملوں کو مسلنے والا مراد بول رہا ہوں۔''

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔ ''یو ڈرٹی ڈاگ! کیا تم سمجھتے ہو عمر کوٹ سے زندہ واپس آسکو گے؟''

وہ ٹھنڈے لہجے میں بولا۔ ''تمہارے اس سوال کا جواب وہ تین لاشیں ہیں' جو یہاں لاوارثوں کی طرح پڑی ہیں۔ آج کی رات زر خرید کرائے کے قاتلوں پر بھاری ہو گی۔ صبح تک لاشوں کی گنتی بڑھتی جائے گی۔''

''وہاں سے صرف دو لاشیں اٹھائی جائیں گی۔ وہ تمہاری اور بلے کی ہوں گی۔ ابھی دیکھو گے وہاں کی پوری پولیس فورس تمہارے پیچھے پڑ جائے گی۔''

عالی جناب نے فون بند کر کے اپنے پرسنل سیکریٹری سے انٹر کام پر پوچھا۔ ''عمر کوٹ میں آئی جی آف پولیس کون ہے؟ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میری سفارش پر اسے وہاں ترقی دی گئی تھی۔''

''یس سر! وہ آپ کے احسان مندوں میں سے ہے۔ اس کا نام کبیر منگی ہے۔''

''اسے فون لگاؤ۔ ہم ابھی بات کریں گے۔''

دس منٹ کے اندر کبیر منگی نے فون پر بڑی خاکساری سے کہا۔ ''آپ نے مجھے یاد کیا ہے۔ میرے نصیب جاگ گئے ہیں۔ شاید مجھے خدمت کرنے کا موقع ملے گا۔ حکم کریں' سرکار! غلام حاضر ہے۔''

عالی جناب نے کہا۔ ''عمر کوٹ میں جو تین لاشیں پائی گئی ہیں' ان کا قاتل مراد علی منگی ہے۔ بلا نامی ایک اور قاتل اس کے ساتھ ہے۔ وہ دونوں وہیں آس پاس کے علاقوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ میں ان کی فوری گرفتاری چاہتا ہوں۔''

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں انہیں صبح ہونے سے پہلے گرفتار کر لوں گا۔''

''یہ ظاہر نہ ہو کہ میں اس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہوں۔''

''سمجھ گیا جناب! آپ کا نام میری زبان پر نہیں آئے گا۔''

''یہ وہی مراد علی منگی ہے جس نے غیر ملکی سیکریٹ ایجنٹ برنارڈ کو قتل کیا تھا اور ایک محب وطن ہیرو کہلانے لگا ہے۔ اس کی تصویریں اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں اور وہ کم بخت دو کوڑی کا گدھا کئی ٹی وی چینلز میں نظر آتا رہا ہے۔''

''جی جناب! میں نے اس کی تصویریں دیکھی ہیں۔ اسے فوراً پہچان لوں گا۔''

''مسٹر کبیر! وہ قومی ہیرو کہلاتا ہے۔ اس کے خلاف قانونی کارروائی ذرا مشکل ہو گی۔ اور یاد رکھو' میں نہیں چاہتا کہ وہ وہاں سے زندہ واپس آئے۔''

''آپ کا یہ خادم اشارے سمجھ لیتا ہے۔ حضور کی عمر دراز ہو۔ آپ جو چاہتے ہیں وہی ہو گا۔''

وہ عالی جناب سے رابطہ ختم کر کے تمام ماتحت افسران کو حکم دینے لگا کہ مراد اور بلا قاتل ہیں۔ یہیں کسی علاقے میں چھپے ہوئے ہیں۔ انہیں جلد سے جلد گرفتار کیا جائے۔ یہ حکم بھی دیا کہ جب وہ گرفتاری پیش نہ کریں۔ مقابلہ کریں اور فرار ہونا چاہیں تو انہیں گولی مار دی جائے۔

اس شہر کے تمام سپاہی فرائض کی ادائیگی کے لیے

مستعد اور متحرک ہو گئے۔ ایسے لوگوں کو چیک کرنے لگے جن کے پاس موٹر سائیکل تھی۔ لوگوں کے سامان کی اور لباس کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ لیکن کسی کی تحویل سے ہتھیار برآمد نہیں ہو رہا تھا۔

رات گیارہ بجے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ عالی جناب کے اور چار شوٹرز وہاں پہنچ گئے تھے۔ جو معرکہ تھم گیا تھا، وہ پھر شروع ہو گیا تھا۔

مسلح سپاہیوں کی دو گاڑیاں ایک مضافاتی علاقے میں گئیں۔ ادھر فائرنگ بند ہو چکی تھی۔ گولیاں چلانے والے اپنے پیچھے ایک لاش چھوڑ گئے تھے۔

اس شہر میں پہلی بار ایسا ہوا تھا، چار گھنٹوں کے اندر وہ چوتھی لاش تھی۔ ان چاروں مرنے والوں کے پاس بندوقیں اور گولیاں خاصی تعداد میں پائی گئی تھیں۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ہلاک ہونے والے واردات کرنے وہاں آئے تھے۔

اور یہ بھی سمجھ میں آ رہا تھا کہ انہیں ہلاک کرنے والے مراد اور بلا ہیں۔ آئی جی کبیر منگی نے دو گاڑیوں میں لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے ہر گلی کوچے میں اعلان کرایا کہ مراد علی منگی اور بلال احمد عرف بلے کہیں چھپ کر نہیں رہ سکیں گے۔ ان کی بہتری اسی میں ہے کہ تھانے میں آ کر گرفتاری پیش کر دیں۔

ایسے وقت کبیر منگی کے آفس کے سامنے ایک بہت مہنگی کلرڈ شیشوں والی کار آ کر رکی۔ اس کے پیچھے ایک گاڑی میں لنگڑا جانی تین مسلح گارڈز کے ساتھ تھا۔

آفس کے باہر مسلح سپاہی تھے۔ انہوں نے آنے والوں پر بندوقیں تان لیں۔ کیونکہ وہ ہتھیار کے ساتھ آئے تھے اور کلرڈ شیشوں کے پیچھے نظر نہیں آ رہا تھا کہ کار میں کون بیٹھا ہے۔

کار میں محبوب علی چانڈیو کے ساتھ حماد صدیقی بیٹھا ہوا تھا۔ پہلے وہ کار سے باہر آیا۔ اس نے وہاں کھڑے ہوئے جونیئر افسر کو اپنی آئی ڈی پیش کی اور کہا۔ ''میرے ساتھ مسٹر محبوب علی چانڈیو ہیں، ہم ابھی آئی جی آف پولیس سے ملنا چاہتے ہیں۔''

وہ افسر آئی ڈی کارڈ لے کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد انہیں آفس میں آنے کی اجازت مل گئی۔ کبیر منگی ایک بڑی سی میز کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر بیٹھا تھا۔ حماد کے ساتھ محبوب کو دیکھ کر ایکدم سے تن کر بیٹھ گیا پھر فاتحانہ انداز میں بولا۔ ''اچھا تو تم گرفتاری پیش کرنے آئے ہو۔''

حماد نے کہا۔ ''یہ مراد نہیں ہے۔ یہ بہت بڑے صنعت کار محبوب علی چانڈیو ہیں۔ دونوں ہو بہو ایک جیسے ہیں۔''

وہ بے یقینی سے محبوب کو تک رہا تھا۔ محبوب نے اپنی آئی ڈی اور پاسپورٹ پیش کیا۔ وہ انہیں دیکھ کر مطمئن ہو کر بولا۔ ''تعجب ہے۔ صورت ایک جیسی ہے لیکن ایک معزز صنعت کار ہے۔ دوسرا قاتل بدمعاش ہے۔''

حماد نے کہا۔ ''پلیز کسی ثبوت کے بغیر اسے قاتل بدمعاش نہ کہیں۔ ہم اس کی سیکیورٹی کے لیے آئے ہیں۔''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''کیا یہ ثبوت کم ہے کہ اس نے چند گھنٹوں میں یہاں چار بندوں کو ہلاک کر دیا ہے۔''

حماد نے کہا۔ ''میں یہ ثابت کر دوں گا کہ وہ ہلاک ہونے والے چاروں سزا یافتہ مجرم ہیں اور کرائے کے ٹارگٹ کلرز ہیں۔''

یہ بات انٹیلی جنس کا ایک بڑا افسر کہہ رہا تھا۔ کبیر اسے جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ محبوب نے کہا۔ ''آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ مراد نے ایک غیر ملکی سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو یہاں سے فرار ہونے نہیں دیا۔ اسے گولی مار دی۔ آج بھی اس نے پیشہ ور چار کرائے کے قاتلوں کو گولی ماری ہے۔

''ہم آسانی سے مراد کی بے گناہی ثابت کر دیں گے۔ فی الحال آپ سے تعاون حاصل کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔''

کبیر منگی نے پوچھا۔ ''میں کس طرح تعاون کر سکتا ہوں؟''

محبوب نے کہا۔ ''یہاں اور بھی اس کی جان کے دشمن آئے ہوئے ہیں۔ وہ تنہا ان سے نمٹ رہا ہے۔ آپ سپاہیوں کو حکم دیں کہ یہاں شہر میں جو لوگ ہتھیار لے کر آ رہے ہیں انہیں تلاش کریں اور فوراً گرفتار کریں۔''

آئی جی نے کہا۔ ''یہ میری ڈیوٹی ہے۔ میں ضرور کروں گا۔ آپ مراد سے بولیں کہ اپنے ساتھی بلے کے ساتھ یہاں آ کر ہتھیار ڈالے۔ اس کے ساتھ انصاف ہوگا۔''

''جناب ....! وہ مجرم نہیں ہے کہ ہتھیار ڈالے گا۔ جب تک اس کا ایک بھی دشمن یہاں زندہ رہے گا تب تک وہ اپنے ہاتھ سے بندوق نہیں چھوڑے گا۔''

آئی جی نے پوچھا۔ ''جس ہتھیار سے وہ کھیل رہا ہے کیا اس کا لائسنس اس کے پاس ہے؟''

محبوب جانتا تھا کہ مراد نے کبھی کسی ہتھیار کا لائسنس حاصل نہیں کیا ہے۔ اس نے حماد کو دیکھا۔ وہ انٹیلی جنس کا افسر انہیں قانونی طور پر تحفظ دینے آیا تھا۔

آئی جی کبیر نے کہا۔ ''آپ خاموش ہیں۔ وہ قانون

کے خلاف اسلحہ استعمال کر رہا ہے۔ آپ اس سے بولیں یہاں آ کر ہتھیار جمع کرے۔ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔ وہ یہاں آپ لوگوں کے ساتھ سلامتی سے رہے گا۔ ہمارے سپاہی ان کرائے کے قاتلوں کو گرفتار کریں گے۔"

محبوب نے اپنے فون پر مراد کو مخاطب کیا اور وائڈ اسپیکر کو آن کر دیا۔ دوسری طرف سے مراد کی آواز سنائی دی۔ "جی سائیں! فرمائیں۔ آپ کہاں ہیں؟"

محبوب نے کہا۔ "تم نے مجھے نہیں بتایا کہ عمرکوٹ میں ہو پھر بھی میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔ میرے ساتھ حماد صدیقی ہیں اور ہم انسپکٹر جنرل آف پولیس کے سامنے بیٹھے ہیں۔ ہماری باتیں یہ سب سنتے رہیں گے۔"

"سائیں! آپ اپنے دماغ سے اپنی مرضی سے کام کر رہے ہیں۔ میں بہت کچھ کہہ سکتا ہوں لیکن نہیں کہوں گا۔"

"فرمایئے۔ آپ ان سب کے سامنے کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"ہم تمہیں یہاں قانونی تحفظ دینے آئے ہیں۔ تم ان قاتلوں سے مقابلہ نہ کرو۔ اپنے ساتھی کے ساتھ یہاں آ جاؤ۔ قاتلوں کو گرفتار کرنا سپاہیوں کا کام ہے۔ وہ انہیں ضرور گرفتار کریں گے۔"

مراد نے پوچھا۔ "اور کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

حماد نے فون کی طرف جھک کر کہا۔ "تمہارے پاس غیر قانونی اسلحہ ہے۔ اسے آئی جی صاحب کے حوالے کر دو۔ ہمارے ساتھ رہو۔ کوئی دشمن تمہاری طرف نہیں آئے گا۔"

"حماد صاحب میں اسپتال میں آپ کے اور سپاہیوں کے ساتھ تھا۔ کیا وہاں آپ دشمنوں کو حملہ کرنے سے روک سکے؟ آپ برا نہ مانیں۔ آپ کی ناک کے نیچے پپو ملنگ مارا گیا۔ بلا فرار ہو گیا آپ اسے گرفتار نہ کر سکے۔"

"میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پولیس والے نااہل ہوتے ہیں۔ البتہ ان سے بھول چوک ہو جاتی ہے۔ میں یہاں آپ پر اور آئی جی صاحب کے سپاہیوں پر بھروسا کر کے اسلحے سے محروم ہو جاؤں گا تو میرا انجام کیا ہوگا۔ کیا یہاں آپ لوگوں سے بھول چوک نہیں ہوگی؟

"میں اپنا انجام بتا دوں کہ مارا جاؤں گا تو سب افسوس کریں گے۔ یہ کہا جائے گا کہ آپ سب نے مجھے سیکیورٹی دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اور یہ سچ ہے۔ لیکن کیا کیا جائے۔ نصیب میں موت لکھی تھی۔

"جب میرے ہاتھ میں اسلحہ ہوگا اور مجھے موت آئے گی تب یہ بات مانی جائے گی کہ نصیب میں موت لکھی تھی۔"

آئی جی کبیر نے غصے سے کہا۔ "یہ شخص بکواس کر رہا ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ غیر قانونی اسلحہ جمع نہیں کرے گا اور اسے یہاں استعمال کرتا رہے گا تو مجرم کہلائے گا۔ اسے گرفتار کرنا لازمی ہوگا۔ ہم اسے نہیں چھوڑیں گے۔"

مراد نے کہا۔ "میں یہ اسلحہ نہیں رکھوں گا۔ وعدہ کرتا ہوں، آپ یہاں آنے والے قاتلوں کو صبح تک گرفتار کریں۔ میں اسی وقت آپ کے سامنے حاضر ہو کر آپ کے قدموں میں اسلحہ رکھ دوں گا۔ یہ ایک مرد کی زبان کہہ رہی ہے۔"

آئی جی نے کہا۔ "قانوناً میری بات درست ہے۔ پہلے یہاں اسلحہ جمع کرو۔"

مراد نے کہا۔ "اپنی سلامتی کے حوالے سے میری بات درست ہے۔ پہلے قاتلوں کو گرفتار کریں۔"

وہ غصے سے بولا۔ "مسٹر حماد! یہ سرپھرا قاتل ہے۔ اسے اسلحے سے کھیلنے کا شوق ہے۔ آپ لوگ اسے قومی ہیرو کہہ کر یہاں سیکیورٹی دینے آئے ہیں۔"

حماد نے کہا۔ "مراد پر اب سے پہلے کئی حملے ہو چکے ہیں۔ وہ جان لیوا حملوں سے بچتا ہوا آ رہا ہے۔ ہم بھی اسے سیکیورٹی دینے میں ناکام رہے ہیں۔ آپ بھی ناکام ہو سکتے ہیں۔"

آئی جی نے میز پر گھونسا مارتے ہوئے کہا۔ "میں مجرموں کی گردنیں توڑ دیتا ہوں۔ میں کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ یہ میرا ریکارڈ ہے۔"

"آپ کی ناکامی ابھی سب کے سامنے ہے۔ ہتھیار لے کر آنے والے چار قاتل یہاں مارے گئے ہیں اور نہ جانے یہاں ابھی کتنے چھپے ہوئے ہیں۔ آپ کو پہلے انہیں گرفتار کرنا چاہیے۔ لیکن آپ اس سے پہلے ہتھیار چھیننا چاہتے ہیں جو تنہا اپنی جان بچاتا پھر رہا ہے۔"

"مسٹر حماد! آپ میری انسلٹ کر رہے ہیں۔ اگر آپ انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسر نہ ہوتے تو۔۔۔"

حماد نے بات کاٹ کر۔ "یہ آپ کی بدنصیبی ہے کہ میں افسر ہوں۔ آپ ہم سے تعاون نہیں کریں گے۔ مراد کے پیچھے پڑے رہیں گے۔ اصل مجرموں کو نظر انداز کریں گے تو صبح تک آپ کو کئی مجرموں کی لاشیں ملیں گی۔ میں اپنے ساتھ گن مین لایا ہوں، ہم مراد کو بھرپور سیکیورٹی دیں گے۔"

وہ محبوب کے ساتھ اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ کبیر منگی نے فوراً ہی عالی جناب سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "جناب! میں کامیاب ہونے والا تھا۔ مراد سے ہتھیار چھیننے والا تھا لیکن انٹیلی جنس کے ایک افسر حماد صدیقی نے رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔"

وہ فون پر بتانے لگا کہ حماد وہاں اپنے اسلحہ برداروں

کے ساتھ مراد کو سیکیورٹی دینے آگیا ہے۔ اس کی موجودگی میں مراد کبھی ہتھے نہیں چڑھے گا۔

عالی جناب نے اسی وقت انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے ڈائریکٹر کو فون پر کہا۔ ''یہ تمہارے ڈیپارٹمنٹ میں حماد صدیقی نامی افسر عمرکوٹ کیوں گیا ہے؟ اسے ابھی اسی لمحے میں واپس بلایا جائے۔''

ڈائریکٹر نے کہا۔ ''سر! جنہیں ہر حال میں سیکیورٹی فراہم کرنا لازمی ہوتا ہے ان اہم شخصیات کی فہرست میں مراد علی منگی کا نام بھی ہے کسی غیرملکی خطرناک تنظیم کی بلیک لسٹ میں اس کا نام آگیا ہے۔ اس پر جان لیوا حملے ہو رہے ہیں۔ ہمارا افسر اسے سیکیورٹی فراہم کرنے گیا ہے۔''

''وہ مراد اتنا ہی اہم ہے تو اسے کراچی یا اسلام آباد بلا کر سیکیورٹی دی جائے۔ فی الحال حماد کو واپس بلاؤ۔ ابھی اسی وقت...... یہ میرا حکم ہے۔ اس میں تاخیر نہ کی جائے۔''

وہ اعلیٰ افسر یہ حکم سن کر پریشان ہوگیا۔ اس نے حماد سے فون پر پوچھا۔ ''یہ عالی جناب تم سے ناراض کیوں ہیں۔ انہوں نے ابھی تمہیں وہاں سے واپس بلانے کا حکم دیا ہے اور کہا ہے حکم کی تعمیل میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہ کی جائے۔''

حماد نے کہا۔ ''یہ تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ مجھے فوراً واپس آنے کا حکم کیوں دیا گیا ہے۔ میرے یہاں سے جانے سے کسے فائدہ پہنچنے والا ہے؟''

''سر...... ! مراد کے دشمنوں کو فائدہ پہنچے گا۔ کیونکہ میری طرف سے مراد کو کوئی مدد کوئی سیکیورٹی نہیں ملے گی۔ وہ مسلح گارڈز بھی چلے جائیں گے جو میرے ساتھ آئے ہیں۔ تب وہ بے چارہ تنہا ان کے رحم وکرم پر رہ جائے گا۔''

اعلیٰ افسر نے کہا۔ ''یہی سمجھ میں آرہا ہے۔ مراد کو تنہا کرنے کی سازش ہے اور اس سازش میں عالی جناب شریک ہے۔ وہ دشمنوں کے راستے سے تمہاری جیسی رکاوٹ دور کررہا ہے۔

''یہ بڑی اور چونکا دینے والی بات معلوم ہوئی ہے کہ عالی جناب دشمنوں کے لیے سہولتیں پیدا کررہا ہے۔ اب یہ معلوم کرنا ہوگا کہ اسے مراد سے کیا دشمنی ہے؟''

''بہرحال یہ بعد میں معلوم ہوسکتا ہے۔ ابھی تو تمہیں فوراً واپس آنا ہوگا۔ ایک برس بعد الیکشن ہیں۔ ان کی حکومت ختم ہوجائے گی تو یہ بھی وزارت سے جائیں گے۔''

حماد نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''میں یہ حکم نہیں مانوں گا۔ یہاں سے واپس نہیں جاؤں گا۔''

''بغاوت نہ کرو۔ ایسا کرو میں عالی جناب سے کہتا ہوں تم واپس آرہے ہو۔ وہاں تم چھپ کر مراد کے کام آتے رہو گے۔ وہ ڈی آئی جی یہی سمجھے گا کہ تم وہاں سے جاچکے ہو۔ یہاں میں کہہ دوں گا کہ تم واپس آگئے ہو۔ اب دوسرے مجرموں کے پیچھے کراچی سے باہر کہیں گئے ہو۔''

پھر یہی کیا گیا۔ اعلیٰ افسر نے عالی جناب سے کہہ دیا کہ حماد عمرکوٹ سے واپس آرہا ہے۔ وہاں سے چل پڑا ہے۔ ادھر آئی جی اور پولیس والوں کو حماد نظر نہیں آیا۔ محبوب نے مراد سے فون پر پوچھا۔ ''تم کہاں ہو؟ میرے پاس آجاؤ۔ یہاں تمہیں بہترین گن شوٹرز ملیں گے۔''

''آپ فوج لے کر آگئے ہیں۔ میں اتنی بھیڑ نہیں چاہتا تھا۔ ویسے آپ آگئے ہیں تو ان کی سیکیورٹی میں رہیں۔ میں ابھی عمرکوٹ سے بہت دور ہوں۔ جب مجبوراً وہاں آؤں گا تو آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔''

اس نے پھر جھوٹ کہہ کر محبوب کو ٹال دیا۔ اس نے سائیں کی کلرڈ شیشوں والی کار کو دور سے پہچان لیا تھا۔ یہ طے کرلیا تھا کہ فاصلہ رکھ کر سائیں کی حفاظت بھی کرے گا اور دشمنوں کو بھی وہاں سے زندہ نہیں جانے دے گا۔

اب وہاں اس کے صرف چار دشمن نہیں رہے تھے۔ سپاہی بھی آستین کا سانپ تھے۔ آئی جی کبیر نے حکم دیا تھا کہ اسے دیکھتے ہی گولی ماردی جائے۔

ایسے وقت وہاں کی اناج منڈی میں فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ کئی مسلح سپاہی ادھر دوڑتے ہوئے گئے وہاں پہنچنے تک فائرنگ رک گئی۔ رات کے وقت منڈی ویران تھی۔ ایک شوٹر مقابلہ کرنے کے بعد وہاں مردہ پڑا ہوا تھا۔

یہ بات محبوب کو معلوم ہوئی تو اس نے فون پر کہا۔ ''مراد تم نے کہا تھا شہر میں نہیں ہو؟''

''ہاں میں دور ایک مضافاتی علاقے میں ہوں۔ وہاں آؤں گا تو پہلے آپ سے ملوں گا۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ ابھی تمہارے ایک دشمن کی لاش اناج منڈی میں پائی گئی ہے۔ اسے تمہارے سوا کون مار سکتا ہے؟ پولیس والوں نے اسے ہلاک نہیں کیا ہے۔''

''میں نے بھی اسے ہلاک نہیں کیا ہے۔ میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا؟''

''تم مجھ سے کترا رہے ہو۔ تم نہیں چاہتے تھے کہ میں عمرکوٹ تک آؤں لیکن میں آگیا۔ تمہیں فوراً میرے پاس آنا چاہیے تھا مگر میں جانتا ہوں تم مجھ سے کس لیے دور ہو۔ تم نہیں چاہتے کہ تمہارے حصے کی گولی مجھے لگ جائے۔

"تمہاری یہ محبت اور جان نثاری اپنی جگہ قابلِ تحسین ہے۔لیکن ہمیں ایک ساتھ رہ کر قاتلوں کو مار بھگانا چاہیے۔"

''اللہ نے چاہا تو وہ صبح تک بھاگ جائیں گے یا ختم ہوجائیں گے۔میں آپ کی طرف سے مطمئن ہوں آپ حماد صاحب اور مسلح گارڈز کے ساتھ ہیں۔وعدہ کرتا ہوں صبح تک آپ کے پاس آؤں گا۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی محبوب نے فون کے ذریعے گولیاں چلنے کی آواز سنی۔وہ چیخ کر بولا۔''مراد تم کہاں ہو؟ کیا تم پر گولیاں چلائی جارہی ہیں؟''

اسے جواب نہیں ملا۔مراد فون بند کر کے زمین پر گر پڑا تھا پھر وہاں سے لڑھکتا ہوا ایک دیوار کی آڑ میں آگیا تھا۔نیم تاریکی میں چاروں طرف سے فائرنگ ہو رہی تھی۔اس وقت بلا کسی دوسری جگہ تھا۔وہ تنہا دشمنوں کی زد میں آگیا تھا۔

دور تاریکی سے آواز سنائی دی۔''مراد۔۔۔۔!میں پولیس انسپکٹر بول رہا ہوں۔ہم نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ہتھیار پھینک کر روشنی میں آجاؤ۔''

مراد نے کہا۔''تمہارے آئی جی سے باتیں ہو چکی ہیں۔جب وہ تمام ٹارگٹ کلرز گرفتار ہوجائیں گے تو میں خود ان کے پاس جا کر اپنا اسلحہ ان کے حوالے کردوں گا۔''

''ہم سے زیادہ نہ بولو۔ہتھیار پھینک دو۔گرفتاری پیش کرو۔ورنہ گولیاں چلیں گی۔تم کب تک جوابی فائر کرو گے؟ ہم تمہاری لاش یہاں سے لے جائیں گے۔''

وہ درست کہہ رہے تھے۔اس کے پاس چند بلٹس رہ گئے تھے۔وہ فائر کرتے ہوئے راستہ بنا کر فرار نہیں ہوسکتا تھا۔بلٹس کم پڑ جاتے۔وہاں جوابی فائرنگ کرنے والے درجنوں تھے۔وہ چاروں طرف سے گھیر لیا گیا تھا۔کسی بھی سمت سے نکل جانے کا راستہ نہیں تھا۔

ادھر محبوب اور حماد پریشان ہوگئے تھے۔اچانک ان کی طرف بھی گولیاں چلنے لگی تھیں۔پھر انہیں دور ایک جیپ میں پولیس افسر نظر آیا۔اس نے کہا۔''مسٹر محبوب! آپ اپنے مسلح گارڈز کے ساتھ یہاں خاموش رہیں۔۔یہاں دور تک بے شمار مسلح سپاہی ہیں۔آپ پولیس مقابلے کی غلطی کریں گے تو نتیجے میں حرام موت مارے جائیں گے۔

''اور مسٹر حماد! آپ واپس نہیں گئے ہیں۔اپنے اوپر والوں کو دھوکا دے رہے ہیں۔آپ کے بڑے آپ سے نمٹ لیں گے۔''

محبوب کے پاس صرف چار شوٹرز تھے۔حماد نے کہا۔''ہم مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔پولیس والوں پر گولیاں چلانے کا مطلب ہوگا' ہم قانون سے کھیل رہے ہیں۔''

ادھر وہ مجبور ہوگئے تھے۔ادھر مراد کو بھی گھیر لیا گیا تھا۔شیر نادیدہ جال میں پھنس گیا تھا۔اب تک بدترین حالات سے اور جانی دشمنوں سے مردانہ وار مقابلہ کرتا آیا تھا۔کسی کی گرفت میں نہیں آتا تھا۔ہوا کی طرح مٹھیوں سے نکل جاتا تھا۔

ان لمحات میں چوکڑیاں بھول گیا تھا۔ایسا بے یار و مددگار ہوگیا تھا کہ ایک تنہا بلا اسے بچا نہیں سکتا تھا۔محبوب اور حماد پولیس کے خلاف فائرنگ کر کے مجرم کہلانا نہیں چاہتے تھے۔پھر یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ مراد کس طرح کہیں بے دست و پا ہوگیا ہے۔

انسپکٹر کی آواز سنائی دی۔''میں دس منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔اگر تم ہتھیار پھینک کر سامنے نہ آئے تو ہم فائرنگ کرتے ہوئے گھیرا تنگ کردیں گے۔''

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیم تاریکی میں دور تک دیکھ رہا تھا۔کہیں کہیں مسلح سپاہی سائے کی طرح دِکھ رہے تھے۔ان لمحات میں فون کی کالنگ ٹون چیخنے لگی۔وہ موت کی دہلیز پر کھڑا تھا۔فون اٹینڈ نہیں کرسکتا تھا۔لیکن ننھی سی اسکرین نے کہا۔''میں ہوں تمہاری ماروی۔۔۔۔''

اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا' پھر بڑے جذبے سے بولا۔''ماروی! میری جان! اپنی آواز سنا دو۔''

''مراد! تم خیریت سے ہونا؟ میرا دل گھبرا رہا ہے۔میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے۔''

''کبھی بائیں آنکھ پھڑکتی ہے۔کبھی کالی بلی راستہ کاٹ دیتی ہے۔جب تک زندہ رہو تب تک ایسی بدشگونیوں کے ذریعے موت کی دھمکیاں ملتی رہتی ہیں۔

"میری جان! جینا مرنا تو لگا ہی رہتا ہے۔وعدہ کرو مجھے کچھ ہوگیا تو تم صبر کرو گی۔"

''یہ کیسی باتیں کررہے ہو؟ تم کسی مشکل میں تو نہیں ہو؟''

''تم وعدہ کرو۔زیادہ صدمہ نہیں اٹھاؤ گی۔۔بے اختیار آنسو آئیں گے تو رو لو گی پھر حوصلے سے زندگی گزارو گی۔''

اسی وقت انسپکٹر کی گونجتی ہوئی آواز سنائی دی۔''دس منٹ ہوگئے۔سامنے آجاؤ۔میں دس تک گن رہا ہوں۔۔۔۔ایک۔''

ماروی نے گھبرا کر پوچھا۔''یہ کون بول رہا ہے؟ کون تمہیں سامنے بلا رہا ہے۔وہ دس تک کیوں گن رہا ہے؟''

''میں اس کے گن لینے کے بعد تم سے فون پر بولوں

گا۔میرا زیادہ انتظار نہ کرنا۔‘‘

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ پھر اپنے بھرے ہوئے ریوالور کو دیکھ کر کلمہ پڑھنے لگا۔

آدمی تمام عمر بولتا ہی رہتا ہے۔ آخر میں صرف ایک کلمہ توحید ہی زبان پر رہ جاتا ہے۔ ٹھائیں کی گونجتی ہوئی آواز کے ساتھ پہلی گولی چلی۔ وہ اس کے قریب ایک دیوار سے لگ کر گزر گئی۔

وہ دو مکانوں کی دیواروں کے درمیان تھا۔ دائیں بائیں طرف سے چلنے والی گولیاں وہاں تک نہیں آسکتی تھیں۔ آگے اور پیچھے سے گولیاں وہاں تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ زمین پر لیٹ گیا تھا۔ بہت دور جو سائے کی طرح دکھ رہا تھا' اس پر گولی چلا رہا تھا۔ جوابی فائرنگ کے باعث اتنا ہوا کہ وہ ذرا پیچھے ہٹ گئے لیکن ایسا کب تک ہوتا؟

اس کا ریوالور خالی ہو گیا۔

اب زندگی بھی سانسوں سے خالی ہونے والی تھی۔

وہ مجبور ہو گیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ خود کو گرفتاری کے لیے پیش نہیں کرے گا۔ وہاں سے بھاگتے ہوئے گولیاں کھاتے ہوئے مر جائے گا۔ ہوسکتا ہے تقدیر دوست بن جائے' موت نہ آئے' کسی سپاہی کی گن ہاتھ آجائے۔

یہ نادانی ہوتی۔ وہ گرفتار ہو کر جیل جا کر کم از کم زندہ تو رہتا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ نادانی نہ کرتا خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرنے کے لیے کھلی جگہ جاتا' تب بھی اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا جاتا۔ ان کے اعلیٰ افسر نے یہی حکم دیا تھا کہ اسے دیکھتے ہی گولی مار دو' اسے ایک کے بعد دوسری سانس لینے نہ دو۔

اس اعلیٰ افسر نے اس کی موت اٹل کر دی تھی۔ قانون کی حفاظت کرنے والے افسران اور سپاہی اسے قانون کے خلاف سزائے موت دینے والے تھے۔ وہ خالی ریوالور کو پھینک کر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب آگے پیچھے سے آنے والی گولیوں سے بچ نہیں سکتا تھا۔

ایک گولی سنسناتی ہوئی آگے سے آئی اور اس کے قریب سے گزر گئی۔۔۔ کمال ہے بچ گیا۔

دوسری گولی پیچھے سے آئی۔ بالکل قریب آکر دیوار سے ٹکرا کر اس کے قدموں میں آپڑی تھی۔ اگر وہ گولیاں اسے لگتیں تو اس کے حلق سے چیخیں نکل جاتیں لیکن اچانک ہی معجزہ ہو گیا۔ گولیاں چلانے والوں کے حلق سے چیخیں نکلنے لگیں۔

مراد نے حیرانی سے سنا۔ مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی اور مرنے والوں کی آخری چیخیں کہہ رہی تھیں کہ مارنے والوں کو دوسرے مارنے والے آگئے ہیں۔

وہ فوراً ہی پھر زمین پر لیٹ گیا۔ فون اسے پکار رہا تھا' اس نے جیب سے۔۔۔ نکال کر بٹن دبا کر کان سے لگایا۔ محبوب پوچھ رہا تھا۔ ’’تم خیریت سے ہو؟ ہم یہاں مجبور ہو گئے ہیں۔ ہم قانون کا سہارا لے کر تمہارے دشمنوں سے نمٹنے آئے تھے لیکن پولیس والے ہی دشمن ہو گئے ہیں۔ انہوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ ہمیں یہاں سے واپس جانے کو کہہ رہے ہیں۔‘‘

مراد نے حیرانی سے پوچھا۔ ’’کیا آپ کے مسلح گارڈز یہاں آکر فائرنگ نہیں کر رہے ہیں؟‘‘

’’نہیں۔ ان سے ہتھیار لے لیے گئے ہیں۔ میں تمہارے فون سے فائرنگ کی آوازیں سن رہا ہوں۔ تم کس پوزیشن میں ہو۔‘‘

ایک گولی پھر اس کے قریب دیوار سے آکر لگی۔ اس نے فون بند کر دیا۔ حیرانی سے سوچنے لگا۔ ’’یہ کون لوگ ہیں جو سپاہیوں کی موت بن گئے ہیں اور مجھے بچانے آئے ہیں؟‘‘

بلا کہیں تنہا ہوگا۔ وہ پولیس فورس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ وہاں تو اس وقت کئی سمتوں سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ بچانے والا ایک نہیں تھا بلکہ کئی تھے۔

پھر گولیوں کی بوچھاڑ میں اسے ایک تیز سنسناتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ’’ارے او میرے ظالم یار۔۔۔ اے رحم دلدار۔۔۔! تیری مرینہ آگئی ہے۔‘‘

مراد کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اس نے ابھی سوچا تھا کہ شاید تقدیر دوست بن جائے گی۔ ارے واہ۔۔۔! کیا تقدیر کی ستم ظریفی تھی کہ اسے مصیبت سے نکالنے کے لیے مصیبت سے بھی بڑی مصیبت آگئی تھی۔ حد نظر تک کہیں نیم تاریکی کہیں نیم روشنی تھی۔ وہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ کہیں چھپی ہوئی اپنے کرائے کے شوٹرز کے ساتھ گولیاں چلا رہی تھی اور چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

’’ارے او سنگدل! تو نے مجھے مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور میں نے قسم کھائی تھی کہ تجھے کسی کے ہاتھوں مرنے نہیں دوں گی۔ دیکھ میں آگئی ہوں۔ تو میرے ہاتھوں سے مرے گا یا میرے قدموں میں جیے گا۔ تو نہیں جانتا' میں تیرے ساتھ کیا کرنے والی ہوں۔‘‘

آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ وہ اس بلا کی گرفت میں نہیں جانا چاہتا تھا لیکن اس کے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا؟ وہاں سے فرار ہونے کا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔

جو دشمن وہاں سے فرار ہونے کا راستہ نہیں دے رہے تھے وہ اب گولیاں کھا کر مر رہے تھے۔ ان کی جگہ دوسرے دشمن لے رہے تھے۔ وہ بھی اسے فرار ہونے نہ دیتے۔

وہ دو دیواروں کے درمیان تھا۔ اس نے دیکھا۔ "کچھ فاصلے پر کھلی جگہ ایک سپاہی مرا پڑا تھا۔ اس کے قریب ایک رائفل دکھائی دے رہی تھی۔ وہ زمین پر رینگتا ہوا دیواروں کے کنارے آگیا۔ وہاں سے کھلی جگہ میں چھ گز کے فاصلے تک جانا تھا۔ ادھر روشنی تھی۔ دیواروں کے سائے سے نکلتے ہی وہ دیکھ لیا جاتا۔

اسے بڑی پھرتی سے وہاں پہنچ کر رائفل کو اٹھانا تھا۔ ادھر فائرنگ رک گئی تھی۔ کئی سپاہی مارے گئے تھے اور باقی بھاگ گئے تھے۔ شاید جنگ ختم ہوگئی تھی۔ ہار جیت کا فیصلہ ہوگیا تھا۔

وہ زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ اٹھ کر دو زانو ہوگیا۔ پھر ذرا اٹھ کر یکبارگی اس نے چیتے کی طرح چھلانگ لگائی۔ چشم زدن میں ایک کے بعد دوسری چھلانگ میں لاش کے پاس آ کر وہاں سے رائفل اٹھائی پھر زمین سے اٹھ کر دیواروں کے درمیان جانے کے لیے چھلانگ لگانا چاہتا تھا۔ اسی وقت ایک گولی چلی چھلانگ ادھوری رہ گئی۔ وہ زمین پر گر پڑا۔

گولی ایک ہاتھ میں لگی تھی۔ رائفل ہاتھ سے نکل کر دور چلی گئی۔ وہ شکست ماننے والا نہیں تھا۔ زخمی ہونے کے باوجود گھسٹتا ہوا رائفل کے پاس آیا۔ اسی وقت چار شوٹرز بھی وہاں پہنچ گئے۔ ایک نے رائفل کے بٹ سے اس کے سر پر ضرب لگائی تو وہ تکلیف کی شدت سے تڑپنے لگا۔

اس کا سر گھوم رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے قمقمے جل بجھ رہے تھے۔ اس نے دھندلائی ہوئی بصارت سے دیکھا۔ مرینہ ہاتھوں میں گن لیے جیسے اس پر سوار ہونے آگئی تھی۔ اس کے سینے کے دائیں بائیں ٹانگیں پھیلا کر فاتحانہ انداز میں کھڑی ہوگئی۔

پھر اس نے کہا۔ "میں موت بن کر آئی ہوں۔ تم پالتو کتے بن کر رہو گے تو زندگی دوں گی۔ یہ جانتی ہوں کہ کتنے خطرناک ہو۔ بائی گاڈ تم سے ہر پل ہوشیار رہوں گی۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی گن کے دستے سے ایک اور ضرب لگائی تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس اندھیرے میں اس کا دماغ ڈوبتا چلا گیا۔ وہ ایک طویل جنگ لڑتا آیا تھا۔ اب قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ وہ بے ہوش ہوگیا۔

☆☆☆

ماروی سر سے پاؤں تک لرز رہی تھی۔ فون کے دوسری طرف کوئی دس تک گن رہا تھا۔ اس نے مراد سے پوچھا تھا۔ "وہ کون ہے؟ میں اپنے فون پر اس کی آواز سن رہی ہوں۔ وہ تمہیں کیوں سامنے بلا رہا ہے؟ کیوں دس تک گن رہا ہے؟"

مراد نے جواب دیا تھا۔ اس کے دس تک گن لینے کے بعد وہ اپنی ماروی سے فون پر بولے گا۔

یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا تھا۔ یہ ایسی بات تھی جو مراد کی طرف سے تشویش میں اور اندیشوں میں مبتلا کررہی تھی۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ مراد نے اسے ٹال دیا ہے۔ وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ دس تک گننے کے بعد کیا ہونے والا ہے؟

اس نے پھر اس کے نمبر پنچ کیے لیکن رابطہ نہیں ہوا۔ پتا چلا کہ نیٹ ورک میں خرابی پیدا ہوگئی تھی۔ ننھی سی اسکرین پر ایک بھی سگنل کا نشان نہیں تھا۔

وہ بے چین ہوگئی۔ صوفے سے اٹھ کر ادھر سے اُدھر یوں جانے لگی جیسے مراد کے پاس دوڑی جارہی ہو۔

اس نے پھر نمبر پنچ کیے پھر رابطہ نہیں ہوا۔ وہ جھنجلا گئی۔ بے چینی سے دروازے کی طرف دیکھا۔ کیسے مراد تک پہنچے؟

وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی اپنے کمرے سے نکل کر چاچی کے پاس آئی۔ "ہائے چاچی! میں کیا کروں؟"

منی نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"مراد کے ساتھ کچھ ہورہا ہے۔ جانے اب تک کیا ہوچکا ہوگا۔ اس سے کال نہیں مل رہی ہے۔"

منی نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "ہائے اللہ! کیا کہہ رہی ہو؟ اس کے ساتھ کیا ہورہا ہے؟ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ کچھ ہورہا ہے؟"

"میں اس سے فون پر بات کررہی تھی۔ ایسے وقت کوئی اس سے کہہ رہا تھا کہ دس تک گننے تک سامنے آجاؤ۔ کوئی ایسا کیوں کہہ رہا تھا؟ ایسا تو سنا ہے گولی مارنے والے تین تک یا دس تک گنتے ہیں۔"

منی نے سر ہلا کر کہا۔ "ہاں میں نے بھی سنا ہے۔"

میڈم روزی ادھر سے گزر رہی تھی۔ ماروی نے کہا۔ "میڈم! کوئی دس تک کیوں گنتا ہے؟ ابھی جہاں مراد ہے وہاں کوئی اس سے کہہ رہا تھا کہ دس تک گننے سے پہلے سامنے آجاؤ۔"

روزی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا اتنا ہی کہا

تھا؟ اس نے آگے بھی کچھ کہا ہوگا؟''

''مراد نے فون بند کردیا تھا۔ میں آگے نہ سن سکی۔''

منی نے کہا۔ ''تم بولو روزی! کوئی مراد کو دھمکی دے رہا ہے نا کہ وہ دس گنتے تک سامنے نہ آیا تو وہ مراد کو کچھ بھی کرسکتا ہے۔''

روزی نے پریشان ہو کر ہاں کے انداز میں سر ہلایا پھر کہا۔ ''وہ تو دشمنوں سے فائٹ کررہا ہے۔ دشمن تو گولیوں کی زبان سے بول رہے ہوں گے۔ یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ مراد ان کے سامنے نہیں آرہا ہے اور وہ وارننگ دینے کے لیے دس تک گن رہے ہیں۔''

ماروی چاچی کے پاس آکر اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ وہ اسے تھپکتے ہوئے تسلیاں دینے لگی۔ ''نہ رو میری جان! اللہ بچانے والا ہے مراد کو کچھ نہیں ہوگا۔''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''کسی طرح معلوم تو ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ کیا ہورہا ہے؟''

روزی نے کہا۔ ''صبر کرو۔ ابھی نیٹ ورک کام کرنے لگے گا۔ تم مراد سے باتیں کرسکو گی۔''

ادھر محبوب اور حماد اپنے مسلح شوٹرز کے ساتھ نیٹے ہو گئے تھے۔ آئی جی نے فون پر کہا۔ ''مسٹر حماد! آپ کو یہاں سے جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ لیکن آپ یہاں چھپے ہوئے تھے۔ میں ابھی آپ کے خلاف رپورٹ کردوں گا۔ بہتر ہوگا کہ آپ ہمارے افسران اور سپاہیوں کے سامنے اس شہر سے چلے جائیں۔''

آئی جی کبیر منگی کو رپورٹ مل رہی تھی کہ پندرہ سپاہیوں نے مراد کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ اس پر گولیاں بھی چلاتے رہے تھے لیکن وہ ان پر بھاری پڑ گیا تھا۔

کئی گن مین اچانک اس کی مدد کے لیے آگئے تھے۔ اچھی خاصی کا ذنٹر فائرنگ کے بعد گیارہ سپاہی مارے گئے تھے۔ ایک انسپکٹر اور تین سپاہی زخمی ہو کر میدان چھوڑ کر بھاگ آئے تھے۔

آئی جی کبیر اتنی بڑی شکست اور ناکامی پر جھنجلایا ہوا تھا۔ عالی جناب کو معلوم ہوا تو وہ غصے سے تلملا کر رہ گیا۔ گیارہ سپاہیوں کے علاوہ اس کے اپنے چھ شوٹرز مارے گئے تھے۔ اس نے دل ہی دل میں تسلیم کیا کہ مراد بہت ہی خطرناک فائٹر ہے۔

وہاں کی پولیس فورس اب بھی مراد کو ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ نامعلوم حملہ آوروں کے ساتھ کہیں گم ہوگیا تھا۔

محبوب اس کی گمشدگی سے پریشان تھا۔ اس کا فون بند پڑا تھا۔ رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ محبوب اور حماد نے آئی جی سے درخواست کی تھی کہ انہیں فوراً شہر سے جانے کو نہ کہا جائے۔ مراد کو وہاں تلاش کرنے کی اجازت دی جائے۔

لیکن اجازت نہیں دی گئی۔ آئی جی نے کہا۔ ''ہمارے سپاہی اسے تلاش کرلیں گے۔ پتا نہیں اس کے کون مددگار آئے تھے اور اس کے ساتھ کہاں چھپے ہوئے ہیں؟

''جو انسپکٹر اور سپاہی زخمی ہو کر آئے تھے۔ ان کا بیان تھا کہ آنے والے گن فائٹرز کی لیڈر ایک عورت تھی۔''

انسپکٹر نے کہا۔ ''وہ کہیں تاریکی میں تھی ہم اسے دیکھ نہیں سکے۔ وہ چیخ چیخ کر مراد کو ظالم اور بے رحم کہہ رہی تھی۔ اسے اپنا دلدار بھی کہہ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا تھا کہ تیری مرینہ آگئی ہے۔''

محبوب اور حماد آئی جی کے آفس سے جا رہے تھے۔ انسپکٹر کی زبان سے مرینہ کا نام سن کر رک گئے۔ محبوب نے حیرانی سے پوچھا۔ ''او گاڈ! یہاں مرینہ آئی تھی؟''

انسپکٹر نے کہا۔ ''ہاں اس عورت نے اپنا یہی نام بتایا تھا۔''

آئی جی نے محبوب سے پوچھا۔ ''یہ مرینہ کون ہے؟''

''لندن کی MET آفیسر ہے۔''

آئی جی نے پوچھا۔ ''یہ میٹ آفیسر کیا ہوتی ہے؟''

''میٹرو پولیس ایلائٹ اینٹی ٹیرر اسکواڈ کے شعبے کی ایک افسر ہے۔ مراد نے اسے نیم مردہ بنا کر اسپتال پہنچا دیا تھا۔ اب وہ واپس آئی ہے تو مراد کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔''

انسپکٹر نے کہا۔ ''ہاں وہ مراد سے کہہ رہی تھی ارے او سنگدل! تو نے مجھے مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میں تجھے کسی کے ہاتھوں مرنے نہیں دوں گی۔''

وہ سب بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ انسپکٹر بول رہا تھا۔ ''وہ عورت کہہ رہی تھی۔ تُو میرے ہاتھوں سے مرے گا یا میرے قدموں میں جیئے گا دیکھ میں تیرے ساتھ کیا کرنے والی ہوں۔''

محبوب نے کہا۔ ''یا خدا..... ! یہ کیا ہوگیا ہے؟ وہ موت کی دلدل میں گیا ہے۔ آہستہ آہستہ دھنستا رہے گا وہ اسے آہستہ آہستہ مارتی رہے گی۔ انتقام ضرور لے گی۔''

آئی جی نے پوچھا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے؟ اسے یہیں مار ڈالے گی یا کہیں لے گئی ہوگی؟''

محبوب نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر کہا۔ ''خدا جانتا ہے وہ کیا کرے گی؟ اسے کہاں لے جائے گی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے اسے کہاں ڈھونڈوں؟''

وہ مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ ''مرینہ..... ! ایک شیطان کی

اولاد ہے۔میں کیا کروں۔اس کا فون نمبر معلوم ہوتا تو اس سے باتیں کرتا۔میرے پاس تو ایک دولت کا ہی ہتھیار ہے۔میں مراد کی سلامتی کے لیے بڑی سے بڑی قیمت پر اس سے سمجھوتا کر لیتا۔''

نہ وہ تھی۔نہ اس سے رابطہ ہو سکتا تھا۔اگر ہو بھی جاتا تو وہ کبھی سمجھوتا نہ کرتی۔اسے حاصل کرنے کے بعد چھوڑنے والی نہیں تھی۔

پہلے ماروی ایک انار تھی اس کے دو بیمار تھے۔اب مراد ایک انار تھا اور اس کی دو بیمار تھیں۔

ایک بیمار اسے جھپٹ کر لے گئی تھی۔دوسری اس کے لیے بے قرار تھی۔یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں ہے؟ کسی سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ زندہ بھی ہے یا نہیں؟

اس نے نیٹ ورک بحال ہوتے ہی مراد سے رابطہ کرنا چاہا تو دوسری طرف سے بار بار یہی سنائی دیا کہ وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔

اس کے فون کی رنگ ٹون بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ماروی نے محبوب کو کال کی وہ حماد اور لنگڑے جانی کے شوٹرز کے ساتھ ناکام واپس آرہا تھا۔اپنے فون پر ماروی کا نام اور نمبر پڑھ کر شرمندہ ہونے لگا کہ ماروی کو کیا جواب دے۔

وہ بڑے جوش اور جذبے سے مراد کو صحیح سلامت واپس لانے اور اس کے دشمنوں سے لڑنے گیا تھا۔

وہ مراد کا احسان نہیں لینا چاہتا تھا۔اس پر احسان کرنا چاہتا تھا۔افسوس اب کرنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ہونے کے لیے شرمندگی رہ گئی تھی۔

وہ کال کر رہی تھی۔اس نے جھجکتے ہوئے فون کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔وہ بڑی بے تابی سے بولی۔''مراد کہاں ہے؟ اس کا فون بند ہے۔آپ وہاں ہیں۔وہ آپ کی نظروں میں ہوگا۔آپ اسے تنہا چھوڑنا نہیں چاہتے تھے' اس کے دشمنوں سے لڑنے گئے تھے۔محبوب صاحب....! میرا دل گھبرا رہا ہے۔مجھے بتائیں' وہاں کیا ہو رہا ہے؟''

چاچی نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔''ماروی چپ ہو جاؤ۔تم بولتی ہی جا رہی ہو۔وہ جواب کیسے دیں گے؟''

''آں....'' وہ جیسے ہوش میں آگئی اس نے چاچی کو دیکھا پھر فون پر کہا۔''محبوب صاحب! میں پاگل ہو جاؤں گی۔خدا کے لیے مجھے اس کی آواز سنائیں۔''

وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا۔''ماروی! بعض حالات میں صبر کرنا پڑتا ہے۔تم اس کی آواز سنو گی۔مگر دل کو سنبھالو۔وہ کہیں گم ہو گیا ہے۔ہم اسے تلاش کر رہے ہیں۔''

''وہ کیسے گم ہو گئے؟ دونوں ایک ہی جگہ تھے پھر بتائیں' وہ آپ سے کیسے بچھڑ گئے؟''

''وہ میرے ساتھ نہیں تھا۔شہر کے کسی دوسرے علاقے میں پتا نہیں اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔وہ کہیں چلا گیا ہے۔یا....''

ماروی نے پوچھا۔''یا....؟''

''یا میں کیا کہوں؟ فون سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔''

''میں نے دو گھنٹے پہلے اس سے بات کی تھی۔اس کے فون پر کوئی اس سے کہہ رہا تھا کہ دس تک گننے سے پہلے سامنے آجاؤ۔''

''آپ بتائیں کوئی اسے وارننگ کیوں دے رہا تھا۔کیا دشمنوں نے اسے گھیر لیا تھا اور اسے سامنے آنے کو کہہ رہے تھے؟''

وہ بولا۔''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔خدا نہ کرے اسے گولی ماری جاتی تو ہمیں اس کی لاش ضرور ملتی۔خدا اسے سلامت رکھے۔وہ جہاں بھی ہے جلد یا بدیر ہم سے رابطہ کرے گا۔تمہیں صبر سے انتظار کرنا چاہیے۔''

وہ بڑے کرب سے رونے کے انداز میں بولی۔''ہمارا ایمان ہے۔اللہ سلامتی دے گا۔مجھے صبر کرنا چاہیے۔لیکن کیسے صبر کروں؟ مجھے یہ تو بتائیں' وہ دس تک کیوں گن رہے تھے؟ پھر دس گننے کے بعد وہاں کیا ہوا تھا؟''

''اسے کچھ نہیں ہوا تھا۔میں تمہیں بتاؤں وہاں مرینہ اپنے فائٹرز کے ساتھ آگئی تھی۔اس نے مراد کو مجبور اور بے بس کر دیا ہے۔اسے کہیں لے گئی ہے۔''

وہ پریشان ہو کر بولی۔''آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ تو اور بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔''

''ہاں وہ شیطانی مصیبت ہے لیکن ہمیں اس حد تک اطمینان ہو گیا ہے کہ وہ زندہ ہے۔''

''وہ چڑیل اسے زندہ نہیں رہنے دے گی۔چاچی نے اس کے بارے میں بہت سی باتیں بتائی ہیں۔وہ ظالم عورت ہے۔اسے زندہ نہیں رہنے دے گی۔''

''زندگی دینے والا خدا ہے۔وہ کسی بہانے سے زندہ رہنے کے راستے ہموار کرتا ہے۔مراد کی موت ہوتی تو دشمن سپاہی اسے مار ہی ڈالنے والے تھے لیکن ان دشمنوں کو مارنے اور مراد کو وہاں سے لے جانے والی آگئی۔

''اللہ بڑا کارساز ہے' اسے موت بننے والی مرینہ کے

سائے میں بھی زندہ رکھے گا۔ اسی لیے ہم سے کہا جاتا ہے صبر کرو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

ماروی نے سر جھکا لیا۔ ایسی ایمان پرور ہدایت کے باوجود بندہ صبر نہ کرے تو کیا کرے؟

☆☆☆

وہ ایک لینڈ کروزر کی درمیانی سیٹ پر بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں آہنی ہتھکڑیاں تھیں اور پیروں میں بیڑیاں پڑی تھیں۔ اسے سیٹ پر رسیوں سے باندھ دیا گیا تھا تاکہ وہ ناہموار راستوں سے گزرتے وقت سیٹ سے نیچے نہ گر پڑے۔

مرینہ اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس کے برابر بیٹھا ہوا ایک تابع دار گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے باقی تابع داروں کو معاوضہ ادا کر کے ان کی چھٹی کر دی تھی۔

عمر کوٹ سے آگے پاکستان کا آخری ریلوے اسٹیشن مونا باؤ ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کی زمین شروع ہوتی ہے۔

وہ بہت محتاط تھی۔ خطرات مول لے کر تاریکی میں چھپ کر سفر کر رہی تھی۔ آگے پیچھے دائیں بائیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنی لینڈ کروزر میں بارڈر لائن سے چند کلومیٹر دور ایک ویران سرحدی علاقے سے گزر رہی تھی۔

وہ تابع دار تاریکی میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ ہیڈ لائٹس بجھی ہوئی تھیں۔ وہ وہاں کے راستوں کو ایک اندھے کی طرح سمجھتا تھا۔

مرینہ نہیں جانتی تھی کتنی دور کہاں آ گئی ہے؟ آگے ایک ننھی سی سرخ روشنی جلتی بجھتی دکھائی دی۔ قریب پہنچنے پر ایک خیمہ دکھائی دیا۔ وہاں چند مسلح افراد کھڑے ہوئے تھے۔ گاڑی ان کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔

ایک شخص نے دروازہ کھولا۔ مرینہ نے باہر آ کر اس سے مصافحہ کیا۔ وہ بولا۔ "میرا نام جگ دیو ہے۔ یہاں سے میں آپ کو لے جاؤں گا۔ آئیں پہلے مسٹر کوبوبو سے بات کریں۔"

وہاں دوسرے گن مین گاڑی کے باہر کھڑکیوں سے جھانک کر مراد کو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں دیکھ رہے تھے۔ وہ خیمے کے اندر آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ سامنے ایک بڑا سا ٹیلیفون سیٹ رکھا ہوا تھا۔ اسے جگ دیو آپریٹ کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد فرانسس کوبوبو کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو جگ دیو! کیا مرینہ آ گئیں؟"

اس نے کہا۔ "یس باس۔ آپ ان سے باتیں کریں۔"

مرینہ نے جگ دیو سے ایئر فون لے کر اپنے کانوں سے لگایا پھر کہا۔ "ہیلو مسٹر کوبوبو! میں اپنے وعدے کے مطابق مراد علی منگی کے ساتھ انڈیا پہنچ گئی ہوں۔"

"تم پاکستان سے لے کر یہاں تک صرف اس کا ذکر کرتی آ رہی ہو لیکن اس سے میری بات نہیں کرا رہی ہو۔ آخر تم دونوں کے درمیان کیا ہو رہا ہے؟"

وہ بولی۔ "میں نے کہا نا اس سے میرا جھگڑا چل رہا ہے۔ میں نے بڑی مشکلوں سے اسے قابو میں کیا ہے۔ اسے بے ہوش کر کے زنجیریں پہنا کر یہاں لائی ہوں۔"

"یعنی وہ تمہارے لیے اتنا خطرناک ہے کہ اسے زنجیریں پہنا کر رکھو گی۔ کیا وہ قیدی بن کر میرے کام آ سکے گا؟"

"شیر کے خونخوار پنجے کاٹ ڈالو اس کے منہ سے دانت نکال ڈالو تو وہ گدھا بن جاتا ہے۔ میں آپ کو دکھاتی رہوں گی اور یہ ثابت کرتی رہوں گی کہ شیر کو گدھا اور ہاتھی کو چیونٹی بنانا جانتی ہوں۔"

وہ بولا۔ "ہم جانتے ہیں تم زبردست ہو اور وہ برنارڈ جیسے زبردست کو ہلاک کرنے والا بھی کم نہیں ہے۔ تم اسے دن رات زنجیریں پہنا کر نہیں رکھ سکو گی۔"

"میں اسے دوستی کرنے اور اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے راضی کر لوں گی۔"

"مجھے بتاؤ کیسے راضی کرو گی اور اسے راضی کرنے میں کتنا وقت لگے گا؟"

"مجھے کسی محفوظ پناہ گاہ میں اس کے ساتھ دو چار دن رہنے دیا جائے پھر دوستی تو کچھ نہیں ہے وہ مجھ سے شادی کرنے کے لیے راضی ہو جائے گا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "اگر ایسا ہو جائے تو ہم بڑی دھوم دھام سے تمہاری شادی کرائیں گے۔ پلیز پہلے کام دکھاؤ۔ اس سے جلد از جلد دوستی کرو اور اب جگ دیو سے بات کراؤ۔"

اس نے ایئر فون اتار کر جگ دیو کو دیا۔ وہ اسے کانوں سے لگا کر بولا۔ "یس باس....."

اس نے پوچھا۔ "تم نے اس کی باتیں سنیں؟"

"یس باس.....!"

"اسے یہاں سے دور کرو۔ کسی محفوظ پناہ گاہ میں پہنچا دو۔ مراد علی منگی ہمارے ہاتھوں سے نہ نکلے۔ تمہیں رازداری سے جو کرنا ہے وہ کرتے رہو۔"

"یس باس..... میں تھوڑی دیر بعد آپ کو کال کروں گا۔"

اس نے رابطہ ختم کر کے مرینہ سے کہا۔ "ایک محفوظ

پناہ گاہ یہاں سے تیس کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہاں کی ریگستانی زمین پر ایک ہی تارکول کی پکی سڑک ہے۔ اس سڑک پر پٹرولنگ پولیس کہیں تمہیں روک سکتی ہے۔"

خیمے کے باہر لینڈ کروزر نظر آرہی تھی۔ جگ دیو نے ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "پولیس کو کیا جواب دوگی کہ تم کون ہو اور کس کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر کہاں لے جارہی ہو؟"

وہ بولی۔ "یہاں کی پولیس سے تو تم ہی نمٹو گے۔"

"کسی کو زنجیریں پہنا کر لے جانے کا معاملہ سنگین ہے۔ جب ایسے معاملات درپیش ہوں تو بڑی پلاننگ کرنی پڑتی ہے۔ بہرحال ہم پولیس والوں سے بچ کر نکلنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ انہیں کچھ کھلاتے پلاتے بھی ہیں۔"

"میں مراد کو کیسے لے جاسکوں گی؟"

"تم اسے اپنے ساتھ لے جا ہی نہیں سکو گی۔ یہاں دو گھنٹے بعد اناج سے بھرا ہوا ٹرک آئے گا۔ ہم مراد کو اناج کی بوریوں کے پیچھے چھپا کر لے جائیں گے۔ تم ہمارے ایک گائڈ کے ساتھ محفوظ پناہ گاہ میں جاؤ۔ دو گھنٹے بعد میرے آدمی مراد کو وہاں پہنچا دیں گے۔"

وہ پریشان ہوکر سوچنے لگی۔ اس نے بڑی مشکلوں سے مراد کو قابو میں کیا تھا۔ اس سے تھوڑی دیر کے لیے بھی دور نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اندیشہ تھا کہ وہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔

ایسے وقت ایک گن مین نے خیمے میں آکر کہا۔ "قیدی کو ہوش آگیا ہے۔"

یہ سنتے ہی وہ اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی خیمے کے باہر گاڑی کے پاس آئی پھر دروازہ کھول کر اسے دیکھا۔ وہ درمیانی سیٹ پر پڑا کسمسا رہا تھا۔ زور لگا رہا تھا۔ وہاں سے اٹھ کر دیکھنا چاہتا تھا کہ کہاں پہنچا ہوا ہے؟

وہ گاڑی کے اندر آکر بولی۔ "آرام سے پڑے رہو۔ میں نے محبت سے اپنا بنانا چاہا مگر تم نفرت کرتے رہے۔ اب ساری زندگی اسی طرح غلام بن کر رہو گے۔"

اس نے گھور کر اسے دیکھا جواباً کچھ نہ کہا۔ دوسری طرف منہ پھیرلیا۔ وہ بولی۔ "اب بھی وہی تیور ہیں۔ رسی جل گئی بل نہیں گئے۔ میں تمہارے سارے کس بل ڈھیلے کر دوں گی۔"

وہ ذرا قریب ہوکر اس پر جھک کر بولی۔ "میں تمہیں موت کے منہ سے نکال کر لائی ہوں۔ چاہتی تو وہیں گولی مار دیتی۔ میری محبت کو سمجھو۔ مجھ سے محبت کرو۔ وعدہ کرتی ہوں تمہیں ان زنجیروں سے رہائی مل جائے گی۔"

"میں نے دل سے مجبور ہوکر بڑی نادانی کی تھی ایک بار تم پر بھروسا کر کے جیل سے رہائی دلائی تھی۔ اور تم میری توقع کے خلاف مجھے دھوکا دے کر چلے گئے تھے۔

"یہ سچ ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ میں اندھی ہوگئی ہوں۔ پھر ایک بار تم پر بھروسا کروں گی۔ مجھے پیار کرو گے پھر دھوکا نہیں دو گے تو یہ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کھول دوں گی۔"

جگ دیو نے آکر کہا۔ "مرینہ....! دیر نہ کرو۔ تمہیں راتوں رات یہاں سے نکلنا ہے۔ آجاؤ۔"

وہ پھر اس پر جھک کر بولی۔ "میں جارہی ہوں۔ دو گھنٹے بعد تمہیں میرے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ تب تک سوچو۔ دانشمندی یہی ہوگی کہ میرے بن کر رہو اور جو عمر لکھوا کر لائے ہو، اس عمر تک میرے ساتھ عیش کرتے رہو۔"

وہ دل ہی دل میں بولا۔ "مجھے غلام بنا کر رکھے گی۔ بہت خوش فہمی ہے۔ ذرا ہتھکڑی تو کھل جائے۔"

وہ گاڑی سے باہر آتے ہوئے دل میں کہہ رہی تھی۔ "میں اور اس ظالم سنگدل پر بھروسا کروں گی؟ کبھی نہیں۔ میں نادان بچی نہیں ہوں۔ بس ایک حسرت ہے۔ دو چار راتیں اس کے ساتھ گزار لوں پھر دل بھرتے ہی اسے کتے کی موت مار ڈالوں گی۔"

وہاں قریب ہی ایک جیپ کار کھڑی ہوئی تھی۔ جگ دیو نے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ رکھو ہے۔ تمہیں پٹرولنگ پولیس کی نظروں سے بچا کر لے جائے گا۔ میں صبح سے پہلے مراد کو لے کر وہاں پہنچوں گا۔"

وہ جیپ میں بیٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ جگ دیو لینڈ کروزر کا دروازہ کھول کر مراد کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کی رسیاں کھولتے ہوئے بولا۔ "وہ جاچکی ہے۔ کیا تم جانتے ہو اس وقت کہاں ہو؟"

مراد اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا۔ "انڈیا میں ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بارڈر کے فوجی اور پٹرولنگ پولیس کے سپاہی کسی پاکستانی کو دیکھتے ہی گولی مار دیتے ہیں۔"

مراد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ یہ سن کر پریشان ہوگیا کہ اپنی مارودی سے اپنی پاک زمین سے دور پڑوسی ملک میں پہنچ گیا ہے۔ اس کا دل دماغ تو پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ آگے نہیں جانا چاہتا تھا۔

لیکن آگے ہر سو اندھیرا تھا۔ راستے نامعلوم تھے اور بدنصیبی سے وہاں زنجیروں میں جکڑا ہوا آیا تھا۔

جگ دیو نے کہا۔ "تم زنجیروں سے نجات پاکر بھی سرحد پار نہیں کرسکو گے۔ مرینہ تمہیں ایسی جگہ لے آئی ہے

کہ یہاں تم آزاد رہ کر بھی اَن دیکھی مجرمانہ زنجیروں سے بندھے رہو گے۔''

''اور میں مجرمانہ ماحول سے نکل جانا چاہتا ہوں۔''

''مسٹر مراد...! یہاں تمہاری یہ خواہش پوری نہیں ہوگی۔ ہوسکتا ہے آگے چل کر تمہیں امن و امان سے زندگی گزارنے کا راستہ مل جائے۔ فی الحال یہ ممکن نہیں ہے۔ تمہیں یہاں رہنا ہی ہوگا۔''

وہ ہاں کے انداز میں سر ہلا کر بولا۔''اپنے وطن واپس جانے کی امید پر یہاں رہوں گا۔''

''یہ ہوئی نا بات۔ اب یہ بتاؤ' کیا ہماری طرح ہندی بول سکتے ہو؟ یہاں کے رسم و رواج جانتے ہو؟''

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ جگ دیو نے پوچھا۔'' کچھ تو جانتے ہی ہو گے؟''

وہ بولا۔''انڈین فلموں میں ہندوؤں کو دیکھا ہے اور ان کی ہندی بھاشا سنی ہے۔ تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

اس لیے کہ یہاں تمہیں رہنا ہے' اور یہاں کی پولیس اور جاسوس تمہاری اردو زبان سنتے ہی کہیں گے کہ تم پاکستانی جاسوس ہو۔ سرحد پار کر کے جاسوسی کرنے آئے ہو۔''

وہ اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔''یہ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں...؟''

''اس کی چابیاں مرینہ کے پاس ہیں۔''

''تم لوگ کون ہو؟ اتنا تو سمجھ گیا ہوں کہ مرینہ کے دوست ہو۔ اس کے لیے کام کر رہے ہو۔''

''ہم صرف کام آنے والوں کے دوست ہوتے ہیں۔ وہ کام آتی ہے اس لیے دوستی نباہ رہے ہیں۔ تم کام آؤ گے تو تمہیں بھی سر پر بٹھائیں گے۔''

''میں کس طرح کام آسکتا ہوں؟''

''تمہارے بارے میں سنا ہے کہ خطرناک گن شوٹر بھی ہو اور تیز طرار فائٹر بھی ہو۔ تم نے برنارڈ کو ہلاک کر کے ہمارے باس کو خوش کر دیا ہے۔ وہ تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔''

مراد نے کہا۔''میں کوئی پیشہ ور ٹارگٹ کلر نہیں ہوں۔''

''اپنے بارے میں بتاؤ۔ باس تم سے براہ راست باتیں کرنا چاہتا تھا۔ مرینہ نے تم سے بات نہیں کرنے دی۔ وہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس کے سوا کوئی تمہیں قابو میں رکھ کر تم سے کام نہیں لے سکے گا۔ وہ کہتی ہے تم اس کے دیوانے ہو۔ اکثر تمہیں زنجیروں سے جکڑ کر رکھتی ہے۔ تم پر ایک طرح کا دورہ پڑتا ہے۔ صرف وہی تمہیں سنبھال سکتی ہے اور تم سے کام لے سکتی ہے۔''

مراد نے کہا۔''وہ سراسر بکواس کرتی ہے۔ مجھ پر کسی طرح کا دورہ نہیں پڑتا ہے۔''

''یہ میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے باس سے کہا تھا کہ وہ تمہیں پاکستان میں نہیں رہنے دے گی۔ اگر ہم اسے اور تمہیں سرحد پار کرا دیں گے تو وہ یہاں تمہارے ساتھ رہ کر ہمارا کام کرے گی۔''

مراد نے پوچھا۔''کیا اس طرح زنجیریں پہنا کر کسی کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں؟''

جگ دیو نے کہا۔''کبھی نہیں۔ ہمارا باس نادان نہیں ہے۔ وہ سمجھ رہا ہے کہ مرینہ باتیں بنا رہی ہے۔ تمہیں اپنے شکنجے میں رکھ کر اپنا الّو سیدھا کر رہی ہے۔

''لندن کے MET ادارے سے اسے نکال دیا گیا ہے۔ وہ جرائم پیشہ تنظیموں میں کہیں اپنی جگہ بنانا چاہتی تھی۔ اس نے ریڈ الرٹ کے میکی البرٹ سے معاملات طے کرنا چاہے۔ وہاں سے ناکام ہو کر ہمارے باس فرانسس کو بو بو کے پاس آگئی ہے۔

''ماسٹر کو بو بو ساؤتھ افریقا میں رہتے ہیں۔ وہ ''سنڈیکیٹ دی ماسٹرز'' کے سربراہ ہیں۔ انڈیا میں ہم سب ان کے تابع دار ہیں۔ ان کے لیے خطرات سے کھیلتے ہیں اور لاکھوں روپے کماتے رہتے ہیں۔ جب تک زندگی ہے' عیش کرتے رہتے ہیں۔''

وہ بولا۔''مجھے جرائم پیشہ تنظیموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کیا یہاں سے واپس جانے کی کوئی صورت ہوسکتی ہے؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔''تم پاکستان میں رہو یا ہندوستان میں۔ تم نے گن پکڑ لی ہے۔ وہاں کئی مرڈر کیے ہیں اور موت سے کھیلتے ہوئے یہاں آئے ہو۔

''تم سوچ رہے ہو گے کہ ہم عادی مجرم ہیں۔ جبکہ ہم سے زیادہ گولیاں تم چلا چکے ہو اور لوگوں کو ہلاک کر چکے ہو۔''

''میں مجرموں کو ہلاک کرتا آیا ہوں۔''

''یہ بات اچھی طرح یاد رکھو کہ مجرموں کو قانون سزا دیتا ہے۔ تم سزا دو گے تو مجرم کہلاؤ گے۔

''یہ تمہیں کہہ دوں کہ تم ہمارے باس کے دماغ میں بیٹھ گئے ہو۔ وہ تمہیں یہاں کی پولیس اور فوجیوں کے ہاتھوں مرنے نہیں دے گا اور تمہیں مرینہ کا بھی غلام بننے نہیں دے گا۔

''تم سوچو آگے تمہاری زندگی کیا ہوگی؟ کیا ایک عورت کے شکنجے میں رہو گے یا پاکستانی جاسوس کہلا کر گولیوں کا نشانہ بنو گے یا ہمارے باس کی چھتر چھایا میں ہماری طرح

آزاد شیر کی طرح دہاڑتے پھرو گے؟''
سوچنے کے لیے بہت ساری باتیں تھیں۔ جگ دیو نے یہ درست کہا تھا کہ ایک بار بندوق پکڑنے کے بعد وہ مجبوراً ہی سہی مجرموں کی طرح گولیاں چلاتا آرہا ہے۔ آگے بھی یہی نظر آرہا تھا۔ نہ واپس جاسکتا تھا۔ نہ انڈیا میں بے یار و مددگار رہ کر شریفانہ زندگی گزار سکتا تھا۔ وہاں یقیناً پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام اٹھا کر مارا جاتا۔ فی الحال اس کے سامنے یہ بات اہم تھی کہ ہر حال میں زندہ رہنا ہے اور کبھی نہ کبھی موقع پا کر ماروی کے پاس واپس جانا ہے۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ زنجیریں تڑوانی تھیں۔ ایک بار پھر مرینہ سے نجات حاصل کر کے اس کے بارہ بجانے تھے۔
حالات اسے بار بار بندوق پکڑنے پر مجبور کر رہے تھے تو پھر یہی سہی۔ وہ اور کیا کرسکتا تھا؟
اس نے جگ دیو سے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں تمہارے باس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''
وہ خوش ہو کر بولا۔ ''یعنی کہ ہمارے ساتھ کام کرو گے۔''
اس نے اپنے آدمیوں کو آواز دی۔ وہ دوڑتے ہوئے آئے۔ وہ گاڑی سے باہر آکر بولا۔ ''مراد کو خیمے میں لے آؤ۔''
پیروں میں بیڑیاں ایسی تھیں کہ وہ کھڑا ہو کر چھوٹے چھوٹے قدموں سے چل سکتا تھا۔ دو گن مینوں نے اسے دائیں بائیں آکر سہارا دیا۔ وہ چلتا ہوا خیمے میں آکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جگ دیو اپنے باس سے رابطہ کرچکا تھا۔ وہ مراد کے کانوں میں ایئر فون پہناتے ہوئے بولا۔ ''باس سے باتیں کرو۔''
وہ کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''ہیلو مسٹر...! میں مراد علی منگی بول رہا ہوں۔''
دوسری طرف سے باس کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو مسٹر مراد علی منگی...! میں مسٹر نہیں ماسٹر کہلاتا ہوں۔ تم سنڈیکیٹ دی ماسٹرز کے ایک ماسٹر فرانسس کوبو بو سے بات کر رہے ہو۔ مجھے سب سے پہلے یہ کہنا چاہیے کہ تم نے... برنارڈ کو جہنم میں پہنچا کر میرا دل خوش کر دیا ہے۔
''میں بہت دنوں سے تمہیں تلاش کر رہا تھا۔ تم سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مرینہ تمہاری آواز نہیں سنا رہی تھی۔ ابھی میرے سوالات کے مختصر سے جوابات دو۔ کیا مرینہ سے محبت کرتے ہو اور اس کے دیوانے ہو؟''
اس نے مختصر سا جواب دیا۔ ''نہیں۔''
''کیا تم پر دورہ پڑتا ہے اور تمہیں زنجیروں سے باندھنا لازمی ہو جاتا ہے؟''
مراد نے کہا۔ ''وہ بکواس کرتی ہے۔''
''تم اس سے الگ خود مختار رہ کر میرا کام کرو گے؟''
''ہاں کروں گا۔''
''یہ تمہارا دانشمندانہ فیصلہ ہے۔ میری سرپرستی میں یہاں کا قانون تمہیں چھو بھی نہیں سکے گا۔''
''کیا میں پاکستان میں اپنے لوگوں سے رابطہ کر سکوں گا؟''
''تمہیں ہر طرح کی آزادی ہوگی لیکن ابھی ضروری ٹریننگ حاصل کرنے تک تمہارے پاس فون نہیں ہوگا۔ کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ تم کہاں ہو؟''
''کتنی مدت تک ٹریننگ حاصل کرنی ہوگی؟''
''تم یہاں کی ہندی زبان اور طور طریقے اس طرح سیکھو کہ سب ہی تمہیں پیدائشی ہندوستانی مسلمان سمجھنے لگیں۔''
''میں جلد سے جلد ایک آدھ ہفتے میں سیکھ لوں گا پھر تو اپنوں سے رابطہ کرسکوں گا؟''
''بے شک پھر تمہیں ہر طرح کی آزادی ہوگی۔ یہ یاد رکھو کہ مرینہ بہت ہی تجربہ کار اور تیز طرار عورت ہے۔ کبھی اس کے ساتھ بھی کام کرنا ہوگا۔''
''مجھے انکار نہیں ہے لیکن ہماری آپس کی دشمنی کے باعث آپ کا کام بگڑ سکتا ہے۔''
''جب ایسا ہوگا تو دیکھا جائے گا۔ میں کچھ سوچ سمجھ کر ہی آگ اور پانی کو کسی مشن پر ساتھ بھیجوں گا۔''
''میں چاہوں گا کہ ہمارے ذاتی جھگڑے کے دوران آپ اور آپ کے آدمی کسی کی حمایت نہ کریں۔ ہمارے معاملات ہم پر چھوڑ دیا کریں۔''
''یہی ہوگا۔ میں انتظار کروں گا۔ تم دونوں کی دشمنی کا انجام بڑی دلچسپی سے دیکھوں گا۔ ویل مسٹر مراد! مجھے امید ہے کہ میری سرپرستی میں رہ کر بہت ہی عیش و عشرت کی زندگی گزارو گے۔ یہ الگ بات ہے کہ خطرات سے کھیلتے رہو گے۔ یہ تو مردوں کی شان ہے۔
''جب ٹریننگ حاصل کرلو گے اور تمہیں فون مل جائے گا تو مجھ سے رابطہ کرسکو گے۔ اس روز تمہیں مبارکباد دینے کے لیے باتیں کروں گا۔ اس وقت تک کے لیے گڈ بائی۔ سی یو لیٹر آن...۔''
کوبو بو سے رابطہ ختم ہوگیا۔ جگ دیو نے ایک ایک آدمی کو بلا کر کہا۔ ''ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کاٹنے کا سامان لے آؤ۔''

اگرچہ مجرموں کے ساتھ رہ کر زندگی گزارنے کا فیصلہ غلط تھا۔لیکن زندہ رہنا بھی ضروری تھا۔زندہ رہ کر یہ امید رہتی کہ کسی نہ کسی دن اپنی پیار بھری زندگی کی طرف لوٹ آئے گا۔

رات کے تین بج چکے تھے۔مرینہ ایک پناہ گاہ میں پہنچ کر مراد کا انتظار کر رہی تھی۔وہاں دو سیکیورٹی گارڈز تھے۔ایک باہر ڈیوٹی پر تھا۔دوسرا اندر اس سے باتیں کر رہا تھا۔اسے بتا رہا تھا کہ اس وقت وہ کس علاقے میں ہے۔وہاں کے لوگ کیسی بولی بولتے ہیں اور کیسی زندگی گزارتے ہیں۔

مرینہ کا دھیان مراد کی طرف تھا۔وہ گارڈ کی باتیں بھی اس لیے سن رہی تھی کہ وہاں کے لوگوں کے متعلق معلومات حاصل کرنا بہت ضروری تھا۔

تقریباً چار بجے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔

گارڈ فوراً ہی اپنی گن سنبھالتا ہوا باہر جاتے ہوئے بولا۔

''تمام لائٹس بجھا دیں۔میں باہر کی لائٹس بجھا رہا ہوں۔''

وہ بھی اپنی گن لے کر لائٹس بجھاتی ہوئی ایک کھڑکی کے پاس آئی۔باہر پورے چاند کی روشنی تھی۔اس نے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر اپنی لینڈ کروزر کو دیکھا تو دنگ رہ گئی۔اس سے ذرا دور دو گاڑیاں تھیں۔ان گاڑیوں کے پیچھے سے کچھ لوگ گولیاں چلا رہے تھے۔ایسے وقت دو شخص لینڈ کروزر سے نکل کر بھاگتے ہوئے فائر کرتے جا رہے تھے۔

دو مخالف گروہوں کے درمیان فائرنگ ہو رہی تھی۔مرینہ پریشان ہو کر اپنی گاڑی کو دیکھنے لگی۔اس گاڑی میں مراد ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑا ہوا گاڑی کے اندر پڑا تھا۔وہ تو یہی سمجھ رہی تھی اور چشم تصور میں اسے لینڈ کروزر کی درمیانی سیٹ پر بے یار و مددگار پڑا ہوا دیکھ رہی تھی۔

ایک گارڈ دوڑتا ہوا مرینہ کے پاس آیا۔پھر اپنا فون اسے دیتے ہوئے بولا۔''جگ دیو آپ کو کال کر رہے ہیں۔''

اس نے فون کو کان سے لگا کر کہا۔''ہیلو جگ دیو! میں اپنی لینڈ کروزر کو یہاں دیکھ رہی ہوں۔یہ کون لوگ حملہ کر رہے ہیں؟''

وہ بولا۔''ہمارے دشمن ہیں۔میں اپنے ایک ساتھی کے ساتھ گاڑی سے نکل آیا ہوں۔لیکن مراد کے پیروں میں بیڑیاں ہیں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہیں۔ایسی حالت میں ہم اسے اُٹھا کر وہاں سے نہیں لا سکتے تھے۔''

وہ چیخ کر بولی۔''وہ اسے گولی مار دیں گے۔''

''میں نہیں جانتا کیا ہوگا۔ہم دو ہیں اور وہ چھ ہیں۔ہم بہت مجبور ہو کر تمہاری لینڈ کروزر سے دور آئے ہیں۔''

ایسے وقت مرینہ نے دیکھا۔کسی نے لینڈ کروزر کو اسٹارٹ کیا تھا اور اسے وہاں سے لے جا رہا تھا۔اس کے ساتھ حملہ کرنے والوں کی دونوں گاڑیاں بھی جا رہی تھیں۔

مرینہ نے ہذیانی انداز میں چیخ کر کہا۔''وہ مراد کو لے جا رہے ہیں۔انہیں روکو۔''

فائرنگ کے شور میں جگ دیو کی آواز سنائی دی۔''ہم دوڑتے ہوئے ان پر فائر کر رہے ہیں۔''

وہ بری طرح ہانپتے ہوئے بول رہا تھا۔''ہے بھگوان! یہ کیا ہو گیا...؟ وہ مراد کو لے گئے ہیں۔''

وہ گاڑیاں دور جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔تھوڑی دیر بعد جگ دیو اپنے ساتھی کے ساتھ مرینہ کے پاس آیا۔اس کا سر جھکا ہوا تھا۔وہ جھنجلا کر کہہ رہا تھا۔''وہ وینکٹ راؤ کے آدمی تھے۔سمجھ رہے تھے ہم بارڈر سے لایا ہوا سونا لے جا رہے ہیں اور وہ سونا لینڈ کروزر میں ہے۔''

مرینہ اپنی گن ایک طرف پھینکتے ہوئے بولی۔''میری محنت مٹی میں مل رہی ہے۔یہ کوئی نہیں جانتا میں کتنی محنت سے کتنی مشکلوں سے اسے یہاں تک لائی تھی۔

''جگ دیو! یہاں آ کر کیوں بیٹھ گئے ہو؟ کچھ کرو۔ان کے پیچھے جاؤ اسے کسی طرح واپس لاؤ۔''

وہ بولا۔''کیسے جاؤں۔ہم جس گاڑی میں آئے تھے اسے وہ لے گئے ہیں۔پرابلم یہ ہے کہ تم جس گاڑی میں یہاں آئی ہو۔اس کا پیٹرول ختم ہو چکا ہے۔''

وہ جھنجلا کر بولی۔''کیا اس طرح کام کیا جاتا ہے؟ تمہارے آدمی گاڑیوں میں پیٹرول کا حساب نہیں رکھتے ہیں۔''

وہ بولا۔''بھول سب سے ہوتی ہے۔تم نے بھی بھول کی ہے۔اگر ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی چابیاں ہمیں دے کر آتیں تو ہم مراد کی بندشیں کھول کر اسے گاڑی سے نکال لاتے۔''

پھر وہ جاتے ہوئے بولا۔''میں جا رہا ہوں۔صبح ہونے تک وینکٹ راؤ کے اڈے پر حملہ کروں گا۔مراد کو کسی طرح وہاں سے نکال لاؤں گا۔''

وہ اپنے ساتھی کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔مرینہ اس پناہ گاہ میں دو گارڈز کے ساتھ خالی ہاتھ رہ گئی۔مراد اس کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔وہ سر پکڑ کر رہ گئی۔

جگ دیو نے بڑی کامیابی سے مراد کے اغوا ہونے کا ڈراما پلے کیا تھا۔ ماسٹر کو بو بو نے اسے حکم دیا تھا کہ مرینہ کو ہمارے فریب کا علم نہیں ہونا چاہیے۔ ایسی چال چلو کہ اسے ہم پر شبہ نہ ہو۔ وہ بھی کام کی عورت ہے اسے بھی اپنے ہاتھ میں رکھنا ہوگا۔

جگ دیو نے ایسا ناٹک کھیلا تھا کہ مرینہ ان پر شبہ نہیں کرسکتی تھی۔ آئندہ کچھ اور ناٹک کھیلا جانے والا تھا۔

وہ رات گزر گئی۔ وہ دوسرے دن دیر تک سوتی رہی۔ شام کو جگ دیو نے آکر بتایا کہ وینٹ راڈ کے ایک اڈے پر حملہ کیا گیا تھا۔ وہاں انہوں نے دشمنوں کو ہلاک تو کیا لیکن لینڈ کروزر وہاں نظر نہیں آئی۔ مراد کے متعلق کہا نہیں جاسکتا کہ دشمنوں نے اسے زندہ رکھا ہے یا نہیں؟

وہ مایوس ہوگئی۔ اس نے ماروی سے اسے دور کرنے کے لیے بڑی پلاننگ کی تھی۔ اسے انڈیا لے آئی تھی۔ یہاں آکر اس کے ساتھ تنہائی کا ایک لمحہ بھی گزار نہیں سکی تھی۔

ایک دن گزر گیا دوسرا دن بھی گزرنے لگا۔ اس کی کوئی خبر نہیں تھی کوئی نام و نشان نہیں رہا تھا۔ تیسری رات وہ گہری نیند میں تھی ایسے وقت ایک آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بیڈ لیمپ کو روشن کرکے دیکھا۔ دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند تھیں۔

اس نے جماہی لیتے ہوئے سوچا۔ پتا نہیں کیسی آواز تھی؟ صبح گارڈ سے پوچھا جائے گا۔ وہ لیمپ بجھا کر سونا چاہتی تھی۔ پھر ویسی ہی آواز نے چونکا دیا۔ ایک بند دروازے کے باہر بالکونی تھی۔ وہاں سے آواز آئی تھی۔

اس نے فوراً ہی انٹرکام کے ذریعے گارڈ سے کہا۔ ”کیا تم آواز سن رہے ہو؟ یہاں میرے کمرے کی بالکونی میں کوئی ہے۔“

وہ گارڈ دوڑتا ہوا آیا۔ پھر دستک دیتے ہوئے بولا۔ ”میڈم دروازہ کھولیں میں آیا ہوں۔“

اس نے دروازہ کھولا پھر بالکونی کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ گارڈ نے قریب جا کر اپنی گن کا رخ دروازے کی سمت کیا پھر للکارنے کے انداز میں بولا۔ ”کون ہے؟“

مرینہ بھی اپنی گن لے کر آگئی۔ باہر سے جواب نہیں ملا۔ بار بار للکارنے کے باوجود خاموشی رہی۔ آخر گارڈ نے ہمت کرکے دروازے کو کھولا۔ دونوں کی گن کا رخ باہر کی طرف تھا۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

انہوں نے دروازے کو پوری طرح کھول دیا تب مرینہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔

بالکونی میں کوئی نہیں تھا۔ وہ دشمنِ جاں بھی نہیں تھا۔ لیکن فرش پر کٹی ہوئی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔

مرینہ کے دماغ میں دھماکے ہونے لگے۔ وہ چند ساعتوں تک گم صم سی رہی پھر گولیاں چلاتی ہوئی بولتی ہوئی بالکونی میں آئی۔ ”وہ آیا ہے۔ یہاں کہیں چھپا ہوا ہے۔“

وہ بالکونی کے دائیں بائیں نیچے دیکھ رہی تھی اور فائر کررہی تھی۔ گارڈ نے کہا۔ ”یہاں کوئی نہیں ہے۔“

نیچے سے دوسرے گارڈ نے اپنے ساتھی گارڈ کو مخاطب کیا۔ ”بھوشن! کیا بات ہے؟ کیوں فائر کررہے ہو؟“

بھوشن نے کہا۔ ”میڈم فائر کر رہی ہیں۔ کہتی ہیں یہاں مراد آیا ہے۔ یہاں بالکونی میں کٹی ہوئی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پڑی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے وہ اِدھر آکے جاچکا ہے۔“

گارڈ نے کہا۔ ”یہاں نیچے کوئی نہیں ہے۔“

مرینہ نے کہا۔ ”وہ آیا تھا۔ اگر نہیں آیا تھا تو اس کی چیزیں بالکونی میں کہاں سے آگئی ہیں؟“

اس گارڈ نے بھی اوپر آکر دیکھا۔ حیرانی سے پوچھا۔ ”واقعی یہ کہاں سے آگئیں؟“

وہ غصے سے پاؤں پٹخ کر بولی۔ ”آسمان سے ٹپکی ہیں۔ کیا ایسی ہی ڈیوٹی دی جاتی ہے۔ شرم کرو۔ تم سو رہے تھے اور وہ میرے قریب آکر انہیں یہاں پھینک کر چلا گیا ہے۔“

وہ گارڈ شرمندہ سا ہو کر باتیں سن رہا تھا۔ مرینہ نے ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کو فرش سے اٹھا کر دیکھا۔

وہ کٹی ہوئی زنجیریں کہہ رہی تھیں کہ وہ جب چاہے آسانی سے اس کی شہ رگ تک پہنچ سکتا ہے۔

ابھی وہ نہیں آیا ہے۔ ابھی اس نے تیرا سامان پہنچایا ہے۔ یہ سامان موت کی پہلی دستک ہے۔ دوسری بار دستک نہیں ہوگی۔ موت بند دروازے سے بھی گزر کر آجائے گی۔

وہ حیران پریشان تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔

وہ ظالم سنگدل ایسا ہی تھا۔ آنے سے پہلے دہلا رہا تھا۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

تیز تر

ش م جمیل

کچھ لوگ مقابلے کے لیے دوڑ لگاتے ہیں اور کچھ زندگی کو جیتنے کے لیے تمام عمر بھاگتے رہتے ہیں لیکن پھر بھی دل کا اطمینان نہیں پاتے... کہیں کوئی کسک، کوئی کمی ان کے تعاقب میں رہتی ہے... اس کے دل پر بھی بوجھ تھا جسے اتارنے کے بہانے تلاش کرتے کرتے وہ مایوسی کے انتہائی مقام تک پہنچ گیا تھا۔

لاحاصل تدبیروں سے تقدیر بدلنے کا کھیل

''آج کل کیا کر رہے ہو؟'' بارٹ نے پوچھا۔

''ٹیکسی چلا رہا ہوں۔ کیا تم نے یہی پوچھنے کے لیے بلایا تھا؟'' اسکر نے تلخ لہجے میں کہا اور بارٹ کے قیمتی لباس کی طرف دیکھا جو خاصا پھیل گیا تھا لیکن وہ آج بھی پہلے ہی کی طرح دبلا پتلا تھا۔ اس کے عضلات ویسے ہی سخت اور کھنچے ہوئے تھے۔

''اور تمہاری ٹانگیں؟ کیا تم پہلے کی طرح تیز دوڑ سکتے ہو؟''

''نائمیں بھی ٹھیک ہیں لیکن ان کا تم سے یا کسی سے بھی کیا تعلق ہوسکتا ہے؟''

''بس اسٹینلے آنے والا ہوگا، وہی بتائے گا۔'' بارٹ نے قیمتی کلائی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں ایک ریستوران کے کیبن میں بیٹھے ہوئے تھے اور برسوں کے بعد ملاقات ہو رہی تھی۔ وہ کالج میں ہم جماعت تھے۔ سات سال قبل تقسیم اسناد کے موقع پر ان کی آخری ملاقات ہوئی تھی لیکن اسٹینلے اس تقریب میں غیر حاضر تھا، اس زمانے میں وہ بچوں کی جیل میں سزا کاٹ رہا تھا۔ اگر بارٹ کا ساتھی اسٹینلے تھا تو وہ ان قیمتی کپڑوں اور طلائی گھڑی والے ذریعۂ معاش کے بارے میں خاصا درست اندازہ لگا سکتا تھا۔

''دیکھو وہ آگیا۔''

اسکر نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اسٹینلے پہلے کی طرح دبلا پتلا تھا لیکن اس کا سر ایک طرف جھکا ہوا تھا جیسے وہ کان لگا کر کوئی آواز سن رہا ہو۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ پچاس گز کے فاصلے سے پولیس والوں کے قدموں کی آہٹ سن لیتا ہے۔

''ہیلو اسکر۔'' اسٹینلے مصافحہ کرکے بیٹھ گیا۔ ''اور سناؤ کیسے ہو؟ ہاں یاد آیا، کیا لوگ اب بھی تمہیں سبک رفتار کے نام سے پکارتے ہیں؟''

اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ''نہیں۔''

''تمہیں سبک رفتار کہا جاتا تھا تو غلط نہیں تھا، میں نے اپنی زندگی میں کسی کو بھی اتنا تیز دوڑتا ہوا نہیں دیکھا۔ تم نے ایک میل دوڑنے کا کیا ریکارڈ قائم کیا تھا اسکر؟''

''چار منٹ اور دس سیکنڈ، لیکن وہ اسکول کے زمانے کی بات تھی۔'' اسکر نے انکساری سے جواب دیا۔ ''میں نے دو سو بیس گز دوڑنے کا جو ریکارڈ قائم کیا تھا وہ واقعی بہت عمدہ تھا۔''

''کیا ریکارڈ تھا؟'' اسٹینلے نے کہا اور قریب سے گزرتے ہوئے ویٹر کو انگلیوں سے اشارہ کیا۔ ''تین کافی۔''

''دو سو بیس گز کا فاصلہ میں نے چوبیس سیکنڈ میں طے کیا تھا۔ میں اسٹیٹ چیمپئن بن گیا تھا لیکن کم بخت ٹونی نے بائیس سیکنڈ میں یہ فاصلہ طے کرکے میرا ریکارڈ توڑ دیا۔ کوئی سوچ سکتا ہے، صرف دو سیکنڈ کے فرق سے میں دوسرے نمبر پر آگیا۔''

بارٹ آہستہ سے ہنسا۔ ''مجھے یقین تھا کہ تم اس منحوس ٹونی کو شکست دینے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ بڑا ہی مغرور اور بد دماغ لڑکا تھا۔''

''ٹونی کہاں ہے آج کل؟'' اسٹینلے نے پوچھا۔

''پتا نہیں، کسی بڑے ادارے میں اعلیٰ عہدے دار لگ گیا ہوگا، وہ اسی قسم کا آدمی تھا۔''

''اور تم کیا کر رہے ہو؟''

''میں؟ ٹیکسی چلا رہا ہوں۔''

اسٹینلے آنکھیں بند کرکے مسکرایا۔ ''ٹونی اعلیٰ عہدے دار اور تم ٹیکسی ڈرائیور، یہاں بھی تم اس سے شکست کھا گئے۔''

اسکر کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ ''سنو! تم لوگوں کو آخر مجھ سے کیا کام ہے؟ یہ دھندے کا وقت ہے۔ میں باتوں میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔''

''پچاس ہزار ڈالرز! کیا تم یہ رقم لینا پسند کرو گے اسکر؟''

اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ چند لمحے وہ خاموش رہا۔ ''تم لوگ کہیں ڈاکا ڈالنا چاہتے ہو؟''

''تمہیں ہم دونوں کے متعلق تو معلوم ہی ہوگا، اس لیے تعجب کا اظہار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر تمہیں پچاس ہزار ڈالرز کمانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے تو کوئی بات نہیں۔ بے شمار افراد پانچ ہزار ڈالرز کے عوض اپنی ماں کو قتل کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔''

''لیکن میں ہی کیوں؟''

''ہمیں ایک تیز دوڑنے والے آدمی کی ضرورت ہے۔ کام بہت آسان ہے جس میں ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور آمدنی...... تم سن ہی چکے ہو۔ تیسرا حصہ پچاس ہزار ڈالرز بنتا ہے۔ کیا خیال ہے؟''

''تفصیلات سنے بغیر میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

اسٹینلے نے سر ہلایا اور میز پر آگے کی طرف جھک گیا۔ ''ریاست آیوا میں ایک بہت بڑی ٹول فیکٹری ہے۔ بارٹ پچھلے دو ماہ سے وہیں ملازمت کر رہا ہے۔'' اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہر جمعے کو وہاں ملازمین کو تنخواہ دی جاتی ہے۔ نقد کل رقم ڈیڑھ لاکھ ہوتی ہے۔'' اس نے جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کر میز پر بچھا دیا۔ اسکر نے اس پر کھینچی ہوئی ٹیڑھی ترچھی لکیروں کو دیکھا لیکن اس کے کچھ بھی پلے نہیں پڑا۔ ''یہ دیکھو یہ ہے فیکٹری کی چہار دیواری اور یہ ہے داخلی دروازہ، اس کے قریب ہی چھوٹا دروازہ ہے۔ بڑے دروازے سے فیکٹری کے مزدور آتے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ دن میں چار مرتبہ ہی کھلتا ہے لیکن چھوٹا دروازہ کھلا رہتا ہے جہاں سے انتظامیہ کے افراد آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس سے اندر داخل ہوں تو کھلا میدان ہے جو سیمنٹ کا بنا ہوا ہے۔ میدان عبور کرنے کے بعد

انتظامی شعبے کی عمارت ہے۔ دروازے اور عمارت کے درمیان تقریباً پانچ سو فٹ کا فاصلہ ہے۔ پہلے یہ میدان گاڑیاں پارک کرنے کے کام آتا تھا لیکن اب فیکٹری کے مالکان نے سامنے والی زمین بھی خرید لی ہے جہاں تمام گاڑیاں کھڑی کی جاتی ہیں۔ میدان میں صبح شام ٹرکوں میں مال لادا جاتا ہے، باقی وقت بالکل خالی پڑا رہتا ہے۔ اب تم سمجھے ہمیں تمہاری مدد کی کیوں ضرورت ہے؟''

اسکر نے احمقوں کی طرح باری باری دونوں کی صورتیں دیکھیں۔

''کمال ہے! ابھی دروازے سے عمارت کا فاصلہ پانچ سو فٹ ہے، گاڑی اندر نہیں جاسکتی اور رقم عمارت کے اندر ہوتی ہے۔ تمہیں عمارت کے اندر سے رقم کا تھیلا اٹھا کر دوڑ لگانی ہے، بہت تیز۔ باہر ہم گاڑی میں تمہارے منتظر ہوں گے، تمہارے بیٹھتے ہی گاڑی دس سیکنڈ میں اس مقام سے ایک میل کا فاصلہ طے کرلے گی۔ سارا مسئلہ اس پانچ سو فٹ میدان کے عبور کرنے کا ہے۔''

''یعنی میں؟''

اسٹینلے نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تم جیسا تیز دوڑنے والا ہی یہ کام کرسکتا ہے۔ صبح ٹھیک سوا دس بجے محاسب تجوری میں سے ساری رقم نکالتا ہے۔ اس کی مدد کے لیے تین عورتیں ہوتی ہیں۔ وہ اپنا کمرا بند کر کے رقم گنتے ہیں اور ہر شخص کی تنخواہ لفافوں میں بند کرتے جاتے ہیں۔ رقم حاصل کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ محاسب ایک بوڑھا آدمی ہے۔ ریوالور دیکھ کر وہ ذرا بھی مزاحمت نہیں کرے گا اور عورتیں ممکن ہے بے ہوش ہی ہوجائیں۔ بس رقم کا تھیلا اٹھا کر دوڑ لگانی ہے۔''

''نہیں، نہیں۔'' اسکر نے جلدی سے کہا۔ ''میں اس قسم کا خطرہ مول نہیں لے سکتا چاہے رقم دس لاکھ ڈالرز ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے علاوہ یہ سوال بھی ہے کہ مجھے دروازے سے اندر جانے کون دے گا؟ فیکٹری کے کارکنوں کو شناختی کارڈ جاری کیے جاتے ہیں جنہیں دکھا کر اندر داخل ہوا جاتا ہے۔''

''شناختی کارڈ پر تصویر تو نہیں ہوتی۔ تم ہارٹ کا کارڈ دکھا کر اندر جاسکتے ہو۔ تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔ فیکٹری میں روزانہ ہی نئے مزدور ملازم رکھے جاتے ہیں۔ کوئی بھی اتنے بہت سے چہرے یاد نہیں رکھ سکتا۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں اسکر... یہ بڑا ہی آسان کام ہے اور تم جیسے تیز دوڑنے والے شخص کے لیے تو یہ کوئی کام ہی نہیں ہے۔''

زیتون

☆ زیتون کا تیل گنج پن کا مرض ختم کرتا ہے، بالوں کو لمبا اور مضبوط بناتا ہے۔

☆ آنکھوں میں ڈالنے سے بینائی بڑھتی ہے، سرخی دور کرتا ہے۔

☆ پتے کی سوزش اور پتھری کے مریضوں کو روغنِ زیتون پلانا چاہیے۔ گردے کے امراض کے لیے مفید ہے۔

☆ آنتوں کے زخم میں نہار منہ زیتون کا تیل دینے سے زخم مندمل ہوجاتے ہیں۔

☆ گردے کی پتھری خارج کرنے کا آزمودہ نسخہ۔ ایک چمچہ شہد، ایک چمچہ لیموں کا رس، ایک چمچہ زیتون کا تیل، آدھے گلاس پانی میں ڈال کر صبح نہار منہ پی لینے سے 8، 10 دنوں میں پتھری ریزہ ریزہ ہوکر بہہ جاتی ہے۔

مرسلہ: محمد خواجہ، کورنگی کراچی

''میں تیز دوڑ سکتا ہوں لیکن گولی کی رفتار سے مقابلہ نہیں کرسکتا۔''

''گولی چلنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ بوڑھے محاسب کو گولی چلانا نہیں آتی، وہ کمرے کا دروازہ مقفل کرنے کا عادی ہے۔''

''تو کوئی مقفل دروازے میں کس طرح داخل ہوسکتا ہے؟''

''تم اس کی فکر مت کرو۔'' ہارٹ نے کہا۔ ''میں وہاں مرمت کے شعبے میں ملازم ہوں۔ میں ایک روز قبل چیکنگ کے بہانے دروازے کے قفل کو ٹھیک کردوں گا، تم ذرا زور سے دھکا دو گے تو دروازہ کھل جائے گا۔ اس سلسلے میں تمہیں ذرا بھی پریشانی نہ ہوگی۔''

''سوری۔ میں یہ کام نہیں کرسکتا۔'' اسکر نے نشست سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''میں نے کیا کہا تھا۔'' اسٹینلے نے ہارٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اسکر اب دوڑنے کے قابل نہیں رہا۔''

''یہ بات نہیں ہے۔''

''ہمیں معلوم ہے، تم دوڑ تو سکتے ہو لیکن تمہارے اندر حوصلے کی کمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تم ٹونی سے شکست

کھا گئے تھے۔'' اسٹینلے زور سے ہنسا۔ ''پچاس ہزار ڈالرز اتنی بڑی رقم ہے کہ تم خود کئی ٹیکسیوں کے مالک بن سکتے ہو لیکن تم یہ رقم حاصل کرنے کے لیے کوشش ہی نہیں کرنا چاہتے۔ چلو بارٹ! اٹھو، کسی اور کو تلاش کریں جو تیز دوڑنے کے ساتھ ساتھ اپنے شاندار مستقبل سے ذرا سی محبت بھی کرسکتا ہو۔''

وہ نشست سے کھڑا ہوگیا۔ ''اسکر! اگر تم اپنا خیال تبدیل کرو تو بارٹ کو فون کردینا، وہ پیلس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔''

''میں اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کروں گا۔''

لیکن اس رات اسکر نے اپنا فیصلہ تبدیل کردیا۔

☆☆☆

سنیچر کی صبح اسکر چھ بجے بیدار ہوگیا۔ اس نے میلے کپڑوں کا ایک جوڑا پہنا۔ دوڑ لگانے والے جوتے پہنے اور بس میں سوار ہوکر شہر سے باہر گرین پارک پہنچا جو اس وقت سنسان پڑا تھا۔ ایک گھنٹے تک وہ دوڑ لگانے کی مشق کرتا رہا۔ یہ دیکھ کر اسے بڑا اطمینان ہوا کہ وہ اب بھی اتنا ہی تیز دوڑ سکتا ہے۔ فرق یہ پڑا تھا کہ مشق چھوٹنے کی وجہ سے اب اس کا سانس جلدی پھولنے لگا تھا لیکن یہ کوئی تشویش کی بات نہیں تھی، اسے بس ایک بار ہی دوڑ لگانا تھی۔ اتوار کی صبح بھی اس نے مشق کی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی رفتار پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ اسے پورا یقین تھا کہ ٹونی اگر اس وقت مقابلے پر ہوتا تو وہ اسے شکست دینے میں کامیاب ہوجاتا۔

منصوبے کے مطابق اسکر بدھ کے روز مزدوروں والا لباس پہن کر صبح چھ بجے گاڑی لے کر ریاست آیوا کی طرف روانہ ہوگیا۔ کل ڈھائی گھنٹے کا سفر تھا۔ اس نے ٹیکسی دور کھڑی کی اور فیکٹری کے دروازے پر پہنچا۔ بڑا دروازہ کھلا ہوا تھا اور مزدور فیکٹری میں داخل ہورہے تھے۔ وہ بھی ان کی قطار میں لگ گیا۔ نمبر آنے پر اس نے چوکیدار کو بارٹ کا شناختی کارڈ دکھایا جس نے سرسری نظر ڈال کر اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ دروازے سے داخل ہوکر اس نے اندر کا جائزہ لیا۔ اسٹینلے نے وہاں کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ درست تھا۔ اس نے انتظامی شعبے کی عمارت اور چھوٹے دروازے کا فاصلہ نظروں سے ناپا، تقریباً پانچ سو فٹ کا فاصلہ تھا یعنی ایک سو پچاس گز، وہ یہ فاصلہ پندرہ سولہ سیکنڈ میں طے کرسکتا تھا۔ اب اسے اطمینان ہوگیا تھا کہ یہ کام واقعی زیادہ مشکل نہیں ہے۔

جمعرات کی شب وہ تینوں بارٹ کے کمرے میں ملے۔ انہوں نے کئی بار منصوبے کی جزئیات پر غور کیا، انہیں دہرایا، اچھی طرح ذہن نشین کیا پھر اسٹینلے نے اس کی طرف ایک ریوالور بڑھایا۔ اسکر جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔

''اس میں کارتوس نہیں ہیں، خالی ہے۔'' اسٹینلے نے کہا۔ ''ڈرنے کی ضرورت نہیں، ہم خود اسلحہ استعمال کرنے کے سخت مخالف ہیں۔ بوڑھے محاسب کو ڈرانے کے لیے تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔''

''تم نے دروازے کا قفل درست کردیا ہے بارٹ؟''

''بالکل۔ آج شام یہ کام کرکے آیا ہوں۔ زور سے دھکا دینا لیکن ایک بات کا خیال رکھنا، تمہیں اس کمرے میں ٹھیک سوا دس بجے داخل ہونا ہے۔''

☆☆☆☆

جمعے کی صبح جب الارم کی تیز آواز سن کر اسکر کی آنکھ کھلی تو اس کی طبیعت مضمحل تھی۔ اس کیفیت کا اس کو سابقہ تجربہ تھا۔ ہر بار دوڑ شروع ہونے سے پہلے اس پر ایسی ہی کیفیت طاری ہوجایا کرتی تھی۔ جلدی جلدی تیاری کرکے وہ فیکٹری کی جانب بڑھ گیا۔ وہ ملازمین کی قطار میں شامل ہوکر اندر داخل ہوگیا۔ کسی نے بھی اس پر توجہ نہیں دی لیکن وہ دوسرے ملازمین کے ساتھ فیکٹری کے اندر نہیں گیا۔ عمارت میں قطار در قطار بیت الخلا بنے ہوئے تھے، اس نے ایک بیت الخلا میں خود کو مقفل کرلیا۔ ٹھیک دس بج کر پانچ منٹ پر وہ باہر نکلا۔ ٹہلتا ہوا فیکٹری کے دروازے پر رک گیا۔ ایک بار اس نے جوتے کے تسمے کھولے اور انہیں دوبارہ باندھا، پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور کی موجودگی کا اطمینان کیا۔ اس کے بعد وہ میدان میں نکل آیا۔ ابھی سوا دس بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ وہ بڑے اطمینان سے ٹہلتا ہوا انتظامیہ کی عمارت کی جانب بڑھ رہا تھا۔ دور تنخواہ بانٹنے والے کمرے میں اسے دو معمر عورتیں اور بوڑھا محاسب نظر آرہا تھا۔ اس روز قسمت ساتھ دے رہی تھی۔ اسے بوڑھا محاسب وقت سے پہلے ہی تجوری پر جھکا ہوا نظر آیا۔ وہ تجوری کا دروازہ کھولنے کے لیے نمبروں والے قفل کے ساتھ مشغول تھا۔ اسکر نے یہ دیکھ کر اپنی رفتار بڑھا دی۔ ٹھیک اس وقت جب اسکر نے کمرے کے مقفل دروازے پر ہاتھ رکھا، بوڑھا محاسب تجوری کے اندر سے نوٹوں سے بھرا ہوا تھیلا باہر نکال رہا تھا۔

اسکر نے خودکار قفل کے لٹو کو گھمایا اور دروازے کو دھکا دیا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ ایک لمحے کے لیے تو اس کے ہوش اڑ گئے، دوسری بار اس نے زیادہ قوت استعمال کی تو دروازہ کھل گیا۔ بوڑھے محاسب نے سر اٹھا کر اس کی جانب

دیکھا، پھر اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اس موقع پر ایک غیر متعلق فرد کی مداخلت اُسے بہت ناگوار گزری تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اسکر کی طرف دیکھا جو اس وقت تک جیب سے ریوالور نکال چکا تھا۔ ریوالور پر نظر پڑتے ہی معمر عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔

''خاموش۔'' اسکر نے سخت لہجے میں کہا۔ ''شور مچانے کی ضرورت نہیں، چپ چاپ رقم کا تھیلا میرے حوالے کردو۔''

''نہیں۔'' بوڑھے محاسب کا سانس پھول گیا تھا۔ ''اس میں ہماری تنخواہیں ہیں۔''

''جلدی کرو!'' اس نے اور زیادہ سخت لہجے میں کہا۔

بوڑھے محاسب نے ہچکچاتے ہوئے نوٹوں سے بھرا ہوا تھیلا اسکر کی جانب بڑھا دیا۔ اسکر نے جھپٹ کر تھیلا چھین لیا لیکن اس کا وزن محسوس کرکے حیران رہ گیا۔ تھیلے کا وزن تقریباً بارہ پونڈ تھا۔ اسے یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ نوٹوں میں وزن بھی ہوتا ہے۔ بارہ پونڈ کا تھیلا لے کر دوڑ لگانے میں اسے دقت ضرور ہوگی لیکن وہ پھر بھی ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ تقریباً اسی رفتار سے پندرہ سولہ سیکنڈ میں طے کرسکتا تھا۔

''شور مچانے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے الٹے قدموں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''اگر کسی نے میرا تعاقب کرنے کی کوشش کی تو میں گولی چلادوں گا۔''

کمرے سے باہر نکل کر اس نے دروازہ بند کیا اور پھر دوڑنا شروع کردیا۔

سات سال پہلے کا زمانہ لوٹ آیا جب وہ دوڑ کے شائقین کے سامنے اپنی اس صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ کرتا تھا۔ شائقین کی پُرجوش آوازیں اسے سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کی طرح سنائی دیتی تھیں۔ طبیعت کا اضمحلال کافور ہوگیا تھا۔ اس کے پیر بڑی خوبصورتی سے زمین پر پڑ رہے تھے۔ کانوں میں تیز ہواؤں کی سیٹیاں گونج رہی تھیں۔ اسے اپنے پیچھے دوڑتے ہوئے قدموں کا بھی احساس تھا لیکن تعاقب کرنے والے قدم سیسے کے مانند وزنی تھے اور اس کے پیروں میں اڑنے والے پرندوں کے ہلکے پھلکے پر لگے ہوئے تھے۔ اس کی نظروں کے سامنے چھوٹا دروازہ تھا جو بہت تیزی سے قریب آتا جارہا تھا۔ وہی اس کی منزل تھی، اس دروازے سے باہر ہارٹ اور اسٹینلے گاڑی میں اس کے منتظر تھے۔ اچانک اُسے احساس ہوا کہ وہ زندگی میں اس سے زیادہ تیز کبھی نہیں دوڑا اور تب اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کاش اس وقت کوئی گھڑی میں دیکھ رہا ہو، تاکہ اس کے قدم دوڑ کی دنیا میں ہمیشہ کے لیے امر ہوجاتے۔ وہ ہوا کے دوش پر اڑ رہا تھا اور اپنی تیز رفتاری پر خود ہی ناز کررہا تھا۔

اچانک عقب سے کسی نے اسے پکڑنے کی کوشش کی۔

اس نے سیمنٹ کے پختہ فرش کو برق رفتاری سے اوپر اٹھتے ہوئے دیکھا، خطرے کا احساس ہوتے ہی لمحے بھر میں اُس کا بدن ٹیڑھا ہوگیا۔ اس کا کاندھا پوری قوت کے ساتھ زمین سے ٹکرایا۔ اس طرح اس کے چہرے کے نقوش محفوظ رہ گئے، اگر وہ سیدھا گرتا تو پھر شاید کوئی بھی عرصہ دراز تک اسے اسکر کے نام سے شناخت نہیں کرپاتا۔

زمین سے ٹکراتے ہی پھیپھڑوں میں بھری ہوئی ہوا نکل گئی۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے جلدی سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کسی نے اس کی ٹانگیں بڑی مضبوطی سے پکڑی ہوئی تھیں۔ اس کے حلق سے ایک ناقابلِ یقین چیخ نکل گئی۔ یہ کس طرح ممکن ہوسکتا تھا؟ وہ اپنی زندگی میں کبھی اتنا تیز نہیں دوڑا تھا۔ آخر کوئی اسے کس طرح پکڑنے میں کامیاب ہوا؟

اس نے سر موڑ کر پیچھے دیکھا، ایک نوجوان اس کے ٹخنے پکڑے ہوئے تھا، اس نے سر اٹھا کر اسکر کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ ''معاف کرنا دوست۔'' اس کی سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی۔ ''اس تھیلے میں میری تنخواہ ہے اس لیے میں تمہیں یہ تھیلا چرانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

پہلے تو اسکر کو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے نوجوان کو پہچان لیا۔ وہ ذرا بھی تبدیل نہیں ہوا تھا۔ اسے پکڑنے والا نوجوان ٹونی تھا۔ وہی جس نے سات سال قبل کالج میں اسے دوڑ کے مقابلے میں ہرایا تھا۔

''ٹونی۔'' اسکر کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ ''تم؟ تم یہاں کیا کررہے ہو؟''

''میں یہاں ملازم ہوں۔'' ٹونی نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ ''ایک شعبے کا منیجر ہوں۔''

پھر دوسرے لوگ بھی آگئے، انہوں نے پہلے رقم کا تھیلا اُٹھایا اور اس کے بعد اسکر کو اس کے قدموں پر کھڑا کیا۔ وہ آپس میں زور زور سے باتیں کررہے تھے۔ ہارٹ اور اسٹینلے کو بھی پکڑ لیا گیا تھا...... اسکر کو ان دونوں کی ذرا سی بھی پروا نہیں تھی۔ اسے رقم ہاتھ سے نکل جانے کا بھی کوئی افسوس نہیں ہوا۔ اسے بس ایک ہی غم تھا کہ اس مرتبہ بھی دوڑ میں ٹونی کے مقابلے پر وہ دوسرے نمبر پر رہا تھا۔

ہمدرد

منظر امام

کبھی بے درد پیچھا نہیں چھوڑتے اور کہیں ہمدرد اپنے حصار سے نکلنے نہیں دیتے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی دائرے میں قید ہوگیا تھا جو مجسم مہربان تھا اور کسی کی مہربانی اس کی سب سے بڑی نادانی بن گئی تھی۔ لہٰذا خمیازہ تو بھگتنا ہی تھا۔

بدلتے چہروں پر ... اور حالات کی ...

بہت بڑی بستی تھی۔ اس بستی میں کم از کم دو تین لاکھ افراد رہتے تھے۔ سیدھے سادے لوگ تھے لیکن اس بستی کے لوگوں میں اچھی خاصی خوش حالی تھی۔ اکثر کے پاس زمینیں تھیں جن سے شاندار فصلیں ہوا کرتیں۔ بہت سوں نے مویشی پال رکھے تھے جن سے دودھ، دہی حاصل کیا جاتا تھا۔

اس بستی کا زمیندار نیک محمد بذاتِ خود بھی ایک نیک انسان تھا۔ اسے ہر دم یہ فکر رہتی تھی کہ بستی کو ایک مثالی نمونہ

کیسے بنایا جائے؟ ایسا کون سا طریقہ ہو کہ لوگ اس بستی میں رہنے والوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں؟

ایک مہمان نے ایک بنیادی بات کی طرف توجہ دلائی۔

''یار نیک محمد تمہاری بستی میں سب کچھ ہے بس ایک چیز کی کمی ہے، اگر وہ ہو جائے تو یہ سمجھو کہ چار چاند لگ جائیں گے۔''

''اور وہ کمی کیا ہے؟''

''ایک اچھے اسکول کی کمی ہے۔'' مہمان نے بتایا۔

''دو تین چھوٹے اسکول تو ہیں لیکن وہ بہت چھوٹے ہیں ایک بڑا اور زبردست اسکول اگر کھل جائے تو آس پاس اس کی شہرت ہو جائے گی اور دور دور سے طالب علم علم حاصل کرنے یہاں آیا کریں گے۔''

نیک محمد کے دل کو یہ بات بہت پسند آئی۔

اس نے ایک بڑے اسکول کی پلاننگ شروع کر دی۔

اس نے شہر کے ایک ٹھیکیدار کو بھی بلوا لیا جو ایک ماہر انجینئر کو اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔ اس انجینئر نے اسکول کا نقشہ تیار کیا۔ ٹھیکیدار نے حساب کتاب لگا کر بتایا کہ اسکول کی تعمیر پر تیس لاکھ خرچ ہوں گے۔

زمیندار کی خواہش بھی تھی اور بستی والوں کی بھی یہی خواہش تھی اس کے باوجود تیس لاکھ کی رقم بہت زیادہ تھی اور یہ تیس لاکھ کہاں سے آتے؟

سب سے پہلا مرحلہ تو مناسب زمین کے حصول کا تھا۔ یہ تیس لاکھ زمین کی قیمت کے علاوہ تھے۔ اس سلسلے میں نیک محمد ہی نے نیکی کا ثبوت دیا۔ اس نے اپنی تین ایکڑ زمین اسکول کے لیے وقف کر دی۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ زمین مل گئی تھی لیکن اور چیزیں کہاں سے آتیں؟ ہزار طرح کے اخراجات تھے۔

پھر ایک دن ایک فرشتہ اس بستی میں نمودار ہوا۔

اس فرشتے کا نام زاہد علی تھا۔ ادھیڑ عمر آدمی، فربہ جسم، قیمتی پوشاک، ہلکی ڈاڑھی۔ اس کو دیکھنے سے یہ احساس ہو جاتا تھا کہ وہ نہ صرف نیک دل اور ہمدرد قسم کا انسان ہے بلکہ اس کے پاس پیسے بھی ہیں۔

وہ براہ راست نیک محمد سے جا کر ملا تھا۔ ''جناب میں شہر سے آیا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''مجھے پتا چلا تھا کہ اس بستی کے لوگوں نے ایک بہت نیک کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔''

''جی ہاں ہم نے ایک بہت بڑا اسکول بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''جزاک اللہ۔ اگر ایسا ہو گیا تو یہ ایک بہت بڑا کام ہوگا۔'' زاہد علی نے کہا۔ ''اس وقت ہماری قوم کو تعلیم کی بہت ضرورت ہے تعلیم کے بغیر ترقی کا تصور ہی محال ہے۔''

''جی ہاں۔ یہی سوچ کر میں نے یہ فیصلہ کیا تھا۔'' نیک محمد نے بتایا۔ ''لیکن کچھ مجبوریاں سامنے آ گئی ہیں۔''

''کیسی مجبوریاں؟ آپ مجھے بتائیں۔''

''وہی پیسوں کی۔'' نیک محمد نے بتایا۔ ''تیس لاکھ کے اخراجات ہیں۔ یہ تیس لاکھ کہاں سے آئیں گے؟''

''اس وقت آپ کے پاس کتنی رقم ہے؟''

''صرف دو لاکھ۔ اس سے کیا ہو سکتا ہے۔''

''بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ دو لاکھ روپے میں دے رہا ہوں۔ آپ چار لاکھ سے کام کا آغاز کر سکتے ہیں۔''

''بھائی جان آپ کے اس جذبے نے تو مجھے حیران کر دیا ہے۔ آپ کون ہیں، کیا کرتے ہیں؟''

''خدا کا ایک بندہ ہوں، چھوٹا موٹا کاروبار ہے میرا اور میں اسی قسم کی نیکی کی تلاش میں رہتا ہوں۔'' زاہد علی نے بتایا۔ ''آپ کا اسکول بن جائے گا آپ بس کام شروع کرا دیں۔''

نیک محمد نے بستی کے معزز لوگوں کو بلا کر ان کے سامنے زاہد علی کو پیش کر دیا۔ پوری بستی زاہد علی کی تعریف کیے جا رہی تھی اور خود زاہد علی شرمندہ شرمندہ سا گردن جھکائے ایک طرف بیٹھا تھا۔

لوگوں کے جانے کے بعد اس نے نیک محمد سے کہا۔

''یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ میں تو بہت خاموشی سے یہ کام کرنا چاہتا تھا لیکن آپ نے مجھے بدنام کر کے رکھ دیا۔''

''بھائی جان ایسی باتوں کی شہرت بہت ضروری ہوتی ہے۔'' نیک محمد نے کہا۔ ''تاکہ دوسروں میں بھی نیکی کا جذبہ بیدار ہو۔''

''آپ کی مرضی ورنہ میں تو ایسی باتوں کے خلاف ہوں۔''

زاہد علی نے دو لاکھ روپے نیک محمد کے حوالے کر دیے اور یوں بے نیاز ہو گیا جیسے اس کا کوئی واسطہ ہی نہیں رہا ہو۔

نیک محمد نے دوسرے دن ہی ٹھیکیدار کو بلوا کر کام شروع کروا دیا تھا۔

پوری بستی یہ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی کہ ان کے علاقے میں ایک بہت بڑا اسکول بننے جا رہا ہے۔ خود نیک محمد اور زاہد علی بھی دن میں دو تین چکر لگا لیتے تھے۔

زاہد علی صرف دو دن اس بستی میں رہا تھا۔ اس کی رہائش نیک محمد ہی کے مکان میں تھی۔ دو دن بعد وہ اجازت لے کر اس وعدے کے ساتھ رخصت ہو گیا کہ وہ ہفتہ دس دن بعد پھر آئے گا۔

اسکول کا کام چلتا رہا۔
لیکن اتنے بڑے پروجیکٹ کے لیے چار لاکھ روپے کیا ہوتے ہیں دس دن بعد ختم ہو گئے۔ اس وقت بستی کے کچھ آدمیوں نے مل ملا کر ایک لاکھ روپے اور جمع کر لیے۔
صرف ایک لاکھ جو یقیناً نہ ہونے کے برابر تھے' وہ پیسے بھی تین چار دنوں کا کام نکال سکے تھے۔ ان کے ختم ہونے کے بعد ایک بار پھر وہی سوال سامنے آ گیا کہ اب کیا ہونا ہے؟
اس وقت وہی فرشتہ یعنی زاہد علی پھر نمودار ہو گیا۔ اس نے آتے ہی پانچ لاکھ روپے نیک محمد کے حوالے کر دیے۔
''یہ لیں بھائی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ پیسے ختم ہو گئے ہوں گے اس لیے میں اپنے ساتھ پانچ لاکھ روپے لیتا آیا ہوں۔''
''ارے یہ...... یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' نیک محمد جیسے احسان کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔
''بس بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ میں آپ کے لیے نہیں کر رہا بلکہ قوم کے بچوں کے لیے کر رہا ہوں۔''
نیک محمد اس کے بعد پھر کیا بول سکتا تھا۔
پوری بستی میں ایک بار پھر زاہد علی کا چرچا ہونے لگا تھا۔ بستی والوں کے لیے وہ رحمت کا فرشتہ بن کر سامنے آیا تھا ورنہ کسی کو کیا پڑی ہے کہ کسی اور علاقے کے اسکول کی تعمیر میں اتنی دلچسپی لے۔ پوری بستی اس کی احسان مند ہو گئی تھی۔
لوگ اس سے ملنے کے لیے آتے لیکن اس کی وہی کیفیت تھی، بے نیازی والی۔ لوگ جب اس کی تعریفیں کرنے لگتے تو وہ فوراً انہیں منع کر دیتا۔ ''دیکھیں ایسا نہ کریں۔ اس طرح منہ پر تعریف نہیں کرنی چاہیے۔ خوامخواہ دل میں غرور پیدا ہونے لگتا ہے اور میں ایسی باتوں سے دور رہنا چاہتا ہوں۔''
اس بار اس نے نیک محمد کو یہ بتایا کہ وہ دبئی میں شوگر کا کارخانہ بنا رہا ہے یعنی اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ دبئی جیسے مقام پر کوئی کارخانہ تعمیر کر سکے۔ اس کی دولت کا اندازہ اس کی ایک ایک حرکت سے ہوا کرتا۔ اس کا چلنا، اٹھنا بیٹھنا، بات کرنے کا انداز یہ سب اعلان کر رہے تھے کہ اس شخص نے اپنی زندگی دولت کے سائے میں گزاری ہے۔
اس کے باوجود اس کی انکساری دیکھنے والی تھی۔
بستی میں کچھ دنوں کے قیام کے بعد وہ واپس چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد بھی اس کے بارے میں باتیں ہوتی رہتی تھیں۔
''بھئی انسان ہو تو زاہد علی جیسا۔''
''ہاں بھائی' اب ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں؟''
''دولت بھی ہے اور خدا کا خوف بھی۔ کیا آدمی ہے؟''
''میاں! نیک کاموں میں خرچ کرتا ہے۔ اسی لیے خدا نے اس کو اتنا دے رکھا ہے۔''
تیسری بار جب وہ آیا تو اپنے ساتھ پھر دو لاکھ لے آیا تھا۔ نیک محمد نے بڑی عقیدت سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ''بھائی یہ گاؤں والے آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گے۔''
''کیسا احسان' میں تو اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''خدا نے پیسے دیے کس لیے ہیں اور اس سے بہتر اور کیا استعمال ہو سکتا ہے کہ دولت علم کے راستے میں خرچ کی جائے؟''
نیک محمد نے اس کے حالات جاننے کی کوشش کی۔ نیک محمد کو ابھی تک اس کے ماضی کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ نیک محمد کے دریافت کرنے پر اس نے بتانا شروع کیا۔
''بھائی صاحب' میں نے بہت پریشان حال زندگی گزاری ہے۔ میرے ماں باپ بہت غریب تھے۔ میری خواہش تھی کہ میں خوب تعلیم حاصل کروں لیکن یہ میرے والدین کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے صرف میٹرک تک پڑھا۔ اس کے بعد ایک کارخانے میں نوکری کر لی۔ ہاں مجھ میں ایک بات شروع سے رہی اور وہ یہ کہ آگے بڑھنے کی خواہش کہ میں خوب ترقی کروں۔ کارخانے کی نوکری کے دوران میں مجھے دبئی جانے کا موقع مل گیا۔ میں نے اس چانس کو مس نہیں کیا اور دبئی پہنچ گیا۔ بھائی صاحب' میں کیا بتاؤں میں نے وہاں کتنی محنت کی؟ ٹیکسی چلائی، مزدوری کی، عام سے ہوٹل میں ویٹر کے طور پر کام کرتا رہا۔ میں یہ سوچا کرتا تھا کہ یا خدا کیا میری زندگی اسی طرح گزر جائے گی؟ زندگی میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آئے گی؟ لیکن ہوا یہ کہ خدا نے میری دعائیں سن لیں اور مجھے ایک شیخ کی جان بچانے کا موقع مل گیا۔''
''وہ کیسے ہوا تھا بھائی صاحب؟'' نیک محمد نے پوچھا۔
''بھائی ایک جلتی دوپہر میں میرا گزر رہائی وے کی طرف سے ہوا۔ میں نے دیکھا ایک گاڑی الٹی ہوئی ہے۔ میں دوڑ کر گاڑی کے پاس پہنچ گیا جس میں شیخ صاحب اندر پھنسے ہوئے تھے اور بہت زخمی حالت میں خون بہہ رہا تھا اور یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔
''بہر حال میں نے بڑی محنت اور کوشش کے بعد انہیں گاڑی سے نکالا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ وہ زندہ تھے، ان کی سانسیں چل رہی تھیں لیکن رفتار بہت سست تھی۔ خون بہت ضائع ہو چکا تھا۔ بہر حال میں نے کسی نہ کسی طرح انہیں

گاڑی میں ڈالا اور اسپتال لے آیا۔ مگر یہاں تو سب سے پہلے یہی خیال آیا کہ شاید یہ حادثہ میں نے ہی کیا ہے۔ یہ اتفاق تھا کہ شیخ صاحب کو خون بھی میں نے ہی دیا تھا۔ میرا گروپ ان سے میچ کر گیا تھا۔

"شیخ صاحب کو دو دن بعد ہوش آیا تھا۔ آپ اندازہ نہیں کرسکتے کہ ان دو دنوں میں میری کیا حالت ہوئی ہوگی؟ ان کی زندگی کی دعائیں مانگ مانگ کر میرے ہونٹ سوکھ گئے تھے۔ خدانخواستہ اگر وہ انتقال کر جاتے تو میں لٹک جاتا۔ وہاں تو اسی قسم کا انصاف ہوتا ہے۔ بس جو شرطے نے کہہ دیا وہی قانون ہے۔

"خدا نے آخرکار میری سن لی بھائی اور شیخ کو ہوش آ گیا۔ اس نے ہوش میں آتے ہی اپنے حادثے کے بارے میں بیان دیا اور میرا شکریہ ادا کیا۔ بس بھائی اس دن کے بعد سے میرے دن بدلنے لگے۔ اس نے مجھے بڑے بڑے ٹھیکے دیے، ہر طرح میری مدد کی اور اب میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ اپنی فیکٹری بنا رہا ہوں۔"

"یہ سب آپ کی نیکیوں کا اجر ہے بھائی صاحب۔" نیک محمد نے کہا۔

زاہد علی نے عادت کے مطابق اپنی گردن جھکالی۔

کھانے کے دوران زاہد علی کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ کسی سے باتیں کرتے ہوئے اس کے چہرے کا رنگ اتر گیا تھا پھر وہ ناراض ہونے لگا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے؟ مجھے ہر حال میں ایک ہزار بندے چاہئیں۔ ہاں ہاں میں کسی بنگلا دیشی یا ہندوستانی کو اپنی فیکٹری میں نہیں رکھوں گا۔ یہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ مجھے پاکستانی مزدور چاہئیں۔ دس ہزار، نہیں صرف پانچ ہزار، بے چارے غریب لوگ دس ہزار کہاں سے دیں گے۔ چلو تم مجھے دو چار گھنٹوں میں بتا دو۔"

زاہد علی کا موڈ بہت خراب معلوم ہوتا تھا۔

"کیا ہو گیا بھائی صاحب۔ خیریت تو ہے؟" نیک محمد نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں میں اپنی فیکٹری کے لیے پاکستان سے مزدور لے جا رہا ہوں۔ ایک ہزار آدمیوں کی ضرورت ہے۔ میں نے ایک صاحب کو ٹھیکا دیا تھا اب وہ عین وقت پر انکار کر رہا ہے۔"

"یہ ایسا کون سا مسئلہ ہے؟ ایک ہزار آدمی تو میں اپنی بستی سے دے سکتا ہوں۔" نیک محمد نے کہا۔

"کیا، کیا یہاں سے اتنے لوگ تیار ہو جائیں گے؟"

"دل و جان سے تیار ہوں گے اور وہ بھی آپ کے لیے کون تیار نہیں ہوگا؟ اگر کہیں تو اعلان کروا دوں؟"

"یہ آپ کا احسان ہوگا بھائی۔"

"میرا کیسا احسان ہوگا؟ احسان تو آپ کریں گے بستی والوں پر جو آپ کرتے چلے آئے ہیں۔" نیک محمد نے کہا۔ "آپ بے فکر ہو جائیں شام تک ایک ہزار بندے آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔"

"ان سے کہیے گا کہ انہیں صرف پانچ ہزار دینے ہیں۔" زاہد علی نے بتایا۔ "ان کے باقی اخراجات خود میں اپنی جیب سے ادا کروں گا۔"

"سبحان اللہ بھائی صاحب۔ اب میں آپ کے لیے کیا کہوں۔"

"کچھ نہیں کہیں بس دعائیں کرتے رہیں۔"

"دعائیں۔ آپ کے ساتھ تو پوری بستی کی دعائیں ہیں۔"

نیک محمد کے اعلان کرنے کی دیر تھی کہ حویلی کے باہر ہزاروں آدمی جمع ہو گئے۔ ایک تو انہیں دبئی جانے کا موقع مل رہا تھا اور دوسری بات یہ تھی کہ وہ سب زاہد علی کے احسانات کا بدلہ اتارنا چاہتے تھے۔

ہر شخص اپنے ساتھ پانچ پانچ ہزار روپے لے کر آ گیا تھا۔

رات گئے تک لوگوں کی رجسٹریشن ہوتی رہی تھی۔

ایک ہزار آدمیوں کے پانچ ہزار کے حساب سے پچاس لاکھ روپے ہو گئے تھے۔

زاہد علی دوسری صبح اس بستی سے روانہ ہو گیا تھا۔ ایک ہزار آدمیوں کو خوبصورت زندگی کے خواب دکھا کر اور اس بستی کے لوگ ابھی تک زاہد علی کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں۔

بستی کا وہ اسکول ابھی تک ادھورا پڑا ہے۔

اور اس بستی سے کئی سو کلومیٹر کے فاصلے پر ایک بستی میں ایک مسجد کی تعمیر ہو رہی ہے۔ بستی والوں کے اندازے سے کہیں زیادہ رقم خرچ ہونے والی ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مسجد کی تعمیر کو کس طرح آگے بڑھایا جائے کہ اسی دوران ایک گاڑی آ کر رکتی ہے اور اس میں موجود آدمی بستی والوں سے کہتا ہے "آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ یہ خدا کا گھر ہے اب میں تعمیر کرواؤں گا۔"

بستی والے اس ہمدرد کی شان میں قصیدے پڑھنے لگتے ہیں اور وہ پوچھنے پر انکساری سے گردن جھکا کر کہتا ہے۔ "بس کیا بتاؤں جی، خدا کا بندا ہوں۔ ویسے لوگ مجھے زاہد علی کہتے ہیں۔"

رب کائنات کی منشا اور حکمتِ عملی کو سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ قدرت کا قانون ہے کہ جب اندھیرا حد سے بڑھ جائے تو کہیں قریب ہی اجالا چھپا ہوتا ہے اور پھر دھیرے دھیرے ظلمت کی یہ چادر سمٹتی چلی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جب مخلوق اپنے خالق سے غافل ہو کر بت پرستی میں مشغول تھی اور صنم خانے آباد تھے ایسے میں اللہ تعالیٰ کو معجزہ دکھانا مقصود ہوا اور جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو زمین پر اتارا جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی ذات کے ہونے کی وجہ تلاش کرنے... اپنے خالق کی جستجو اور تسلیم ورضا کے سانچے میں ڈھلنے میں گزرا... اپنے ہی ہاتھوں تراشے ہوئے خداؤں کو زمیں بوس کر کے آپ علیہ السلام نے کسی معبود کے ہونے کا یقین دلایا اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کیا... حتیٰ کہ انہی کوششوں میں حج بیت اللہ کے مناسک بھی رقم ہو گئے جن پر رہتی دنیا تک تمام مسلمانانِ عالم کو عمل کرنا ہے۔

[illegible] آزمائشوں پر پورا اترنے والے جلیل القدر پیغمبر کی سوانح حیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام

رضوانہ ساجد

ایک بچہ بڑی دیر سے اپنے باپ کو لکڑی کے چھوٹے اور بڑے بُت بناتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اپنے ہاتھ سے بتوں کے ہاتھ بنا رہا تھا، آنکھیں تراش رہا تھا۔ کسی بت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، کسی کے چہرے پر غصے کی آگ تھی، کوئی منہ بسورے کھڑا تھا۔ بنانے والا بڑی مہارت سے ایک ایک جذبے کو ابھار رہا تھا۔

جب وہ اس کام سے نمٹ گیا اور دوپہر ہو گئی تو اس نے ان بتوں پر مختلف رنگ پھیرے اور سوکھنے کے لیے دھوپ میں

رکھ دیا۔

قریب بیٹھے بچے کے لیے یہ تماشا نیا نہیں تھا لیکن اس وقت یہ نئی بات ہوئی تھی کہ اس کے دل میں ان بتوں کی طرف سے نفرت کا جذبہ ابھر آیا تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ سوچا تھا کہ ان بتوں کا فائدہ کیا ہے؟ اگر یہ محض کھلونے ہوتے تو کوئی بات نہیں تھی، ہم سب تو انہیں سجدہ کرتے ہیں، انہیں خدا مانتے ہیں۔ انہیں خوش رکھنے کے لیے ان پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں جبکہ میرا باپ انہیں اپنے ہاتھوں سے بناتا ہے۔ انہیں بازار میں فروخت کر کے پیسے وصول کرتا ہے۔ ان کے رنگ اتنے کچے ہیں کہ اگر ابھی بارش ہو جائے تو ابھی سارے رنگ اتر جائیں۔

وہ ابھی اتنا چھوٹا تھا کہ اپنے باپ سے کوئی سوال نہیں کر سکتا تھا۔ بس وہ اتنا کر سکتا تھا کہ جب اس کا باپ ان بتوں کو فروخت کرنے کے لیے بازار جانے لگا اور بچے کو ساتھ چلنے کے لیے کہا تو بچے نے انکار کر دیا۔ اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ ان جھوٹے خداؤں کو ہاتھوں میں اٹھا کر بازار کی طرف جائے۔

باپ کے بازار چلے جانے کے بعد وہ دیر تک ان بتوں کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔

☆☆☆

یہ بچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے اور بت بنانے والے ان کے والد آذر تھے۔

ان کا اصل نام (توریت کے مطابق) ابرام تھا اور پھر خدا نے انہیں ابراہام کہہ کر خطاب کیا تھا۔

"دیکھ میرا عہد تیرے ساتھ ہے اور تو بہت قوموں کا باپ ہوگا اور تیرا نام پھر ابرام نہیں کہلائے گا بلکہ تیرا نام ابراہام ہوگا کیونکہ میں نے تجھے بہت قوموں کا باپ ٹھہرا دیا۔"

یہی ابراہام عربی میں آکر ابراہیم ہو گیا۔ قرآن نے آپؑ کو اسی نام سے مخاطب کیا ہے۔

"بے شک! ابراہیم بڑے تحمل والے اور نرم دل رجوع کرنے والے تھے۔" (القرآن)

توریت میں حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام تارح بن نحور درج ہے جبکہ قرآن نے یہ نام "آذر" بتایا ہے۔

"اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم نے اپنے باپ آذر سے کہا، کیا تو بتوں کو خدا بناتا ہے۔"

"آدار" کالڈی زبان میں بڑے پجاری کو کہتے ہیں اور عربی میں یہی "آذر" کہلایا۔ تارح چونکہ بت تراش اور سب سے بڑا پجاری تھا۔ اس لیے "آذر" کے نام سے مشہور ہو گیا حالانکہ یہ نام نہ تھا، لقب تھا اور جب لقب نے نام کی جگہ لے لی تو قرآن نے بھی اس کو اسی نام سے پکارا۔

توریت یہ بتاتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق کے قصبے "اور" کے باشندے اور اہلِ فدان میں سے تھے۔ ان کی قوم بت پرست اور ستارہ پرست تھی۔ گویا شرک کی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔

انجیل میں یہ تصریح موجود ہے کہ ان کے والد نجاری کا کام کرتے تھے اور اپنی قوم کے لیے لکڑی کے بت بناتے اور انہیں فروخت کرتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو شروع ہی سے بصیرت حق اور رشد و ہدایت سے نوازا تھا اور انہیں یہ یقین تھا کہ یہ بت نہ سن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ کسی کی پکار کا جواب دے سکتے ہیں اور نہ نفع نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ لکڑی کے دیگر کھلونوں اور ان بتوں میں کوئی فرق نہیں۔

"اور بلاشبہ ہم نے ابراہیم کو اول ہی سے رشد و ہدایت عطا کی تھی۔"

ان بتوں کی کم وقعتی کا ان سے بڑا شاہد کون ہو سکتا تھا۔ وہ صبح شام اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ ان بے جان مورتیوں کو میرا باپ اپنے ہاتھوں سے بناتا ہے، جس طرح اس کا جی چاہتا ہے ان کی آنکھ، کان ہاتھ اور جسم تراشتا ہے۔ وہ سوچا کرتے تھے یہ کیسا خدا ہے جو بیچا اور خریدا جا سکتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کوئی عام بچے نہیں تھے جو ایسی باتیں نہ سوچتے۔ انہیں بابل، شام اور مصر میں آباد سامیہ قبائل کی اصلاح کے لیے بھیجا جانا تھا۔ اس کے آثار بچپن ہی سے ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔

ان کی قوم بت پرستی کے ساتھ ساتھ "کواکب یعنی ستارہ پرستی" میں بھی مبتلا تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ انسانوں کی موت و حیات، ان کا رزق، ان کا نفع و ضرر، خشک سالی، فتح و شکست، غرض کارخانہ عالم کا نظم و نسق کواکب اور ان کی حرکات کی تاثیر پر چل رہا ہے۔ اس لیے ان کی خوشنودی اور ان کی پرستش ضروری ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اس عقیدے کو بھی شک کی نظروں سے دیکھتے تھے لیکن ابھی ان کے پاس واضح دلائل نہیں تھے۔ اللہ کی طرف سے کوئی ہدایت ابھی نہیں پہنچی تھی۔ بعثت کا مرحلہ ابھی کچھ فاصلے پر تھا۔ ابھی تو زمین ہموار کی جارہی تھی۔ سن شعور تک پہنچنے کا انتظار تھا۔

☆☆☆

آذر بسترِ علالت پر تھا۔ بہت سے بت تیار رکھے تھے جنہیں بازار لے جا کر بیچنا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بہت دن ہوئے تھے باپ کے ساتھ بازار جانا چھوڑ دیا تھا لیکن آج جب آذر نے انہیں مجبور کیا اور ماں نے بھی ضد کی تو حیرت انگیز طور پر آپؑ ان بتوں کو بازار لے جا کر بیچنے پر تیار ہو گئے۔ شاید انہوں نے اپنے دل میں کچھ اور سوچا تھا۔

قصبہ ''اور'' کے بڑے بازار میں آج بڑی رونق تھی۔ شاید کوئی تہوار تھا۔ بعض چلنے پھرنے والے لوگ بڑی شدت سے آذر بت تراش کو یاد کررہے تھے۔ ایسے موقعوں پر وہ سب سے آگے نظر آتا تھا۔ وہ ماہر بت تراش تھا۔ لوگ بڑی دور دور سے اس کے بنائے ہوئے بت خریدنے آتے تھے۔ آج بھی اس کی تلاش ہورہی تھی۔

اتنی دیر میں ایک آواز گونجی۔ ''ہے کوئی ایسا خریدار جوان بتوں کو خریدے جو نہ سن سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں۔ نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔''

جب یہ آواز بار بار سنائی دی تو لوگ اس طرف متوجہ ہوئے۔ اس بازار میں آج تک کسی نے اس طرح سودا نہیں بیچا تھا بلکہ سچی بات تو یہ تھی کہ کوئی دیوانہ ہی اس طرح اپنی چیزیں فروخت کرتا ہوگا۔ لوگ اس آواز کے پیچھے دوڑے اور ذرا سی دیر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو گھیر لیا۔ آپؑ نے لوگوں کو جمع ہوتے دیکھ کر اور زور زور سے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ ''ہے کوئی ایسا خریدار......''

''ارے یہ تو آذر کا بیٹا ہے۔'' ایک شخص نے انہیں پہچانتے ہوئے دوسروں کو باخبر کیا۔

''اس کا بیٹا ہوگا لیکن یہ کس انداز میں سودا بیچ رہا ہے۔ اس کا باپ تو ایسا نہیں ہے۔''

''یہ تو ہمارے خداؤں کی صاف صاف توہین کررہا ہے۔''

''اس کا باپ تو نہایت نیک ہے، کس عقیدت سے بت بناتا ہے اور کس محبت سے ہمیں بیچتا ہے۔''

''اس سے ذرا پوچھو تو۔ اسے یہ جرأت کیسے ہوئی، اس کا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔''

آپؑ نے اپنے گرد باتیں ہوتی دیکھیں تو خاموشی اختیار کر لی۔ انہیں دیکھنا تھا کہ لوگ کس قسم کے ردِعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ انہیں خاموش دیکھ کر ایک شخص آگے بڑھا اور ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''ذرا ایک مرتبہ پھر کہنا ابھی تم کیا کہہ رہے تھے؟''

''میں کیا غلط کہہ رہا تھا۔ یہ بت جو میرا باپ اپنے ہاتھ سے بناتا ہے، تمہیں کوئی فائدہ یا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟''

''تو کیا جانے ان سے ہمیں کیا کیا فائدے پہنچتے ہیں۔ ہماری خوش حالی انہی کے دم سے ہے۔ آج تک ہم سے کسی نے یہ سوال نہیں کیا۔''

''اور تو ہمیں سمجھانے چلا ہے۔'' ایک اور شخص نے کہا۔

''آپ لوگ کتنے نادان ہیں۔ بھلا خدا کو بھی کوئی بنا سکتا ہے؟''

''تیرا باپ بناتا ہے، کیا اسے بھی یہ بات معلوم نہیں؟''

''اس کا تو میں نہیں کہتا لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم ان کی پرستش کر کے غلطی کرتے ہو۔''

''ہمیں بھی اتنی بات معلوم ہے کہ ہمارے باپ دادا ان کی پرستش کرتے چلے آرہے ہیں اور ہم بھی وہی کررہے ہیں۔''

''آپ لوگ مجھ سے یہ کیوں چاہتے ہیں کہ میں بھی اسی غلطی کو دہراؤں؟''

''اچھا صاحب زادے، اب تم بتادو کہ ہمیں کس کی پرستش کرنی چاہیے؟''

''ایک خدا کی جس نے مجھے اور تمہیں بنایا ہے۔''

''وہ رہتا کہاں ہے تاکہ ہم اس سے جا کر ملیں؟''

''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم لیکن وہ ہے ضرور اور ہمیں بغیر دیکھے اسے ماننا چاہیے۔''

کئی قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس لڑکے کا دماغ چل گیا ہے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے سنے گئے کہ آذر سے اس کی شکایت کی جائے اور اس سے کہا جائے کہ اس لڑکے کو باز رہنے بھیجا کرے۔ یہ ہمارے بتوں کی توہین کرتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ بحث چھیڑ کر خود بھی تذبذب میں پڑ گئے تھے۔ ان کے پاس اس سے زیادہ دلائل نہیں تھے جو وہ دے چکے تھے۔ ابھی لڑکپن تھا۔ خدا کے خاص کرم سے یہ احساس تو ان میں بیدار ہو گیا تھا کہ ان کی قوم جن رسوم میں گھری ہوئی ہے وہ غلط ہیں لیکن صحیح کیا ہے اس کے بارے میں ان کا ذہن صاف نہیں تھا۔ ابھی نبوت نہیں ملی تھی۔ یہ ان کی صالح طبیعت تھی جو انہیں قوم سے الجھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ لوگوں نے بھی شاید نادان سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔

اس واقعے نے انہیں کچھ سوچنے بلکہ سوچتے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ قوم کے نظریات باطل ہیں یا درست؟ غور کرنا ضروری تھا تاکہ کسی نتیجے پر پہنچ کر قوم کے سامنے اپنے دلائل رکھ سکیں اور انہیں حقائق سے آگاہ کر سکیں۔ اب وہ ہر وقت غور و فکر میں ڈوبے ہوئے نظر آتے تھے۔ آذر ان کی طرف سے فکرمند رہنے لگے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے بیٹے کو کسی بیماری نے آن دبوچا ہے۔

''بیٹے، تو میرے بتوں کو برا کہتا رہتا ہے۔ وہ تجھ سے ناراض رہنے لگے ہیں۔ میرے ساتھ عبادت خانے میں چل کر بڑے بت سے معافی مانگ لے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کسی صورت تیار نہ ہوئے۔ آذر کہتے کہتے تھک گئے تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ خاندان اور قبیلے کے دوسرے لوگ بھی ان کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔

وقت گزرتا رہا۔ اب آپ لڑکپن سے جوانی کی منزل کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔

گرمیوں کی رات تھی۔ آپ کوٹھے پر پلنگ بچھائے لیٹے تھے اور حسبِ دستور قوم کی حالتِ زار پر غور کر رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک نادیدہ ہستی سے دعا بھی کرتے جا رہے تھے کہ وہ ان پر حقیقت ظاہر کر دے۔ ایسے مشاہدوں سے فیض یاب کر دے کہ انہیں یقینِ کامل ہو جائے۔ صحیح کیا ہے، غلط کیا ہے یہ راز ان پر کھل جائے۔

آسمان پر نظر گئی تو آسمان کا تھال ستاروں کے موتیوں سے بھرا ہوا نظر آیا۔ ایک ستارہ خوب روشن تھا۔ آپ نے اس کو دیکھ کر فرمایا۔ ''کیا یہ میرا رب ہے؟'' اس لیے کہ اگر ستارے ربوبیت کر سکتے ہیں تو یہ ان سب میں ممتاز اور روشن ہے۔

کچھ دیر آپ اس پر نظریں جمائے رہے لیکن جب وہ اپنے مقررہ وقت پر نظر سے اوجھل ہو گیا اور اس کو یہ مجال نہ ہوئی کہ اپنے پرستاروں کے لیے ایک گھڑی اور رونمائی کرا سکتا اور اپنے پوجنے والوں کے لیے زیارت گاہ بنا رہتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔

''میں چھپ جانے والے کو پسند نہیں کرتا۔''

کچھ دیر آپ اس ستارے کے ڈوب جانے پر خود سے بحث کرتے رہے۔ جس شے پر مجھ سے بھی زیادہ تغیرات کا اثر پڑتا ہو اور جو جلد جلد ان اثرات کو قبول کر لیتا ہو وہ میرا معبود کیونکر ہو سکتا ہے۔

ابھی آپ انہی خیالوں میں غلطاں تھے کہ کیا دیکھتے ہیں چاند آب و تاب کے ساتھ سامنے موجود ہے۔ اس روشن ستارے سے کہیں زیادہ روشن۔ اسے دیکھ کر فرمایا۔ ''یہ میرا رب ہے؟ اس لیے کہ یہ خوب روشن ہے۔ اس کی روشنی نے تاریکی کو دور کر دیا ہے۔ اگر کوا کب کو رب بنانا ہی ہے تو اسی کو کیوں نہ بنایا جائے کیونکہ یہی اس کا زیادہ مستحق ہے۔''

یہ کیا......! رات ڈھلی اور سحر کا وقت ہونے لگا تو ساری بساط الٹ گئی۔ آسمان کے تھال میں تارے تھے نہ چاند۔ سب نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ڈوبنے والے پروردگار کیسے ہو سکتے ہیں؟ اب آفتاب عالم تاب کا رخ روشن سامنے آیا۔ دن نکل آیا اور وہ پوری آب و تاب کے ساتھ چمکنے لگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ ''شاید یہ میرا رب ہو کیونکہ نظامِ فلکی میں اس سے بڑا ستارہ اور کوئی نہیں۔''

دن بھر آپ اسی خیال پر قائم رہے لیکن دن بھر چمکنے اور روشن رہنے کے بعد وقتِ مقررہ پر اس نے بھی عرب کی سرزمین سے پہلو بچانا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سورج کی روشنی پر اندھیرا غالب آنے لگا۔

''کوئی چراغ جلاؤ بڑا اندھیرا ہے۔''

ڈوبنے نکلنے کا یہ کھیل کئی سوال سامنے لے آیا۔ اگر ان کواکب کو ربوبیت اور معبودیت حاصل ہے تو اس کی کیا وجہ ہے

کہ ہم سے بھی زیادہ ان میں تغیرات نمایاں ہیں؟ اگر یہ معبود ہیں تو چمک کر ڈوب کیوں جاتے ہیں؟ چھوٹے ستاروں کی روشنی کو ماہتاب نے کیوں ماند کر دیا اور ماہتاب کے نور کو آفتاب کے نور نے کیوں بے نور کر دیا؟ اگر یہ معبود ہیں تو ایک غالب دوسرا مغلوب کیوں ہو جاتا ہے؟

ہر چیز کو اپنے وقت پر موت آجاتی ہے۔ جس کو موت آجائے وہ پروردگار کیسے ہو سکتا ہے۔ آپؑ پکار اٹھے۔ ''پروردگار یہ چاند ستارے نہیں بلکہ وہ ہستی ہے جس کے حکم سے یہ ڈوبتے اور طلوع ہوتے ہیں۔ جو لوگ خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں میں ان سے بے زار ہوں۔ بلاشبہ میں نے اپنا رخ صرف اسی ایک خدا کی جانب کر لیا ہے جو زمینوں اور آسمانوں کا خالق ہے۔''

پھر یہ ہوا کہ آپ کا سینۂ مبارک ہدایت کے نور سے بھر گیا۔ خداوند تعالیٰ نے روزِ اول ہی سے آپؑ کو رشد و ہدایت کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ آپ کے یقین کو یقین کامل میں بدلنے کے لیے آپؑ پر مشاہدات کے دروازے کھول دیے۔

اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔ ''اے میرے رب مجھے دکھا دے کہ تو کس طرح مردے زندہ کرتا ہے۔ فرمایا کیا تیرا ایمان نہیں۔ بولے کیوں نہیں لیکن میں اپنے دل کے اطمینان کے لیے چاہتا ہوں۔ فرمایا اچھا تو چار پرندے لے لے پھر انہیں اپنی طرف بلا۔ لے پھر ان میں سے ہر پہاڑ پر ان کا ایک پارچہ رکھ پھر انہیں بلا۔ وہ تیری طرف دوڑ کر آئیں گے اور یقین رکھ کہ اللہ بڑی عزت والا اور بڑی حکمت والا ہے۔''

یقین کے یقین کامل میں بدلتے ہی وہ دعوتِ حق کے لیے مضطرب ہو گئے۔ آپؑ کو حکم ہوا کہ انھیں اور لوگوں کو توحید کا پیغام پہنچائیں۔ آپؑ عرب کی سرزمین پر اکیلے مسلمان تھے۔ نہ کوئی ساتھی تھا نہ سہارا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مشرکوں کی بھیڑ میں کس کس کو پکاریں اور کس طرح پکاریں۔ بہت غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ شرک کا سب سے بڑا مرکز تو خود ان کا اپنا گھر ہے۔ بت یہیں بنتے ہیں، شرک یہیں سے پھیلتا ہے۔

آزر اس وقت بھی بت بنانے میں مشغول تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے سامنے پہنچ گئے۔ معاملہ باپ کا تھا جن کا آپ بے حد ادب کرتے تھے۔ بات کا کہاں سے آغاز کریں سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ ہزار سال قبل مسیح کے معاشرے میں جو بات وہ کہنے جا رہے تھے وہ تھی بھی اتنی انوکھی اور نئی کہ انہیں اس کے ردعمل کا اندازہ تھا لیکن تھی بھی اتنی ضروری کہ اسے ٹالا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ آپؑ سچے پیغمبر تھے اور پیغمبر کا فرض ہوتا ہے کہ وہ دعوتِ حق دے۔ اس کے بعد کوئی نہ مانے تو یہ اس کی ذمے داری نہیں۔

آپؑ کو یوں مضطرب ٹہلتے ہوئے دیکھ کر آزر نے خود آپؑ سے پوچھا۔

''اے ابراہیم! تجھے میرے دیوتا اپنی پناہ میں رکھیں۔ اتنا پریشان کیوں ہے؟''

''مجھے دیوتاؤں کی نہیں اس کی پناہ کی ضرورت ہے جو رحمٰن و رحیم ہے۔ جس نے مجھے بھی بنایا ہے اور تجھے بھی۔ جس کے حکم پر یہ کائنات چلتی ہے۔''

''مجھے شک تھا کہ تیرا دماغی توازن ٹھیک نہیں۔ اب جو تو ایسی انوکھی باتیں کر رہا ہے تو میرا شک یقین میں بدلتا جا رہا ہے۔''

''دماغی توازن تو ان لوگوں کا بگڑ گیا ہے جو ایک خدا کو چھوڑ کر ہاتھ کے بنے ہوئے بتوں کی پوجا کرتے ہیں اور افسوس تو یہ ہے کہ ان میں آپ بھی شامل ہیں۔''

''میرے دیوتا تجھ سے ضرور ناراض ہیں جو تو سیدھے راستے سے بھٹک گیا ہے۔''

''بھٹکے ہوئے تو آپ ہیں جو باطل پرستی کو صراطِ مستقیم کہتے ہیں۔ حق صرف وہ ہے جس کی دعوت میں اب دے رہا ہوں۔ توحید ہی سرچشمۂ نجات ہے نہ کہ تیرے ہاتھ کے بنائے ہوئے ان بتوں کی پرستش و عبادت۔''

''میں نے تیری باتیں بہت سن لیں۔ اب اگر ان بتوں کی شان میں ایک لفظ بھی کہا تو اچھا نہیں ہوگا۔''

باپ کے تیور بدلتے ہوئے دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کی اور سمجھانے کے انداز میں کہنے لگے۔

''اے میرے باپ! تو کیوں ایک ایسی چیز کی پوجا کرتا ہے جو نہ سنتی ہے نہ دیکھتی ہے۔ نہ تیرے کسی کام آسکتی ہے۔ میں سچ کہتا ہوں، علم کی ایک روشنی مجھے مل گئی ہے جو تجھے نہیں ملی۔ پس میرے پیچھے چل۔ میں تجھے سیدھی راہ دکھاؤں گا۔ اے میرے باپ! شیطان کی بندگی نہ کر۔ شیطان تو خدائے رحمٰن سے نافرمان ہو چکا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو خدائے

رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب تجھے گھیرے اور تو شیطان کا ساتھی ہو جائے۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ باتیں اتنی دردمندی سے کہی تھیں کہ ان کے موثر ہونے کا آپ کو یقین تھا لیکن شرک پرستی کا رنگ اتنا گہرا چڑھ چکا تھا کہ آذر پر اس نصیحت کا مطلق اثر نہ ہوا۔

"ابراہیم! کیا تو میرے دین سے پھر گیا ہے؟"

"اے ابا! میں پھر کہتا ہوں وہ راستہ جسے آپ آباؤ اجداد کا قدیم راستہ بتاتے ہیں گمراہی کا گڑھا ہے جس میں آپ ایک دن گر کر رہیں گے۔"

"اے ابراہیم! میں بھی تجھ سے کہتا ہوں اگر تو ایسی باتوں سے باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا۔ تیری جان کی سلامتی اسی میں ہے کہ تو مجھ سے الگ ہو جا۔"

ایک طرف باپ کا احترام تھا تو دوسری جانب ادائے فرض، حمایتِ حق اور اطاعت امرالٰہی کا سوال تھا۔ آخر آپ نے وہی کیا جو ایسے برگزیدہ انسان اور اللہ کے جلیل القدر پیغمبر کے شایانِ شان تھا۔ باپ کی سختی کا جواب سختی سے نہیں دیا بلکہ نرمی اور اخلاقِ کریمانہ کے ساتھ یہ جواب دیا۔

"اے باپ! اگر میری بابت کا یہی جواب ہے اور آپ یہی چاہتے ہیں تو آج میرا آپ کو سلام۔ میں آپ لوگوں سے اور جن کی آپ عبادت کرتے ہیں سب سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہوں۔ میں آپ کے لیے اپنے پروردگار سے بخشش کی دعا کروں گا۔ وہ مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔

"میں اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں، امید ہے اپنے پروردگار کو پکار کے محروم ثابت نہیں ہوں گا۔"

سورۂ مریم میں اس واقعے کو اس طرح بیان کیا گیا۔

"اس نے اپنے باپ سے کہا، اے میرے باپ! تو کیوں ایک ایسی چیز کی پوجا کرتا ہے جو نہ سنتی ہے نہ دیکھتی ہے، نہ تیرے کسی کام آسکتی ہے۔ اے میرے باپ! میں سچ کہتا ہوں علم کی ایک روشنی مجھے مل گئی ہے جو تجھے نہیں ملی۔ پس میرے پیچھے چل، میں تجھے سیدھی راہ دکھاؤں گا۔ اے میرے باپ! شیطان کی بندگی نہ کر۔ شیطان تو خدائے رحمٰن سے نافرمان ہو چکا ہے۔ اے میرے باپ میں ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو خدائے رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب تجھے گھیرے اور تو شیطان کا ساتھی ہو جائے۔" باپ نے کہا۔

"ابراہیم تو میرے معبود سے پھر گیا ہے؟ یاد رکھ اگر تو ایسی باتوں سے باز نہ آیا تو تجھے سنگسار کر کے چھوڑ دوں گا۔ اپنی خیر چاہتا ہے تو جان سلامت لے کر مجھ سے الگ ہو جا۔" ابراہیم نے کہا۔

"اچھا میرا سلام قبول ہو۔ اب میں پروردگار سے تیری بخشش کی دعا کروں گا۔ وہ مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے میں نے تم سب کو چھوڑا اور انہیں بھی جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ میں اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں۔ امید ہے اپنے پروردگار کو پکار کے میں محروم ثابت نہیں ہوں گا۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا فرض پورا کر دیا تھا۔ باپ کے احترام کا بھی پورا خیال رکھ چکے تھے۔ باپ کی خوشنودی کا خیال رکھتے ہوئے باپ سے علیحدگی بھی اختیار کر لی اور اپنی دعوتِ حق اور پیغامِ رسالت کو وسیع کر دیا۔ اب صرف آذر ہی مخاطب نہ رہا بلکہ پوری قوم سے خطاب کرنا تھا۔

یہ معاشرہ کفر و ضلالت سے آباد تھا۔ حضرت صالح علیہ السلام کے بعد سے کوئی نبی نہیں آیا تھا لہٰذا قوم شترِ بے مہار کی طرح دوڑ رہی تھی۔ عراق و بابل کا تو برا حال تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایسی بے سمت قوم کو راہِ راست دکھانی تھی۔

آپ بازاروں میں گھوم پھر کر لوگوں کو توحید کی دعوت دینے لگے۔

"خدا کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو، اگر تم سمجھ رکھتے ہو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ تم خدا کو چھوڑ کر بتوں کو پوجتے ہو اور جھوٹ کا طوفان باندھتے ہو۔ تو جن لوگوں کو خدا کے سوا تم پوجتے ہو وہ تم کو رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ پس خدا کے ہاں سے رزق طلب کرو اور اسی کی عبادت کرو۔"

"تم خدا کو چھوڑ کر بتوں کو دنیاوی زندگی میں باہمی دوستی کے لیے لے بیٹھے ہو پھر قیامت کے دن ایک دوسرے سے انکار کر دو گے اور ایک دوسرے پر لعن طعن کرو گے اور تمہارا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور تمہارے لیے کوئی مددگار نہ ہوگا۔"

جب اس تبلیغ کو بہت دن گزر گئے اور قوم کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ وہ آپ کا مذاق اڑاتے رہے۔ ان کے پاس دلیل تو کوئی تھی نہیں بس یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیتے تھے کہ ہمارے باپ دادا یہی کرتے چلے آئے ہیں لہٰذا ہم بھی وہی کر رہے ہیں۔

آپؑ نے فرمایا۔ ''اگر تم یہ کہتے ہو تو میں یہ کہتا ہوں تمہارے باپ دادا بھی غلطی پر تھے، تم بھی غلط کر رہے ہو۔''

قوم کہنے لگی۔ ''ابراہیم! اگر یہ غضب ناک ہو گئے تو تمہیں تباہ کر دیں گے۔''

آپؑ نے اعلانیہ کہا۔ ''میں تمہارے ان سب بتوں کو اپنا دشمن جانتا ہوں اور ان سے اعلانِ جنگ کرتا ہوں۔ اگر یہ میرا کچھ بگاڑ سکتے ہیں تو اپنی حسرت نکال لیں۔''

''تو پھر اپنی بربادی کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

''میں صرف اس ہستی کو اپنا مالک سمجھتا ہوں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک اور موقع پر فرمایا۔ ''کیا تم مجھ سے جھگڑتے ہو اور اپنے بتوں سے مجھ کو ڈراتے ہو حالانکہ خدائے تعالیٰ نے مجھ کو صحیح راہ دکھا دی ہے اور تمہارے پاس گمراہی کے سوا کچھ نہیں۔ مجھے تمہارے بتوں کی مطلق پروا نہیں جو کچھ میرا رب چاہے گا وہی ہوگا۔ تمہارے بت کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ کیا تمہیں ان باتوں سے کوئی نصیحت حاصل نہیں ہوتی۔ تم کو تو خدا کی نافرمانی کرنے اور اس کے ساتھ بتوں کو شریک ٹھہرانے میں بھی کوئی خوف نہیں آتا جس کے لیے تمہارے پاس ایک بھی دلیل نہیں اور مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ خدائے واحد کا ماننے والا اور امنِ عالم کا ذمے دار ہو کر میں تمہارے بتوں سے ڈر جاؤں گا۔ کاش تم سمجھتے کہ کون مفسد ہے اور کون مصلح و امن پسند۔''

ایک عرصہ گزر گیا۔ آپؑ نے ہر دلیل استعمال کر کے دیکھ لی مگر قوم اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔ وہ اپنے بے جان معبودوں کی طرح اندھے، گونگے اور بہرے بن گئے۔

اتنی کوششوں کے بعد صرف دو نفوس تھے جو آپؑ پر ایمان لائے۔ ایک آپؑ کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام اور دوسری آپؑ کی زوجہ حضرت سارہ۔

جب آپؑ نے اپنی قوم پر ہر طرح بت پرستی کے مصائب ظاہر کر کے اسے باز رکھنے کی سعی کر لی اور ہر قسم کے پند و نصائح کے ذریعے ان کو یہ باور کرانے میں قوت صرف کر دی کہ یہ بت نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان اور یہ کہ تمہارے کاہنوں اور پیشواؤں نے ان کے متعلق تمہارے دلوں میں غلط خوف بٹھا دیا ہے کہ اگر ان سے منکر ہو جاؤ گے تو یہ غضب ناک ہو کر تم کو تباہ کر ڈالیں گے۔ یہ تو اپنی آئی ہوئی مصیبت کو بھی نہیں ٹال سکتے۔ لیکن آذر اور قوم کے دلوں پر مطلق اثر نہ ہوا اور وہ اپنے دیوتاؤں کی خدائی قوت کے عقیدے سے کسی طرح باز نہ آئے بلکہ کاہنوں اور سرداروں نے ان کو اور زیادہ پختہ کر دیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نصیحت پر کان دھرنے سے سختی کے ساتھ روک دیا اور آپؑ سے بچ بچ کر گزرنے لگے تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوچا کہ اب مجھ کو رشد و ہدایت کا ایسا پہلو اختیار کرنا چاہیے جس سے قوم کو یہ مشاہدہ ہو جائے کہ واقعی ہمارے دیوتا صرف لکڑی اور پتھروں کی مورتیاں ہیں جو گونگی بھی ہیں، بہری اور اندھی بھی۔ انہیں یہ یقین ہو جائے کہ ان کے کاہن غلط کہتے ہیں اور ایسی کوئی صورت نکل آئے کہ تبلیغِ حق کے لیے آسانی ہو جائے۔

آپؑ دل ہی دل میں ایک منصوبہ تیار کرنے لگے۔ اسے آپؑ نے کسی پر ظاہر نہیں کیا حتیٰ کہ اپنی زوجہ اور حضرت لوط علیہ السلام کو بھی اس کی ہوا نہیں لگنے دی (حضرت لوط علیہ السلام ابھی نبی قرار نہیں پائے تھے۔ عظمت صرف اتنی تھی کہ آپؑ کے بھتیجے تھے اور ایمان لے آئے تھے)

ایک روز جب قوم کے لوگ آپؑ سے جھگڑ رہے تھے، آپؑ نے باتوں باتوں میں کہہ دیا۔ ''میں تمہارے بتوں کے ساتھ ایک خفیہ چال چلوں گا۔'' یہ جملہ آپؑ کو کہنا نہیں چاہیے تھا لیکن کہہ گزرے۔ وہ تو شکر ہوا کچھ نے سنا کچھ نے نہیں سنا۔ پھر یہ کہ مفہوم بھی واضح نہیں تھا اس لیے کسی نے توجہ نہیں دی اور بات آئی گئی ہو گئی۔

اس قوم کا سال میں ایک مرتبہ ایک خاص تہوار ہوا کرتا تھا۔ شہر سے باہر میلا لگا کرتا تھا۔ اس میں شرکت کے لیے تمام لوگ باہر چلے جایا کرتے تھے۔ پورا شہر تقریباً خالی ہو جاتا تھا۔ صرف بوڑھے یا چند بیمار رہ جاتے تھے جو اپنے گھروں میں پڑے رہتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے اسی تہوار کے انتظار میں تھے۔

کئی مہینوں کے انتظار کے بعد یہ تہوار آ گیا۔ پوری قوم ڈھول تاشے بجاتی ہوئی شہر سے باہر جا رہی تھی۔ لوگوں نے آپؑ

سے بھی چلنے کے لیے اصرار کیا۔ آپؑ نے ستاروں کی جانب نگاہ اٹھائی اور انکار کر دیا۔ لوگوں نے بھی زیادہ اصرار مناسب نہ سمجھا کیونکہ وہ آپؑ کے عقائد سے واقف تھے۔

لوگ آپؑ کو چھوڑ کر میلے میں چلے گئے۔

شہر میں سناٹا تھا جیسے سب کو موت آ گئی ہو۔ اکا دکا گھروں سے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آپؑ نے گھر کا چراغ گل کیا اور باہر نکل آئے۔ چلتے چلتے بڑے دیوتا کے ہیکل (مندر) میں پہنچے۔ یہاں کی تو دنیا ہی انوکھی تھی۔ سب مردہ تھے لیکن اہتمام زندوں والے تھے، قسم قسم کے حلووں، پھلوں، میووں اور مٹھائیوں کے چڑھاوے رکھے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان مورتیوں کے پاس پہنچے۔

''یہ سب کچھ موجود ہے، ان کو کھاتے کیوں نہیں؟''

ایک بت کے کان میں کہا۔ ''میں بات کر رہا ہوں کیا بات ہے تم جواب نہیں دیتے؟''

جب ان بتوں کا خوب مذاق اڑا چکے تو ساتھ لائی ہوئی کلہاڑی سے انہیں توڑ پھوڑ ڈالا۔ کچھ ہی دیر میں کسی کے کان نہیں تھے، کسی کی ناک ٹوٹی ہوئی تھی۔ کسی کا سر قلم کر دیا گیا تھا تو کسی کے ہاتھ غائب تھے۔ صرف بڑا دیوتا تھا جو ابھی تک سلامت تھا' وہ آپؑ کی کلہاڑی سے محفوظ رہا تھا۔ آپؑ نے کلہاڑی اس کے کندھے پر رکھی اور مندر سے باہر نکل آئے۔

دوسرے دن لوگ میلے سے واپس آئے اور رسمیں ادا کرنے کے لیے مندر میں آئے تو بتوں کا حال دیکھ کر ہوش اڑ گئے۔ اسی وقت یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ یہ اندازے بھی لگائے جانے لگے کہ یہ حرکت کس نے کی ہوگی۔ ایک شخص کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ جملہ یاد آ گیا۔ ''میں تمہارے بتوں کے ساتھ خفیہ چال چلوں گا۔''

کئی مہینے گزر گئے تھے۔ لوگ اس جملے کو بھول بھی گئے تھے لیکن اس شخص کی یادداشت نے ساتھ دیا۔

''ان عزائم کا اظہار ابراہیم (علیہ السلام) نے کیا تھا۔ یقیناً اسی نے ہمارے دیوتاؤں کا یہ حال کیا ہوگا۔''

ایک دوسرا شخص بولا۔ ''اب سمجھ میں آیا وہ ہمارے ساتھ میلے میں کیوں نہیں گیا تھا۔ وہ اکیلے رہ کر یہ کارروائی کرنا چاہتا ہوگا اور کر گزرا۔''

''اس سے یہ حرکت بعید نہیں کیونکہ وہ ہمارے عقیدے کے خلاف ہے۔''

''اسے فوراً پکڑ کر لاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بھاگ جائے۔''

''اسے اس کی سزا ملنی چاہیے۔''

قرآن کہتا ہے۔

''وہ کہنے لگے یہ معاملہ ہمارے خداؤں کے ساتھ کس نے کیا ہے۔ بلاشبہ وہ ضرور ظالم ہے۔ ان میں سے بعض کہنے لگے۔ ہم نے ایک جوان کی زبان سے ان بتوں کا (برائی کے ساتھ) ذکر سنا ہے۔ اس کو ابراہیم کہا جاتا ہے (یعنی یہ اس کا کام ہے) کاہنوں اور سرداروں نے جب یہ سنا تو غصے سے سرخ ہو گئے اور کہنے لگے اس کو مجمع کے سامنے پکڑ کر لاؤ تاکہ سب دیکھیں کہ مجرم کون شخص ہے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کیوں بھاگنے لگے تھے۔ انہوں نے تو بہت سوچ سمجھ کر یہ کام کیا تھا۔ وہ تو چاہتے ہی یہ تھے کہ ان کے بتوں پر زوال آئے تو یا تو خود انہیں نصیحت ہو جائے کہ اگر یہ بت خدا ہوتے تو انہیں کون توڑ پھوڑ سکتا تھا اور اگر ایسا ہو بھی گیا تھا تو وہ اپنی زبان سے کچھ بتاتے تو سہی۔ مگر وہ نہ کچھ بتا سکتے ہیں نہ اپنی حفاظت کر سکتے ہیں، پھر یہ کیسے خدا ہیں۔

اگر ان ظالموں کو نصیحت نہیں ہوئی تو انہیں شرمندہ کرنے کا اچھا موقع مل جائے گا۔ دلیل سامنے ہوگی۔ بت گرے پڑے ہوں گے اور وہ یہ بتانے کے قابل بھی نہیں ہوں گے کہ ان کا یہ حشر کس نے کیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت سارہ کے پاس بیٹھے یہی باتیں کر رہے تھے کہ چند نوجوان آپؑ کو ڈھونڈتے ہوئے آئے۔ موقع نازک تھا لیکن ایمان اتنا پختہ تھا کہ بے خوف و خطر باہر نکل آئے۔

''اے ابراہیم! ہمارے ساتھ چل۔ ہم تجھے قوم کے سامنے رسوا کریں گے۔ تُو نے ہمارے بتوں کو رسوا کیا ہے۔''

''وہ تو دیوتا ہیں انہیں رسوا کون کر سکتا ہے؟''

''ہمارے ساتھ ہنسی مذاق مت کر۔ تجھے قوم کے سامنے جا کر وضاحت کرنی ہوگی۔''

''میں نے کب انکار کیا۔ میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔''
آپؑ مندر کے قریب پہنچے تو ہزاروں کا مجمع سامنے تھا۔ بڑا کاہن سامنے آیا اور بڑے طمطراق سے پوچھا۔
''ابراہیم! تو نے ہمارے بتوں کے ساتھ کیا کیا؟''
''یہ سب اس بڑے بت کی کارستانی ہے۔ دیکھ لو کلہاڑی اب تک اس کے کندھے پر رکھی ہے۔''
''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''
''اگر نہیں ہوسکتا تو خود اسی سے پوچھ لو۔ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اسے معلوم ہوگا بلکہ اس سے یہ بھی پوچھو کہ اس نے چھوٹے بتوں کو بچایا کیوں نہیں؟''
''تو کیوں ہمارے ساتھ مذاق کرتا ہے جبکہ تو خوب جانتا ہے کہ ان دیوتاؤں میں بولنے کی سکت نہیں ہے۔ یہ تو بے جان مورتیاں ہیں۔''
''یہی بات تو میں تم سے کہتا چلا آیا ہوں۔ تم اللہ کے سوا ان کی پرستش کیوں کرتے ہو جو تم کو کچھ بھی نفع نہیں پہنچا سکتے اور نہ نقصان دے سکتے ہیں۔ تف ہے تم پر اور ان پر جن کی تم خدا کے سوا عبادت کرتے ہو۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے؟''
اب ان کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ شرمندگی سے سر جھکائے کھڑے تھے۔ گویا اعتراف کرچکے تھے کہ ان کے عقیدے نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے شکست مان لی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے انہیں قبول کرنا پڑا تھا کہ ان کے دیوتا جواب دینے اور بولنے کی طاقت نہیں رکھتے چہ جائیکہ نفع نقصان کے مالک ہوں۔
ان کی خاموشی کو دیکھ کر آپؑ نے ایک مرتبہ پھر اپنی قوم کو مخاطب کیا۔
''جن بتوں کو ہاتھوں سے گھڑتے ہو انہی کو پھر پوجتے ہو۔ تم نے دیکھ لیا کہ ان بتوں سے میں نے اعلانِ جنگ کیا اور یہ مجھ سے بدلہ لینے کے لائق نہیں۔ جو اپنے دشمن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے وہ دوست کا خیال کیا رکھیں گے۔ اصل یہ ہے کہ تمہارا معبود برحق وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی نے تم کو پیدا کیا ہے۔ اور بے شک میں اس پر گواہوں میں سے ہوں۔''
یہ قوم بھی اپنے بتوں کی طرح گونگی اور بہری تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تمام قوم اپنے باطل عقیدوں سے توبہ کرلیتی لیکن دلوں کی کجی نے اس طرف آنے ہی نہیں دیا۔ ایمان لانے کے بجائے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے دشمنی کا نعرہ بلند کیا اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ اس کو اس کی گستاخی پر سزا ملنی چاہیے۔
کاہنوں نے اعلان کیا کہ ابراہیم کو اس وقت چھوڑ دیا جائے لیکن ان پر نظر رکھی جائے۔ اتنے میں ہم سوچتے ہیں کہ ابراہیم کس سزا کا مستحق ہے۔

☆☆☆

روایات کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام اس نمرود کے دورِ حکومت میں پیدا ہوئے جو حضرت نوح علیہ السلام کے دوسرے بیٹے ''حام'' کی اولاد میں سے تھا۔ حام کی اولاد میں سے جس شخص نے سب سے پہلے حکومت کی بنیاد ڈالی اور دریائے دجلہ و فرات کے زیریں حصے پر بابل کا شہرۂ آفاق شہر آباد کیا تھا، اس کا نام کنعان تھا۔ اس بادشاہ نے اپنی سلطنت کو مستحکم بنانے کے لیے بابل شہر میں ایک اونچی شہر پناہ بنائی جس کے یکساں فاصلے پر ایک سو پھاٹک تھے۔ بیرونی حملہ آوروں سے بچاؤ کے لیے ڈھائی سو خوب صورت عظیم الشان برج تعمیر کیے گئے تھے جن پر شبانہ روز مسلح فوج پہرا دیتی تھی۔
کنعان کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا حاصد تخت نشیں ہوا۔ وہ اپنے دور کا ایسا زبردست بادشاہ تھا جس کے پاس اَن گنت دولت وحشمت اور لاؤ لشکر تھا۔ تاریخ میں یہ ظالم اور متکبر بادشاہ نمرود کے نام سے مشہور ہوا۔
یہ بادشاہ الوہیت کا دعویدار تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ خدا کی ذات اس کے جسم میں حلول کرکے زمین پر اتری ہے۔ وہ بے پناہ دولت وحشمت کے باعث خود کو خدا کہلوانے لگا۔ اس نے اپنی صورت کے بت بنا کر پرستش گاہیں تعمیر کیں جن میں لوگ اسے خدا مانتے ہوئے سجدہ کرتے تھے۔
یہی وہ نمرود تھا جس کے دربار تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شہرت پہنچی۔
بت پرستوں نے اس تک شہرت پہنچائی کہ ایک شخص ابراہیمؑ نے ہمارے اور اپنے باپ دادا کے دین سے بغاوت کردی ہے۔ وہ سرِعام دیوتاؤں کو برا بھلا کہتا پھرتا ہے۔ یہی نہیں اس مرتبہ تو اس نے حد ہی کردی۔ بت خانے میں گھس گیا اور وہاں رکھے

ہوئے تمام بت ریزہ ریزہ کر دیے۔ نمرود یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ سوچنے لگا اگر اس شخص کی پیغمبرانہ سرگرمیاں اسی طرح جاری رہیں تو یہ میری ربوبیت سے بھی سب کو برگشتہ کر دے گا اور باپ دادا کے مذہب کے ساتھ ساتھ میری سلطنت کے لیے بھی خطرہ بن جائے گا۔ اس فتنے کا ابتدا ہی میں سر کچل دینا چاہیے۔ اس نے آدمی دوڑا دیے کہ ابراہیم کو پکڑ کر ہمارے دربار میں لاؤ۔

یہ حکم نامہ پہنچا تو شہر میں خوشی کے شادیانے بج اٹھے۔ سب کو یقین تھا کہ اب حضرت ابراہیم علیہ السلام یا تو اپنے عقائد سے توبہ کر لیں گے یا نمرود انہیں قتل کرا دے گا۔ بہت سے کاہن مل کر آذر کے پاس گئے کہ وہ ایک مرتبہ پھر اپنے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کرے۔ آذر آخر باپ تھا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سمجھانے کے لیے ان کے گھر پہنچا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی باتوں پر عمل کرنے کے بجائے اسے ایک مرتبہ پھر دعوتِ حق دی۔

''ابا جان، مجھے ڈر ہے کہ قیامت کے روز آپ رسوا نہ ہوں۔ اگر آپ کو وہاں سزا ملی تو مجھے تکلیف ہوگی۔ اس لیے میں آپ سے کہتا ہوں باپ دادا کے باطل دین سے توبہ کر لیں اور اس خدائے واحد کی عبادت کریں جس کا پیغام بر میں بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

''کیا میرے باپ دادا سب غلطی پر تھے؟''

''ان تک وہ روشنی نہیں پہنچی ہوگی جو مجھ تک پہنچی ہے۔ آپ اس روشنی کو نہ مان کر گناہ گار نہ بنیں۔''

''اور کتنے لوگوں نے تیری بات مان لی؟ ایک یا دو؟''

''مجھے اس کی پروا نہیں کہ کون مانتا ہے کون نہیں۔ میں جو سچ ہے اسے بیان کرتا رہوں گا۔''

''تو بھی میری فکر چھوڑ دے۔ اپنی فکر کر۔ مجھے ڈر ہے نمرود تجھے قتل کرا دے گا۔ تو یہاں سے کہیں بھاگ جا یا نمرود کے دربار میں جا کر توبہ کر لے۔''

''اگر آپ مجھے یہ سمجھانے آئے تھے تو میرا غم نہ کریں۔ میرا اللہ میرے ساتھ ہے۔ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر کوئی مجھے بلانے آیا تو میں اس کے پاس ضرور جاؤں گا بلکہ مجھے پہلے ہی وہاں جانا چاہیے تھا کیونکہ میری تبلیغ کا وہ زیادہ حقدار ہے۔ وہ تو خود کو خدا کا پرستار نہیں، خدا کہلواتا ہے۔''

آذر انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا رہا لیکن آپؑ نے تہیہ کر لیا تھا کہ نمرود کے دربار میں ضرور جائیں گے۔

تاریخ میں ایک باب رقم ہونے کو تھا۔

نمرود کے سپاہی حضرت ابراہیم کو ڈھونڈتے ہوئے آئے اور آپؑ کے گھر پہنچ گئے۔ جب آپؑ کو گرفتار کر کے لے جایا جا رہا تھا تو ایک خلقت جمع تھی جس نے آپؑ کو دیکھ کر تالیاں بجائیں اور آپؑ کے خلاف نعرے بلند کیے۔ آپؑ ان کی قسمتوں پر افسوس کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔

سرکش بادشاہ آراستہ تخت پر بیٹھا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام قیدیوں کی طرح اس کے سامنے تھے۔ نمرود نے سر سے پاؤں تک آپؑ کو دیکھا اور پھر دربار میں اس کی آواز گونجی۔ دربار میں موجود کاہنوں اور دوسرے درباریوں نے جان لیا کہ اب ابراہیم کا وقت آخر آن پہنچا۔

''تو باپ دادا کے دین کی مخالفت کیوں کرتا ہے اور مجھے رب ماننے سے کیوں انکاری ہے؟''

''اس لیے کہ میں خدائے واحد کا پرستار ہوں۔ کسی کو اس کا شریک نہیں مانتا۔ تمام عالم اس کی مخلوق ہے۔ وہی ان سب کا خالق و مالک ہے۔ تو بھی اسی طرح کا انسان ہے جس طرح ہم انسان ہیں۔ پھر تو کیسے رب اور معبود ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ گونگے بہرے لکڑی اور پتھر کے بت کس طرح معبود ہو سکتے ہیں۔ میں صحیح راہ پر ہوں اور تم سب غلط راہ پر ہو اس لیے میں تبلیغِ حق کو کس طرح چھوڑ سکتا ہوں۔ تمہارے باپ دادا کے خود ساختہ دین کو کیسے اختیار کر سکتا ہوں؟''

''اس کا مطلب ہے تو یہ سمجھتا ہے کہ میرے علاوہ بھی کوئی رب ہے جس نے تجھے بہکا دیا ہے۔''

''بس وہی رب ہے اور اس نے مجھے بہکایا نہیں سیدھا راستہ دکھایا ہے۔''

''اے ابراہیم! اگر میرے علاوہ کوئی تیرا رب ہے تو اس کا ایسا وصف بیان کر کہ جس کی مجھ میں قدرت نہ ہو۔''

''میرا رب وہ ہے۔'' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ ''جس کے قبضہ قدرت میں موت و حیات ہے۔ وہی موت دیتا ہے اور وہی زندگی بخشتا ہے۔''

نمرود نے قہقہہ بلند کیا۔ ''موت وحیات تو میرے قبضۂ قدرت میں بھی ہے۔ تو دیکھنا چاہتا ہے تو ابھی دیکھ لے۔''
نمرود نے ایک بے قصور شخص کو بلوایا اور جلاد کو حکم دیا کہ اس کی گردن مار دو۔ نمرود کا حکم تھا۔ دیر کیسے لگتی۔ جلاد نے اسی وقت اس شخص کو قتل کر دیا۔
''تو نے دیکھ لیا، میں کس طرح زندگی کو موت میں بدل سکتا ہوں۔ اب دوسرا مظاہرہ بھی دیکھ۔''
نمرود نے داروغۂ جیل کو حکم دیا کہ کسی ایسے مجرم کو پیش کرو جسے موت کی سزا سنائی جا چکی ہو۔ داروغہ نے ایک ایسے شخص کو جیل سے نکال کر بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ جاؤ ہم نے تمہاری جان بخشی۔ تم موت کے منہ میں جارہے تھے ہم نے تمہیں حیات دی۔
پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جانب متوجہ ہو کر کہنے لگا۔ ''دیکھا میں بھی کس طرح زندگی بخشتا اور موت دیتا ہوں۔ تیرے خدا کی خصوصیت کیا رہی؟''
حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ نمرود یا تو موت وحیات کی اصل حقیقت سے نا آشنا ہے اور یا جمہور کو مغالطہ دینا چاہتا ہے کہ وہ اس فرق کو نہ سمجھ سکیں کہ زندگی بخشنا اس کا نام نہیں ہے بلکہ نیست سے ہست کرنے کا نام زندگی بخشنا ہے۔ کسی کو قتل یا پھانسی سے بچا لینا موت کا مالک ہونا نہیں ہے۔ موت کا مالک وہی ہے جو روحِ انسانی کو اس کے جسم سے نکال کر اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔
اس موضوع پر آپ بہت دیر تک گفتگو کر سکتے تھے لیکن آپ نے سوچا کہ اگر میں نے اس موقع پر موت وحیات کے دقیق فلسفے پر بحث شروع کر دی تو نمرود کا مقصد پورا ہو جائے گا اور وہ اصل معاملے کو الجھا دے گا اور اس طرح میرا ایک مقصد پورا نہ ہو سکے گا اور تبلیغِ حق کے سلسلے میں ہر محفل نمرود کو لاجواب کرنے کا موقع ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اس لیے آپ نے اس دلیل کو نظر انداز کر کے سمجھانے کا ایک دوسرا پیرایہ اختیار کیا اور ایسی دلیل پیش کی جس کا صبح وشام ہر شخص آنکھوں سے مشاہدہ کرتا اور بغیر کسی منطقی دلیل کے روز وشب کی زندگی میں اس سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ ''میں اس ہستی کو اللہ کہتا ہوں جو روزانہ سورج کو مشرق سے لاتا اور مغرب کی جانب لے جاتا ہے۔ پس اگر تو بھی اسی طرح خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کے خلاف سورج کو مغرب سے نکال اور مشرق میں غروب کر۔''
نمرود اس دلیل کو سن کر مبہوت ہو گیا اور بے بسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ وہ ایسا کرنے پر قادر ہے کیونکہ اول تو وہ ایسا کر نہیں سکتا تھا اور دوسرے یہ کہ اپنے ہم قوموں کی طرح وہ بھی سورج کو دیوتا کہتا تھا۔ اسے یہ جواب ضرور دینا پڑتا کہ یہ کیسا دیوتا ہے جو کسی کے کہنے سے اپنی سمت بدل سکتا ہے۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دلیل کا حاصل یہ تھا کہ میں ایک ایسی ہستی کو اللہ کہتا اور مانتا ہوں جس نے اس کائنات کو بنایا ہے اور اس کے لیے ایک نظام تخلیق کیا ہے۔ کوئی شے نہ وقتِ مقررہ سے پہلے اپنی جگہ سے ہٹ سکتی ہے اور نہ ادھر ادھر ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے طلوع وغروب کا بھی ایک نظام مقرر کر دیا ہے۔ پس اگر آفتاب لاکھ بار بھی چاہے تو وہ اس نظام سے باہر نکلنے پر قادر نہیں۔ ہاں اگر اللہ چاہے کیونکہ یہ اس کی قدرت ہے کہ جو چاہے کر گزرے۔
نمرود کے سامنے تین ہی صورتیں جواب دینے کی ہو سکتی تھیں۔ وہ یہ کہتا کہ یہ سارا نظام میں نے بنایا ہے اس لیے اسے بدلنے پر قدرت رکھتا ہوں لیکن وہ یہ کہہ نہیں سکتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ کائنات اس نے نہیں بنائی اور نہ وہ آفتاب کی حرکت پر قادر ہے۔
دوسری صورت یہ تھی کہ وہ کہتا کہ میں اس عالم کو کسی کی مخلوق نہیں مانتا اور آفتاب تو خود مستقل دیوتا ہے۔ اس نے یہ بھی نہیں کہا کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہی تو کہتے تھے کہ اگر آفتاب بذاتِ خود دیوتا ہے تو اس میں فنا اور تغیرات کے اثرات کیوں موجود ہیں؟ یہ وقتِ مقررہ پر غروب ہونے پر کیوں مجبور ہے؟
تیسری صورت یہ تھی کہ سورج کو مغرب سے نکال کر دکھا دیتا۔ یہ وہ کیسے کر سکتا تھا۔ جانتا تھا کہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے لاجواب ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔
قرآن نے سورۂ بقرہ میں فرمایا۔
''کیا تو نے نہیں دیکھا اس شخص کا واقعہ جس کو اللہ نے بادشاہت بخشی تھی۔ اس نے کس طرح ابراہیم (علیہ السلام) سے اس کے پروردگار کے بارے میں مناظرہ کیا؟ جب کہا ابراہیمؑ نے میرا پروردگار تو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے' بادشاہ

نے کہا میں بھی زندگی بخشتا ہوں اور موت دیتا ہوں۔ ابراہیمؑ نے کہا بلاشبہ اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ پس تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا۔ بس وہ کافر مبہوت اور لاجواب ہو کر رہ گیا اور اللہ ظلم کرنے والوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امید تھی کہ نمرود میری باتوں سے لاجواب ہو گیا ہے۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں لہٰذا ایمان لائے بغیر اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں بچے گا۔ نمرود کی شرمندگی یہی بتا رہی تھی لیکن اس کی بے جا انا اس کے راستے رکاوٹ تھی کہ میں بادشاہ ہوں اور بادشاہ بھی ایسی شان و شوکت والا کہ میری رعایا مجھے سجدے کرتی ہے۔ ایک معمولی سے آدمی کی باتوں پر لاجواب ہو جانا مجھے زیب نہیں دیتا۔ اسے آزاد چھوڑ دینا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ ابھی تو یہ بے سہارا ہے، اکیلا ہے، کمزور ہے، نہتا ہے۔ باپ اس کا دشمن ہے، قوم اس کی مخالف ہے۔ کون اس کے حق میں بول سکے گا۔

نمرود، دلائل کا جواب دلائل سے نہ دے سکا تو قوم کے دیگر افراد کی طرح لڑنے جھگڑنے لگا اور بالآخر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فیصلہ عوام پر چھوڑ دیا۔

''اگر تم لوگ اپنے خداؤں کا بدلہ لینا چاہتے ہو تو اس شخص کو جلا ڈالنا ہی بہتر ہے۔''

کاہنوں نے یہ سزا پہلے ہی تجویز کر لی تھی اور اب بادشاہ بھی اس سزا کی حمایت کر رہا تھا۔

بادشاہ سے لے کر رعایا تک سب نے متفقہ فیصلہ کر لیا کہ دیوتاؤں کی توہین کے جرم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دہکتی آگ میں جلا دینا چاہیے۔ ایسے سخت مجرم کی یہی سزا ہے۔ نمرود نے یہ سوچ کر آپ کو پابند سلاسل کر دیا کہ کہیں بھاگ نہ جائیں۔

(بعض کا خیال ہے آپ ایک سال تک نمرود کی قید میں رہے۔ بعض نے سات سال لکھا ہے)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کی تیاریاں زور شور سے شروع ہو گئیں۔ لوگ اس کام میں اس طرح مشغول ہوئے جیسے کسی مذہبی جشن منانے کی تیاریاں کی جا رہی ہوں۔ ایک ایسے شخص کو سزا دینے کی تیاری ہو رہی تھی جو ان کے دیوتاؤں کے لیے گستاخ تھا۔ تیاریاں اسی طرح ہونی چاہیے تھیں۔ ہر شخص پر لازم تھا کہ وہ آگ روشن کرنے کے لیے لکڑیاں جمع کرے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی عورت بیمار پڑ جاتی تو وہ منت مانتی کہ اگر اس کو شفا ہو گئی تو وہ ابراہیم علیہ السلام کو جلانے کے لیے لکڑیوں کا گٹھا دے گی۔

تھوڑے ہی عرصے میں لکڑیوں کا انبار جمع ہو گیا۔

کہتے ہیں اس کام کے لیے ایک بڑی عمارت بنائی گئی تھی۔ ہزاروں من لکڑیاں اس عمارت میں جمع ہو گئیں۔ جب تیاریاں مکمل ہو گئیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کا ارادہ ہو گیا تو چاروں طرف سے آگ کو خوب بھڑکایا گیا۔ آگ کے شعلے ایسے بلند ہو رہے تھے کہ دور دور کی چیزیں جھلس رہی تھیں۔ جب آپ کو آگ میں پھینکنے کے لیے اس بلند عمارت کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو آپؑ نے آسمان کی طرف دیکھا اور اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا بہ لب ہوئے۔

''اے اللہ! تو آسمانوں میں اکیلا ہے اور میں زمین میں تیری عبادت کرنے والا تنہا ہوں۔''

مطلب یہ کہ اگر آگ نے مجھے جلا دیا تو تیرا یہ اکیلا عبادت کرنے والا بھی نہیں رہے گا۔

بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوا میں تھے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام ان سے ملے اور عرض کیا۔ ''آپ کو کوئی ضرورت؟ فرمایا آپ کی طرف کوئی ضرورت نہیں۔''

حضرت ابنِ عباسؓ سے مروی ہے کہ اس وقت بارش والا فرشتہ مضطرب ہو کر کہہ رہا تھا کہ کب مجھے حکم ملے اور میں بارش برساؤں لیکن اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے خود حکم دینے والا تھا۔ قرآن میں ہے۔ ''ہم نے کہا اے آگ ابراہیم پر ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی والی ہو جا۔''

حضرت کعب احبارؓ فرماتے ہیں کہ جس روز حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکا گیا اس روز کوئی شخص آگ سے نفع نہ اٹھا سکا (یعنی آگ سے تپش ختم کر دی گئی) اور فرمایا کہ اس روز آگ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بندھی ہوئی رسی کے علاوہ اور کچھ نہ جلایا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اردگرد جو آگ جلائی گئی تھی قدرتِ خداوندی سے گلزار بن گئی۔ آپؑ اس آگ سے محفوظ نکل آئے۔ آپؑ پر اس آگ کا صرف اتنا اثر ہوا تھا کہ آپ کی پیشانی پر پسینے کے چند قطرے ابھر آئے تھے۔ آپؑ اس آگ سے باہر آئے تو پسینا پونچھ رہے تھے۔

اتنے بڑے معجزے کے بعد تو ہونا یہ چاہیے تھا کہ بادشاہ سمیت پوری بستی ایمان لے آتی لیکن بادشاہ نے یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیا۔
''میں تیرے خدا کے حضور چار ہزار جانور ذبح کرنے کو تیار ہوں۔''
''جب تک تو اپنے دین کو چھوڑ کر میرا دین اختیار نہ کرلے اللہ تعالیٰ تیری کسی چیز کو قبول نہیں کرے گا۔''
''میں اپنی بادشاہت نہیں چھوڑ سکتا۔''
آگ سے سلامت نکل آنا ایسا کھلا معجزہ تھا کہ قوم کی آنکھیں کھل جانی چاہیے تھیں لیکن بدبخت قوم نے اسے کھلا جادو قرار دیا اور سب منہ موڑ کر چلے گئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دلائل و براہین کی ہر صورت اختیار کر کے دیکھ لی تھی۔ پہلے اپنے والد آذر کو سمجھایا پھر جمہور کے سامنے حق کی روشنی کو پیش کیا اور آخر میں نمرود سے مناظرہ کر کے اس کے سامنے بھی جو حق تھا اسے بہتر سے بہتر اسلوب کے ساتھ ادا کیا اور ہر لمحہ یہی سب کو تلقین کی کہ خدائے واحد کے علاوہ کسی کی پرستش جائز نہیں اور اصنام پرستی اور کواکب پرستی کا نتیجہ ذلت کے سوا دوسرا نہیں۔ اس لیے شرک سے باز آنا چاہیے اور آپ کی ہدایت ہی کو صراطِ مستقیم سمجھنا چاہیے لیکن بدبخت قوم نے کچھ نہ سنا۔

اتنی تگ و دو کا نتیجہ صرف اتنا نکلا کہ حضرت سارہ اور حضرت لوط علیہ السلام کے سوا کوئی تیسرا شخص ایمان نہ لایا۔
آپؑ نے ارادہ کیا کہ اس پتھر دل قوم کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جائیں اور پیغام الٰہی سنائیں اور دعوتِ حق پہنچائیں۔
آپؑ نہایت بے بسی کے عالم میں نکلے۔ اس وقت آپؑ کے ساتھ آپؑ کا اللہ اور اس کا وعدہ تھا۔ آپؑ کی زوجہ حضرت سارہ تھیں اور آپؑ کے بھتیجے حضرت لوط تھے۔
''پس لوط، ابراہیم (علیہ السلام) پر ایمان لے آیا اور کہنے لگا میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔ بے شک وہ غالب ہے، حکمت والا ہے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والد آذر اور قوم سے جدا ہو کر فرات کے غربی کنارے کے قریب ایک بستی میں چلے گئے۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کیا اور پھر حران یا حاران کی جانب چلے گئے اور وہاں دینِ حنیف کی تبلیغ شروع کر دی۔
اس وقت یہ جگہ بھی کواکب پرستی کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ یہ لوگ سات سیاروں کی پوجا پاٹ کیا کرتے تھے۔ یہ قطب شمالی کی طرف رخ کرتے تھے اور اقوال و افعال میں کئی طرح سے سات سیاروں کی عبادت کرتے تھے۔ اسی وجہ سے دمشق کے پرانے سات دروازوں میں سے ہر ایک پر ایک سیارے کی ہیکل بنا کر نصب کر رکھی تھی اور ان کے پاس عید اور تہوار کی رسوم مناتے تھے۔

یہاں رہ کر آپؑ نے کھیتی باڑی شروع کر دی جس سے آپؑ کے مال و متاع میں اضافہ ہوا۔ آپؑ کے اور حضرت لوط علیہ السلام کے پاس بڑے بڑے ریوڑ جمع ہو گئے تھے۔ ان کے لیے محافظ اور چرواہے مقرر کیے گئے تھے۔
اس عرصے میں آپؑ برابر اپنے والد آذر کے لیے بارگاہِ الٰہی میں استغفار کرنے اور اس کی ہدایت کے لیے دعا مانگتے رہے اور یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ آپؑ نہایت نرم دل واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے آذر سے جدا ہوتے وقت ہی کہہ دیا تھا کہ میں تجھ سے جدا ہو رہا ہوں لیکن میں تیرے حق میں خدا سے مغفرت کی دعا کرتا رہوں گا۔ پھر آپؑ کو وحی الٰہی نے مطلع کیا کہ آذر ایمان لانے والا نہیں اور یہ انہی اشخاص میں سے ہے جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے۔ ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔
جب آپؑ کو یہ معلوم ہو گیا تو آپؑ نے آذر سے اپنی لاتعلقی کا صاف صاف اعلان کر دیا کہ جو امید موہوم میں نے لگا رکھی تھی وہ اب ختم ہو گئی اس لیے اب استغفار کا سلسلہ بے محل ہے۔
''اور نہ تھا ابراہیم کا استغفار اپنے باپ کے لیے مگر اس وعدے کے مطابق جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا پھر جب اس پر یہ ظاہر ہو گیا کہ یہ خدا کا دشمن ہے تو اس نے بے زاری کا اظہار کر دیا۔ بے شک! ابراہیم ضرور رقیق القلب بردبار ہے۔''
آپؑ حاران میں تھے کہ یہاں قحط پڑا اور آپؑ نے حاران چھوڑ دیا۔ آپؑ وہاں سے نکلے اور مختلف بستیوں میں تبلیغ کرتے ہوئے فلسطین تک پہنچے۔ آپؑ نے فلسطین کے غربی اطراف میں سکونت اختیار کی۔ یہ علاقہ کنعانیوں کے زیرِ اقتدار

تھا۔ پھر قریب ہی شکیم (نابلس) میں چلے گئے۔
اہلِ کتاب نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب شام تشریف لائے تو اللہ عزوجل نے آپؑ کی طرف وحی نازل فرمائی۔
''یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا اور اس نے (ابراہیم علیہ السلام) وہاں خداوند کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں سے کوچ کر کے اس پہاڑ کی طرف گیا جو بیت ایل کے مشرق میں ہے اور اپنا ڈیرا ایسے لگایا کہ بیت ایل (بیت المقدس) مغرب میں تھا۔''
آپؑ نے مصریوں کی آسودگی کے بارے میں سن رکھا تھا لہٰذا آپؑ نے ہجرت کر کے مصر جانے کا عزم کرلیا تاکہ مصریوں کی فراخ دستی سے فائدہ اٹھائیں اور وہاں کے علمائے یہود سے اللہ کی ذات وصفات کے بارے میں تبادلۂ خیال کریں۔
توریت کے مطابق:
''اور ایسا ہوا کہ جب وہ مصر میں داخل ہونے کو تھا تو اس نے اپنی بیوی سارا (سارہ) سے کہا دیکھ میں جانتا ہوں کہ تو دیکھنے میں خوب صورت ہے اور یوں ہوگا کہ مصری تجھے دیکھ کر کہیں گے کہ یہ اس کی بیوی ہے۔ سو وہ مجھے تو مار ڈالیں گے مگر تجھے زندہ رکھ لیں گے۔ سو تو یہ کہہ دینا کہ میں اس کی بہن ہوں تاکہ تیرے سبب سے میری خیر ہو اور میری جان تیری بدولت بچی رہے اور یوں ہوا کہ جب ابرام (ابراہیمؑ) مصر میں آیا تو مصریوں نے اس عورت کو دیکھا کہ وہ نہایت خوب صورت ہے اور فرعون کے امرا نے اسے دیکھ کر فرعون کے حضور میں اس کی تعریف کی اور وہ (حضرت سارہ) فرعون کے گھر پہنچائی گئی اور اس نے اس کی خاطر ابرام پر احسان کیا اور بھیڑ بکریاں اور گائے، بیل اور غلام، لونڈیاں اور اونٹ اس کے پاس ہوگئے۔
پر خداوند نے فرعون اور اس کے خاندان پر ابرام کی بیوی سارہ کے سبب سے بڑی بڑی بلائیں نازل کیں تب فرعون نے ابرام کو بلا کر اس سے کہا کہ تو نے مجھ سے یہ کیا کیا۔ تو نے مجھے کیوں نہ بتایا کہ یہ تیری بیوی ہے۔ تو نے یہ کیوں کہا کہ وہ میری بہن ہے۔ اسی لیے میں نے اسے لیا کہ وہ میری بیوی بنے۔ سو دیکھ تیری بیوی حاضر ہے۔ اس کو لے اور چلا جا اور فرعون نے اس کے حق میں اپنے آدمیوں کو ہدایت کی اور انہوں نے اسے اور اس کی بیوی کو اس کے مال کے ساتھ روانہ کیا۔''
توریت کے بیان کردہ اس قصے کو علما نے طرح طرح سے ذکر فرمایا ہے۔
بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا۔
''حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کبھی جھوٹ نہیں بولا سوائے تین مواقع کے۔ دو تو اللہ کے بارے میں (یعنی اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے لیے) ان میں سے ایک یہ تھا کہ جب قوم نے ان کو اپنے ساتھ عیدگاہ پر چلنے کے لیے کہا تو انہوں نے کہا میں بیمار ہوں، دوسرا جب کافروں نے پوچھا کہ ہمارے خداؤں کا یہ حشر نشر کس نے کیا تو آپ نے فرمایا، ان کے بڑے (بت) نے اور تیسرا جھوٹ جو سرزد ہوا وہ یوں ہوا کہ ان کا اور سارہ کا گزر ایک ظالم جابر بادشاہ پر ہوا تو اس کو کسی نے مخبری کی کہ یہاں ایک آدمی آیا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ایسی عورت ہے جو لوگوں میں سب سے حسین ہے تو بادشاہ نے حضرت ابراہیمؑ کے پاس پیغام بھیجا اور اس عورت کے بارے میں پوچھا کہ وہ کون ہے تو آپ نے فرمایا میری بہن ہے۔ اس کے بعد آپ حضرت سارہ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا اے سارہ! روئے زمین پر تیرے اور میرے سوا کوئی مومن نہیں ہے اور یہ بادشاہ مجھ سے سوال کرتا تھا تو میں نے اس کو تیرے بارے میں کہہ دیا کہ تو میری بہن ہے لہٰذا اب تو مجھے جھٹلا نہ دینا۔
بادشاہ نے حضرت سارہ کو بلا بھیجا اور یہ اس کے پاس تشریف لے گئیں تو بادشاہ نے آپ کو برے ارادے سے جکڑنا چاہا تو وہ اپنی جگہ جکڑا گیا پھر بادشاہ نے کہا آپ (حضرت سارہ) میرے لیے اللہ سے دعا کر دیجیے پھر میں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا تو حضرت سارہ نے دعا کر دی اور وہ اس قید اور جکڑ سے رہا ہو گیا لیکن وعدہ خلافی کی۔ دوسری مرتبہ بری نیت سے آگے بڑھا اور قدرت خدا کی پھر جکڑا گیا اور پہلے سے بھی سخت اور پھر کہا میرے لیے اللہ سے دعا کر دیجیے۔ میں آپ کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا تو حضرت سارہ نے دعا کر دی اور وہ چھوٹ گیا۔
اس نے اپنے کسی خادم کو بلایا اور کہا تم میرے پاس کوئی انسان نہیں لائے بلکہ کوئی شیطان لے کر آئے ہو پھر بادشاہ نے حضرت سارہ کو ایک خادمہ دے کر واپس کر دیا اور وہ (خادمہ ہم سب امت محمدیہ کی ماں بنی جو حضرت ہاجرہ علیہا السلام تھیں)
حضرت سارہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس واپس تشریف لائیں۔ ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے نماز میں

مشغول تھے تو صرف ہاتھ سے اشارتاً پوچھا کیا ہوا؟ تو حضرت سارہ نے جواب دیا۔ ''اللہ نے کافر کے مکر کو رد کر دیا اور فاجر کی برائی کو اس کے سینے میں دبا دیا۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ''اے لوگو! یہی ہاجرہ تمہاری ماں ہیں۔''

دوسرے بزرگوں نے بھی اپنی روایتوں میں تھوڑے بہت تغیر و تبدل کے ساتھ اس قصے کو دہرایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ جب سے حضرت سارہ ظالم بادشاہ کے پاس گئی تھیں تب سے مسلسل حضرت ابراہیم علیہ السلام نماز میں مشغول تھے اور التجا کر رہے تھے کہ اللہ میرے گھر والوں سے اس کو دفع کر اور اس عذاب کو ٹال دے جس کا اس نے برائی کے ساتھ خیال رکھا ہے۔

مصنف ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ میں نے بعض بزرگوں کے اقوال میں دیکھا ہے کہ حضرت سارہ جب سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے نکلی تھیں تب سے واپس آنے تک عزوجل نے دونوں کے درمیان رکاوٹیں ہٹا دی تھیں یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام مسلسل حضرت سارہ کو دیکھ رہے تھے اور حضرت سارہ کے بادشاہ کے پاس ہونے کو مشاہدہ کر رہے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ کیسے اللہ عزوجل نے ان کے اہل کی حفاظت کی اور اللہ پاک نے ان کے لیے یہ انتظام اسی وجہ سے فرما دیا تھا تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دل اطمینان و سکون اور پاکیزگی کے ساتھ برقرار رہے۔

حضرت سارہ اور فرعون مصر کے واقعے کی تفصیلات توریت میں بیان ہوئی ہیں جبکہ قرآن خاموش ہے اس لیے محتاط علما نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ توریت میں غیر محتاط جملے بہ کثرت ملتے ہیں لہٰذا ممکن ہے راویان اسلام سے بھی اسرائیلی روایات اور صحیح روایت تعبیر میں خلط ملط ہو گیا ہو۔

واقعہ صرف اتنا ہے کہ حضرت ابراہیم مصر تشریف لے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مصری حکومت ایسے خاندان کے ہاتھ میں تھی جو سام بن نوح کی نسل سے تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی سامی نسل سے تھے اسی لیے اس خاندان سے نسبی تعلق تھا۔ یہاں پہنچ کر ابراہیم اور فرعونِ مصر کے درمیان کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جس سے فرعون کو یقین ہو گیا کہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کا خاندان خدا کا مقبول اور برگزیدہ خاندان ہے۔ یہ دیکھ کر اس نے حضرت سارہ اور حضرت ابراہیمؑ کا بہت اعزاز کیا اور ان کو ہر قسم کے مال و منال سے نوازا اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے خاندانی رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے اپنی بیٹی حضرت ہاجرہ کو بھی ان کی زوجیت میں دے دیا جو اس زمانے کے رواج کے مطابق پہلی بیوی کی خدمت گزار قرار پائیں۔

''سفر ایشیا میں (جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے) مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں مصر کا بادشاہ حضرت کا ہم وطن تھا۔''

اسی طرح یہود کی معتبر روایات سے یہ مسئلہ بھی صاف ہو جاتا ہے کہ حضرت ہاجرہ، شاہ مصر کی بیٹی تھیں، لونڈی یا باندی نہیں۔

اس لیے بنی اسرائیل کا یہ طعن کہ بنی اسماعیل ہم سے اس لیے کم تر ہیں کہ وہ لونڈی سے ہیں اور ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سارہ سے، صحیح نہیں ہے اور اصل واقعہ اور تاریخ دونوں کے خلاف ہے اور جس طرح توریت کے دوسرے مضامین میں تحریف کی گئی ہے اسی طرح اس واقعے میں بھی تحریف کی گئی ہے۔ واقعے کی تمام تفصیلات حذف کر کے صرف ''لونڈی'' کا لفظ باقی رہنے دیا۔

ہاجرہ اصل میں عبرانی لفظ ہاغار ہے جس کے معنی بیگانہ اور اجنبی کے ہیں۔ ان کا وطن چونکہ مصر تھا اس لیے یہ نام پڑ گیا لیکن اسی اصول کے پیش نظر زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ ہاغار کے معنی جدا ہونے والے کے ہیں اور عربی میں ہاجر کے معنی بھی یہی ہیں۔ یہ چونکہ اپنے وطن مصر سے جدا ہو کر یا ہجرت کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریکِ حیات اور حضرت سارہ کی خدمت گزار بنیں اس لیے ہاجرہ کہلائیں۔

☆☆☆

حضرت ابراہیم علیہ السلام برگزیدہ پیغمبر تھے۔ پیغمبر کوئی کام اپنی مرضی سے نہیں کرتا۔ قدم اٹھانے سے پہلے خدا کی رضا اس کے لیے سمت کا تعین کر دیتی ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام اب تک ہر ہجرت میں آپؑ کے ساتھ تھے لیکن اب وحیِ الٰہی نے آپؑ کو ہدایت کی کہ لوط علیہ السلام کو اپنے سے الگ کر کے مشرق کی جانب روانہ کر دے۔

آپؑ کو یہ جدائی شاق گزر رہی تھی۔ اتنی ہمت نہیں تھی کہ حضرت لوط علیہ السلام سے کہ جنہیں بہ منزلہ اولاد کے سمجھا تھا، یہ کہہ سکیں کہ تو اب مجھے چھوڑ کر چلا جا۔ انہیں معلوم تھا کہ لوط علیہ السلام ان کی نافرمانی نہیں کریں گے، دراصل خود ان کا دل نہیں

چاہ رہا تھا کہ جدائی کا زخم دل پر لگے۔ اللہ نے اپنے نبی کی دلداری کے لیے ایسے اسباب فراہم کر دیے کہ دونوں کی راہیں خود بخود الگ ہوگئیں۔

مصر کی سرزمین پر سورج کی کرنیں شام کی سیاہی کے لیے جگہ خالی کر رہی تھیں کہ حضرت لوط علیہ السلام کے ریوڑوں کی نگرانی کرنے والے آپؑ کے پاس حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چرواہوں کی شکایت لے کر آئے۔

''جناب، یہ کیا بات ہوئی، آپ کے چچا کے ملازم ہرا بھی چراگاہ میں اپنے جانور لے کر گھس آتے ہیں جیسے ہمارے جانوروں کو تو بھوک ہی نہیں لگتی۔''

''ان کا یہ حق ہے کیونکہ وہ اللہ کے نبی کے ملازم ہیں۔ ان کا یہ حق ہے کہ ان کے جانور تم سے پہلے چراگاہ میں داخل ہوں۔''

''ہم جس چراگاہ میں جاتے ہیں، وہ بھی اپنے جانوروں کو وہیں لے آتے ہیں۔ انہوں نے تو اچھی خاصی ضد باندھ لی ہے۔ ہم آپ کو مطلع کرنے آئے ہیں۔ اگر اب انہوں نے زبردستی کی تو ہم ان سے جنگ کریں گے۔''

''خبردار! تم ایسا سوچنا بھی مت۔ میرے جانور، اگر بھوک سے مر بھی جائیں تو بھی میں یہ نہیں چاہوں گا کہ تم ان سے جنگ کرو۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم کل سے اپنے جانوروں کو چراگاہ میں لے کر ہی نہ جائیں۔''

''تم دل برداشتہ نہ ہو۔ میں اپنے چچا سے بات کرلوں گا۔ وہ اپنے ملازموں کو سمجھا دیں گے۔ کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔''

ادھر ایسا ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آدمی بھی آپؑ کے پاس شکایت لے کر پہنچے۔ انہوں نے بھی اسی قسم کی باتیں کیں جو حضرت لوط علیہ السلام کے آدمی حضرت لوط علیہ السلام سے کر چکے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے آدمیوں کو خاموش رہنے کی تلقین کی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے آدمیوں کو سمجھا بجھا کر خاموش کرا دیا لیکن ایک فکر ضرور لاحق ہوگئی تھی۔ اگر یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا تو ہمارے آدمی آپس میں لڑ پڑیں گے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لوط (علیہ السلام) کے دل میں میری طرف سے برائی آجائے۔ اچانک وہ حکم بھی یاد آگیا جو خدا کی طرف سے دیا گیا تھا۔ اس حکم میں ہدایت کی گئی تھی کہ وہ لوط (علیہ السلام) کو خود سے الگ کر دیں۔ قدرت بھی چاہتی ہے اسی لیے چراگاہوں کا مسئلہ کھڑا کیا گیا ہے۔ آپ سے جو تاخیر ہوئی تھی اس کے لیے استغفار کیا اور لوط علیہ السلام کو اپنے پاس بلالیا۔

''لوط، میں جو کچھ تم سے کہوں گا وہ مانو گے؟''

''میں نے کبھی حکم عدولی کی ہے۔''

''ہمارے آدمیوں کے درمیان جھگڑے ہونے لگے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں یہ جھگڑے ہمارے درمیان دوری پیدا کریں گے۔''

''یہ آپ نے کیسے سوچ لیا۔ میرے دل میں آپ کی طرف سے کبھی میل نہیں آسکتا۔''

''پھر بھی کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم اپنے راستے الگ کرلیں؟''

''مجھ سے کیا خطا ہوئی ہے؟''

''میں بھی خوش ہوں اور تجھ سے خدا بھی خوش ہے۔''

''آپ جو مجھے جدائی کا مشورہ دے رہے ہیں، یہ آپ کا مشورہ ہے یا خدا نے آپ کو حکم دیا ہے؟''

''یہ حکم بہت پہلے آچکا تھا لیکن میں تجھ سے کہتے ہوئے ڈرتا تھا۔''

''میں کدھر جاؤں؟''

''کیا یہ سارا ملک تیرے سامنے نہیں۔ اگر تو بائیں جائے تو میں دائیں جاؤں گا اور اگر تو داہنے جائے تو میں بائیں جاؤں گا۔''

تب لوط علیہ السلام نے آنکھ اٹھا کر یردن کی ساری ترائی پر نظر دوڑائی کیونکہ یہ زمین مصر کے ملک کی طرح خوب سیراب تھی لہٰذا یردن کی ساری ترائی کو اپنے لیے چن لیا۔

(جاری ہے)

قصص القرآن۔ قصص الانبیاء۔ توریت۔ حضرت ابراہیم از علامہ عباس محمود

میٹھا زہر

تنویر ریاض

کہتے ہیں محبت بذات خود ایک زہر ہے لیکن شیریں۔ اسی لیے اس کے مہلک ہونے کا احساس ذرا دیر میں ہوتا ہے۔ اسے بھی بہت آخر میں احساس ہوا مگر... وقت کا پنچھی اس کے ہاتھ سے اڑ چکا تھا جبکہ پیار کے اس میٹھے زہر نے بالآخر اپنا اثر دکھلا دیا اور جاتے جاتے بھی وفا کی رسم نبھادی۔

محبت کو میٹھا زہر بھی کہا جاتا ہے۔ آپ چاہے اسے آئس کریم کی طرح جلدی جلدی کھا جائیں یا کسی فرحت بخش مشروب کے مانند دھیرے دھیرے گھونٹ لیں۔ دونوں صورتوں میں اس کا ذائقہ اتنا شیریں ہوگا کہ آپ اس کے مہلک ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اس کہانی کا آغاز ہمارے علاقے میں واقع مکسز بار سے ہوا۔ جہاں ہم یعنی لیون، ایڈی اور میں، مختلف نوعیت کے کام کیا کرتے تھے۔ ہم تینوں بچپن سے ساتھ تھے جب ہمارا زیادہ وقت سڑکوں پر فٹ بال کھیلنے میں گزرتا تھا۔ ذرا بڑے ہوئے تو رات کے بار سے باہر آنے والے نشے میں مست لوگوں کو لوٹنے لگے جنہیں اتنا ہوش بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنے گھر تک جاسکیں۔ یہ خدمت بھی ہم تینوں ہی انجام دیتے بھی کبھی کسی کا بیٹا کیون بھی ہمارے ساتھ شریک ہوجاتا لیکن جب وہ اتنا بڑا ہوگیا کہ اپنے باپ کے ساتھ بار پر کام کرسکے تو اس نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔

انہی دنوں ہم نے سویٹ فل کے لیے کام کرنا شروع کردیا جو پورے علاقے کا بے تاج بادشاہ تھا۔ اس نے بھی جارحانہ انداز نہیں اپنایا بلکہ ہمیشہ بہت ہی عمدہ انداز میں

بات کرتا تھا۔ رقم کی وصولی کے لیے وہ ہمیں بھیجا کرتا اور اس کے لیے ہمیں کوئی سختی نہیں کرنا پڑتی تھی۔ جس شخص کو نشانہ بنایا جاتا، وہ چپ چاپ رقم ہمارے حوالے کر دیتا۔ ہم اپنا زیادہ تر کام دن میں ہی نمٹا لیتے تھے اس لیے رات کو فارغ ہوتے۔

وہ جمعے کی شام تھی۔ اکتوبر کے مہینے میں ویسے بھی جلدی اندھیرا ہو جاتا ہے۔ باہر سرد ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے لیکن بار کے اندر کا ماحول خاصا گرم تھا۔ کیون حسبِ معمول بار کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا ڈرنکس سرو کر رہا تھا۔ گو کہ بار کی اندرونی حالت کافی خستہ تھی لیکن ہمارے لیے یہ گھر کی طرح پُرسکون تھا۔ اس وقت بھی میں محلے کے دو لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا جبکہ لیون اور ایڈی میرے عقب والی میزوں میں سے ایک پر جمع شدہ رقم کا حساب کر رہے تھے۔ لیون کو ہمیشہ سے ہی اچھے کپڑے پہننے کا شوق تھا۔ وہ چھوٹے قد کا خوش شکل بندہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔ وہ دبلے لیکن مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اسے اپنے جذبات پر قابو پانے کا ہنر آتا تھا۔

لیون کی گرل فرینڈ چارلین دو عورتوں کے ساتھ بار کاؤنٹر پر بیٹھی کوئی مشروب پی رہی تھی لیکن اس کی نظریں مسلسل لیون پر تھیں۔ وہ لیون کے لیے دیوانی تھی حالانکہ وہ اسے کبھی ساتھ لے کر گھومنے نہیں جاتا تھا لیکن چارلین کے اطمینان کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ اس کی نظروں کے سامنے رہے۔ تقریباً ساڑھے دس بجے کے قریب ایک لڑکی دوڑتی ہوئی بار میں داخل ہوئی۔ اس نے سیاہ رنگ کی لیدر جیکٹ، جینز اور اونچی ایڑی کے جوتے پہن رکھے تھے۔ سیاہ گھنگھریالے بالوں کی وجہ سے وہ اور زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔ سبز آنکھوں اور گلابی ہونٹوں کے ساتھ وہ بالکل ایک چھوٹی سی گڑیا کے مانند لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں جب اس نے دیکھا کہ وہ کہاں آ گئی ہے اور پھر آگے پیچھے اس طرح ہلنے لگی جیسے کسی چٹان پر کھڑی ہو۔

چارلین نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''گھبراؤ نہیں۔ یہاں کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔''

اس عورت نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔

''کیا ہوا... ہنی؟'' چارلین نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، تین لڑکے بار میں داخل ہوئے۔ ان کی عمریں کالج کے طالبِ علموں جتنی ہوں گی۔ ان تینوں نے جینز پہن رکھی تھیں جبکہ ان میں سے ایک آگے آگے چل رہا تھا جیسے ان کا سرغنہ ہو۔ جب اس عورت نے انہیں دیکھا تو وہ بار کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگی لیکن چارلین نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روک لیا۔

''وہ رہی!'' پہلے لڑکے نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنے دوستوں سے کہا اور اس کی جانب بڑھنے لگا اور اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا۔ ''پہلے میں اس کا دماغ درست کر دوں گا۔''

''رک جاؤ!'' کیون بار کاؤنٹر کے پیچھے سے بولا۔ ''میں یہاں کسی قسم کا جھگڑا نہیں چاہتا۔''

اس لڑکے کے چہرے پر ایک مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''تم سب بھی اس تماشے سے اتنے ہی لطف اندوز ہو گے جتنے کہ ہم۔''

وہ عورت زور زور سے رونے لگی۔ چارلین اپنی جگہ سے اٹھی اور اس عورت کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے ان لڑکوں سے بولی۔ ''یہاں سے دفع ہو جاؤ۔''

''تم میرے راستے میں نہ آؤ۔'' اس لڑکے نے ترش جواب دیا۔

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ لیون اور ایڈی آگے بڑھے۔ لیون نے سامنے آ کر ان تینوں پر نگاہ ڈالی تو وہ تینوں خاصے نروس نظر آنے لگے لیکن ان کا سرغنہ بناوٹی ہنسی سے بولا۔ ''چھوٹے۔ میرے راستے سے ہٹ جا۔''

لیکن لیون اپنی جگہ مضبوطی سے کھڑا رہا۔ اس کے اعصاب تن گئے تھے اور جسم میں سختی آ گئی تھی لیکن اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے نرمی سے کہا۔ ''بہتر ہو گا کہ تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔''

ممکن تھا کہ لیون انہیں نرمی سے وہاں سے ہٹا دیتا لیکن ان کے سرغنہ نے لیون کی نرمی کو اس کی بزدلی سمجھا اور اسے ایک طرف کرنے کے لیے اپنا ہاتھ اس پر ڈال دیا۔ اس کے بعد سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ اس کے ساتھی ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ ان کا دوست فرش پر پڑا کراہ رہا تھا اور اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک ایک تصویر کی طرح ساکت کھڑے رہے پھر لیون نے سر ہلایا تو ان کی جان میں جان آئی۔ انہوں نے اپنے ساتھی کو اٹھایا اور اسے گھسیٹتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھنے لگے۔ اچانک ہی اس لڑکے نے اپنے جسم کو ساتھیوں کی

گرفت سے آزاد کرایا اور ایک ہاتھ سے اپنی ناک کو دباتے ہوئے چلّایا۔ ''یہ لڑکا ہے لیکن دیکھنے میں لڑکی لگتی ہے۔ یہ مجھے سڑک پر ملی تھی اور جب میں نے.....''

اس نے فرش پر تھوکتے ہوئے کہا۔ ''شاید تم ایسے ہی لوگوں کو پسند کرتے ہو۔ ٹھیک ہے۔ اب یہ تمہاری ہے۔''

وہ کچھ اور کہنے والا تھا لیکن اس کے ساتھی اسے کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔ اس کے جانے کے بعد بالکل خاموشی چھا گئی۔ ہم سب لیون کو دیکھ رہے تھے لیکن اس کی نظریں اس عورت پر جمی ہوئی تھیں۔ لیون کی آنکھیں سکڑ گئیں لیکن وہ مسلسل اسے دیکھے جا رہا تھا۔ چارلین اس کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے بولی۔ ''اگر تم اسے یوں ہی دیکھتے رہے تو یہ خوف سے مر جائے گی۔ اسے بتا دو کہ اب سب کچھ ٹھیک ہے۔''

ایڈی بولا۔ ''تم نے اس لڑکے کی بات نہیں سنی۔ یہ عورت نہیں ہے۔ مجھے تو یہ درمیان کی کوئی چیز لگتی ہے۔''

چارلین اس کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''ہم سب میں کوئی نہ کوئی کمی ہے۔ کم از کم اس نے ڈھنگ کے کپڑے تو پہن رکھے ہیں۔ کم آن لیون! اسے بتا دو کہ سب ٹھیک ہے۔''

لیون اب بھی مسلسل اسے دیکھے جا رہا تھا جیسے اس کی حقیقت جاننے کی کوشش کر رہا ہو جبکہ وہ عورت بھی لیون کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ تبھی کیمرن نے بیئر کی ایک بوتل کاؤنٹر پر رکھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ اچھل پڑی اور اس چوہے کی طرح منمنانے لگی جو بلی کی قید سے آزاد ہوا ہو۔ یہ منظر دیکھ کر ہم سب کو ہنسی آ گئی۔ لیون بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا اور بولا۔ ''میرے لیے بیئر لے کر آؤ اسکوٹیک!''

اسکوٹیک نے چارلین کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے کاؤنٹر سے بوتل اٹھائی اور دونوں ہاتھوں میں اٹھائے اس طرح لیون کی جانب بڑھی جیسے کوئی تحفہ پیش کر رہی ہو۔ جیسے ہی اس نے بوتل پکڑی اور دونوں کی نظریں ملیں، اسکوٹیک نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ فرش کی جانب دیکھا اور چارلین کے پاس واپس آ گئی۔ لیون نے بیئر کا ایک لمبا گھونٹ لیا اور ایڈی سے بولا۔ ''چلو! ہم اپنا کام ختم کر لیں۔''

اس طرح اسکوٹیک بار میں اکثر و بیشتر آنے لگی۔ کسی نے بھی اس کا اصل نام جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ سب اسے اسی نام سے پکارنے لگے تھے۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ اس کے لیے ان لڑکوں کو الزام نہیں دیا جا سکتا۔ اگر کوئی ہمیں بھی لڑکی بن کر ملنے کی کوشش کرتا تو ہم بھی ان لڑکوں کی طرح اسے مارنے کے لیے دوڑتے۔ شاید ہم نے اسکوٹیک کو اس لیے برداشت کر لیا کہ وہ لڑکے اس کا پیچھا کرتے ہوئے بار تک آ گئے تھے اور ہمیں بتانے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے لیکن زیادہ اہم وجہ یہ بھی کہ لیون کو اس کے آنے پر کوئی اعتراض نہ تھا اور ہم اس دن کا انتظار کر رہے تھے جب لیون اس سے بے زار ہو جاتا۔

اسکوٹیک عام طور پر چارلین کے ساتھ والے اسٹول پر دوسری عورتوں کے ساتھ بیٹھتی۔ وہ کپڑوں، فیشن اور میک اپ کے بارے میں باتیں کرتی رہتیں۔ جب بھی میری نگاہ اس پر جاتی تو میں اسے چوری چوری لیون کو دیکھتے ہوئے پاتا۔ میری نظروں سے گھبرا کر وہ اپنی نگاہوں کا زاویہ تبدیل کر لیتی لیکن اس نے اس کے علاوہ لیون کی طرف بڑھنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ شاید وہ اس کی سخت گیر فطرت سے واقف ہو چکی تھی۔ اس نے کبھی ہم لوگوں سے کچھ نہیں کہا۔ اس لیے ہم بھی اس کے بارے میں اس سے زیادہ نہیں جانتے تھے جو چارلین نے ہمیں بتایا تھا۔

اسکوٹیک نے ایک بہت ہی مشکل زندگی گزاری تھی۔ وہ ہائی اسکول میں تھی کہ والدین نے اس کو گھر سے نکال دیا اور اسے اپنی ذمے داری خود اٹھانا پڑی۔ اس نے کئی جگہ ملازمت کی۔ بہت سی جگہوں سے نکالی بھی گئی مگر اس نے کبھی احتجاج نہیں کیا اور اپنی بقا کے لیے جدوجہد کرتی رہی۔ جیسا کہ چارلین نے کہا تھا کہ ہر شخص کے اپنے مسائل ہوتے ہیں وہ جو کچھ بھی کماتی، اس کے بارے میں کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ اپنی بچت کہاں رکھتی ہے۔ اسے آپریشن کے لیے ایک بڑی رقم درکار تھی جس کے بعد وہ مرد سے مکمل عورت بن جاتی۔ چارلین نے بتایا تھا کہ وہ اب بھی کام کے دوران مردوں والا لباس پہنتی ہے ورنہ اگر انہیں اس کی حقیقت معلوم ہو جائے تو اسے ملازمت سے نکال دیا جائے گا۔ چارلین کا یہ بھی کہنا تھا کہ اس نے آپریشن کی تیاری کے سلسلے میں دوائیں بھی استعمال کرنا شروع کر دی ہیں۔ چارلین اور بھی بہت کچھ بتانا چاہ رہی تھی لیکن مجھے اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اگلے دو ماہ تک کوئی خاص بات نہیں ہوئی اور سب کچھ معمول کے مطابق چلتا رہا۔ انہی دنوں نیا پولیس کمشنر آ گیا اور اس نے اعلان کیا کہ وہ علاقے کو جرائم سے پاک کر دے گا۔ ایسے دعوے ہر نیا آنے والا افسر کیا کرتا ہے

لیکن اس نے آتے ہی کچھ پولیس والوں کا ٹرانسفر کر دیا جن سے سویٹ فل کے گہرے مراسم تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے جواریوں کو بھی گرفتار کرلیا گیا جس کی وجہ سے ہمارے باس کا کاروبار بری طرح متاثر ہوا جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ کچھ عرصے بعد ہمارے پاس کچھ زیادہ کام نہیں ہوگا۔

اس کا اثر ہم تینوں یعنی لیون، ایڈی اور مجھ پر براہِ راست ہوا۔ رفتہ رفتہ کام سکڑتا گیا اور ہماری آمدنی میں بھی کمی واقع ہونے لگی پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ہمارے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا اور ہم دن کا بیشتر حصہ فارغ بیٹھے گزار دیتے تھے۔ میں نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر اس کی شاپ میں کام کرنے کی کوشش کی لیکن ہمارے درمیان ہمیشہ کی طرح لڑائی ہونے لگی اور مجبوراً مجھے اس کا ساتھ چھوڑنا پڑا۔ اب میں رات کے علاوہ دن میں بھی جانے لگا۔ کام نہ ہونے اور پیسوں کی تنگی کی وجہ سے ہم سب لوگ جھنجلاہٹ کا شکار رہنے لگے تھے۔ چارلین نے بہت زیادہ ڈرنک شروع کر دی تھی اور نشے میں چور ہوکر وہ اسکوئیک سے الجھ جاتی۔ اس کی آواز اتنی بلند ہو جاتی کہ ہم سب آسانی سے سن سکتے تھے۔ ایڈی کا کسی ٹرک ڈرائیور سے جھگڑا ہو گیا اور اس نے ڈرائیور کی بری طرح پٹائی کر دی۔ میں نے جوئے میں جیتنے کے بعد بھی کوئی خوشی محسوس نہیں کی اور لاس اینجلس جانے کے بارے میں سوچنے لگا جہاں میرے چچا کا برگر پوائنٹ تھا۔ ہم سب ہی اپنے اپنے مسائل کی وجہ سے پریشان تھے۔

لیون حسبِ عادت خاموش رہتا تھا۔ وہ دن میں جم جاتا اور رات بار میں گزارتا۔ وہ چپ چاپ تنہا ایک میز پر بیٹھا رہتا اور اسکوئیک اس کے لیے دونوں ہاتھوں میں بیئر کی بوتل تھامے اسی طرح آتی جیسا اس نے پہلی بار کیا تھا۔ وہ چند سیکنڈ تک اس کے چہرے پر نظریں جمائے رہتی پھر اس کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی پھر اس کے بعد وہ تیزی سے بار کاؤنٹر کی جانب پلٹ جاتی۔ لیون نے بھی اس پر توجہ نہیں دی۔ وہ اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کے ایک لمبا گھونٹ لیتا اور اس کی نگاہیں دروازے پر جم جاتیں۔

وہ منگل کا دن تھا۔ اس شام لیون ضرورت سے زیادہ ہی خاموش تھا۔ اس نے کارڈز کھیلے اور نہ ہی چارلین کو اپنے پاس بلایا۔ بس وہ پورے وقت دروازے پر ہی نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ اسکوئیک ہمیشہ اس کے لیے بیئر لے کر آتی تھی لیکن شاید اس روز وہ وہاں نہیں تھی۔ جب آدھی رات گزر گئی اور کیون نے بار بند کرنے کی تیاری شروع کر دی تو لیون نے مجھے اور ایڈی کو اپنے پاس بلایا۔ لوگ ایک ایک کرکے رخصت ہو رہے تھے۔ کیون نے دروازے کو تالا لگایا۔ کیش رجسٹر خالی کیا اور حساب کتاب میں مصروف ہو گیا۔

لیون نے ایک نظر ہم دونوں پر ڈالی اور بولا۔ ''اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے بارے میں سوچیں۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔'' ایڈی بولا۔

''ہم اپنی زندگی گزارنے کے لیے کب تک ایک آدمی کے رحم و کرم پر رہیں گے۔ ہم اسے ڈھیروں نوٹ کما کر دیتے ہیں اور ہمارے حصے میں چند سکے ہی آتے ہیں۔ کیا تم اس سے عاجز نہیں آگئے؟ اب وقت آگیا ہے کہ ہم خود ہی مالک بن جائیں۔''

''میں اب بھی تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ ذرا کھل کر بات کرو۔'' میں نے کہا۔

لیون نے اِدھر اُدھر دیکھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ کیون وہاں نہیں ہے تو وہ بولا۔ ''دو مہینے پہلے کی بات ہے میں چارلین کو اس کی سالگرہ پر ''گلاس سلپرز'' میں لے گیا تھا۔ تم نے تو وہ ریسٹورنٹ دیکھا ہی ہوگا۔ ہم جیسے تو وہاں جانے کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ وہاں زیادہ تر عورتیں لنچ کے لیے آتی ہیں۔ ان کے پاس ڈھیروں پیسے اور جیولری ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ریسٹورنٹ کے کیش رجسٹر میں بھی ٹھیک ٹھاک رقم ہوتی ہے۔''

''کیا تم وہاں ڈاکا ڈالنے کی بات کر رہے ہو؟'' ایڈی ہکلاتے ہوئے بولا۔

''ہم دس منٹ میں اتنی رقم حاصل کرلیں گے جو سویٹ فل کے یہاں کام کرکے برسوں میں بھی جمع نہیں کر سکتے۔''

میں انکار کرنے والا ہی تھا کہ ایڈی نے بولنا شروع کر دیا۔ ''میں تیار ہوں۔ یہ کم از کم اس سے تو بہتر ہوگا کہ ہم یہاں بیٹھ کر بھوکے مرتے رہیں اور انتظار کریں کہ کب فل ہمیں کام سے جواب دیتا ہے۔''

''ایک منٹ رکو۔'' میں نے کہا۔ ''تم ڈاکا ڈالنے کی بات کر رہے ہو۔ اس مقصد کے لیے ہمیں اسلحہ بھی استعمال کرنا ہوگا اور اگر ہم پکڑے گئے تو لمبے عرصے کے لیے جیل کی ہوا کھانا پڑے گی۔ یہ بتاؤ کہ تمہارا پلان کیا ہے؟''

''ہم یہ کام جمعے کے دن ایک بجے کے قریب کریں گے۔'' لیون کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''پورے ہفتے میں اسی وقت وہاں سب سے زیادہ رش ہوتا ہے۔''

''تمہیں کس طرح معلوم ہوا؟ کیا تم سنیچر والے دن وہاں جاکر دیکھا ہے؟''

''تمہیں میری بات پر یقین کرلینا چاہیے۔ ہم اپنی

ویگن لے کر جائیں گے۔ اس میں سامان رکھنے کی کافی گنجائش ہے اور اسے اس سڑک پر پارک کریں گے جو ریسٹورنٹ کے عقب میں جانے والی گلی کی مخالف سمت میں ہے۔ وہاں کچن میں جانے کے لیے ایک دروازہ ہے جہاں سے سامان اندر پہنچایا جاتا ہے۔"

"تمہیں یقین ہے کہ اس وقت کچن کا دروازہ کھلا ہوا ہوگا؟"

لیون سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ سارا دن ہی کھلا رہتا ہے۔ اس راستے سے سامان ہی نہیں آتا بلکہ ہوٹل کا عملہ گلی میں رکھے ڈرم میں کوڑا کرکٹ پھینکنے کے لیے بھی اسی دروازے کو استعمال کرتا ہے۔"

"تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ ہمیں مطلوبہ جگہ پر پارکنگ مل جائے گی؟" میں نے اپنے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ لنچ ٹائم میں وہاں گاڑیوں کا کتنا رش ہوتا ہے؟"

"بے فکر رہو۔ میں نے اس کا متبادل بھی سوچ رکھا ہے۔" لیون اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ہم کار سے اترتے ہی اپنے چہروں پر نقاب چڑھالیں گے۔ ایڈی کچن میں کام کرنے والے لوگوں کو قابو کرے گا اور اس بات کو یقینی بنائے گا کہ کچن میں آنے والا کوئی شخص واپس نہ جاسکے۔ پھر میں اور تم کچن کے دروازے سے ریسٹورنٹ میں داخل ہوجائیں گے۔ ہم دونوں کے پاس لوٹ کے سامان کو رکھنے کے لیے تھیلے ہوں گے۔ تم دروازے پر ہی رک جاؤ گے جبکہ میں ریسٹورنٹ کے داخلی دروازے پر جاکر کیش رجسٹر کے پاس کھڑا ہوجاؤں گا اور وہاں موجود تمام ویٹرز کو بار کے پیچھے کھڑا کردوں گا۔"

میں نے بے یقینی کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "صرف دو افراد اتنے سارے لوگوں پر نظر رکھنے کے لیے کافی ہوں گے؟"

لیون نے کہا۔ "وہ جگہ اتنی بڑی نہیں ہے۔ پھر میں ان پر نظر رکھنے کے لیے موجود ہوں گا۔ تم ہر میز پر سے جیولری اور نقد رقم تھیلے میں ڈالتے ہوئے میری طرف آؤ گے اور جب وہ بھر جائے گا تو میں اپنا تھیلا بھی تمہیں دے دوں گا۔ اس کے بعد میں کیش رجسٹر سے بھی تمام رقم نکال لوں گا۔ ہم کچن کے راستے سے باہر آئیں گے اور ایڈی کو ساتھ لے کر گلی میں آنے کے بعد اپنے نقاب اتار کر

تھیلے میں ڈال لیں گے اور کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔‘‘

’’میرے خیال میں ہم تین آدمی اتنی بڑی واردات کے لیے ناکافی ہیں۔‘‘ میں نے بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ’’خاص طور پر اس لیے بھی کہ ریسٹورنٹ میں صرف ہم دونوں ہی جائیں گے اور مجھ اکیلے کو تمام لوٹ کا مال سمیٹنا ہوگا۔ فرض کرو اگر اس دوران کسی عورت نے چیخ ماردی تو کیا ہوگا؟‘‘

’’وہ اتنی خوف زدہ ہو جائیں گی کہ ان کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکل سکے گی۔ اگر کوئی تمہارے لیے مسئلہ کرے تو بلا جھجک اسے تھپڑ مار دینا۔ اس سے دوسروں کو بھی سبق مل جائے گا۔ ہمیں یہ سارا کام دس منٹ میں کرنا ہے۔ دن کے وقت وہاں پولیس کی گاڑی گشت نہیں کرتی اور اگر وہ آ بھی گئے تو انہیں باہر سے کچھ نظر نہیں آئے گا۔ ایک بار ہم کچن کے عقبی دروازے سے نکل کر گلی میں آ گئے تو دو منٹ میں اس علاقے سے نکل جائیں گے۔‘‘

’’اگر پولیس وہاں آ گئی اور اس نے گلی کی ناکا بندی کر دی تو......‘‘

لیون نے ایک بار پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور بیئر کا لمبا گھونٹ پیتے ہوئے بولا۔ ’’اطمینان رکھو۔ اول تو پولیس آئے گی نہیں اور آ بھی گئی تو وہ مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوں گے۔ گلی کی طرف ان کا دھیان بھی نہیں جائے گا۔‘‘

وہ منگل کی رات تھی۔ ابھی ہمارے پاس دو دن کا وقت تھا۔ یہ جان کر ہمیں کافی سکون محسوس ہو رہا تھا کہ عنقریب ہمیں اس بے کاری سے نجات مل جائے گی۔ ہمارے لیے وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایڈی کو بولنے کا مرض تھا، اگر وہ ترنگ میں آ کر چارلین یا کسی اور کے سامنے بول پڑتا تو ہمارا منصوبہ خاک میں مل جاتا۔ اس لیے میری اور لیون کی یہی کوشش تھی کہ اسے بالکل تنہا نہ چھوڑا جائے۔

جمعرات کی سہ پہر چارلین کسی کام سے چلی گئی۔ لیون بھی اس کے ساتھ تھا۔ ان کی واپسی چھ بجے کے قریب ہوئی۔ میں اپنی میز پر بیٹھا تاش کی بازی شروع ہونے کا انتظار کر رہا تھا کہ چارلین میرے پاس آئی اور بے تکلفانہ انداز میں بولی۔

’’کیا بات ہے۔ ان دنوں تم مجھ سے زیادہ بات نہیں کر رہے؟‘‘

میں نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ’’میرا باتیں کرنے کا موڈ نہیں ہے۔ ویسے بھی تم اسکوٹیک کے ساتھ زیادہ مصروف رہتی ہو۔‘‘

چارلین نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور بولی۔ ’’وہ بس آنے ہی والی ہوگی۔ یہ اچھی بات ہے کہ تم لوگ اسے بالکل تنگ نہیں کرتے۔‘‘

’’یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ مکمل عورت نہیں ہے۔ تم اس کی موجودگی کو کس طرح برداشت کر لیتی ہو؟‘‘

’’کیونکہ میں اسے مرد کی نظروں سے نہیں دیکھتی۔ ویسے بھی وہ اپنے آپ کو عورت ہی کہتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے تمہیں اچھا نہیں لگتا۔‘‘

’’تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟‘‘ میں نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

’’کیا مطلب؟‘‘ وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

’’تم نے کبھی غور کیا کہ وہ لیون کو کس انداز سے دیکھتی ہے؟‘‘

’’یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟‘‘

’’یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ تم کچھ نہیں جانتیں۔ اس کا لیون کو ایک مخصوص انداز میں بیئر پیش کرنا اور چوری چوری اسے دیکھتے رہنا کیا ظاہر کرتا ہے؟ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ اسے کسی اور ہی نظر سے دیکھ رہی ہے۔‘‘

چارلین نے یوں کندھے اچکائے جیسے اسے ان باتوں سے بوریت محسوس ہو رہی ہے، حالانکہ میں جانتا تھا کہ میری باتیں اس کے دل کو لگ رہی ہیں۔ میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ’’اب یہ مت کہنا کہ تم اس سے حسد محسوس نہیں کر رہی ہو۔‘‘

’’مجھے معلوم ہے کہ تم مذاق کر رہے ہو۔ میں نے کبھی ان عورتوں سے حسد نہیں کیا جو لیون کے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ پھر میں ایسی لڑکی سے کیوں جلوں گی جو بے چاری خود نامکمل ہے۔ لیون کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ وہ میرا ہے اور ہمیشہ میرا ہی رہے گا۔‘‘

دوسرے دن بارہ بجے کے قریب میں اور ایڈی پروگرام کے مطابق لیون سے ملنے اس کے گھر پہنچ گئے۔ ہم نے جیکٹ کے پیچھے بیلٹ میں ریوالورز رکھے تھے۔ لیون نے ایک بار پھر پورا منصوبہ دہرایا۔ ابھی اس کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے فون کان سے لگایا اور بولا۔ ’’ٹھیک ہے ہم پہنچ رہے ہیں۔‘‘

میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ کیا ہم تینوں کے علاوہ بھی کوئی اس میں شامل ہے؟‘‘

’’نہیں۔ صرف چارلین ہمیں اپنی کار میں ریسٹورنٹ

تک لے کر جائے گی کیونکہ میں نے اپنی کار صبح ہی وہاں کھڑی کر دی تھی تاکہ بعد میں پارکنگ کا مسئلہ نہ ہو۔"

"لیکن چارلین......؟"

"چارلین کو کچھ معلوم نہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ میں نے اس سے صرف اتنا کہا ہے کہ وہ لنچ کے وقفے میں ہمیں اپنی گاڑی میں کسی جگہ چھوڑ دے۔"

مجھے گزشتہ رات کی بات یاد آ گئی۔ چارلین نے جس انداز میں اسے دیکھا تھا اور جو کچھ کہا تھا، اس کے بارے میں سوچ کر میں پریشان ہو گیا پھر بھی میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "تم نے وہاں سے نکلنے کا راستہ تو اچھی طرح دیکھ لیا ہے نا؟"

"تم پریشان مت ہو۔ میں نے اچھی طرح جائزہ لے لیا ہے۔ اگر پولیس آ بھی گئی تو وہ ہمیں ڈھونڈتی ہی رہ جائے گی۔"

تھوڑی دیر بعد ہم اس بلڈنگ سے نیچے آئے اور چارلین کی کار میں بیٹھ گئے۔ میں اور ایڈی پچھلی نشست پر تھے جبکہ لیون اس کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔ چارلین اپنی عادت کے برعکس خاموش تھی اور اس نے ہم لوگوں سے کوئی بات نہیں کی۔ شاید لیون نے اسے منع کر دیا ہوگا یا پھر اسے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہم کیا کرنے جا رہے ہیں اور وہ اس کا حصہ بننا نہیں چاہتی تھی۔

ڈویژن اسٹریٹ پر ہمیشہ کی طرح رش تھا اور لنچ کا وقفہ ہونے کی وجہ سے تمام ریسٹورنٹ بھرے ہوئے تھے۔ ہماری گاڑی کا رخ مغرب کی جانب تھا۔ وہاں پہنچ کر چارلین نے گاڑی داہنے ہاتھ مارش فیلڈ پر موڑ دی۔ سڑک کے پار ہی گلاس سلپرز تھا۔ جیسا کہ لیون نے کہا تھا، اس کی کار ریسٹورنٹ کے عقب میں گلی کی مخالف سمت کھڑی ہوئی تھی۔ چارلین نے ہمیں مقررہ جگہ پر گاڑی سے اتار دیا۔ میرے اور لیون کے کندھوں پر ایک ایک تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ چارلین اس وقت بھی خاموش رہی لیکن جب لیون آگے بڑھنے لگا تو اس نے اسے اپنی جانب کھینچا اور اس کے ماتھے کو چوم لیا۔ پھر وہ گاڑی لے کر وہاں سے چلی گئی۔

ہم سڑک پار کر کے گلی میں داخل ہوئے اور اپنے چہروں پر ماسک چڑھانے کے بعد اپنے پستول نکال لیے۔ پھر ہم کچن کا عقبی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ وہاں دیوار کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے ایلومینیم کے سنک لگے ہوئے تھے اور تین قطاروں میں میزیں لگی ہوئی تھیں جن پر نصف درجن میکسیکن کام کر رہے تھے جبکہ ان کی راہنمائی اور نگرانی کے لیے دو سفید فام بندے بھی وہاں موجود تھے۔ پہلے تو انہوں نے ہماری موجودگی کا نوٹس نہیں لیا لیکن جب لیون نے پستول کا دستہ ایک سفید فام کے منہ پر مارا تو وہ اپنی جگہ پر منجمد ہو کر رہ گیا۔ لیون نے اسے کونے میں دھکیلا اور اس کے سر پر فرائی پین دے مارا۔ سب لوگوں کی توجہ اس جانب ہو گئی۔ ایڈی اور میں نے باقی ماندہ افراد کو بھی کونے میں دھکیلا۔ ایڈی نے انہیں سختی سے خاموش رہنے اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا رہنے کی ہدایت کی۔ ان کی طرف سے ہمیں کوئی زیادہ خطرہ نہیں تھا اور نہ ہی کسی مزاحمت کا امکان تھا کیونکہ ہم ان کی دولت لوٹنے نہیں آئے تھے۔ پھر میں اور لیون ریسٹورنٹ کے دروازے کی جانب بڑھے اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سیکنڈ فلور پر واقع ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئے۔

لیون تیزی سے کیشیر کی جانب بڑھا۔ وہ ایک لمبے قد کا خوش شکل شخص تھا اور دروازے کے ساتھ ہی بار کے کونے پر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اپنی گن پیٹی میں اڑس لی اور کچن کے دروازے کے قریب والی میز سے کارروائی کا آغاز کیا۔ جہاں تین عمر رسیدہ خواتین بیٹھی چائے اور بسکٹوں سے شوق فرما رہی تھیں۔ پہلے تو انہوں نے میری جانب توجہ نہیں دی پھر ان میں سے ایک مجھے ویٹر سمجھی کیونکہ جب میں نے اس کے ہاتھ سے گھڑی اتاری تو وہ اس گستاخی پر مشتعل ہو گئی لیکن میرے ماسک پر نظر پڑتے ہی اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ دوسری دو خواتین نے بھی کوئی مزاحمت نہ کی اور جو کچھ ان کے پاس تھا وہ خاموشی سے میرے حوالے کر دیا پھر میں نے ریسٹورنٹ کے فرنٹ ڈور کے قریب سے ایک عورت کے چیخنے کی آواز سنی۔ یقیناً وہ لیون کی پستول اور ماسک دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی ہوگی۔ باقی سب لوگ اس طرح خاموش ہو گئے جیسے کلاس روم میں ٹیچر آ گیا ہو۔

لیون نے اپنی عادت کے مطابق نرم لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "تمام لوگ اپنی نقدی، جیولری اور گھڑیاں میز پر رکھ دیں اور اپنی جگہ خاموشی سے بیٹھے رہیں۔ زبان ہلانے کی کوئی احمقانہ حرکت کرنے یا بھاگنے کی کوشش نہ کی جائے۔ ہمارے آدمی کچن اور ریسٹورنٹ کے دروازے پر موجود ہیں۔" پھر اس نے ان چاروں ویٹرز جن میں دو خواتین بھی شامل تھیں، مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم چاروں بھی کاؤنٹر کے پیچھے جا کر کیشیر کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔" انہوں نے حکم کی تعمیل میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ میں ہر میز پر جا کر نقدی اور دیگر اشیا سمیٹ رہا تھا۔ جب

ایک لڑکے نے اپنی گرل فرینڈ کے سامنے اسمارٹ بننے کی کوشش میں کچھ کہا تو میں نے کوئی لحاظ کیے بغیر اس کے جبڑے پر مکا رسید کر دیا۔ اس کے بعد کسی شخص نے میرے لیے مسئلہ پیدا نہیں کیا۔

میں تقریباً آدھی میزوں سے فارغ ہو چکا تھا۔ جب میرا تھیلا بھر گیا تو لیون نے اپنا تھیلا مجھے پکڑا دیا۔ پھر میں نے اس کی آنکھوں میں سختی دیکھی۔ وہ تیزی سے اس میز کی جانب بڑھا جہاں ایک بھاری بھرکم شخص ڈارک سوٹ میں ملبوس سیل فون پر گفتگو کر رہا تھا۔ لیون کو دیکھتے ہی وہ اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔ لیون نے اپنے پستول کے دستے سے اس کی کھوپڑی پر ضرب لگائی تو اس کے سر سے خون بہنا شروع ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر خواتین نے چلانا شروع کر دیا۔

''اس نے پولیس کو فون کیا تھا۔'' میں نے لیون سے کہا۔ ''ہمیں بہت کچھ مل گیا ہے۔ اب یہاں سے نکل چلو۔''

لیون نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ وہ اس شخص کی جامہ تلاشی لے رہا تھا۔ گولڈ واچ، ہیرے کی انگوٹھی اور کوٹ کی اندرونی جیب سے اس کا پرس نکالنے کے بعد اس نے یہ سب چیزیں تھیلے میں ڈالیں اور بار کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی نظریں اب بھی اس شخص پر جمی ہوئی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ کسی قیمت پر بھی اس شخص کو یہ پلان تباہ کرنے نہیں دے گا۔

''آجاؤ۔'' میں نے لوٹ کے مال سے بھرے ہوئے بیگ کو پکڑتے ہوئے کہا۔ ''میں جا رہا ہوں۔'' اور یہ کہہ کر کچن کی طرف جانے لگا۔ لیون نے اپنی پستول کا رخ میری جانب کر لیا اور ہم ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ وہاں اتنی خاموشی تھی کہ میں اپنے سانسوں کی آواز بھی سن سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ لیون کسی دوسرے کا مشورہ ماننے کے بجائے مرنے کو ترجیح دے گا لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ یہاں مزید رکنا ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ پولیس سائرن کی آواز نے میری سماعت کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا۔ ایک اسکواڈ کار ریسٹورنٹ کے مرکزی دروازے کی جانب آ رہی تھی جبکہ دوسری کار سڑک کے عین درمیان میں کھڑی ہو گئی تھی۔ جیسے ہی میں نے کچن کی طرف بڑھنا شروع کیا تو لیون نے ریسٹورنٹ کے پانچوں ملازمین پر نگاہ ڈالی اور بولا۔ ''مجھے تم میں سے ایک کی ضرورت ہو گی۔''

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی ویٹرز میں سے ایک سیاہ بالوں والا لڑکا دوسروں کو دھکیلتا ہوا باہر آیا اور لیون کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ خوفزدہ ہے یا پھر ہیرو بننا چاہ رہا ہے۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو۔ ہمیں ایک یرغمالی مل گیا تھا۔ میں نے ان دونوں کو اس وقت تک کور کیا جب تک وہ میرے پاس سے نہ گزر گئے۔ پھر ہم تینوں کچن کی جانب بڑھنے لگے۔ اس سے پہلے کہ ہم وہاں سے نکل پاتے، پولیس ریستوران میں داخل ہو گئی۔ گاہکوں نے پولیس مقابلے کے خطرے کے پیش نظر میزوں کے نیچے جھکنا شروع کر دیا۔ اسی وقت میں نے ایک فائر کی آواز سنی۔ یوں لگا جیسے گولی میرے دائیں جانب سے گزر گئی ہو۔ میں دیوار سے ٹکرایا اور فرش پر گر گیا۔

لیون نے فوراً ہی ویٹر کو اپنے سامنے کر لیا اور اپنا پستول اس کے سر پر رکھ دیا۔

''ہتھیار پھینک دو۔'' ایک پولیس والا چلایا۔ ''تمہارے لیے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہم نے گلی کی بھی ناکا بندی کر دی ہے۔''

اسی دوران کچن سے کسی کے شور مچانے کی آواز آنے لگی۔

لیون نے میری طرف دیکھا۔ میں اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھ گیا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور چھت کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ پولیس والوں سمیت وہاں موجود تمام لوگ پھرتی سے جھک گئے تو اس نے ویٹر کو چھوڑ دیا اور سیڑھیوں کی جانب مڑ گیا۔ اچانک ہی ایک پولیس والا اٹھا اور اس نے لیون پر فائر کر دیا۔ اس دوران ویٹر تیزی سے لیون کی جانب لپکا اور پولیس والے کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ لیون نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر سیڑھیوں کی جانب دوڑ لگا دی۔ اسے بھاگتا دیکھ کر ایک پولیس والا چلایا۔

''وہ بھاگ رہا ہے۔''

اس کے بعد دوسرے لوگ بھی چلانے لگے لیکن میں ان آوازوں پر دھیان نہیں دے رہا تھا اور نہ ہی مجھے اپنے جسم سے بہنے والے خون کی کوئی فکر تھی بلکہ اس بات پر اطمینان ہو رہا تھا کہ کم از کم لیون باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا پھر میں نے اس لڑکے پر نگاہ ڈالی، وہ بھی مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

''اسکوئیک!'' میں نے دھیرے سے سرگوشی کی۔

اس نے میری آواز نہیں سنی۔ وہ کچھ سننے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔

ایڈی نے کوئی مزاحمت کیے بغیر ہی اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ مجھے اسپتال لے جایا گیا اور پھر ہم پر مسلح ڈکیتی کا الزام عائد کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس

جرم کی سزا دس سے بیس سال ہو سکتی تھی۔ بعد میں لیون کے بارے میں ہمارے وکیل اور کیون نے جو کچھ بتایا۔ اس کے مطابق وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا چھت کی طرف بھاگا اور وہاں سے بغلی عمارت کی چھت پر چھلانگ لگادی اور وہاں سے سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اترتے ہوئے ملوکیہ ایونیو کی طرف نکل گیا جبکہ پولیس والے اسے ریسٹورنٹ کی عقبی گلی میں تلاش کرتے رہے پھر وہ پیدل چلتا ہوا اسٹیشن تک پہنچا اور ٹرین میں سوار ہو کر زی تھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

وہ تقریباً دو ہفتے تک روپوش رہا۔ مجھے اور ایڈی کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہوگا لیکن پولیس والے جانتے تھے کہ ان کا سراغ کس ذریعے سے مل سکتا ہے۔ دورانِ تفتیش وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ ہمیں چارلین نے اپنی گاڑی میں ریسٹورنٹ کے سامنے اتارا تھا۔ جب اس سے پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے اعتراف کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ پولیس کو یقین تھا کہ لیون جلد یا بدیر چارلین سے ضرور رابطہ کرے گا اور ایسا ہی ہوا۔ وقوعہ کے دو ہفتے بعد اس نے چارلین کو فون کیا۔ اسے پیسوں کی ضرورت تھی تاکہ کچھ عرصے کے لیے جنوب کی طرف چلا جائے اور معاملہ ٹھنڈا ہونے تک وہیں رہے۔ انہوں نے صبح سویرے ایک کافی شاپ میں ملنے کا پروگرام بنایا جو گلی کے بارے سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ ایک بوتھ میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی جبکہ پولیس والے گاہکوں اور ویٹرز کے روپ میں وہاں موجود تھے۔ لیون نے دروازے میں داخل ہوتے ہی خطرے کی بو سونگھ لی۔ وہ واپس جانے کے لیے پلٹا ہی تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور کے بھیس میں دو پولیس والوں نے اس کا راستہ روک لیا۔ اس نے اپنے دفاع میں گولی چلانا چاہی لیکن پولیس نے پہلے ہی اس پر فائر کھول دیا۔

اس واقعے کے بعد چارلین نے کلب کے بار میں آنا چھوڑ دیا پھر اس نے اپنی ملازمت ترک کر دی اور شہر چھوڑ کر چلی گئی شاید اسے یہ ڈر تھا کہ جیل سے باہر آنے کے بعد میں اور ایڈی نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کریں حالانکہ اسے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ لیون کے مر جانے کے بعد ہم دونوں میں سے کسی ایک کو ہی اس کی جگہ لینی تھی اور یہ بات صرف ہم ہی سمجھ سکتے تھے۔ البتہ ایک بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ اسکوٹیک نے ایسا کیوں کیا اور لیون کو بچانے کے لیے کیوں درمیان میں آگئی۔ میں اور ایڈی جیل کے میدان میں چہل قدمی کرتے ہوئے اکثر اس بارے میں گفتگو کرتے ہمارا خیال تھا کہ اس نے ہی لیون کو اس جگہ ڈاکا ڈالنے کا آئیڈیا دیا ہوگا جہاں وہ کام کرتی تھی۔ وہاں کا ... محلِ وقوع، واردات کے لیے مناسب وقت اور وہاں سے بھاگنے کے بارے میں تمام تفصیلات اسی نے مہیا کی ہوں گی۔ شاید اس طرح وہ اپنے آپریشن کے لیے شارٹ کٹ کے ذریعے یک مشت رقم حاصل کرنا چاہ رہی تھی۔

ایڈی اکثر کہا کرتا۔ ''وہ لیون کو بچانے کے لیے اس کے سامنے کیوں آئی؟ کیا وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ پولیس والا اس پر گولی نہیں چلائے گا؟''

شاید ہم دونوں ہی اس سوال کا جواب جانتے تھے لیکن کسی میں ہمت نہیں تھی کہ اسے زبان پر لاتا۔

اخبارات نے اسے یرغمالی ہیرو قرار دیا۔ اس کی جرأت مندی اور بہادری کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ کچھ لوگوں نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ اسے اپنے آپ کو یرغمالی کے طور پر پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ اکثریت کا خیال تھا کہ اس نے ریسٹورنٹ میں موجود لوگوں اور عملے کی جان بچانے کے لیے ایسا کیا ورنہ لیون اپنے آپ کو بچانے کے لیے کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتا تھا۔

اسکوٹیک کے والدین اس پر گولی چلانے کے الزام میں پولیس کے خلاف مقدمہ دائر کر سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس طرح شاید یہ بھید کھل جاتا کہ اسکوٹیک درحقیقت کون تھا؟ تھی اور یہ بات ان کے لیے شرمندگی کا سبب بن سکتی تھی۔ ویسے بھی وہ عرصہ ہوا اسے اپنی زندگی سے نکال چکے تھے اور اس کا وجود ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ لوگ اسے ایک ہیرو کے طور پر یاد رکھیں اور اس کی تدفین ایک عمدہ سے سوٹ میں ہو۔

ایڈی کہا کرتا تھا۔ ''میں نے کبھی اس کے بارے میں زیادہ نہیں سوچا لیکن آخر میں اس نے اپنے مرد ہونے کا ثبوت دے ہی دیا۔''

میں نے مرتے وقت اس کی نرم مسکراہٹ اور پھر آنکھوں کا بند ہونا دیکھا تھا اور یہ منظر زندگی بھر کے لیے میرے ذہن کے پردے پر محفوظ ہو گیا تھا۔ میں ایڈی کو کیسے بتاتا کہ محبت ایک میٹھا زہر ہے جسے کچھ لوگ آئسکریم کی طرح ایک دفعہ میں کھا جاتے ہیں اور کچھ لوگ پسندیدہ مشروب کے مانند گھونٹ گھونٹ حلق میں اتارتے ہیں۔ لیون اور اسکوٹیک کو بھی اس زہر کی مٹھاس لے ڈوبی۔

دُہرا جرم

نشور ہادی

مشاہدہ کہتا ہے کہ جو لوگ بے باکی سے حالات کا سامنا کرنے کے عادی ہوتے ہیں وہ ہی درحقیقت مقدر کے بادشاہ ہوتے ہیں لیکن... جو آنکھیں چرانے کے عادی ہوں وہ تمام عمر خود سے بھی نظریں نہیں ملا پاتے۔ اگرچہ وہ بھی کسی شہزادے سے کم نہ تھا مگر حالات روپ بدل بدل کر اسے آزما رہے تھے۔ تنہا لمبی مسافت... طوفان بادوباراں کا خوف... بے شمار بھید بھری باتوں کی پردہ پوشی اور... پُراسرار راتوں کے قصے جانے کتنی داستانیں رقم کر جاتے ہیں۔ درد کی کتنی لہریں اندر سے ہلا کر رکھ دیتی ہیں اور وہ... یہ سارے عذاب تنہا جھیلنے پر مجبور تھا۔ کچھ کہتا تو نظروں سے گرتا اور چپ رہتا تو دل سے اترتا... عجب مشکل تھی۔ پانی... جو سمٹ کر آنکھ میں ٹھہرے تو آنسو اور زمین پر پھیلے تو سمندر... اور وہ تھا کشتی کا مسافر جسے سمندر کی گہرائی کا قطعی کوئی اندازہ نہ تھا۔ اپنی نارسائی پر جب اس کی آنکھ سے پانی کا وہ قطرہ آنسو بن کر ٹپکا تو سمندر کی لہروں میں گویا طوفان برپا کر گیا لیکن کہتے ہیں کہ قدرت کبھی ناانصافی نہیں کرتی۔ جس کی جتنی خطا ہوتی ہے سزا بھی اتنی ہی دیتی ہے۔ دھیرے دھیرے وہ بھی شاید قدرت کے اس پیمانے کو بھرتا جا رہا تھا لیکن زندگی کے اس موڑ پر اگر اس کی شریک حیات اسے اپنی شراکت کا احساس نہ دلاتی تو اس کے لڑکھڑاتے قدم کبھی منزل مقصود کی خوشی نہ پاتے۔ شعور و آگہی کا ایک لمحہ اسے یہ ادراک دے گیا کہ ہم سفر اگر مزاج آشنا کے ساتھ ساتھ درد آشنا بھی ہو تو زندگی کس قدر سہل ہو جاتی ہے۔

محبت کے شیش محل کو چشم تر میں قید کرنے والے ایک دلبر کی ستم طرازیاں

بریکوں کی چرچراہٹ کی آواز دور تک پھیلی۔

سڑک پار کرتے ہوئے نوجوان جوڑے نے بوکھلا کر خود کو اس کار کی زد سے بچانے کی کوشش کی۔ کار چلانے والے جوان العمر صبور نے بھی اپنی دانست میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی لیکن حادثہ ہو ہی گیا۔ نوجوان تو کار کی زد پر براہِ راست آیا تھا۔ زد پر آنے سے ذرا پہلے اس نوجوان نے اپنی ساتھی لڑکی کو بڑی زور سے دھکا دے دیا تھا۔ اس لڑکی پر صبور کی اچٹتی سی نظر پڑی تھی اور اسے پل بھر کے لیے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ اس کے لیے کوئی اجنبی لڑکی نہیں تھی۔ اس دھکے کے باعث وہ سڑک پر اس طرح گری کہ کار کی زد پر نہیں آسکی لیکن نوجوان نہ بچ سکا۔ کار کی رفتار اتنی ہی تیز تھی کہ بریک لگنے کے باوجود اس کی ٹکر سے نوجوان اچھل کر سڑک کے کنارے لگے ہوئے درختوں میں سے ایک درخت سے جا ٹکرایا۔

صبور گھبرا گیا۔ فوری طور پر اس کے دماغ میں یہی آیا کہ بھاگ نکلے۔ اس کا پیر غیر شعوری طور پر ایکسلریٹر پر پہلے ہی جا چکا تھا۔

تیز رفتار ڈرائیونگ صبور کی عادت تھی۔ سڑکیں سنسان ملنے کی صورت میں وہ کچھ زیادہ ہی بے قابو ہو جاتا تھا۔ وہ سڑک بھی ایسی ہی تھی جہاں غروب آفتاب کے وقت ہی بڑی حد تک سناٹا ہو جاتا تھا۔ اِکّا دُکّا ہی گاڑیاں آتی جاتی نظر آتی تھیں۔ سڑک کی دونوں طرف بنگلے بنے ہوئے تھے۔ یہ علاقہ ہی رہائشی تھا۔ ٹریفک کی گہما گہمی شاہراہوں پر تو قریباً آدھی رات تک رہتی تھی لیکن ان شاہراہوں سے ادھر ادھر نکلنے والی، بنگلوں کے سامنے کی بھی سڑکیں خاصی حد تک ویران نظر آتی تھیں۔

صبور کی کار تیز رفتاری سے ایک ایسی ہی سڑک پر مڑی تھی۔ موڑ کے وقت صبور نے کار کی رفتار کم بھی کی تھی لیکن پھر فوراً ہی ایکسلریٹر پر اس کا دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ اس کی جیب میں پڑے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی بھی اسی وقت بجی تھی۔ اسی کی وجہ سے صبور کا دھیان کچھ بٹا اور وہ سڑک پار کرنے والے اس جوڑے کو بروقت نہیں دیکھ سکا۔

بنگلوں کی قطاریں ختم ہوتے ہی ایک چھوٹا سا چوراہا تھا جہاں سے صبور نے کار بائیں جانب موڑی۔ پھر ایک چوراہا آیا تو وہ دائیں جانب مڑا۔ اس طرح وہ بار بار موڑ لیتا ہوا جائے حادثہ سے خاصی دور نکل گیا۔ تیز رفتاری کے باعث اتنی دور نکل آنے میں اسے پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اسی مختصر دورانیے میں رات نے اپنے سیاہ پر

پوری طرح پھیلا دیے تھے۔ بنگلوں کی کھڑکیاں اور پھاٹک روشن نظر آنے لگے تھے۔

صبور بھاگ تو نکلا تھا لیکن اب اس کا ضمیر اسے بار بار ملعون کر رہا تھا۔ اس سے ایک سنگین جرم کے بعد ایک غیر انسانی اور غیر اخلاقی حرکت بھی سرزد ہوئی تھی۔ اسے رک کر دیکھنا تو چاہیے تھا کہ اس حادثے کے نتیجے میں اس نوجوان جوڑے کی کیا حالت ہوئی تھی۔ وہ ان زخمیوں کو اپنی ہی کار میں کسی قریبی اسپتال تک پہنچا سکتا تھا۔

لیکن ضمیر کی ملامت کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں یہ بات بھی تھی کہ بریکوں کی تیز چرچراہٹ سن کر بنگلوں کے مکین باہر نکلتے یا نہ نکلتے، بنگلوں کے چوکیداروں کا اس طرف جھپٹ پڑنا تو ایک لازمی امر تھا۔ صبور ان کے نرغے میں پھنس جاتا۔ ممکن تھا کہ وہ سب اسے مارنا بھی شروع کر دیتے۔ ایسا ایک آدھ واقعہ صبور کے مشاہدے میں آ چکا تھا۔

کشمکش کی اس حالت میں صبور نے کار ایک جگہ روک دی۔ وہ نسبتاً زیادہ تاریک جگہ تھی۔ جو ہونا تھا، وہ تو اب ہو ہی چکا، صبور سوچتا ہوا کار سے اترا۔ اب صرف اپنے بچاؤ کی فکر کرنا چاہیے۔ اسے اندیشہ تھا کہ شاید کسی بنگلے کے چوکیدار نے کار کا نمبر نوٹ کر لیا ہو۔

وہ کار صبور کی نہیں، اس کے ایک دوست جاوید کی تھی جو اسی شام کسی کام سے ایک دن کے لیے لاہور گیا تھا۔ صبور کی کار اسی دن خراب ہوئی تھی اور مکینک نے کہا تھا کہ کار کی درستی اگلے روز دوپہر سے پہلے ممکن نہیں تھی۔ جاوید کو اس کا علم تھا۔ اسی لیے اس نے خود ہی صبور کو اپنی کار کی پیشکش کی تھی اور کہا تھا کہ وہ ایک دن کے لیے شہر سے جا رہا ہے اس لیے اسے کار کی ضرورت بھی نہیں۔

صبور اسے اسی کی کار میں ائرپورٹ تک چھوڑنے چلا گیا تھا۔ وہاں سے واپسی پر اس نے خاصا وقت اپنے ایک اور دوست کے گھر پر اس سے گپ شپ میں گزارا تھا۔ وہاں سے وہ اپنے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا کہ وہ نوجوان جوڑا اس کی تیز رفتاری اور ذرا سی عدم توجہی کے باعث کار کی زد میں آ گیا۔

جائے حادثہ سے اتنی دور نکل آنے کے بعد اب بھی صبور کا دماغ صحیح طور پر کام نہیں کر رہا تھا۔ کسی بھی فیصلے پر عمل کرنے سے پہلے اس پر سوچ بچار کی سکت ہی نہیں رہی تھی۔ اس نے کار وہیں چھوڑی اور تیز رفتاری سے پیدل چلتا ہوا قریب کی ایک شاہراہ کی طرف بڑھا۔ اب تک اس کے دماغ میں یہ بات رہی تھی کہ وہ نوجوان جوڑا بہت بری طرح زخمی ہوا ہوگا لیکن اب اچانک اسے خیال آیا کہ وہ دونوں کہیں مر ہی نہ گئے ہوں۔

صبور اس خیال سے اندرونی طور پر کپکپا گیا۔ اگرچہ وہ لڑکی کار کی لپیٹ میں آنے سے بچ گئی تھی لیکن صبور حادثے کے وقت اتنی شدت سے بوکھلا گیا تھا کہ کچھ دیکھ ہی نہیں سکا تھا۔ بس ایک بات اس کے ذہن میں رہ گئی تھی کہ اس نے اس لڑکی کو شاید پہلے بھی کہیں دیکھا تھا لیکن اس نے یہ بھی سوچا کہ کسی کو دیکھ کر بعض اوقات خوامخواہ بھی یہ احساس ہوتا ہے۔ یہ قطعاً ضروری نہیں تھا کہ اس نے اس لڑکی کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہو۔

شاہراہ پر پہنچ کر اس نے ایک ٹیکسی روکی۔ اس نے اپنے گھر جانے کا فیصلہ کیا لیکن اچانک بدل بھی دیا۔ اسے خیال آیا تھا کہ اسے جائے حادثہ پر جا کے یہ تو جاننا چاہیے کہ وہ دونوں صرف زخمی ہی ہوئے تھے یا مر گئے تھے۔ اسے یہ اندیشہ تو تھا کہ شاید کسی نے کار کا نمبر دیکھ لیا ہو لیکن اس کا امکان نہیں تھا کہ کسی نے اس کا چہرہ بھی دیکھ لیا ہو۔ جائے حادثہ پر جمع ہونے والوں میں سے کوئی بھی اسے پہچان نہیں سکتا تھا۔

اس نے ٹیکسی ان بنگلوں کی عقبی گلی میں رکوائی جہاں حادثہ ہوا تھا۔ وہاں سے وہ پیدل چلتا ہوا گلی عبور کر کے مڑا اور پھر اس سڑک کے کونے پر پہنچ گیا جہاں اسے دور ہی سے پولیس کی دو گاڑیاں نظر آ گئیں۔ لوگوں کی بھی بہت بڑی تو نہیں لیکن اچھی خاصی تعداد جمع ہو چکی تھی۔

دھڑکتے دل کے ساتھ صبور جائے حادثہ کی طرف بڑھنے لگا۔ اسی وقت اس کے موبائل فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ جب وہ حادثے کے وقت بجی تھی تو صبور کال ریسیو نہیں کر سکا تھا۔

اب صبور نے جیب سے موبائل نکالا۔ اسے جو توقع تھی، وہ درست ثابت ہوئی۔ وہ اس کی بیوی سلطانہ کی کال تھی۔

”کہاں رہ گئے صبور؟“ سلطانہ نے اس کی آواز سننے کے بعد پوچھا۔

”میں تو تمہیں بتا کے گھر سے چلا تھا سلطانہ کہ مجھے واپسی میں کچھ دیر ہو جائے گی۔“ صبور نے جواب دیا۔ ”ائرپورٹ پر جاوید کو چھوڑنے کے بعد میں لوٹتے ہوئے راستے میں ایک دوست کے پاس رک گیا تھا۔ وہاں سے اب میں گھر پہنچ چکا ہوتا لیکن ایک جگہ ٹیکسی کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ اس بے وقوف ٹیکسی ڈرائیور کا اسپیئر وہیل پہلے ہی پنکچر ہو چکا تھا۔ مجبوراً مجھے ٹیکسی چھوڑنا پڑی، یہاں سے اب ٹیکسی بھی مشکل سے ملے گی۔“

سلطانہ کو اس کا علم تو تھا کہ صبور کی کار خراب ہوگئی تھی لیکن اس وقت تک صبور نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے جاوید کی کار مل گئی تھی۔

سلطانہ نے پوچھا۔ ''کہاں ہیں آپ اس وقت؟''

صبور نے جگہ کا نام بتایا۔

سلطانہ بولی۔ ''ہاں، وہاں سے ٹیکسی اتفاقاً ہی جلدی مل سکتی ہے۔ آپ وہاں سے کسی قریبی شاہراہ کا رخ کریں۔''

''یہی کرتا لیکن یہاں مجھے ایک جگہ پولیس کاریں اور لوگوں کا ہجوم نظر آرہا ہے، شاید کوئی ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔''

''ایکسیڈنٹ تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ آپ گھر آنے کی فکر کریں۔''

''میں آتا ہوں۔ یہاں سے گھر پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی، بس ٹیکسی مل جائے۔''

سلطانہ نے کچھ کہا تھا جو صبور توجہ سے نہ سن سکا۔ اس نے موبائل بند کر دیا تھا۔ اس کی توجہ ان دو آدمیوں کی طرف مبذول ہوگئی تھی جو جائے حادثہ کی طرف سے آرہے تھے۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ ''نہ جانے وہ بے چاری بھی زندہ بچے گی یا نہیں۔''

لفظ ''بھی'' سن کر صبور کا دل بہت زور سے اچھلا۔ اس سے وہ یہی مطلب اخذ کر سکتا تھا کہ جولڑکی کے ساتھ تھا، اس کی موت واقع ہوچکی تھی۔

''کیا کوئی ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے بھائی؟'' صبور بے اختیار ان سے پوچھ بیٹھا۔

وہ دونوں رک گئے۔ ایک بولا۔ ''کوئی کاروالا مار کے بھاگ گیا ہے۔''

''کیا کوئی مر بھی گیا ہے؟'' صبور نے مزید تصدیق چاہی۔

''ہاں بھائی صاحب! بڑی خوف ناک موت ہوئی ہے۔ ہم نے تو ایکسیڈنٹ ہوتے دیکھا نہیں، لوگوں کی باتیں سنی ہیں۔ جس نے دیکھا ہے، اسی نے بتایا ہوگا کہ وہ بے چارہ کار کی ٹکر سے اچھل کر ایک درخت سے جا ٹکرایا تھا۔ درخت سے ٹکرا کر اس کا سر پھٹ گیا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی، وہ بچ گئی۔ ابھی ابھی ایک ایمبولینس اسے لے گئی ہے۔''

''کار کا نمبر نہیں دیکھا کسی نے؟''

''سنا تو یہی ہے کہ کسی نے نہیں دیکھا۔''

پھر وہ دونوں آدمی آگے بڑھ گئے۔

صبور کو جو کچھ معلوم ہوگیا تھا، اس سے زیادہ وہ کچھ جاننا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اب اسے جائے حادثہ کے قریب جانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

کیا کروں؟ کیا کروں؟ صبور کے دماغ میں یہ سوال دھماکے سے کرنے لگا۔ اسے اچانک یہ خیال بھی آیا کہ اس نے جاوید کی کار چھوڑ کر غلطی کی تھی۔ وہ پولیس کو مل جاتی تو اس کا گرفتار ہونا بھی یقینی ہو جاتا۔ پولیس کو کار کے اسٹیئرنگ کے علاوہ بھی کئی جگہ اس کی انگلیوں کے نشانات مل جاتے۔ یہ تو پولیس کو آسانی سے معلوم ہو جاتا کہ وہ کار جاوید کی تھی اور جاوید پولیس کو یہی بیان دیتا کہ اس نے لاہور جاتے وقت اپنی کار صبور کو دے دی تھی۔

بڑی حماقت ہوئی ہے اس سے۔ صبور سوچتا ہوا ایک طرف بڑھنے لگا۔ اب اسے ٹیکسی کی تلاش تھی جو اسے اس جگہ تک پہنچا سکے جہاں اس نے کار چھوڑی تھی۔ حادثے کے باعث صبور کا دماغ صحیح طور پر کچھ نہیں سوچ سکا تھا ورنہ اس سے یہ حماقت سرزد نہیں ہوتی۔

وہ اس معاملے میں خوش قسمت رہا کہ ٹیکسی اسے جلد ہی مل گئی اور وہ مطلوبہ جگہ پر جلد ہی پہنچ گیا لیکن اس وقت اس کا دل دھک سے رہ گیا جب اسے کار اس جگہ دکھائی نہیں دی جہاں اس نے چھوڑی تھی۔

وہ شروع ہی سے دماغی ناکارکردگی کا شکار رہا تھا اس لیے اسے خیال آیا کہ شاید اسے وہ جگہ بھی یاد نہیں رہی جہاں اس نے کار چھوڑی تھی۔ وہ بوکھلایا اور گھبرایا ہوا آس پاس کی دوسری گلیوں میں چکرانے لگا لیکن کار اسے کہیں دکھائی نہیں دی۔

شاید وہ پولیس کے ہاتھ لگ چکی ہے، صبور اس کے علاوہ کچھ نہیں سوچ سکتا تھا۔ مایوسی اور خوف کے عالم میں اس نے ایک شاہراہ کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اب اسے پھر ٹیکسی کی تلاش تھی تاکہ اپنے گھر جا سکے۔ اسے کچھ اور سوجھ ہی نہیں سکا تھا۔

شاہراہ کی طرف بڑھتے ہوئے وہ مسلسل سوچ رہا تھا کہ اب وہ اپنا بچاؤ کس طرح کر سکتا ہے۔ اگر پولیس اس تک پہنچ گئی، جس کا امکان قوی تھا، تو وہ کیا جواب دے کر خود کو بچا سکے گا؟

ایک صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ حادثے کے وقت اپنی موجودگی کہیں اور ثابت کر سکے۔

مگر کہاں؟

مسلسل یہی سوچتے ہوئے اسے شیما کا خیال آگیا۔ وہ ایک ماڈل گرل ہونے کے ساتھ کچھ اور بھی تھی۔ اس نے صبور سے شادی کرنے کے لیے اس پر ڈورے ڈالے تھے

لیکن صبور اس کے جال میں نہیں پھنسا تھا۔ وہ ایک ٹی وی چینل کے ایک ڈبیٹ شو میں شرکت کے لیے گیا تھا تو وہیں اس کی پہلی ملاقات شیما سے ہوئی تھی۔ شیما کو غالباً کسی سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ صبور ایک جاگیردار کا بیٹا ہے۔ اسی لیے وہ صبور پر مہربان ہوئی تھی۔

ٹی وی چینل کے دفتر میں اس کا آمنا سامنا چھ ماہ قبل ہوا تھا۔ اس وقت تک صبور کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ابھی اس کی شادی ہوئے صرف تین ماہ گزرے تھے۔ شادی سے پہلے تک صبور نے پانچ ماہ کے عرصے میں شیما سے کئی ملاقاتیں بھی کی تھیں لیکن عام مقامات پر۔ اس نے شیما کے ساتھ اس کے گھر جانے کی پیشکش کبھی قبول نہیں کی تھی۔ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے پہلو بچا گیا تھا۔ سلطانہ سے شادی کے بعد وہ شیما سے کبھی نہیں ملا تھا۔ شیما نے دو تین مرتبہ اس کے موبائل فون پر اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن صبور نے اس کی کال ریسیو کرنے سے بھی گریز کیا تھا۔ صبور کا مزاج اور فطرت ہی یہ نہیں تھی۔ ابتی طالب علمی کی زندگی میں اس نے کئی لڑکیوں سے دوستی کی تھی لیکن محض فلرٹ کے معاملے میں بھی اس نے عملاً کوئی اخلاقی حد عبور نہیں کی تھی۔ وہ اب بھی بی اے فائنل ایئر کا طالب علم تھا۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں سلطانہ سے اس کی شادی کے پس منظر میں کچھ خاص حالات تھے۔

شاہراہ پر صبور کو ٹیکسی مل گئی۔ شیما اسے بتا چکی تھی کہ وہ کہاں رہتی تھی۔ اس نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ اکیلی رہتی ہے۔ اپنے والدین کے بارے میں اس کا بیان تھا کہ وہ کسی دوسرے اور چھوٹے سے شہر میں رہتے تھے۔ صبور نے اس کے بیان پر یقین نہیں کیا تھا لیکن اس بارے میں سوچنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔

اچانک اسے خیال آیا کہ وہ شیما کے گھر کی طرف چل تو پڑا ہے مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ شیما اس وقت اپنے گھر پر نہ ہو۔ یہ امکان خاصا قوی تھا کیونکہ ماڈل گرلز کی شامیں گھروں پر نہیں گزرتیں۔

صبور نے اپنا موبائل نکال کر شیما کے موبائل فون پر رابطہ کیا۔

''زہے نصیب!'' دوسری طرف سے شیما کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''اس وقت تم کو میری یاد کیسے آ گئی صبور!'' ان دونوں میں جو ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں، ان میں وہ صبور سے خاصی بے تکلف ہو گئی تھی۔

صبور بولا۔ ''اس وقت تم کہاں ہو؟''

''یہ کیوں جاننا چاہتے ہو؟''

''میں تم سے ملنے تمہارے گھر آ رہا ہوں۔''

یہ سن کر شیما نے ایک پُرمسرت حیرت کا اظہار کیا، پھر بولی۔ ''تم کتنی دیر میں پہنچو گے؟''

''میرا خیال ہے کہ بیس منٹ لگیں گے۔''

''میں کچھ ہی دیر پہلے گھر سے نکلی ہوں۔''

یہ جواب سن کر صبور مایوس ہوا لیکن دوسرے ہی پل اس کی مایوسی ختم ہو گئی جب شیما نے کہا۔ ''لیکن میں فوراً واپس لوٹتی ہوں۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ تم آؤ اور میں گھر پر نہ ہوں۔ میں اس وقت اپنے گھر سے صرف دس منٹ کی ڈرائیو پر ہوں، تم پہنچو گے تو میں گھر پر ہی ملوں گی۔''

☆☆☆

شیما ایک چھوٹے سے لیکن خوب صورت اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ دو کمروں اور ایک ٹی وی لاؤنج کو اس نے خاصی قیمتی اور خوب صورت چیزوں سے آراستہ کیا تھا۔ ٹی وی لاؤنج ہی کو وہ ڈرائنگ روم کے طور پر بھی استعمال کرتی تھی۔

''اس وقت میری مسرت کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔'' شیما بولی۔

اس وقت ٹی وی لاؤنج میں صبور اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

''لیکن ابھی مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔'' وہ جلدی سے پھر بولی۔ ''مجھے پہلے تو تمہیں شادی کی مبارک باد دینا چاہیے تھی۔''

''اچھا ہوا کہ تم نے مبارک باد نہیں دی۔'' صبور نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ اس طرح اس نے اپنا سوچا سمجھا ہوا ایک ڈراما شروع کیا تھا۔

''کیوں؟'' شیما سنجیدہ ہو گئی۔ صبور کی طرف دیکھتے ہوئے وہ کچھ سوچنے بھی لگی تھی۔

صبور نے کہا۔ ''کیا تم یقین کرو گی کہ میں گزشتہ ایک گھنٹے سے سڑک پر خوامخواہ کار ادھر سے اُدھر دوڑا تا رہا ہوں۔''

''مگر کیوں صبور؟''

''ذہنی انتشار کی وجہ سے۔'' صبور نے جواب دیا۔ ''بس اچانک مجھے خیال آیا کہ اس طرح اِدھر اُدھر مارے مارے پھرنے سے بہتر ہے کہ اگر تم مل جاؤ تو میں کچھ وقت تمہارے ساتھ گزاروں۔ گپ شپ میں دل کچھ بہل جاتا ہے۔''

''آخر ہوا کیا ہے؟ تمہارا اپنی بیوی سے کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟''

''ابھی تو نہیں ہوا۔'' صبور نے پھر ٹھنڈی سانس لی۔

''لیکن امکان ہے کہ ہوگا اور بہت زوردار ہوگا۔ یہ شادی میری زندگی کی بہت بڑی حماقت تھی۔ شادی کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ فریقین میں ذہنی ہم آہنگی ہو لیکن میں نے اس بارے میں سوچا ہی نہیں۔ یا یہ کہو کہ مجھے سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ بابا نے حکم صادر کیا اور مجھے اس کی تعمیل کرنا پڑی۔'' وہ اپنے باپ جاگیردار صابر شاہ کو ''بابا'' کہتا تھا۔

''تمہارے چہرے سے بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ تم بہت منتشر ہو۔'' شیما نے کہا۔

صبور کو بالکل یقین نہیں تھا کہ اس کے چہرے پر اس قسم کے تاثرات ہوں گے۔ وہ اس حد تک اداکاری کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا لیکن اس نے شیما کے خیال کی تردید نہیں کی۔

''میں تمہارے ذہنی انتشار کے لیے دوا لاتی ہوں۔'' شیما نے اٹھتے ہوئے کہا اور صبور کے کچھ بولنے سے پہلے تیزی سے اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی۔

صبور سمجھ گیا کہ وہ شراب ہی لائے گی۔ وہ شراب کا عادی نہیں تھا مگر دوستوں میں بیٹھ کر کبھی کبھی پی لیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے یہی سوچا کہ شیما کے ساتھ بیٹھ کر ایک آدھ پیک پینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسے کسی بھی طرح شیما کو اس بات کا گواہ بنانا تھا کہ وہ گزشتہ ڈیڑھ دو گھنٹے سے اس کے ساتھ تھا۔

قانون سے بچنے کی اسے یہی ایک صورت سوجھی تھی۔ پولیس کو وہ یہی بیان دیتا کہ جس وقت حادثہ ہوا، اس سے بھی خاصی دیر پہلے وہ شیما کے اپارٹمنٹ میں تھا۔

یہ بات سامنے آنے پر اس کی بیوی سلطانہ پر یقیناً منفی اثرات پڑتے جو ختم کرنے کے لیے وہ سلطانہ کو سب کچھ سچ سچ بتا دیتا۔ گزشتہ ایک ماہ میں یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ سلطانہ ایک بہت اچھی اور محبت کرنے والی بیوی تھی۔

شیما شراب کی بوتل کے ساتھ پانی کا مگ اور دو گلاس بھی لے آئی۔ پھر دو پیک بنائے۔

''تمہارے ایک نئے بہتر اور خوشگوار مستقبل کے نام۔'' شیما نے کہا اور گلاس ٹکرا کر پہلا گھونٹ لیا۔

''شیما!'' صبور نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''میں سلطانہ سے اپنے تعلقات اس حد تک خراب کر لینا چاہتا ہوں کہ وہ خود ہی طلاق کا مطالبہ کرے۔''

''معاملات اس حد تک خراب ہو گئے ہیں؟'' شیما نے تشویش کا اظہار کیا لیکن اپنے دل میں وہ یقیناً بہت خوش ہوگی۔

''ہاں۔'' صبور نے فوراً ہی دوسرا گھونٹ لیا۔ ''اور اس معاملے میں تم ہی میری مدد کر سکتی ہو۔''

''تمہیں ذہنی اذیت سے بچانے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتی ہوں صبور!'' شیما نے والہانہ انداز میں کہا اور اٹھ کر اس کے پہلو میں آ بیٹھی۔

صبور نے اس سے پہلے کبھی شیما کو اس حد تک بے تکلف ہونے کا موقع نہیں دیا تھا مگر اس وقت اسے ضبط سے کام لینا پڑا۔ وہ شیما کو اپنے بچاؤ کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ......'' صبور نے قدرے رکتے ہوئے کہا۔ ''سلطانہ کو اس بات کا علم ہو جائے کہ میں جب گھر سے چلا تھا، اس کے بعد فوراً ہی تمہارے پاس آ گیا تھا۔ یہ جان کر وہ بہت تلملائے گی۔ آج کے بعد ہم دونوں پبلک پلیسز پر بھی ایک دوسرے سے ملیں گے۔ یہ بات بھی کسی نہ کسی طرح سلطانہ کے علم میں آتی رہے گی۔ کیونکہ تم ماڈل گرل ہو، اس لیے شاید کسی اخباری فوٹوگرافر کو موقع مل جائے کہ وہ ہماری تصویر کھینچ لے اور وہ تصویر اخبار میں بھی چھپوا دے۔ اخبار والے ایسی باتوں کی تاک میں رہتے ہیں۔ ممکن ہے وہ اسکینڈل بنانے کی کوشش کریں اور یہ خبر بھی لگا دیں کہ مشہور ماڈل گرل شیما کو آج کل مختلف مقامات پر ایک طالب علم صبور کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے۔ بات جب یہاں تک پہنچے گی تو ممکن ہے کہ...... بلکہ قوی امکان ہے...... وہ اس مرحلے پر آپے سے باہر ہو جائے گی۔ وہ مجھ سے طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ میں اس کا مطالبہ فوراً مان لوں گا۔''

''یہ سب کچھ تو بہت آسانی سے ہو جائے گا۔'' شیما نے خوش ہو کر کہا۔ ''میں خود کسی اخباری نمائندے کو ایسا اشارہ دے دوں گی کہ وہ ہماری تاک میں رہے گا۔ تصویر بھی کھنچ جائے گی اور خبر بھی چھپ جائے گی اور خبر چھپنے کے بعد...... اگر تم کہو تو میں اخبارات کے لیے یہ بیان بھی جاری کر دوں گی کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں اور تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔''

''یہ بہت اچھا رہے گا۔'' مگر اس کے دل میں یہی تھا کہ شیما کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے بعد ایسا کوئی موقع آنے ہی نہیں دے گا کہ ان کی تصویر چھپے اور اسکینڈل بنے۔

''ارے!'' صبور اپنے سوچے ہوئے منصوبے کے مطابق اچانک کھڑا ہو گیا۔

''کیا ہوا؟'' شیما نے جلدی سے پوچھا۔

''مجھے ابھی ابھی خیال آیا ہے۔'' صبور بولا۔ ''میں ذہنی طور پر اتنا منتشر تھا کہ میں نے کار مناسب جگہ پارک

نہیں کی تھی۔ کہیں پولیس والے اٹھا نہ لے جائیں یا...... اچھا خیر! میں ابھی آتا ہوں۔ کار کسی صحیح جگہ پارک کرآؤں۔''

''کرآؤ۔'' شیما نے کہا۔ ''اگر پولیس کار اٹھا لے گئی ہوگی تو بھی پریشانی کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ اس علاقے کا ایس ایچ او مجھے جانتا ہے۔ میں تمہارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلوں گی۔ کار ہم لے آئیں گے۔ پولیس کوئی کارروائی بھی نہیں کرے گی۔''

''ٹھیک ہے، میں آتا ہوں۔''

''میں بالکونی میں کھڑی ہوکر دیکھتی رہوں گی۔ تم نے کار شاید اسی طرف کھڑی کی ہوگی۔ ادھر ہی کار کھڑی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''ہاں۔'' صبور نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''تم بالکونی میں کھڑی رہنا۔ اگر کار نہ ہوئی تو میں تمہیں اشارہ کردوں گا۔ تم نیچے آجانا تاکہ مجھے اپنی گاڑی میں پولیس اسٹیشن لے جاسکو۔''

صبور کے باہر نکلنے کے بعد شیما نے دروازہ بند کرلیا۔

صبور نیچے پہنچا۔ اپارٹمنٹس کی اس جانب کوئی کار نہیں تھی۔ کچھ آگے جاکر ایک موڑ تھا۔ صبور خوامخواہ اس طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس نے ایک اچٹتی سی نظر سے دیکھ لیا تھا کہ شیما اپنے اپارٹمنٹ کی بالکونی میں کھڑی ہوئی تھی۔

موڑ پر پہنچ کر صبور رکا۔ پھر تیزی سے واپس مڑا اور شیما کی بالکونی کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی ہاتھ سے اشارے کرنے لگا۔ وہ شیما کو جتانا چاہ رہا تھا کہ کار نہیں ہے۔ شیما نے اس کے اشارے دیکھ لیے۔ وہ فوراً بالکونی سے غائب ہوگئی۔

صبور اپارٹمنٹس کے احاطے کے پھاٹک کے قریب جا کھڑا ہوا اور شیما کا انتظار کرنے لگا۔ وہ اپنی منصوبہ بندی سے بہت مطمئن تھا۔ اب وہ پولیس اسٹیشن جاتا تو کار وہاں ظاہر ہے کہ نہیں ملتی۔ اس صورت میں صبور کار کی چوری کی رپورٹ درج کراسکتا تھا۔ شیما کے ساتھ ہونے کی وجہ سے رپورٹ میں یہ بات بھی آجاتی کہ وہ اس وقت شیما کے ساتھ تھا جب کار سے ایک حادثہ ہوا۔ اس طرح پولیس یہ باور کرسکتی تھی کہ جو کار چوری کرکے بھاگا تھا، اسی سے وہ حادثہ ہوا۔

صبور نے جہاں کار چھوڑی تھی، وہ اسے وہاں نہیں ملی تھی۔ اس سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ کار پہلے ہی پولیس کو مل چکی تھی۔

لیکن اس منصوبہ بندی میں ایک جھول بھی تھا جس کی طرف اس کا دھیان نہیں گیا تھا۔ اس نے جو منصوبہ بندی کی تھی، ذہنی انتشار کے عالم میں کی تھی۔ اگر اس نے اپنے منصوبے کا ہر زاویے سے جائزہ لیا ہوتا تو وہ جو کچھ کرتا، زیادہ بہتر طریقے سے کرتا لیکن اسے اب بھی خیال نہیں آسکا تھا کہ منصوبے میں رہ جانے والا ایک جھول آگے چل کر اس کے لیے پریشانی کا سبب بن سکتا تھا۔

شیما کی کار پھاٹک سے نکلتی نظر آئی تو صبور اس کی طرف بڑھا۔ شیما نے کار روکتے ہوئے اپنے برابر کی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ صبور نے بہ عجلت کار میں بیٹھتے ہوئے دروازہ بند کیا۔ شیما کار کو پھر حرکت میں لے آئی۔

''کیا ہوگیا تھا تمہیں کہ کار یہاں کھڑی کردی۔'' شیما بولی۔

''اس طرف بھی اوپر جانے کے زینے ہیں نا!''

صبور نے جواب دیا۔ ''بس یہ خیال آیا تھا کہ ادھر ہی سے اوپر چلا جاؤں اور پھر میں ذہنی طور پر منتشر بھی تھا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔''

''کیا بیگم صاحبہ سے کچھ زیادہ جھگڑا ہوگیا تھا؟'' شیما نے ہنس کر پوچھا۔

''جھگڑا تو نہیں کہا جاسکتا مگر کچھ تلخ باتیں ہوگئی تھیں۔ اچھا اب یہ تو طے کرلو کہ پولیس اسٹیشن پر کہنا کیا ہے۔ یہ تو ظاہر کرنا ہوگا نا کہ میں اتنی دیر سے تمہارے اپارٹمنٹ میں کیوں تھا۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟ کیا کہا جائے؟ میں ایک ماڈل گرل ہوں۔ پولیس خود سمجھ لے گی کہ تم نے اتنا زیادہ وقت میرے اپارٹمنٹ میں کیوں گزارا۔''

''لیکن اس قسم کی بات خود تو نہیں کی جاسکتی نا!''

''تم کیا چاہتے ہو؟''

''یہ کہنا مناسب رہے گا کہ میں کسی ٹی وی چینل کے لیے کوئی ڈراما بنانا چاہتا ہوں۔ کہانی کا ایک ہلکا سا خاکہ میرے ذہن میں ہے اور کیونکہ اس لائن میں میری واقفیت صرف تم ہی سے ہے، اس لیے میں اس کہانی پر بات کرنے کے لیے تمہارا ہی انتخاب کرسکتا تھا۔ زیادہ وقت اس لیے لگا کہ اس ڈرامے کو بنانے کے لیے اس کے بجٹ پر بھی تفصیلی بات چیت ہوئی تھی اور کہانی پر بھی!''

''ہاں، یہ بیان مناسب تو ہے لیکن اس بارے میں کیا کہو گے کہ تم نے کار غلط جگہ پارک کیوں کی تھی؟''

''کہہ دوں گا کہ بس بے دھیانی میں غلطی ہوگئی۔ کیونکہ اس وقت میرے دماغ میں کہانی گھوم رہی تھی اس لیے خیال نہیں رہا تھا کہ کار کہاں کھڑی کررہا ہوں اور کیونکہ

تمہارے گھر میں پہلی مرتبہ آیا تھا اس لیے جانتا بھی نہیں تھا کہ وہاں کار پارک کرنا ممنوع ہے۔"

"وہاں ایک جگہ نو پارکنگ لکھا ہوا تھا۔"

"میں کہہ سکتا ہوں کہ اس پر میری نظر نہیں پڑی۔"

یکا یک شیما نے کچھ منہ بنایا۔

"کیوں؟" صبور نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا میری کوئی بات غلط ہے؟"

"یہ بات نہیں۔" شیما بولی۔ "بس اس لیے تھوڑی سی بور ہوگئی ہوں کہ آج پہلی بار تم مجھ سے ملنے آئے اور یہ کھڑاگ ہوگیا۔ اچھا سنو..... پولیس اسٹیشن سے واپسی پر کیا ارادہ ہے تمہارا؟"

صبور سمجھ گیا کہ شیما کیا چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ "ابھی تمہارے ساتھ ہی رہوں گا شیما! دو تین پیگ تو پیوں گا، کار کی اس گڑبڑ کی وجہ سے میں بھی مکدر تو ہوا ہوں۔"

اس جواب سے شیما خوش ہوگئی۔

☆☆☆

پولیس اسٹیشن پہنچ کر جو بات سامنے آنا چاہیے تھی، وہ آئی۔ کار پولیس نے نہیں اٹھائی تھی۔

"اس کا مطلب ہے۔" شیما ہی بول پڑی۔ "کار چوری ہوئی ہے۔"

"یہ تو بہت برا ہوا۔" صبور بولا۔ "وہ کار میرے ایک دوست کی تھی۔" شیما اس بات پر بالکل نہیں چونکی۔ راستے میں صبور نے اسے اس بارے میں بتایا تھا کہ اس کی کار خراب ہوگئی تھی اس لیے اس کا ایک دوست جاوید، جو اسی شام دو دن کے لیے لاہور گیا تھا تو اپنی کار اسے دے گیا تھا۔

اس موقع پر صبور کو پہلی مرتبہ خیال آیا کہ اس معاملے میں جاوید سے بھی پوچھ گچھ کی جاتی اور وہ پولیس کو بتاتا کہ اپنی کار اس نے ائرپورٹ پر صبور کے حوالے کی تھی۔ اس صورت میں اس کے اور شیما کے بیان کا تضاد سا منے آتا۔

لیکن اب صبور کو اتنی مہلت نہیں ملی تھی کہ وہ کچھ سوچ سکتا اور شیما کے بیان میں کوئی تبدیلی کراتا۔

رپورٹ اسی طرح درج کرانا پڑی جس طرح پہلے ہی طے پا گیا تھا۔

پولیس اسٹیشن سے واپسی پر شیما بولی۔ "اس طرح چوری کی جانے والی کاریں عموماً تو ملتی نہیں ہیں۔"

"ایسی صورت میں مجھے جاوید کو کار کی قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ خیر یہ تو میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا لیکن......"

شیما نے اس کی بات کاٹی۔ "ظاہر ہے کہ یہ تمہارے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ تم ایک بڑے جاگیردار کے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے ہو۔"

"تم نے میری پوری بات نہیں سنی۔" صبور بولا۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کار کسی واردات میں استعمال کی جائے۔"

"اس سے تمہاری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ تم کار چوری کی رپورٹ درج کرا چکے ہو۔"

"پوچھ گچھ تو بہرحال ہوگی۔"

"اب جو ہونا ہے، وہ تو ہوگا۔ جھٹک دو ان باتوں کو ذہن سے اور یہ ضروری بھی نہیں ہے کہ وہ کار کسی واردات میں استعمال کی جائے۔"

"ہاں، یہ ضروری تو نہیں۔"

"بس تو چھوڑو اب یہ ذکر۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

صبور مسکرا دیا لیکن مسکرانے کے لیے اسے خود پر جبر کرنا پڑا تھا۔ اسے پریشانی اب بھی لاحق تھی کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھ سکے گا۔ وہ شیما کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ میں پہنچ گیا۔ فی الحال ضروری تھا کہ وہ شیما کو خوش رکھے۔

"مجھے ایک بات پر حیرت ہے۔" شیما نے بیٹھتے ہی شراب کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم بتا چکے ہو کہ بیگم صاحبہ سے تمہارا کوئی خاص جھگڑا نہیں ہوا تھا، بس تھوڑی سی تلخ کلامی ہوگئی تھی۔ اس کے بعد اتنی دیر ہو چکی ہے، بیگم صاحبہ نے تمہیں ایک بار بھی فون نہیں کیا۔ انہیں پوچھنا تو چاہیے تھا کہ تم کہاں ہو۔ موبائل تو ہے تمہارے پاس...... وہ رابطہ کر سکتی تھیں۔"

"میں نے اپنے موبائل کا سوئچ آف کر دیا ہے۔"

یہ صبور نے شیما سے موبائل پر رابطہ کرنے کے بعد کیا تھا تا کہ گھر واپس پہنچنے کے سلسلے میں اسے کوئی اور بہانہ تراشنا نہ پڑے۔ یہ خیال تو اسے تھا کہ رابطہ نہ ہونے کے باعث سلطانہ پریشان ہوگی لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ بعد میں اسے سب کچھ بتا دے گا۔ یہ بھی کہ جائے حادثہ سے اپنی عدم موجودگی ثابت کرنے کے لیے اس نے ایک ماڈل گرل کا سہارا لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ سلطانہ اسے جھوٹا نہیں سمجھے گی اور نہ اس کے کردار پر شبہ کرے گی۔ شادی کے بعد کم ہی عرصے میں وہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے لگے تھے۔

اس کا جواب سننے کے بعد شیما بولی۔ "کیوں؟ سوئچ آف کیوں کر دیا تھا؟"

"میں نہیں چاہتا کہ میری اور تمہاری رفاقت میں کوئی رخنہ اندازی ہو۔" صبور نے یہ جواب شیما کو خوش کرنے کے

لیے بھی دیا تھا جس پر وہ بعد میں پچھتایا کیونکہ شیما نے خوش ہو کر اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے اس کے ہونٹ چوم لیے تھے۔

''آج اچانک اتنی اچھی لگنے لگی ہوں تمہیں۔'' وہ بولی اور گلاس کی باقی شراب ایک ہی سانس میں پی گئی۔ وہ اب بھی اس کے گلے کا ہار بنی ہوئی تھی اور وہ کسمسا رہا تھا۔

شیما اپنے لیے دوسرا پیگ بناتے ہوئے بولی۔ ''تم بھی اپنا گلاس ختم کرو نا! تم خود کہہ چکے ہو کہ میرے ساتھ دو تین پیگ پیو گے۔''

صبور کو یاد تھا۔ وہ کبھی کبھی دو تین پیگ پی بھی لیتا تھا مگر شیما کو جذباتی ہوتا دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔ شیما کی جذباتیت کے پس منظر میں اس کی ایک خواہش بھی تھی۔ صبور کی شادی سے پہلے بھی وہ اسے اپنے جال میں لانے کی کوششیں کر چکی تھی۔ صبور کی شادی نے اسے مایوس کر دیا ہو گا لیکن اب اچانک اسے یہ نوید ملی تھی کہ صبور اپنی بیوی سے خوش نہیں تھا۔ اب وہ پھر صبور کو اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کر سکتی تھی۔ اس کی کوشش پھر یہی ہوتی کہ صبور اس سے شادی کر لے۔ اس جیسی کسی بھی لڑکی کے لیے صبور جیسا کوئی بھی شخص ایک آئیڈیل ہوتا ہے۔ صبور جو ایک بڑے جاگیردار کا بیٹا تھا۔ اس قسم کی شادیاں عموماً کامیاب نہیں ہوتیں لیکن کم عرصے ہی میں اس قسم کی لڑکیاں مادی طور پر خاصا کچھ حاصل کر لیتی ہیں۔

شیما کے اصرار پر صبور کو اپنا پیگ جلدی ختم کرنا پڑا۔ شیما اس کے لیے دوسرا پیگ بنانے لگی۔ اس وقت تک وہ اپنا دوسرا پیگ آدھا ختم کر چکی تھی۔ اس کی اس ''برق رفتاری'' سے صبور کو یہ اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ وہ جس بات سے بچنا چاہتا تھا، وہ زیادہ جلدی قریب آ جاتی۔ وہ سوچنے لگا کہ شیما سے بچنے کے لیے وہ ایسا کون سا راستہ اختیار کرے کہ شیما اس سے خفا نہ ہو۔

''یہ پیگ میں تم کو اپنے ہاتھ سے پلاؤں گی۔'' شیما نے کہتے ہوئے گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔ ''تم کو میری قسم ہے۔ یہ پیگ میرے ہاتھ سے پیو۔'' اس کا انداز بڑا والہانہ ہو گیا۔

صبور نے ایک چھوٹے سے گھونٹ پر اکتفا کرنا چاہا لیکن شیما نے اسے چھوٹے چھوٹے تین گھونٹ لینے پر مجبور کر دیا۔

''آج میری زندگی کی یہ سب سے خوب صورت رات ہو گی۔'' شیما نے صبور کا گلاس رکھ کر اپنا گلاس اٹھایا اور دو بڑے گھونٹ لیے۔ پھر دوبارہ صبور کا گلاس اٹھایا۔

اسی مختصر دورانیے میں صبور کو ایک تدبیر سوجھ گئی۔ شیما سے نظر بچا کر اس تدبیر پر عمل پیرا ہونے کا موقع بھی اسے مل گیا۔ شیما جب ذرا سا آگے جھک کر اس کا گلاس اٹھا رہی تھی، صبور نے اپنی جیب میں پڑے ہوئے موبائل کا سوئچ آن کر دیا۔

موبائل کھولنے سے جو ہلکی سی میوزیکل آواز آئی، صبور کو اس کا خیال نہیں رہا تھا۔ شیما اس آواز سے اس وقت چونکی جب وہ شراب کا گلاس صبور کی طرف بڑھا رہی تھی۔ صبور وہ آواز سن کر گھبرا سا گیا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر اس نے گھبراہٹ کا اظہار اپنے چہرے سے نہیں ہونے دیا۔

''شاید ہاتھ کا دباؤ پڑ گیا بٹن پر۔'' صبور نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا اور موبائل نکالا۔

اب وہ دوبارہ موبائل بند کرنے پر مجبور تھا مگر اس کے ایسا کرنے سے پہلے ہی موبائل نے کوئی میسج آنے کا سگنل دیا۔

''کوئی میسج آیا ہے۔'' شیما فوراً بولی۔

''ہاں۔'' صبور، میسج اسکرین پر لانے لگا۔

''میسج دیکھ کر بند کر دینا موبائل۔'' شیما نے کہا۔

لیکن میسج پڑھتے ہی صبور کا سارا جسم سنسنا گیا۔ وہ اس کی بیوی سلطانہ کا میسج تھا۔ اس نے اطلاع دی تھی کہ روحی اور ثاقب کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا جس میں ثاقب کی ہلاکت ہو گئی تھی۔

صبور بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے سے پریشانی صاف ظاہر ہونے لگی تھی۔ اسے اپنا ایکسیڈنٹ یاد آ گیا تھا۔

''کیا میسج ہے؟'' شیما نے جلدی سے پوچھا۔

''سلطانہ کی چچازاد بہن اور اس کے منگیتر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ اس کا منگیتر ہلاک ہو گیا ہے۔''

''اوہ!''

''اب میرا جانا ضروری ہو گیا ہے شیما لیکن......''

''لیکن کیا؟'' شیما بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑی۔

''میں دو پیگ پی چکا ہوں۔ بُو تو آئے گی۔ خیر، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ سبھی جانتے ہیں کہ میں پیتا ہوں۔ آئی ایم سوری شیما! مجھے اب جانا چاہیے۔ میں تم سے کل ملوں گا۔''

بات ایسی تھی کہ شیما اسے روک نہیں سکی۔ ہر چند اسے

بڑی کوفت ہوئی ہوگی کہ اس کا شکار کم از کم وقتی طور پر تو اس کے ہاتھ سے نکل ہی رہا تھا۔

''جاؤ گے کیسے؟ اور کہاں جاؤ گے۔''

''ٹیکسی ہی سے جاؤں گا لیکن پہلے سلطانہ سے بات کرنا ہوگی۔''

صبور اس وقت شیما سے بچنا چاہتا تھا۔ میسج کی وجہ سے اس کی خواہش پوری بھی ہوگئی تھی لیکن اس میسج نے اسے... بدحواس کر دیا تھا۔ اسے اپنے ایکسیڈنٹ کے وقت اس لڑکی کا چہرہ کچھ شناسا سا محسوس ہوا تھا لیکن اب سلطانہ کا میسج پڑھ کر اسے یاد آگیا تھا کہ وہ روحی تھی۔ ایکسیڈنٹ کے وقت روحی پر اس کی اچٹتی سی نظر بدحواسی کے عالم میں پڑی تھی اس لیے اسے اس وقت خیال نہیں آسکا تھا کہ وہ روحی تھی۔

اس نے موبائل پر سلطانہ سے رابطہ کیا۔ شیما کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

''تم کہاں ہو صبور!'' سلطانہ کی آواز بھرائی ہوئی سی تھی۔'' تم نے کہا تھا کہ جلد ہی گھر پہنچو گے لیکن نہیں پہنچے۔ اس کے بعد مجھے تمہارا موبائل بند ملتا رہا۔ میں نے ایک میسج بھیج دیا تھا کہ جب بھی تم اپنا موبائل کھولو گے، میسج تمہیں مل جائے گا۔ کیا وہ تمہیں ملا؟''

''مل گیا ہے۔'' صبور نے جواب دیا۔'' یہ ایکسیڈنٹ کہاں ہوا ہے؟''

''تم نے مجھے بتایا تھا نا کہ ایک جگہ کوئی ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ اس وقت تمہیں گمان بھی نہیں ہوگا کہ وہاں روحی اور ثاقب سے کوئی کار ٹکرائی تھی۔ ثاقب تو......'' سلطانہ کی آواز رندھ گئی۔ کچھ دور کا رشتہ اس کا ثاقب سے تھا اور روحی سے تو وہ بہت ہی محبت کرتی تھی۔

یہ جواب سن کر صبور کا سارا جسم سنسنا گیا۔ اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ وہ ایکسیڈنٹ اسی سے ہوا تھا۔ وہ لڑکی شناسا سی بھی اسے اسی لیے لگی تھی کیونکہ وہ روحی تھی۔

''تم اس وقت کہاں ہو؟'' صبور نے پوچھا۔ وہ بدقت تمام بولا۔

سلطانہ نے رندھی ہوئی آواز پر قابو پاتے ہوئے ایک اسپتال کا نام بتایا۔

''میں پہنچتا ہوں۔'' صبور کے لہجے سے پریشانی صاف ظاہر تھی جس کا سبب سلطانہ نے کچھ اور سمجھا ہوگا لیکن صبور کی پریشانی اس خیال سے تھی کہ ثاقب کی موت اور روحی کے زخمی ہونے کا ذمے دار وہ خود ہی تھا۔

''کون سے اسپتال میں ہے؟'' شیما نے پوچھا۔

''چلو میں تمہیں اپنی کار میں چھوڑ آتی ہوں۔''

''میں ٹیکسی کر لوں گا شیما!''

''میرے ساتھ جاتے ہوئے کوئی ڈر ہے تمہیں؟''

''ارے نہیں! یہ بات نہیں۔ اور ضروری بھی نہیں کہ کوئی... تمہیں میرے ساتھ دیکھ لے۔''

صبور کو شیما کے ساتھ اس کی کار میں روانہ ہونا پڑا۔ وہ جوں جوں سارے معاملے پر غور کر رہا تھا، اس کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ اس نے جو منصوبہ بندی کی تھی، اس میں اب گڑبڑ ہونے کا قوی امکان نظر آرہا تھا۔ راستے میں شیما نے جو باتیں کیں، وہ ان کا مختصر جواب دیتے ہوئے اپنے خیالوں سے نبرد آزما رہا۔

آخر شیما کہہ رہی تھی۔''معلوم ہوتا ہے تمہیں اپنی بیوی کی چچازاد بہن اور اس کے منگیتر سے خاصا لگاؤ تھا۔''

''نہیں، یہ بات نہیں۔''

''پھر تم اس وقت ذہنی طور پر غیر حاضر کیوں ہو؟''

''میں بعد میں بتاؤں گا تمہیں۔''

پھر شیما نے کچھ نہیں کہا۔ وہ صبور کو اسپتال کے پھاٹک کے قریب چھوڑ کر واپس چلی گئی۔

اسپتال کے ریسیپشن سے صبور کو معلوم ہوگیا کہ روحی انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے خطرناک چوٹیں نہیں آئی تھیں۔ صبور اس روم میں پہنچا جس کا نمبر اسے ریسیپشن سے معلوم ہوا تھا۔

وہاں اس وقت سلطانہ کے علاوہ روحی کے والدین اور سلطانہ کے گھر والے بھی تھے۔ روحی بستر پر چادر اوڑھے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ کچھ خراشیں چہرے پر تھیں۔ اس کے چہرے پر غم و اندوہ کے تاثرات تھے۔ اس نے صبور پر ایک گہری نظر ڈالی اور پھر اس کی پلکیں جھک گئیں۔

''آئی ایم سوری! میں وقت پر نہیں پہنچ سکا۔'' صبور نے یہ بات گویا ان سبھی لوگوں سے کہی تھی جو اس وقت وہاں موجود تھے۔

صبور کو دیکھ کر روحی کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔ اپنی آنکھیں ہی چھپانے کے لیے اس نے پلکیں جھکائی تھیں۔

اس موقع پر سلطانہ نے صبور سے نہیں پوچھا کہ اس نے اپنا موبائل کیوں بند کر رکھا تھا۔ ان لوگوں سے گفتگو میں صبور کو ایکسیڈنٹ کی تفصیلات معلوم ہوئیں اور ذرا بھی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ وہ حادثہ صبور ہی سے ہوا تھا۔

ثاقب کی لاش ابھی پولیس ہی کی تحویل میں تھی۔

''وہ کار پکڑی نہیں جاسکی ہے؟'' صبور نے پوچھا۔

''کار تو ابھی نہیں پکڑی گئی لیکن اس کے مالک کا پتا تو چل ہی جائے گا۔'' سلطانہ کے والد نے جواب دیا۔

صبور کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

''کار کے مالک کا پتا کیسے چل جائے گا؟''

''روحی اس کار کا نمبر ٹھیک سے تو نہیں دیکھ سکی تھی مگر کچھ ہندسے اس کے ذہن میں رہ گئے تھے۔ اس نے پولیس کو تین چار نمبر بتائے ہیں۔ خود روحی کا خیال ہے کہ ان میں سے کوئی ایک نمبر ضرور درست ہوگا۔ پولیس ان سبھی نمبروں کے بارے میں تحقیقات کرکے اصل آدمی تک پہنچ سکتی ہے۔''

صبور کے لیے یہ سب پریشان کن باتیں تھیں۔ پولیس جاوید تک پہنچ جاتی تو جاوید انہیں یہی بیان دیتا کہ اس نے لاہور جاتے وقت اپنی کار صبور کو دے دی تھی۔ جاوید کے بعد پولیس صبور کے پاس پہنچتی۔ صبور انہیں یہی بیان دے سکتا تھا کہ اس کی کار اس وقت چوری کی گئی تھی جب وہ شیما کے گھر پر تھا۔

پہلے صبور نے سوچا تھا کہ وہ ایکسیڈنٹ کے بارے میں سلطانہ کو بتا دے گا اور یہ بھی نہیں چھپائے گا کہ وہ حادثے کے وقت اپنی موجودگی دوسری جگہ ثابت کرنے کے لیے شیما کے پاس چلا گیا تھا۔ سلطانہ یہ بات سوچ کر اسے گوارا کرلیتی کہ اس کے شوہر کو اپنے بچاؤ کے لیے یہی راہ سوجھ سکی لیکن اب صبور کے لیے یہ مسئلہ ہوگیا تھا کہ اس کے ایکسیڈنٹ سے کوئی اجنبی نہیں بلکہ روحی کی چچازاد بہن کا منگیتر مرا تھا۔ اب صبور کے لیے یہی مشکل تھی کہ وہ اپنی بیوی کو ایکسیڈنٹ کے بارے میں نہیں بتا سکتا تھا اور ایسی صورت میں شیما کی بات سن کر سلطانہ کے دل پر جو کچھ گزرتی، اسے اس کا خوب اندازہ تھا۔

دوسری مصیبت قانونی بھی کھڑی ہوسکتی تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ وہ شیما کے بیان پر شبہ کرتے ہوئے یہ سمجھتی کہ صبور نے جائے حادثہ سے اپنی عدم موجودگی ظاہر کرنے کے لیے شیما کو آلۂ کار بنایا تھا۔

اس کے ساتھ پولیس کے لیے یہ معما بھی ہوتا کہ کار غائب کہاں ہوگئی؟

صبور کے ذہن میں یہ سب خیالات چکراتے رہے تھے اس لیے روحی کے کمرے میں جو باتیں ہوئیں، ان میں وہ ذہنی طور پر غیر حاضر سا رہا۔

روحی اور سلطانہ کے والدین کو اب یہ جلدی بھی تھی کہ

وہ ثاقب کے گھر جاکر اس کے والدین کے غم میں بھی شریک ہوں۔ طے پایا کہ فوری طور پر صرف سلطانہ کو روحی کے پاس رہنے دیا جائے اور باقی لوگ ثاقب کے گھر کا رخ کریں۔ یہ ایک اخلاقی اور معاشرتی تقاضا تھا۔

"تم بھی چلے جاؤ صبور!" سلطانہ نے کہا۔ "میری نمائندگی بھی ہوجائے گی۔"

صبور اس گھر میں نہیں جانا چاہتا تھا جس گھر کا چراغ اس کے ہاتھوں گل ہوا تھا لیکن وہ اس سے پہلو تہی نہیں کرسکا۔ اگر سامنے صرف سلطانہ ہوتی تو شاید وہ نہ جانے کے لیے کوئی جواز پیدا کرلیتا لیکن اس وقت سبھی لوگ اور روحی بھی موجود تھی جس کا منگیتر اسی کے ہاتھوں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ سلطانہ کو روحی کے پاس چھوڑ کر جب سب لوگ اسپتال سے روانہ ہوئے تو صبور ان کے ساتھ تھا۔

☆☆☆

سلطانہ اور صبور کی شادی بہت ہنگامی طور پر ہوئی تھی، ورنہ یہ شادی ایسے حالات میں ہرگز نہیں ہوتی جبکہ صبور ابھی بی اے کے فائنل ایئر کا طالب علم تھا۔ صرف تعلیم ہی کی غرض سے وہ کراچی میں مقیم تھا۔ اس کے باپ جاگیردار صابر شاہ نے اسے کراچی میں ایک خوب صورت فلیٹ دلانے کے ساتھ ساتھ اپنی حویلی کا ایک پرانا ملازم بھی اس کی خدمت کے لیے کراچی بھیج دیا تھا۔

سلطانہ کے باپ سرجن عباس کو سارے ملک کے طبی حلقوں میں ایک محترم شخصیت سمجھا جاتا تھا۔ وہ اور صابر شاہ آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کرچکے تھے۔ ان کی دوستی وہیں ہوئی تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پائیدار ہوتی چلی گئی تھی۔ اسی لیے جب سلطانہ کی عمر دس سال اور صبور پندرہ یا چودہ سال کا تھا تو ان دونوں دوستوں میں طے پاگیا تھا کہ مناسب وقت آنے پر وہ سلطانہ اور صبور کو شادی کے بندھن میں جکڑ دیں گے۔

"مناسب وقت" سے ان دوستوں کی مراد یہ تھی کہ جب صبور اور سلطانہ تعلیم مکمل کرلیں گے لیکن سلطانہ کی ماں کی ایک بیماری کی وجہ سے اس مناسب وقت کا انتظار نہیں کیا جاسکا۔ بیماری ایسی تھی کہ سلطانہ کی ماں کے بچنے کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ مرنے سے پہلے اپنی بیٹی کو دلہن بنتے ہوئے دیکھ لے۔

یہی وجہ تھی کہ سلطانہ جب سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی تو ماں کی خواہش کے احترام میں اسے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑنا پڑی۔ شادی کے بعد اسے صبور کے ساتھ صوبے کے اندرونی علاقے میں صابر شاہ کی حویلی جانا پڑا تھا لیکن صبور کو کیونکہ اپنی تعلیم مکمل کرنا تھی اس لیے صابر شاہ نے ان دونوں کے لیے ایک بڑا اپارٹمنٹ خرید لیا تھا۔ وہ دونوں حویلی سے کراچی آکر اس اپارٹمنٹ میں مقیم ہوگئے تھے۔ پرانے خادم کے علاوہ حویلی سے ایک پرانی خادمہ بھی وہیں آگئی تھی۔

لیکن ملازم کبھی کسی کی تنہائی کا ازالہ نہیں کرتے۔ اسی لیے صبور جب پڑھنے جاتا تو سلطانہ اپنے والد کے پاس چلی جایا کرتی تھی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس کی ماں بیمار تھی۔ شادی کے دس دن بعد اس کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس وقت کچھ عزیزوں کے علاوہ سلطانہ بھی کچھ دن تک اپنے باپ کے گھر میں رہی تھی۔ شام کو صبور بھی وہاں کا ایک چکر لگالیا کرتا تھا۔

شادی کے موقع پر تو روحی سے صبور کی ملاقات سرسری سی ہوئی تھی لیکن روزانہ سرجن عباس کے گھر جانے کی وجہ سے روحی سے اس کی دو تین ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ دو ماہ قبل اس کی منگنی ثاقب سے ہوچکی تھی۔ شادی چند ماہ بعد ہونا اس لیے قرار پایا تھا کہ ثاقب کے باپ کی بہت عزیز بہن نیروبی میں رہتی تھی جو کسی وجہ سے فوری طور پر کراچی نہیں آسکتی تھی اور ثاقب کے باپ کی خواہش تھی کہ اس کے بیٹے کی شادی میں اس کی بہن ضرور شریک ہو۔

جب حادثہ ہوا، اس وقت صبور کے لیے ثاقب کی شناخت کرنا تو خیر ممکن ہی نہیں تھا کیونکہ ثاقب کی اس سے ایک سرسری ملاقات اس کی منگنی کے موقع پر ہوئی تھی لیکن بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ میں صبور ایک اچٹتی سی نظر میں روحی کو بھی نہیں پہچان سکا تھا۔ اس کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ شام ہوجانے کی وجہ سے اس سڑک پر روشنی بہت کم تھی۔ صبور کو بس یہ خیال رہ گیا تھا کہ وہ لڑکی اس کے لیے اجنبی نہیں تھی، وہ اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکا تھا۔

لیکن جب سے اس پر حقیقت منکشف ہوئی تھی، وہ اپنے وجود میں اندر ہی اندر لرز رہا تھا۔ ثاقب کے گھر پر اس کی ہمت نہیں ہوسکی تھی کہ وہ ثاقب کے باپ سے نظریں ملاسکتا۔

گیارہ بجے کے قریب اسے دوبارہ اسپتال جانے کا موقع مل سکا۔

معلوم ہوا کہ دوسری صبح روحی کو اسپتال سے رخصت کردیا جاتا۔ اس وقت طے پایا کہ روحی کی کوئی رشتے دار لڑکی رات کو روحی کے پاس رک جائے گی۔ خود روحی کا کہنا یہ تھا کہ اس کی ضرورت نہیں لیکن سلطانہ نے اصرار کیا کہ

روحی اسپتال میں تنہا نہ رہے۔

سلطانہ کو صبور کے ساتھ اسپتال سے رخصت ہونا تھا۔ اس نے رخصت ہونے سے پہلے روحی کی پیشانی چوم کر آہستہ سے کہا۔ ''خبردار جو تم نے پھر اس انداز میں سوچا۔''

روحی پھیکے سے انداز میں مسکرا دی۔

سلطانہ نے روحی سے وہ بات اگرچہ دھیمی آواز میں کہی تھی مگر بہت قریب ہونے کی وجہ سے صبور نے سن لیا۔ صبور نے سرجن عباس کو بتا دیا تھا کہ اس کی کار کچھ خراب ہو گئی ہے اور گیراج میں ہے چنانچہ سرجن عباس نے اپنے شوفر کو ہدایت کی کہ وہ سلطانہ اور صبور کو ان کے گھر چھوڑ آئے۔

''روحی پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔'' راستے میں سلطانہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''تم نے اسے کس بارے میں سوچنے سے روکا ہے؟'' صبور نے پوچھا۔

''گھر چل کر بتاؤں گی۔'' سلطانہ نے جواب دیتے ہوئے شوفر کی طرف ایک نظر ڈالی۔

صبور سمجھ گیا۔ وہ ضرور کوئی خاص بات تھی اور سلطانہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ بات شوفر کے علم میں آئے۔ صبور کا خیال تھا کہ اس کا موبائل فون بند ہونے کے بارے میں بھی سلطانہ اس سے استفسار کرتی لیکن راستے میں اس نے ایسا نہیں کیا۔ جب وہ دونوں گھر پہنچے تو بہت تھکے ہوئے تھے، تاہم سلطانہ نے ملازم اور ملازمہ کو چند ہدایات دینے کے بعد ہی صبور کے ساتھ خواب گاہ کا رخ کیا۔ اس وقت بھی اس نے کوئی بات کرنے سے پہلے لباس تبدیل کرنے کو ترجیح دی تھی۔ جب دونوں بستر پر لیٹ گئے تو وہ بولی۔

''کیا تم نے اپنا موبائل اس لیے بند کر دیا تھا کہ کہیں پینے بیٹھ گئے تھے؟''

صبور نے اس کی طرف دیکھا، پھر نظریں چرا کر دھیمی آواز میں بولا۔ ''آئی ایم سوری سلطانہ! میں نے تم سے کہا تھا کہ جلد گھر پہنچ رہا ہوں لیکن راستے میں ایک اور دوست مل گیا۔ اس کا گھر قریب ہی تھا۔ اس نے مجھے بہ اصرار روک لیا۔ اس کے ساتھ بیٹھا تو دو ایک پیگ پینے پڑے۔''

''مجھے بتا تو دیتے!''

''ہاں، یہ ایک غلطی ہو گئی۔ دراصل خیال یہ تھا کہ جلدی سے ایک پیگ پی کر نکل لوں گا لیکن ایسا کر نہیں سکا۔''

''اور پھر اپنا موبائل بھی بند کر لیا۔''

''ایسا میں نے دانستہ نہیں کیا تھا۔'' صبور کو جھوٹ بولنا پڑا۔ ''کسی وقت جیب میں ہاتھ ڈالا ہو گا تو بے خیالی میں سوئچ آف ہو گیا ہو گا۔''

''یہی خیال مجھے بھی آیا تھا۔''

اس جواب سے صبور نے کچھ سکون محسوس کیا۔

سلطانہ کہتی رہی۔ ''لیکن میں پریشان اس لیے زیادہ ہوئی کہ فون پر مجھے روحی اور ثاقب کے حادثے کی اطلاع مل گئی تھی جو میں فوری طور پر تمہیں بھی دینا چاہتی تھی۔ رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے میں نے یہ سوچ کر میسج کر دیا تھا کہ تم جب بھی اپنا موبائل آن کرو گے، میسج تو تمہیں مل ہی جائے گا اور پھر تم فوراً ہی مجھ سے رابطہ کرو گے۔''

''ایسا ہی ہوا تھا۔'' صبور نے کہا۔ ''میں نے فوراً تم سے رابطہ کیا تھا۔''

صبور نے محسوس کیا کہ یہ باتیں کرتے ہوئے بھی سلطانہ کہیں کھوئی کھوئی سی رہی تھی۔

''تم نے اپنے دل پر اس حادثے کا بہت زیادہ اثر لیا ہے۔'' صبور نے کہا۔ ''اور یہ قدرتی بات ہے۔ روحی اور تم ایک دوسرے سے بہت قریب رہی ہو۔ روحی پر جو قیامت گزری ہے، اسے تم بھی شدت سے محسوس کر رہی ہو۔ اسپتال سے چلتے وقت تم نے روحی کو کسی خاص انداز میں نہ سوچنے کی تاکید بھی کی تھی۔ آخر وہ کیا سوچ رہی ہے؟''

''میں ابھی خود تم سے اس کا ذکر کرتی۔'' سلطانہ نے کہا، پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ''روحی سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔''

''غلطی؟''

''ہاں۔''

''کیسی غلطی؟''

سلطانہ چپ رہی۔

''بتاؤ سلطانہ!'' صبور پھر بولا۔

''بتانا تو چاہتی ہوں میں تمہیں لیکن بات ایسی ہے کہ...... میری سمجھ میں نہیں آرہا...... کس طرح بتاؤں...... دراصل......'' وہ پھر چپ ہو گئی۔

''تمہاری باتوں سے میں بے چین ہو رہا ہوں سلطانہ!''

''صبور!'' سلطانہ متذبذب لہجے میں بولی۔ ''روحی ماں بننے والی ہے۔'' صبور بھونچکا رہ گیا۔

سلطانہ کچھ رک کر آہستہ آہستہ بولنے لگی۔ ''وہ اور ثاقب ایک دوسرے سے ملتے تو رہتے تھے۔ لوگ غلط نہیں کہتے کہ عورت اور مرد کی تنہائی بڑی مخدوش ہوتی ہے۔ ان دونوں کے ساتھ بھی اس تنہائی نے ایک غضب ڈھایا۔ قدم بہک گئے ان کے۔ اگرچہ ایسا صرف ایک بار ہوا لیکن وہی

رنگ لایا۔ ہم دونوں کی شادی کو اتنے دن گزر گئے لیکن ابھی تک ایسی کوئی علامت سامنے نہیں آئی ہے۔ روحی کو قدرت نے شاید اس بات کی سزا دی کہ وہ شادی سے پہلے ہی ثاقب سے اتنی قریب ہوگئی۔"

"تمہیں اس نے کب بتایا تھا؟"

"آج ہی بتایا ہے۔ تم سب لوگ ثاقب کے گھر گئے ہوئے تھے۔ روحی مجھ سے لپٹ کر رونے لگی اور یہ سب کچھ بتایا۔ آج وہ اسی بارے میں بات کرنے کے لیے ثاقب سے ملی تھی۔ دراصل وہ اسقاط نہیں کرانا چاہتی تھی۔ اس نے ثاقب سے کہا تھا کہ وہ اس معاملے کی وجہ سے کوئی ایسی تدبیر کرے کہ ان کی شادی جلد از جلد ہوجائے۔ ان کی یہ ملاقات ثاقب کے ایک دوست کے گھر پر ہوئی تھی۔ وہاں سے نکل کر وہ سڑک پار کررہے تھے۔ ثاقب نے اپنی کار اسی طرف کہیں پارک کی تھی۔ روحی ٹیکسی کر کے گئی تھی۔ واپسی پر ثاقب اسے اپنی کار پر اس کے گھر تک چھوڑ آتا لیکن......" سلطانہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہوگئی۔

"تو اب وہ کیا سوچ رہی ہے؟ تم نے اسے کس بات سے روکا ہے۔"

"وہ بدنامی سے بچنے کے لیے خودکشی کرلینا چاہتی ہے۔ اس کے سوچنے کا انداز یہ ہے کہ اپنے ہونے والے بچے کو قتل کرنے کے بجائے اپنے آپ کو ہی ختم کرلے۔"

"یہ تو کوئی ہوش مندانہ فیصلہ نہیں ہے۔" صبور نے کہا۔ "بہتر تو یہی صورت ہے کہ وہ اسقاط کرادے۔"

"میں نے بھی اس سے یہی کہا تھا لیکن اس پر یہ جنون طاری ہوگیا ہے کہ خود کو ختم کرلے۔ میں نے اسے بہت سمجھایا ہے کہ وہ ایسے کسی اقدام کے بارے میں نہ سوچے اور یہ کہ میں اس معاملے کا ذکر تم سے کروں گی اور تم ضرور اس مسئلے کا حل نکال لوگے۔"

"میں کیا حل نکال سکتا ہوں؟" صبور تیزی سے بولا۔

"اس سے تو میں نے یہی کہا ہے کہ تم اپنے کسی دوست کو اس سے شادی کرنے پر آمادہ کرسکتے ہو لیکن دراصل میرے ذہن میں کچھ اور تھا۔"

صبور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

سلطانہ پھر بولی۔ "تم ماہرِ نفسیات تو نہیں لیکن نفسیات تمہارا پسندیدہ موضوع ہے۔ تم نے اس کا بہت مطالعہ کیا ہے۔ تم اس سے باتیں کر کے کچھ ایسے نفسیاتی حربے استعمال کرو کہ وہ خودکشی کا خیال ذہن سے نکال دے اور اسقاط پر آمادہ ہوجائے۔ میں نے جب اس سے تمہارا نام لیا تھا تو وہ مجھے قسمیں دینے لگی تھی کہ میں تم سے اس کا ذکر ہرگز نہ کروں لیکن میں نے اسے کسی نہ کسی طرح سمجھا بجھا دیا۔"

"اس طرح تو تم مجھے بہت کڑے امتحان میں ڈال رہی ہو سلطانہ!" صبور کی آواز بھرا گئی۔ حقیقتاً وہ اس کے لیے بہت کڑا امتحان ہوتا کہ اسے روحی سے بات کرنا پڑتی۔

"روحی مجھے بہت عزیز ہے صبور!" سلطانہ نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "وہ مجھ سے دو سال بڑی ہے لیکن ہم دونوں ایک دوسرے کی بہت اچھی دوست ہیں، تمہیں اس کی زندگی بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا ہوگا۔ تم اگر اسے نفسیاتی طور پر خودکشی کے اقدام سے نہیں روک سکتے تو کوئی ایسی راہ نکالو کہ اس کی شادی کسی اور سے ہوجائے اور شادی کرنے والا اس بات پر آمادہ ہو کہ وہ کسی اور کے بچے کو اپنا نام دے سکے۔"

"کیا روحی کسی اور سے شادی کرنے پر تیار ہوجائے گی؟ میرا خیال ہے کہ شاید اسے ثاقب سے بہت زیادہ محبت ہوگی۔ وہ اس کی جگہ کسی اور کو قبول نہیں کرے گی۔"

"تم اسے نفسیاتی طور پر اس کے لیے آمادہ کرو کہ وہ یا تو اسقاط کرادے یا کسی اور سے شادی کرلے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، وہ ثاقب سے جنونی انداز کی محبت نہیں کرتی تھی اور اگر کرتی بھی تو اس سے ایک بات کہی جاسکتی ہے۔ میں نے تو نفسیات پڑھی نہیں لیکن میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے۔"

"کیا؟" صبور پوچھ بیٹھا۔

"اس کے دماغ میں یہ بات بٹھائی جائے کہ اس کا ہونے والا بچہ اس کے محبوب کی نشانی ہے لہٰذا اس نشانی کو اپنے کلیجے سے لگائے رکھنے کے لیے کسی اور سے شادی کرنے پر آمادہ ہوجائے۔"

صبور نے سوچتے ہوئے سر ہلایا، پھر بولا۔ "بادی النظر میں تمہاری یہ بات دل کو لگتی ہے لیکن عملاً یہ کس حد تک ممکن ہے، اس بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔"

"تم کچھ کوشش تو کرو نا صبور!" سلطانہ کے انداز میں التجا تھی۔

"اچھا!" صبور نے ٹھنڈی سانس لی۔ "میں سوچوں گا اس بارے میں۔"

سلطانہ چپ رہی، وہ کچھ سوچنے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی کا تاثر تھا۔

ادھر صبور کی یہ حالت تھی کہ اس ساری گفتگو کے دوران میں اس کی اپنی پریشانیاں بھی اس کے دماغ میں چکراتی رہی

تھیں۔ آنے والے وقت میں اس کے لیے کیا مسائل کھڑے ہوسکتے ہیں؟ اس بارے میں وہ کوئی اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔ اسے کچھ خوش گمانی ضرور تھی کہ شاید وہ کسی مسئلے میں نہ پھنسے لیکن شیما کا معاملہ اس کے لیے ضرور پریشان کن ثابت ہوتا۔ ابھی تو اس نے یہ کہہ کر اپنی جان بچالی تھی کہ وہ ایک دوست کے ساتھ شراب پینے بیٹھ گیا تھا لیکن اگر پولیس اس تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاتی تو شیما کا معاملہ ضرور سامنے آتا جس سے سلطانہ کو دماغی جھٹکا لگنا یقینی بات تھی۔

دوسرا پریشان کن معاملہ روحی کا بھی تھا۔

صبور نے سوچا کہ سلطانہ کو اس بارے میں یہ سب کچھ قبل از وقت بتادے اور اس طرح بتائے کہ اس میں ایکسیڈنٹ کا ذکر نہ ہو لیکن اسے ہمت نہیں ہوسکی۔

☆☆☆

یہ سب کچھ اتوار کے دن پیش آیا تھا۔ اگلے دن صبح صبور کو کالج جانا ہوتا لیکن رات ہی کو یہ بات طے پا گئی تھی کہ صبور اس دن کالج نہیں جائے گا۔

پولیس نے ثاقب کے والدین کو یقین دہانی کرائی تھی کہ صبح نو دس بجے کے درمیان ثاقب کی لاش ان کے حوالے کردی جائے گی چنانچہ گھر والوں نے طے کیا تھا کہ ظہر تک اس کی تدفین کردی جائے۔ سلطانہ اور صبور کو ان آخری رسومات میں شرکت کرنا تھی اس لیے صبور کالج جا ہی نہیں سکتا تھا۔ صبح اٹھ کر دونوں میاں بیوی نے روانگی کی تیاری کرنے سے پہلے ناشتا کیا۔ اس دوران میں روحی اور ثاقب کی باتیں ہوتی رہیں۔ صبور کا دماغ اپنی پریشانی میں بھی الجھا رہا۔

ناشتے کے بعد وہ دونوں روانگی کے لیے تیار ہوئے مگر انہیں فوری طور پر اس کی مہلت نہیں مل سکی۔ پولیس ان کے دروازے پر موجود تھی۔ کال بیل بجی تو ملازم نے دروازے کا رخ کیا اور پھر آکر انہیں پولیس کے بارے میں اطلاع دی۔

''پولیس!'' حیرت کے عالم میں سلطانہ کے منہ سے نکلا۔ ''یہاں کیوں؟''

صبور کو سینے میں اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوا۔ اس کے لیے یہ ناگہانی صرف اس اعتبار سے تھی کہ اسے پولیس کی اتنی برق رفتاری کا گمان بالکل نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات تو تھی کہ ایسا ہوگا لیکن اتنی جلدی ایسا ہونے کا خیال بالکل نہیں تھا۔

صبور کے ساتھ ہی سلطانہ بھی دروازے پر پہنچی۔

''فرمایئے!'' صبور نے بولتے وقت کوشش کی تھی کہ اس کے لہجے اور چہرے سے حیرت کے اظہار کے علاوہ کسی قسم کا تاثر ظاہر نہ ہو۔ اندرونی طور پر وہ ہیجانی کیفیت کا شکار ہوچکا تھا۔

''مسٹر صبور؟'' آگے کھڑے ہوئے پولیس آفیسر نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی۔'' صبور نے کہا۔

''ہمیں آپ سے ایک مسئلے کے بارے میں پوچھ گچھ کرنا ہے۔''

''ضرور۔'' صبور نے کہا اور ایک طرف ہٹتے ہوئے بولا۔ ''تشریف لایئے!''

پولیس آفیسر نے فوراً قدم آگے نہیں بڑھایا۔ وہ کچھ سوچنے لگا تھا لیکن اس نے سوچ بچار میں زیادہ وقت نہیں لگایا۔ اس نے سپاہیوں کو باہر ہی رکنے کا اشارہ کیا اور صرف اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ اندر آیا۔

صبور نے ان دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ سلطانہ ساتھ رہی۔ صبور سوالیہ نگاہوں سے پولیس آفیسر کی طرف دیکھتا رہا۔ یہی کیفیت سلطانہ کی بھی تھی۔

''مسٹر صبور!'' پولیس آفیسر بولا۔ ''آپ کی کار کہاں ہے؟''

''کچھ خراب ہوگئی ہے۔'' صبور نے جواب دیا۔ ''ٹھیک ہونے کے لیے دی ہے۔ آج دوپہر کو کسی وقت مل جائے گی لیکن......''

پولیس آفیسر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''کار آپ نے ٹھیک ہونے کے لیے کب دی تھی؟''

''کل دوپہر۔'' صبور نے جواب دیا۔ ''کل چھٹی تھی مگر میرا رابطہ ہمیشہ کیونکہ ایک ہی مکینک سے رہا ہے اس لیے کار میں نے اس کے گھر لے جا کر اس کے حوالے کی تھی۔''

صبور مزید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پولیس آفیسر پھر بول پڑا۔ ''آپ کے پاس کوئی اور کار نہیں ہے؟''

''جی نہیں لیکن......''

پولیس آفیسر نے پھر اس کی بات کاٹی۔ ''گویا کل سے اب تک آپ کہیں آئے گئے ہوں گے تو ٹیکسی میں گئے ہوں گے؟''

''جی نہیں، میں آپ کو یہی تو بتانا چاہ رہا ہوں کہ میرے ایک دوست نے مجھے ایک دن کے لیے اپنی کار دے دی تھی۔ وہ کل لاہور گیا تھا، آج کسی وقت واپس آجائے گا۔''

صبور کا یہ جواب سن کر سلطانہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ صبور نے محسوس کیا کہ یہ بات پولیس آفیسر نے

بھی محسوس کرلی تھی۔
"آپ کے اس دوست کا نام جاوید ہے؟" پولیس آفیسر بولا۔
صبور چونکا۔
پولیس آفیسر بولا۔ "ہم نے ان کے گھر والوں سے رابطہ کیا تھا۔ انہی سے ہم کو مسٹر جاوید کا موبائل فون نمبر ملا تھا۔ ہم نے ان سے بات کی تھی۔ انہوں نے ہمیں بتایا تھا کہ لاہور روانگی کے وقت انہوں نے اپنی کار آپ کے حوالے کردی تھی۔"
"جی ہاں۔" صبور نے جواب دیا اور اس خیال سے کہ پولیس آفیسر پھر کچھ بول پڑے گا، اس نے جلدی سے کہا۔ "میرے پاس سے وہ کار چوری ہوگئی تھی۔"
"ہمیں اس کا علم بھی ہو چکا ہے۔" پولیس آفیسر نے کہا۔ "ماڈل گرل شیما کے ساتھ آپ نے ایک پولیس اسٹیشن جا کر اس کی رپورٹ درج کرائی تھی۔"
"جی!" غیر اختیاری طور پر صبور کی آواز مدھم رہی۔
اس نے کن انکھیوں سے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ بھی اس وقت اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں جو تبدیلی آئی تھی، اس کا سبب شیما کا نام ہی ہوسکتا تھا۔
پولیس آفیسر بولا۔ "آپ کے دوست مسٹر جاوید کی فلائٹ چھ بجے تھی؟"
"جی ہاں۔"
"وہ ساڑھے پانچ بجے ڈپارچر لاؤنج میں چلے گئے ہوں گے۔"
"جی ہاں۔"
"اس کے بعد آپ ائرپورٹ کی عمارت سے باہر آگئے ہوں گے۔"
"ظاہر ہے۔"
"گویا اس وقت سے مسٹر جاوید کی کار آپ کے پاس تھی؟"
"جی۔"
"آپ مسٹر جاوید کے ساتھ ائرپورٹ جانے کے لیے کس وقت روانہ ہوئے تھے؟"
"جاوید سے فون پر میری بات ہوئی تھی۔" صبور نے جواب دیا۔ "طے پایا تھا کہ میں اس کے گھر پہنچنے کے بجائے ائرپورٹ کے راستے میں اس سے مل لوں گا اور اس کے ساتھ ائرپورٹ جاؤں گا۔"
"آپ ان سے کس وقت ملے تھے؟"
"میں نے گھڑی تو نہیں دیکھی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ پونے پانچ بجے ہوں گے۔"
یکایک پولیس آفیسر کے چہرے کے تاثرات میں سختی سی آگئی۔ وہ صبور کو گھورتے ہوئے بولا۔ "آپ سے مزید پوچھ گچھ اب پولیس ہیڈکوارٹر چل کر ہوگی۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔"
"مگر کیوں؟" سلطانہ بول پڑی۔ اس کا لہجہ خاصا تیز تھا۔ "کیا انہوں نے کوئی جرم کیا ہے، جو آپ انہیں پولیس ہیڈکوارٹر لے جانا چاہتے ہیں؟"
"پلیز مسز صبور!" پولیس آفیسر نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "اگر آپ اس معاملے میں دخل انداز نہ ہوں تو بہتر ہے۔"
پولیس ہیڈکوارٹر کی بات آتے ہی صبور کو اپنے پیروں تلے سے زمین نکلتی محسوس ہوئی۔ اسے خیال آیا تھا کہ اپنا بیان دیتے ہوئے اس سے کوئی غلطی ہوگئی تھی کہ پولیس آفیسر کے دل میں کوئی خاص شک پیدا ہوگیا تھا۔
یہ سب خیالات آنے کے باوجود صبور نے اپنے چہرے سے پریشانی ظاہر نہیں ہونے دی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ "تم کیوں بلاوجہ پریشان ہورہی ہو۔ قانون کے محافظوں سے ہمیشہ تعاون کرنا چاہیے۔ کوئی وجہ ہوگی جو یہ مجھے پولیس ہیڈکوارٹر لے جانا چاہتے ہوں گے۔" پھر اس نے پولیس آفیسر کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میں کپڑے تو تبدیل کرلوں؟"
پولیس آفیسر نے ذرا سا کچھ سوچا، پھر سر ہلا کے بولا۔ "کرلیجیے، مگر دیر نہ ہو۔"
صبور اٹھا۔ وہ اس وقت سلیپنگ سوٹ پر گاؤن پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ساتھ ہی سلطانہ بھی اٹھی۔
"آپ ذرا رکیں مسز صبور!" پولیس آفیسر بول پڑا۔ "دو ایک سوال مجھے آپ سے بھی کرنا ہیں۔"
سلطانہ کے چہرے پر بے بسی کا تاثر ابھرا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس وقت پولیس آفیسر کے چہرے پر سخت گیری کے تاثرات آگئے تھے۔
پریشان صبور بھی ہوا لیکن اس نے سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں، کوئی حرج نہیں ہے۔ اچھے شہری کو ہمیشہ قانون سے تعاون کرنا چاہیے۔" صبور پولیس آفیسر کو بھی اپنے بارے میں اچھا تاثر دینا چاہتا تھا کیونکہ اس کی دانست میں اس کی بہتری اسی میں تھی۔
سلطانہ کو چھوڑ کر وہ تیزی سے خواب گاہ میں پہنچا۔ اس نے کپڑے تبدیل کرنا شروع کیے مگر اس کے ساتھ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ ان حالات میں اسے اپنے باپ سے مدد

لینا پڑ سکتی تھی۔

جاگیردار صابر شاہ کی شخصیت سیاست کی دنیا میں بھی اجنبی نہیں تھی۔ وہ ایک سیاسی پارٹی سے وابستہ تھا۔ گزشتہ انتخابات میں اسے شکست ہوچکی تھی لیکن اس سے پہلے کی حکومت میں وہ قومی اسمبلی کا ممبر رہ چکا تھا۔ اسی لیے ہر سطح پر اس کے تعلقات تھے جو صبور کے خیال کے مطابق موجودہ حالات میں اس کے کام آسکتے تھے۔

صابر شاہ نے کال ریسیو کی۔ ''کیا بات ہے صبور؟'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''اتنی صبح صبح فون کرنے کی ضرورت کیوں پڑگئی؟ تمہاری سسرال میں جو سانحہ ہوا ہے، اس کی اطلاع تو مجھے مل چکی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ تدفین کس وقت ہوگی۔ میں حویلی سے روانہ ہونے ہی والا ہوں۔ دو گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا۔''

صابر شاہ اپنے علاقے سے بائی روڈ ہی کراچی آسکتا تھا۔

صبور نے بے چینی سے باپ کے خاموش ہونے کا انتظار کیا۔ وہ باپ کی بات کاٹنے کی گستاخی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ صابر شاہ کے خاموش ہونے پر بولا۔ ''بات کچھ اور ہے بابا! پولیس اس وقت گھر پر موجود ہے اور مجھے پولیس ہیڈ کوارٹر لے جانا چاہتی ہے۔''

''کیوں؟'' صابر شاہ چونکا۔

''میں اس وقت تفصیل سے نہیں بتا سکتا بابا! پولیس افسر نے مجھے کپڑے تبدیل کرنے کے لیے بہت کم وقت دیا ہے۔ میں اسی سے فائدہ اٹھا کر آپ کو فون کر سکا ہوں۔ معاملہ کچھ ایسا ہے کہ پولیس کو شاید کسی معاملے میں مجھ پر کسی قسم کا شک ہوگیا ہے۔''

''کیا وہ تمہیں گرفتار کررہے ہیں؟ وارنٹ ہے تمہاری گرفتاری کا؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ بس کسی قسم کی پوچھ گچھ کے لیے مجھے لے جانا چاہتے ہیں۔ انہیں کوئی شک ہے تو وہ غلط ہوگا اور میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ایک اچھے شہری کی حیثیت سے قانون کا احترام کرنا چاہیے۔ میں نے آپ کو محض اس لیے فون کیا ہے کہ آپ کسی سے کچھ کہہ دیں۔ بس اتنا ہوجائے کہ محض شک کی وجہ سے وہ لوگ میرے ساتھ کوئی بدتمیزی نہ کرسکیں۔''

''اگر تم قانون کا احترام کرنا چاہتے ہو تو چلے جاؤ، ان لوگوں کے ساتھ لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ پولیس کا کوئی بڑے سے بڑا افسر بھی صابر شاہ کے بیٹے کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرسکتا۔ میں ابھی ہوم سیکریٹری کو فون کیے دیتا ہوں۔''

''یس بابا! میں یہی چاہتا ہوں۔ اب میں فون بند کر رہا ہوں۔''

لیکن صبور سے پہلے دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کیا جاچکا تھا۔

صبور نے اس گفتگو کے دوران میں بھی تیاری جاری رکھی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا دھیان ڈرائنگ روم کی طرف بھی لگا رہا تھا۔ وہ پولیس افسر سلطانہ سے نہ جانے کس قسم کے سوالات کررہا ہوگا۔

اگر سلطانہ کو صبور کے ساتھ آنے کا موقع ملتا تو وہ شیما کے بارے میں ضرور پوچھتی۔ اس معاملے میں فی الحال صبور کی بچت ہوگئی تھی۔ وہ تیار ہوکر ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ اسے دیکھتے ہی پولیس افسر اور اس کا ماتحت دونوں کھڑے ہوگئے۔ گویا پولیس افسر کو سلطانہ سے جو سوالات کرنا تھے، وہ کرچکا تھا۔

صبور کو رخصت کرتے وقت سلطانہ خاصی پریشان نظر آرہی تھی۔ اس نے صبور کے قریب ہوکر بہت دھیمی آواز میں کہا۔ ''میں ابھی ڈیڈی کو فون پر بتادوں گی۔''

جواب میں صبور نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ اپنے باپ کو فون کرنے کے بعد خاصا مطمئن ہوچکا تھا۔ کسی شک کی بنیاد پر پولیس اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرسکتی تھی۔

☆☆☆

پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ کر صبور کو ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ اس سے کہا گیا تھا کہ وہ ذرا دیر انتظار کرے۔ اسے پانچ منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اسے وہاں سے ایک اور کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

اس کمرے میں تین کرسیوں اور ایک میز کے علاوہ کسی قسم کا سامان نہیں تھا۔ دو کرسیاں اس کرسی کے سامنے تھیں جس پر صبور کو بٹھایا گیا۔ بیچ میں میز تھی۔ سامنے کی دونوں کرسیوں پر وہی پولیس آفیسر اور اس کے ساتھ ایک اور آدمی بیٹھا تھا جو سادہ لباس میں تھا...... اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے لیکن پولیس آفیسر کے چہرے پر اب بھی خشونت نظر آرہی تھی۔

''مسٹر صبور!'' وہ بولا۔ ''ساڑھے پانچ بجے آپ نے مسٹر جاوید سے جو کار لی تھی، وہ چند گھنٹے بعد شہر کے ایک دوردراز علاقے میں دہشت گردی کی ایک کارروائی میں استعمال کی گئی۔''

''اوہ!'' صبور کے منہ سے نکلا۔ دہشت گردی کی

بات نے اس کے سارے جسم میں سنسناہٹ پھیلا دی تھی۔
''اس دہشت گردی میں جو کچھ ہوا، میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔'' پولیس آفیسر نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''دہشت گرد تین تھے۔ انہیں کار سمیت بھاگنے کا موقع نہیں مل سکا۔ وہ کار سے اتر کر گلیوں میں بھاگے تھے مگر ان میں سے صرف ایک کو فرار ہونے میں کامیابی ہو سکی۔ ایک پولیس کی گولی سے موقع پر ہی ہلاک ہو گیا لیکن تیسرے کو گرفتار کیا جا چکا ہے۔ اس نے ابھی تک اپنی زبان نہیں کھولی لیکن کب تک؟ آخر کار اسے بولنا ہی پڑے گا۔'' پولیس آفیسر خاموش ہو کر صبور کی طرف تکتا رہا۔ غالباً وہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ اس کی باتوں نے صبور پر کیا اثر کیا تھا۔
صبور بولا تو اس کی آواز کچھ بھرا گئی۔ ''کیا آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ دہشت گردی کی اس کارروائی سے میرا کوئی تعلق ہے؟ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ وہ کار چوری ہو گئی تھی۔''
''ابھی تو میں نے آپ کو کسی کارروائی میں ملوث نہیں کیا۔'' پولیس آفیسر بولا۔ ''میں آپ کو صرف واقعات بتا رہا ہوں۔ اس کار کے نمبر کی وجہ سے ہم مسٹر جاوید کے گھر پہنچ گئے۔ یہ میں آپ کو بتا بھی چکا ہوں، اسی دوران میں ایک اور بات بھی میرے علم میں آئی۔ چھ بج کر کچھ منٹ پر ایک کار ایکسیڈنٹ میں ایک شخص ہلاک اور اس کے ساتھ جو لڑکی تھی، وہ زخمی ہوئی ہے۔ اس لڑکی کا نام روحی اور اس کے ساتھی کا نام ثاقب تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ وہ لڑکی آپ کی مسز کی اہلیہ ہے۔''
''مجھے اس ایکسیڈنٹ کا علم ہے۔'' صبور نے آہستہ سے کہا۔ ''میں اسپتال جا کر روحی سے مل چکا ہوں اور ثاقب کے گھر جا کر اس کے والدین سے تعزیت بھی کر چکا ہوں۔''
''یہ سب کچھ ہمارے علم میں ہے۔'' پولیس آفیسر بولا۔ ''آپ نے میری بات مکمل نہیں ہونے دی۔ میں آپ کو بتانے جا رہا تھا کہ جس کار سے ثاقب کی ہلاکت ہوئی، اس کار کے نمبر روحی نے حواس باختگی کے عالم میں دیکھے تھے۔ اس نے کئی نمبروں کے بارے میں شبہ ظاہر کیا تھا کہ اس کار کا نمبر غالباً انہی نمبروں میں سے کوئی ایک ہو چنانچہ ساری رات ان نمبروں کی کار کے مالکان کو چیک کرنے میں گزری ہے۔ ان کی کاریں ان کے گھروں میں موجود ہیں۔ روحی کے بتائے ہوئے نمبروں میں سے ایک نمبر ایسا ہے جو مسٹر جاوید کی کار کے نمبر سے مماثلت رکھتا ہے۔ صرف ایک ہندسے کا فرق ہے۔ روحی نے پانچ بتایا ہے جبکہ مسٹر جاوید کی کار کے نمبروں کا ایک ہندسہ چھ ہے۔ انگریزی کے ہندسے چھ کے دائرے میں اگر کوئی رگڑ یا دھبا لگ جائے تو بادی النظر اور بدحواسی میں اسے پانچ سمجھا جا سکتا ہے۔ بہرحال وہ کار بھی چیک کر لی گئی ہے۔ وہ بھی اس کے مالک کے گھر پر موجود ہے۔ اس تحقیق سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ مسٹر جاوید کی کار دہشت گردی کی واردات میں ملوث ہوئی اور اسی سے وہ ایکسیڈنٹ بھی ہوا جو ثاقب کی ہلاکت کا سبب بنا۔''
''ہو سکتا ہے۔'' صبور نے کہا۔ اس کا جسم پسیجنے لگا تھا۔ اس نے دوبارہ کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ جب کار چوری کی گئی تو اسے ڈرائیو کرنے والا تیز رفتاری کے باعث وہ ایکسیڈنٹ کر بیٹھا ہو۔''
پولیس آفیسر نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی کی طرف دیکھا جو اس دوران میں ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ غالباً اس کی ڈیوٹی صرف یہ تھی کہ وہ صبور کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہے۔
پولیس آفیسر دوبارہ صبور کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔ ''تو وہ کار اس وقت چوری کی گئی جب آپ شیما کے گھر میں تھے؟''
''جی ہاں۔ یہ بات اس رپورٹ میں درج ہو گی جو ہم نے......''
''میں وہ رپورٹ بھی دیکھ چکا ہوں۔'' پولیس آفیسر نے صبور کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''اب میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ ابھی ہم نے جو گفتگو کی ہے، وہ ریکارڈ کر لی گئی ہے۔''
صبور کو خود بھی خیال تھا کہ وہ ساری باتیں اس کمرے کے باہر کسی جگہ ریکارڈ کی جا رہی ہوں گی اور جہاں یہ باتیں کی جا رہی تھیں، وہاں کسی جگہ کوئی خفیہ مائک لگا ہوا ہوگا۔ وہ خفیہ مائک ایک سے زائد بھی ہو سکتے تھے۔
''لہٰذا۔'' پولیس آفیسر نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''آپ غور کر لیں کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے، اس میں آپ سے دانستہ یا نادانستہ کوئی غلطی تو نہیں ہوئی ہے۔''
صبور نے دبنگ بننے کی کوشش کی اور کہا۔ ''کسی غلطی کا امکان اس وقت ہو سکتا ہے جب آدمی دروغ گوئی سے کام لے۔''
''یعنی آپ بالکل سچ بولتے رہے ہیں؟''
''ظاہر ہے۔''
''آپ بیٹھیں، میں ابھی آتا ہوں۔'' پولیس آفیسر نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ صبور کچھ نہیں بولا۔ پولیس آفیسر کی عدم موجودگی میں بھی سادے لباس والا شخص کچھ نہیں بولا مگر اس کی نظریں صبور کے چہرے پر جمی رہیں۔ پولیس آفیسر کی عدم موجودگی میں صبور کو وہ نظریں اپنے چہرے پر چبھتی ہوئی سی

محسوس ہونے لگیں۔ دس منٹ بعد پولیس آفیسر لوٹ آیا۔ اپنی کرسی پر بیٹھ کر اس نے صبور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے بتایا تھا کہ آپ ایئرپورٹ کی طرف جانے والے راستے پر مسٹر جاوید سے پانچ بجے ملے تھے؟''

''جی۔''

''گویا اپنے گھر سے ساڑھے چار بجے تو نکلے ہی ہوں گے۔ ساڑھے چار بجے یا اس کے لگ بھگ۔''

''جی۔'' صبور اب پریشان ہونے لگا۔ اسے محسوس ہورہا تھا کہ پولیس آفیسر اسے کسی جال میں لانے کی کوشش کررہا ہے۔

پولیس آفیسر بولا۔ ''اور ساڑھے پانچ بجے آپ ایئرپورٹ سے روانہ ہوئے ہوں گے؟''

''جی۔''

''شیما کے گھر پہنچنے میں آپ کو پون گھنٹا تو لگنا چاہیے۔''

''جی۔'' صبور کی پیشانی پر پسینا چمکنے لگا۔ اب اسے خیال آگیا تھا کہ اس سے کیا غلطی ہوئی تھی۔

''گویا آپ سوا چھ بجے یا اس کے دو تین منٹ بعد شیما کے گھر پہنچے ہوں گے۔''

اس مرتبہ صبور کچھ بول نہیں سکا۔ اس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''ہاں یا نہ میں جواب دیجیے مسٹر صبور!'' پولیس آفیسر کے لہجے میں زیادہ سختی آگئی۔

''جی۔'' صبور کو بولنا پڑا۔ ''جی ہاں۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ایکسیڈنٹ ان لوگوں سے نہیں ہوا تھا جنہوں نے کار چرائی تھی۔'' پولیس آفیسر نے کہا۔ ''ایکسیڈنٹ چھ بجنے کے دو چار منٹ بعد ہی ہوگیا تھا۔''

''ہاں۔'' صبور بڑی مشکل سے بول سکا۔ ''آپ کے اس تجزیے کی روشنی میں میری یہ بات غلط ثابت ہورہی ہے کہ ایکسیڈنٹ، کار کی چوری کرنے والوں سے ہوا تھا۔''

''آپ نے اپنے خیال کو غلط کہنے میں دیر نہیں لگائی۔'' اس مرتبہ پولیس آفیسر کے ہونٹوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ تھی۔

''آپ کا تجزیہ ہی ایسا تھا کہ بات بالکل واضح ہوگئی تھی۔''

''اب میں آپ کو بتاؤں کہ اس وقت شیما بھی پولیس ہیڈکوارٹر میں موجود ہے۔'' پولیس آفیسر نے اس طرح کہا جیسے الفاظ چبا رہا ہو۔ ''ایک اور کمرے میں اس سے پوچھ گچھ کی جارہی ہے۔ میں ابھی یہی معلوم کرنے گیا تھا کہ اس نے کیا بتایا ہے۔ اب اس کے بیان پر بھی آپ ہی تبصرہ کریں۔ اس کا کہنا ہے کہ آپ پانچ بجے سے اس کے گھر پر تھے جبکہ آپ ابھی خود اعتراف کرچکے ہیں کہ آپ اس کے گھر لگ بھگ سوا چھ بجے پہنچے ہوں گے۔''

صبور کو اب اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہونے لگا تھا۔ اس نے تھوک نگلنے کی ناکام کوشش کی، پھر بولا۔ ''وہ پیے ہوئے تھی۔ صحیح وقت کا اسے دھیان نہیں رہا ہوگا۔''

''آپ نے پولیس اسٹیشن میں جو رپورٹ درج کرائی، اس میں آپ نے بھی یہی لکھوایا ہے کہ آپ پانچ بجے سے شیما کے ساتھ تھے۔''

صبور چکرا گیا۔ وہ محسوس کررہا تھا جیسے کسی دلدل میں دھنستا چلا جارہا ہو۔ پولیس افسر اب اسے غضب ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ صبور کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔ ''آپ نے رپورٹ میں خود پانچ بجے کا وقت لکھوایا اور شیما نے بھی غالباً آپ ہی کے ایما پر یہ بیان دیا ہے۔ کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ یہ کیوں چھپانا چاہتے تھے کہ پانچ سے سوا چھ بجے تک کہاں رہے؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' صبور نے جواب دینے کی ہمت کی۔ ''میں نے یہ دانستہ نہیں کیا۔ میں اب اعتراف کیے لیتا ہوں کہ شیما کے ساتھ میں نے بھی پی ہوئی تھی۔ اس نشے ہی کی وجہ سے میں بھی صحیح وقت نہیں لکھوا سکا۔ میرا مطلب ہے کہ رپورٹ لکھواتے وقت مجھے کچھ خیال نہیں رہا کہ میں......''

''دلچسپ بات ہے۔'' پولیس افسر نے طنزیہ انداز میں بات کاٹی۔ ''نشے کی وجہ سے آپ دونوں ہی کو پانچ بجے کا وقت یاد رہا۔''

''اسے اتفاق کہا جاسکتا ہے۔'' صبور اپنی ہمت بندھائے رکھنے کی پوری کوشش کررہا تھا۔ اس کے دماغ میں یہ خیال بھی تھا کہ اب تک اس کے باپ نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا کہ وہ اس قسم کے سوالات کی مصیبت سے بچ سکتا۔

''خوب اتفاق ہے۔'' پولیس افسر کا لہجہ طنزیہ ہی رہا۔ ''یہ بھی اتفاق ہے کہ ٹاتب کے حادثے کے بعد آپ اس جگہ سے گزر رہے تھے۔ آپ نے وہاں لوگوں کا ہجوم دیکھا تھا۔''

صبور سمجھ گیا کہ پولیس آفیسر کو یہ بات اس کی بیوی سلطانہ سے معلوم ہوئی ہوگی۔ وہ اپنے گھر پر جب کپڑے تبدیل کرنے گیا تھا تو پولیس آفیسر نے کسی قسم کی پوچھ گچھ کرنے کے لیے اس کی بیوی کو روک لیا تھا۔

''جی ہاں۔'' صبور اس موقع پر جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ ''زندگی میں اس قسم کے اتفاقات ہوتے ہیں۔ اس

وقت میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جن افراد کا کار سے ایکسیڈنٹ ہوا ہے، وہ میرے سسرالی عزیزوں میں سے ہیں۔ یہ اتفاق اس لیے ہوا کہ میں اپنے گھر جارہا تھا اور میرے گھر کا راستہ وہی ہے۔''

''لیکن آپ اپنے گھر کے بجائے شیما کے گھر پہنچ گئے تھے۔'' پولیس آفیسر بولا۔'' شیما کا گھر تو آپ کے گھر کے راستے میں نہیں ہے۔''

''مجھے اچانک اس سے ملنے کا خیال آیا تھا۔'' صبور نے جواب دیا۔''دراصل میرے ذہن میں ایک کہانی کا خاکہ ہے۔ میں اس پر ڈراما بنانا چاہتا ہوں، شیما سے ملاقات میں نے اسی سلسلے میں کی تھی۔''

''آپ کی اس بات کی تصدیق تو شیما نے بھی کی ہے لیکن میرے لیے اہم بات یہ ہے کہ آپ نے شیما کے گھر پر اپنی موجودگی کا وقت پانچ بجے کیوں بتایا؟ دوسرے آپ اپنی بیوی سے بھی غلط بیانی کر چکے ہیں۔ آپ نے ان کی کال ریسیو کی تھی تو انہیں بتایا تھا کہ آپ ٹیکسی میں تھے۔ انہیں آپ نے جاوید کی کار کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔''

''دراصل میری بیوی اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ میں کسی سے کوئی چیز عارضتاً بھی لوں۔ وہ خود بھی اس سے احتراز کرتی ہے۔''

''آپ نے انہیں اپنی تاخیر کی وجہ یہ بتائی تھی کہ آپ کسی دوست کے پاس رک گئے ہیں۔ آپ نے انہیں شیما کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔''

''آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ میں نے شیما کے بارے میں بتانے سے گریز کیوں کیا ہوگا۔'' صبور نے مسکرانے کی کوشش کی۔''بیویاں اس قسم کی ملاقاتوں کو بلاوجہ شک وشبے کی نظروں سے دیکھنے لگتی ہیں۔''

پولیس آفیسر پھر کچھ کہتا مگر اسی وقت اس کے موبائل پر کسی کی کال آگئی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

''یس سر!'' وہ ماؤتھ پیس میں بولا۔ پھر دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد اس نے کہا۔''میں آتا ہوں سر!''

وہ موبائل جیب میں ڈالتے ہوئے کھڑا ہوا۔ اس نے جھک کر سادہ لباس والے سے کچھ کہا اور کمرے سے چلا گیا۔

اس کی واپسی پندرہ منٹ کے بعد ہوئی۔ صبور نے اس کے تاثرات میں نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ اب اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تو تھی لیکن سخت گیری کا تاثر نہیں تھا۔

''آپ صابر شاہ صاحب کے بیٹے ہیں؟'' اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

صبور نے سکون کا سانس لیا۔''جی ہاں۔''

''یہ عجیب مصیبت رہتی ہے ہم پولیس والوں کے ساتھ۔'' پولیس افسر نے اس طرح کہا جیسے خود سے مخاطب ہوا ہو۔ اس کے لہجے میں کچھ تلخی تھی۔

صبور بولا۔''میں سمجھا نہیں۔''

''آپ سے نہیں کہا ہے میں نے!'' اس مرتبہ پولیس آفیسر کے انداز میں خفیف سی جھنجلاہٹ تھی۔ پھر غالباً اس نے خود پر قابو پایا اور کہا۔''اب فی الحال مجھے آپ سے کوئی سوال نہیں کرنا۔ آپ جاسکتے ہیں۔''

''شکریہ آفیسر!'' صبور اطمینان سے کھڑا ہوگیا۔ ''اگرچہ میرے بیان میں دو ایک تضاد آگئے ہیں لیکن میں نے آپ کو اس کی وجہ بھی بتادی ہے۔ امید ہے آپ مطمئن ہوگئے ہوں گے، تاہم اگر کسی وقت آپ کو میری کوئی ضرورت پڑے تو آپ مجھ سے رابطہ کرسکتے ہیں۔ میں ایک امن پسند شہری ہوں اور قانون کا احترام کرتا ہوں۔''

''اس کا اندازہ تو مجھے ہوگیا ہے۔'' پولیس آفیسر کا جملہ طنزیہ مگر لہجہ سپاٹ تھا۔ پھر اس نے کہا۔''آپ نے اپنے والد سے غالباً اس وقت رابطہ کیا ہوگا جب آپ کپڑے تبدیل کرنے گئے تھے۔''

''جی ہاں۔'' صبور اب بالکل پُرسکون تھا۔''اگر اس قسم کے حالات ہوں تو ہر شخص یہی چاہے گا کہ اپنے سرپرستوں یا کسی سرپرست کو ان حالات سے بے خبر نہ رکھے۔''

پولیس آفیسر کچھ نہیں بولا۔ صبور نے سادہ لباس والے کی تو آواز ہی نہیں سنی تھی۔

☆☆☆

پولیس ہیڈکوارٹر کے باہر نکلتے ہی صبور کو چونکنا پڑا۔ کسی طرف سے شیما جھپٹتی ہوئی اس کے قریب آئی تھی۔

''یہ معاملہ آخر کیا ہے صبور!'' وہ چھوٹتے ہی بولی۔ ''کار تمہاری چوری ہوئی ہے اور پریشان بھی تمہیں کیا گیا ہے۔ تمہارے ساتھ میں بھی لپیٹ میں آگئی۔''

''تمہیں ان لوگوں نے کب چھوڑا؟'' صبور نے پوچھا۔

''ابھی کوئی دس منٹ پہلے۔ میں یہاں تمہارا انتظار کررہی تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ تم سے بھی پوچھ گچھ کی جارہی ہے۔''

صبور نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور اس کے ساتھ چلنے لگا۔

''ان لوگوں نے تم سے کیا پوچھ گچھ کی؟''

شیما نے جواب دیا۔''بنیادی طور پر مجھ سے یہ پوچھا

گیا کہ تم کل میرے ساتھ کب سے تھے۔ دوسری بات یہ کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو کب سے جانتے ہیں۔ میں نے بتادیا کہ ہم دونوں کافی عرصے سے ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اس ملاقات کی وجہ بھی وہی بتائی جو تم ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ میں ان کی ایک بات سے بہت چکرائی کہ تم سوا چھ بجے سے پہلے میرے گھر پہنچ ہی نہیں سکتے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ بات وہ بلا وجہ نہیں کہہ سکتے تھے اس لیے میں تھوڑی سی نرم پڑ گئی۔ میں نے کہا کہ ہوسکتا ہے مجھے صحیح وقت یاد نہ ہو کیونکہ میں اس وقت نشے میں تھی۔''

صبور نے اس بات سے سکون محسوس کیا کہ اس معاملے میں اتفاق سے اس کے اور شیما کے جواب میں کوئی تضاد نہیں تھا۔

''میں ذرا اپنی بیوی کو فون کرلوں۔'' صبور نے کہا اور جیب سے اپنا موبائل نکالا۔

اس وقت تک وہ شیما کی کار کے قریب پہنچ چکے تھے۔

''تم اب کہاں ہو صبور؟'' سلطانہ نے کال ریسیو کرتے ہی پوچھا۔

''میں پولیس ہیڈ کوارٹر سے روانہ ہو رہا ہوں۔'' صبور نے کار میں بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

شیما انجن اسٹارٹ کرچکی تھی۔

صبور کے کانوں میں سلطانہ کی آواز آئی۔ ''مجھے بابا نے فون کیا تھا۔'' وہ بھی صبور کے والد کو ''بابا'' ہی کہتی تھی۔ ''انہوں نے مجھے اطمینان دلایا تھا کہ پولیس ہیڈ کوارٹر میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ مجھے اندازہ بھی ہے کہ بابا بہت بارسوخ ہیں۔ ان کا فون آنے سے پہلے میں یقیناً پریشان تھی۔ اس کے بعد میں ٹیکسی کرکے ثاقب کے گھر آگئی ہوں۔ تم بھی وہیں آجاؤ۔''

''ٹھیک ہے، میں وہیں آتا ہوں۔''

صبور نے محسوس کیا تھا کہ سلطانہ کے لہجے میں وہ لگاوٹ نہیں تھی جو ہمیشہ ہوتی تھی۔ اس کا لہجہ بالکل سپاٹ رہا تھا۔ یقیناً اس کے دل و دماغ پر شیما چھائی ہوئی ہوگی لیکن یہ اس کی سمجھ داری تھی کہ اس موقع پر اس نے وہ ذکر چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

صبور نے شیما سے اس علاقے کی طرف چلنے کے لیے کہا جہاں ثاقب کا گھر تھا۔

''ٹھیک ہے، ادھر ہی چلتی ہوں۔'' شیما نے کہا۔ ''لیکن یہ تو بتاؤ کہ آخر سب کچھ الٹا کیوں ہو رہا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ گاڑی ہماری چوری ہوئی ہے اور ہم ہی کو پولیس ہیڈ کوارٹر بلا کر اس قسم کی پوچھ گچھ ہو رہی ہے جیسے ہم نے کوئی جرم کیا ہے۔''

''جرم تو ہم نے نہیں کیا لیکن وہ کار دہشت گردی کی ایک کارروائی میں استعمال کی گئی ہے۔'' صبور نے کہا۔

شیما چونکی اور پھر اس نے تیزی سے کہا۔ ''آج میں اخبار پڑھ تو چکی ہوں۔ ایک خبر ہے تو کل رات کی ایک دہشت گردی کے بارے میں لیکن وہ خبر پڑھتے ہوئے مجھے ذرا بھی خیال نہیں آیا تھا کہ اس کارروائی میں استعمال کی جانے والی کار تمہاری ہوگی۔''

''بدقسمتی سے ایسا ہی ہوا ہے۔'' صبور نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اسی لیے پولیس اس قسم کی پوچھ گچھ کر رہی ہے۔''

''انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ تم سوا چھ بجے سے پہلے میرے پاس نہیں پہنچ سکتے تھے اس لیے میں یہ غلط بیانی کیوں کر رہی ہوں کہ تم پانچ بجے سے میرے اپارٹمنٹ میں تھے۔ میں نے یہ جواب دے کر جان تو چھڑالی کہ میں اس وقت نشے میں تھی اس لیے مجھے وقت کے بارے میں ٹھیک سے یاد نہیں ہوگا لیکن اب میں تم سے ضرور پوچھنا چاہتی ہوں کہ پولیس نے مجھ سے یہ بات کیوں کہی؟ یہ بات کہ تم میرے پاس سوا چھ بجے سے پہلے نہیں پہنچ سکتے تھے۔''

''پولیس کا خیال درست ہے شیما!'' صبور نے سنجیدگی سے کہا۔

''تو پھر تم نے مجھ سے یہ کیوں کہا تھا کہ اپنے گھر سے سیدھے میرے پاس آئے ہو۔'' شیما کچھ سوچتی ہوئی بولی۔

''دراصل۔'' صبور نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ''تم سے ملاقات ہونے پر میں ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنی بیوی سے تلخ کلامی کے بعد گھر سے نکل کر سیدھا ائرپورٹ کے راستے پر چلا گیا تھا جہاں میرا دوست جاوید مجھ سے آملا۔'' صبور نے وہ واقعات بیان کرنے کے بعد کہا۔ ''واپسی پر میں کیونکہ سیدھا اپنے گھر نہیں جانا چاہتا تھا اس لیے تمہارے پاس آگیا۔ جو دہشت گردی کل ہوئی تھی، اس میں کار پولیس کے ہاتھ لگ گئی تھی اس لیے وہ لوگ جاوید تک پہنچ گئے۔ جاوید کے بیان کے بعد میرے لیے ان سب باتوں سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔''

''اگر تم مجھے پہلے بتادیتے تو اچھا تھا۔ خوامخواہ یہ غلط بیانی اس رپورٹ میں بھی آگئی جو کار کی چوری کے سلسلے میں درج کرائی گئی تھی۔''

''میں یہ کیسے سوچ سکتا تھا شیما کہ کار چوری ہوجائے

گی اور معاملہ اس حد تک بڑھ جائے گا۔''

''اس کی وجہ سے گڑبڑ تو ہو گئی۔'' شیما نے سنجیدگی سے کہا۔''میں نے محسوس کیا ہے میرے اس بیان پر پولیس کو یقین نہیں آیا تھا کہ میں نشے میں ہونے کی وجہ سے وقت کا خیال نہیں رکھ سکی۔ وہ لوگ مجھے زیادہ پریشان کرتے اگر میں نے بہانے سے ٹوائلٹ جا کر ایک شخص کو فون نہ کیا ہوتا۔ وہ ایک بڑا پولیس آفیسر ہے۔ اسی کی وجہ سے میری جان چھوٹ سکی۔''

صبور کو ان باتوں پر ذرا بھی تعجب نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ شیما جیسی خوب صورت ماڈل گرل کے تعلقات کئی بڑی شخصیتوں سے ہوں گے جن میں کوئی پولیس افسر بھی ہو سکتا تھا۔

''خیر!'' شیما نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ''جان تو چھوٹ گئی۔ اب تم کہاں جانا چاہتے ہو۔ تم نے مجھ سے اس طرف چلنے کے لیے کیوں کہا تھا؟''

''مجھے ثاقب کے گھر جانا ہے۔''

''اچھا وہ...... تمہاری بیوی کی کزن کا منگیتر...... کل جو ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہوا تھا؟''

''ہاں، مجھے اس کی تدفین میں شرکت تو کرنا ہو گی۔''

''میں نے وہ خبر بھی پڑھی تھی اخبار میں۔'' شیما کچھ سوچتی ہوئی بولی۔''خبر میں تھا کہ وہ ایکسیڈنٹ چھ بجے کے لگ بھگ ہوا تھا۔''

''ہاں۔'' صبور نے کہا اور کن انکھیوں سے شیما کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر اب بھی سوچ بچار کے تاثرات تھے۔ صبور اندازہ نہیں لگا سکا کہ وہ کیا سوچ رہی ہو گی لیکن اسے ایک پریشان کن خیال ضرور آیا۔ شیما کہیں یہ نہ سوچ رہی ہو کہ وہ ایکسیڈنٹ اس سے ہوا تھا لہٰذا اس نے جائے واردات سے اپنی عدم موجودگی ثابت کرنے کے لیے اس سے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہا کہ وہ پانچ بجے سے اس کے ساتھ تھا۔

''اب راستہ تو بتاؤ۔'' شیما بولی۔''ہم اس علاقے میں تو پہنچ گئے۔''

صبور چونکا۔ اسے پریشانی میں خیال ہی نہیں رہا تھا کہ کار کہاں پہنچ گئی تھی۔ وہ جلدی سے بولا۔''بس یہیں روک دو۔''

''یہ تو کمرشل ایریا ہے۔''

''ہاں بس یہیں اتار دو مجھے۔'' صبور نے کہا۔''مجھے تین چار فرلانگ آگے جانا ہے لیکن یہاں سے میں ٹیکسی کر لوں گا۔ مناسب نہیں ہو گا کہ وہاں لوگ مجھے تمہاری گاڑی سے اترتے دیکھیں۔''

''لیکن تم اپنی بیوی پر تو یہ بات ظاہر کرنا ہی چاہتے ہو کہ میں تمہاری دوست ہوں۔'' شیما نے کہا لیکن اس نے کار روک دی تھی۔

''میری بیوی کو معلوم ہو چکا ہے لیکن ابھی یہ مناسب نہیں ہو گا کہ دوسرے لوگ بھی مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیں۔'' صبور نے کار سے اترنے کے لیے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

شیما نے جلدی سے پوچھا۔''تمہاری بیوی کو کیسے معلوم ہو گیا؟''

''میں جلد ہی تم سے پھر ملوں گا تو بتا دوں گا۔'' صبور نے کار سے اترنے کے لیے ایک ٹانگ باہر نکالی۔

''کب ملو گے؟'' شیما نے اس مرتبہ بھی تیزی سے پوچھا۔

''شاید آج رات کو، ورنہ کل تو ضرور ملوں گا۔''

شیما اس سے کوئی حتمی وعدہ لینا چاہتی تھی لیکن صبور نے اسے بتایا کہ اس کے والد بھی آج یہاں پہنچنے والے ہیں اس لیے وہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اسے کب موقع مل سکے گا۔

وہاں سے صبور ایک ٹیکسی کر کے ثاقب کے گھر پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ ایک ایمبولینس ثاقب کے گھر کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی۔ صبور سمجھ گیا کہ ایمبولینس میں ثاقب کی لاش ہو گی۔ صبور کے جسم میں سنسناہٹ سی پھیل گئی۔ وہ اس شخص کی تدفین میں شرکت کرنے آیا تھا جو اسی کے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا۔

ثاقب کی لاش گھر میں پہنچی تو وہاں کہرام بپا ہو گیا۔ بعض خواتین تو اس طرح بین کر رہی تھیں کہ ان کی چیخوں سے صبور کا کلیجا دہلنے لگا۔

خود سلطانہ بھی ان لوگوں کا وہ بین دیکھ کر اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکی۔ آنسو اس کے بھی بہہ نکلے۔ اس نے صبور کو دیکھا تو اپنے آنسو پونچھتی ہوئی اسے الگ تھلگ لے گئی۔

''پولیس......؟'' اس نے سوال کرنا چاہا۔

''وہ سب ٹھیک ہے۔'' صبور نے اس کی بات کاٹ دی۔''کوئی تکلیف دہ صورتِ حال پیش نہیں آئی۔ بابا نے غالباً ہوم سیکریٹری کو فون کر دیا ہو گا۔ تفصیلی باتیں بعد میں کر لیں گے۔ ابھی تم سب کے پاس جاؤ۔''

''بابا مجھے بھی دو بار فون کر چکے ہیں۔'' سلطانہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔''دوسرا فون تو ابھی پانچ منٹ پہلے آیا تھا۔ وہ بتا رہے تھے کہ تم پولیس اسٹیشن سے روانہ ہو چکے

ہو۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ تمہارا فون بھی آچکا ہے۔''
''میت قبرستان لے جانے میں تو میرا خیال ہے کہ ابھی کچھ دیر لگے گی۔'' صبور نے کہا۔ ''میں ابھی اپنے مکینک کو فون کرتا ہوں، اگر کار ٹھیک ہوگئی ہوگی تو میں جا کر لے آؤں گا۔ تم جاؤ۔''
سلطانہ سر ہلا کر چلی گئی۔
صبور نے کچھ دیر بعد لوگوں سے الگ جا کر اپنے مکینک کو فون کیا۔
''آپ کی کار ٹھیک ہو چکی ہے صاحب!'' مکینک نے ہنس کر کہا۔ ''آپ جب کار دے گئے تھے تو میں حیران تھا کہ تین مہینے پہلے خریدی ہوئی نئی کار میں ایسی کیا خرابی ہو سکتی ہے کہ آپ کسی قسم کی آواز سن کر پریشان ہو گئے۔ وہ تو شاید کسی بچے نے شرارت کی ہوگی...... آپ کی کار میں......''
صبور نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''اچھا میں کار لینے آرہا ہوں۔'' پھر اس نے جواب دیے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔
ٹیکسی میں مکینک کے گیراج تک پہنچنے میں صبور کو بیس منٹ لگے۔ وہ اپنی کار میں واپس لوٹا۔ وہ ثاقب کے گھر سے کچھ فاصلے پر تھا جب اس کے موبائل فون پر اس کے والد کی کال آئی۔ وہ کراچی پہنچ گیا تھا اور اس وقت ثاقب ہی کے گھر پر تھا۔
''تم کہاں ہو؟'' اس نے صبور سے پوچھا پھر خود ہی بولا۔ ''سلطانہ نے ابھی بتایا تھا کہ تم کسی مکینک کے پاس اپنی کار لینے گئے ہو۔''
''جی ہاں بابا!'' صبور نے کہا۔ ''میں کار لے کے آرہا ہوں۔ بس پانچ منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔''
''اچھا تو باہر کار میں ہی رکنا۔ پانچ منٹ بعد میں باہر آؤں گا۔''
''اچھا بابا!''
دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔
صبور سمجھ گیا کہ اس کا باپ اس سے سارے معاملے کی تفصیلات سننے کے لیے بے چین ہوگا۔ صبور کے لیے اس میں زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ اس کا باپ شیما کے بارے میں باخبر ہو چکا ہوگا۔ اس معاملے میں صبور کو سرزنش کا سامنا کرنا پڑتا۔
صابر شاہ جاگیردار ہونے کے باوجود اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک مختلف قسم کا انسان تھا۔ اسے کوئی بھی روایتی جاگیردار نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس نے کبھی شراب نہیں پی تھی۔

اپنی خاندانی بیوی کے بعد دوسری شادی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ دوسرے جاگیرداروں کی طرح اس کی کوئی داشتہ بھی نہیں تھی۔
ثاقب کے گھر کے باہر خاصی دور تک دائیں بائیں کاریں پارک کی گئی تھیں۔ ثاقب کو اپنی کار خاصی دور پارک کرنا پڑی۔ اس نے موبائل پر باپ سے رابطہ کر کے اسے بتا دیا کہ وہ کار کہاں پارک کر سکا ہے۔
پانچ منٹ بعد صابر شاہ اس کی کار میں تھا۔ صبور کے سلام کا جواب دینے کے بعد اس نے کہا۔ ''اب مجھے تفصیل سے سب کچھ بتاؤ۔ مجھے یہ سن کر بہت صدمہ پہنچا ہے کہ اب تمہارے تعلقات ماڈل گرلز سے بھی ہو گئے ہیں۔ میں نے تمہیں تعلیم کے لیے کراچی میں تنہا اس لیے چھوڑا تھا کہ مجھے تم پر بہت اعتماد تھا۔ تم نے اس اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔''
''آپ نے جتنا غلط تاثر لیا ہے بابا! بات اتنی خراب نہیں ہے۔'' صبور نے نظریں جھکا کر دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ''شیما کے علاوہ میں کسی اور ماڈل گرل کو جانتا بھی نہیں۔ شیما سے میری ملاقات ایک ٹی وی چینل کے پروگرام میں جانے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس نے تو مجھ سے بے تکلف ہونا چاہا تھا لیکن میں گریز کر گیا تھا۔ اب شاید میری شامت دھکا دے گئی کہ میرے دماغ میں ایک کہانی کا خاکہ ابھرا تو مجھے اس پر ڈراما بنانے کی سوجھ گئی اور اس بارے میں بات کرنے کے لیے بھی مجھے شیما ہی کا خیال آیا۔''
''میں نے تم سے سارے معاملے کی تفصیل بیان کرنے کے لیے کہا تھا۔'' صابر شاہ خشک لہجے میں بولا۔
صبور نے نظریں جھکائے جھکائے وہ سب کچھ بیان کر دیا جو وہ بیان کر سکتا تھا۔ ایکسیڈنٹ کی بات تو اسے چھپانا ہی تھی۔
سب کچھ سننے کے بعد صابر شاہ ذرا دیر کچھ سوچتا رہا، پھر بولا۔ ''مجھے سب کچھ سچ سچ بتاؤ صبور! پانچ سے ساڑھے پانچ بجے کے دوران میں تم سے کوئی ایسی گڑبڑ تو نہیں ہوئی ہے جو تم نے شیما کو گواہ بنایا ہے کہ تم پانچ بجے سے اس کے ساتھ تھے۔''
''اس دوران میں کیا گڑبڑ ہو سکتی ہے بابا!'' صبور بولا۔ ''جاوید پولیس کو بتا چکا ہے کہ میں ساڑھے پانچ بجے تک ائرپورٹ پر اس کے ساتھ تھا۔ وہاں سے میں گھر کی طرف لوٹا۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ ائرپورٹ سے گھر پہنچنے میں کتنا وقت لگتا ہے۔ یکایک مجھے شیما کا خیال آگیا اور میں نے کار اس کے گھر کی طرف موڑ دی۔ یہ سارا وقت کار ڈرائیو کرنے ہی میں گزرا۔ مجھ سے یا کسی سے بھی اس پون

گھنٹے میں ایسی کیا گڑبڑ ہوسکتی ہے جسے چھپانے کے لیے کسی کو گواہ بنانے کی ضرورت پیش آئے۔''

صابر شاہ کچھ توقف سے بولا۔''بہ ظاہر تمہاری دلیل مضبوط ہے لیکن پولیس افسر کے دماغ میں یہی سوال چبھ رہا ہے کہ اس پون گھنٹے میں تم سے کوئی گڑبڑ ہوئی ہے جسے تم چھپانا چاہتے ہو۔شاید وہ تم سے درشت انداز میں پیش آتا لیکن میں نے چونکہ ہوم سیکریٹری سے بات کرلی تھی اس لیے وہ ایسا نہیں کرسکا...... لیکن ایک بات یاد رکھنا صبور! اگر مستقبل میں تمہاری کوئی ایسی بات سامنے آئی کہ تم قانون کے شکنجے میں پھنس جاؤ تو میں تمہارے لیے کچھ نہیں کروں گا۔ابھی تو ہوم سیکریٹری کو اس لیے فون کردیا تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی ناجائز سلوک نہ ہو، شبے کی وجہ سے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو لیکن...... اچھا خیر! امید ہے کہ تم نے میری بات سمجھ لی ہوگی۔ دوسرے سیاست دانوں کی طرح میں نے کبھی کوئی اقربا پروری نہیں کی اور نہ آئندہ کروں گا۔میرا دامن ہمیشہ صاف رہا ہے۔میں مستقبل میں بھی اس پر کوئی داغ لگانا پسند نہیں کروں گا۔افسوس تو خیر مجھے اس بات کا بھی ہے کہ تم شراب پینے لگے ہو لیکن اس کے لیے میں تمہیں کوئی دوش نہیں دوں گا۔میں نے تمہاری شادی ہی ایسے ماڈرن لوگوں میں کرائی جو شراب نوشی کو برا نہیں سمجھتے لیکن یہ میں اب بھی نہ سنوں کہ شیما سے تمہارا میل جول برقرار ہے۔''

''میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا بابا!'' صبور نے وعدہ تو کرلیا لیکن اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اب شیما سے جان چھڑانا اس کے لیے آسان نہیں ہوگا۔

صابر شاہ نے مزید کچھ کہے بغیر کار سے اترنے کے لیے دروازہ کھولا۔

''آپ دو ایک دن رکیں گے؟'' صبور نے پوچھا۔

''نہیں۔'' صابر شاہ نے جواب دیا۔''میں تو رات تک بھی نہیں رک سکتا۔میں صرف ثاقب کے سانحے کی وجہ سے آیا ہوں۔ تدفین کے بعد تھوڑا سا وقت تمہارے اپارٹمنٹ میں اس لیے گزاروں گا کہ سلطانہ بیٹی کی ڈھارس بندھا سکوں۔شیما کی وجہ سے اس کے دل کو بھی دھچکا لگا ہوگا۔اس کے بعد میں کچھ دیر کے لیے عباس کے پاس جاؤں گا۔ چار بجے تک مجھے کراچی سے روانہ ہوجانا ہے۔ چھ بجے مجھے حویلی میں ہونا چاہیے۔ چھ ساڑھے چھ کے درمیان میرے کچھ مہمان آنے والے ہیں۔''

صابر شاہ کار سے اتر گیا۔اس کے بعد صبور بھی اترا اور باپ سے ایک قدم پیچھے رہتے ہوئے ثاقب کے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

دوسرے لوگوں کے ساتھ ان دونوں نے بھی ثاقب کی تدفین میں شرکت کی۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد صبور سلطانہ کو لے کر وہاں سے روانہ ہونے والا تھا تو صابر شاہ بھی کار کی پچھلی نشست پر آبیٹھا۔

''آپ کی گاڑی کہاں ہے بابا!'' صبور نے پوچھا۔

''شوفر ہے۔ وہ گاڑی لے آئے گا۔ میں نے سوچا کہ راستے میں بھی تم دونوں سے باتیں کرتا چلوں۔''

سلطانہ، صبور کے برابر میں اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اتری اور پچھلی نشست پر آگئی۔

''وہیں بیٹھی رہتیں نا بیٹی!'' صابر شاہ نے کہا۔

''نہیں بابا!'' سلطانہ نے کہا۔''یہ اچھا نہیں لگے گا۔ مجھے صبور نے بتایا بھی ہے کہ آپ تھوڑی دیر بعد ہی چلے جائیں گے۔ تو میں کچھ وقت آپ کے قریب بیٹھ کر کیوں نہ گزاروں۔''

''خوش رہو۔'' صابر شاہ نے مسکرا کر شفقت سے سلطانہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

صبور نے کار چلا دی۔

سلطانہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن اسے موقع نہیں ملا۔ صابر شاہ نے کہا۔''مجھے امید ہے بیٹی کہ تم صبور کی یہ پہلی غلطی معاف کردو گی۔''

''آپ مجھ سے اتنے دبے ہوئے لہجے میں بات نہ کیا کیجیے بابا! مجھے شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ ہر بات کے لیے آپ مجھے حکم دیا کیجیے۔ آپ نے ابھی جو بات کی ہے، اس سے میں سمجھی ہوں کہ آپ کا اشارہ غالباً شیما کی طرف ہے۔ میں اس کے جواب میں پوری سچائی سے عرض کروں گی بابا کہ اس بات سے میرے دل کو ٹھیس تو لگی تھی لیکن وہ ایک وقتی بات تھی۔ میں زیادہ وقت کے لیے جذباتی نہیں ہوئی۔ میں نے بہت کم دنوں ہی میں صبور کو سمجھ لیا ہے۔ یہ عام لوگوں سے مختلف اور مضبوط کردار کے مالک ہیں۔ مجھے اب صرف حیرت ہے کہ یہ ایک ماڈل گرل کے گھر کیوں گئے تھے؟''

صابر شاہ کو جو کچھ صبور سے معلوم ہوا تھا، وہ اس نے سلطانہ کو بتا دیا۔

سلطانہ ہنس کر بولی۔''پھر تو کوئی خاص بات ہی نہیں۔ اسے میں صبور کی ایک چھوٹی سی غلطی کہوں گی کہ یہ کسی اور سے بات کرنے یا مشورہ کرنے کے بجائے شیما کے پاس کیوں گئے۔ خیر، غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔''

صابر شاہ نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔''شکر

ہے، تم نے میرے سینے سے ایک بوجھ اتار دیا بیٹی۔ میں تو اس الجھن میں تھا کہ تمہاری ڈھارس کیسے بندھاؤں گا۔ بہرحال! میں نے صبور کو تاکید کردی ہے۔ آئندہ میں نہیں سننا چاہتا کہ صاحب زادے پھر شیما سے ملے ہیں۔''

''نہیں، آپ یہ نہیں سنیں گے۔'' سلطانہ نے کہا۔

''مجھے اعتماد ہے صبور پر..... ایک آدھ بار تو کسی سے بھی کوئی غلطی ہوسکتی ہے۔''

سلطانہ کی ان باتوں نے نہ صرف صابر شاہ کے دماغ کا بوجھ ہلکا کیا بلکہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے صبور نے بھی سکون کی سانس لی۔

☆☆☆

صابر شاہ گھر پر تھوڑی دیر رکا۔ چائے پی، کچھ باتیں کیں اور رخصت ہوگیا۔ اسے سلطانہ کے والد سرجن عباس سے مل کر چار بجے تک واپس جانا تھا۔

''بہت تھکن ہوگئی ہے، لیٹا جائے۔'' سلطانہ نے کہا۔

صبور نے اس سے اتفاق کیا۔ دونوں خواب گاہ میں چلے گئے۔

''شیما ہے تو کافی دلکش۔'' سلطانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بہت سے اشتہارات میں آرہی ہے آج کل۔''

''میں اب اسے اپنے ذہن سے جھٹکنا چاہتا ہوں اور تم پھر اسی کا ذکر لے بیٹھیں۔'' صبور کے لہجے میں ہلکا سا احتجاج تھا۔

''چھیڑ رہی تھی تمہیں۔ اب کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں؟''

''تمہیں مجھ پر مکمل حق حاصل ہے سلطانہ!'' صبور نے اسے محبت سے دیکھا۔ ''لیکن بس شیما کا نام مت لاؤ زبان پر..... وہ ویسے ہی میرے لیے خاصی الجھن کا سبب ہے۔''

''کیوں؟ الجھن کیسی؟''

''بابا کہہ گئے ہیں کہ اب وہ کبھی میرے اور شیما کے بارے میں کچھ نہ سنیں لیکن وہ بڑی حرافہ ہے۔ معاملہ پولیس تک بھی پہنچ گیا ہے۔ اب وہ آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اگر میں اس سے سختی سے پیش آیا تو وہ مجھے کسی پریشانی میں ڈال سکتی ہے۔''

''کس پریشانی میں ڈال سکتی ہے؟''

''اگر وہ اپنا بیان بدل دے تو کیا ہوگا؟''

''کیا ہوگا..... تم بتاؤ؟''

''وہ کہہ سکتی ہے کہ پہلے اس نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ پانچ بجے کی بات اس نے نشے میں نہیں کی تھی بلکہ میں نے اسے یہ بیان دینے کے لیے کوئی بڑی رقم دی تھی۔''

صبور نے کہا۔

''میں نہیں سمجھتی کہ وہ ایسا کرے گی۔'' سلطانہ نے کہا۔ ''غلط بیانی کے الزام میں وہ اپنے لیے پریشانی مول نہیں لے گی۔ اسے جھڑک دو اگر وہ تمہارے پیچھے پڑنے کی کوشش کرے۔''

سلطانہ کیونکہ اصل بات سے واقف نہیں تھی اس لیے اس کا یہ مشورہ کوئی غیر فطری بات نہیں تھی لیکن صبور نے اس معاملے میں اس سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ سلطانہ اس کی باتوں سے غلط مطلب اخذ کرسکتی تھی۔

صبور کو خاموش پاکر سلطانہ پھر بولی۔ ''تمہیں اب صرف روحی کے بارے میں سوچنا چاہیے۔''

صبور چونکا۔ ''کیا سوچنا چاہیے؟'' اس کے منہ سے نکلا۔

''کل رات ہی میں تمہیں سب کچھ تو بتا چکی ہوں۔''

''مگر وہ سب کچھ کیسے ممکن ہے سلطانہ؟ اس سے میں یہ باتیں کیسے کرسکتا ہوں؟ اور پھر حالات..... ابھی ایک ہی دن گزرا ہے اس کے منگیتر کی ہلاکت کو۔ اس سے تو ملاقات ہونا بھی مشکل ہے۔''

''اس میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔'' سلطانہ نے کہا۔ ''میں سوچ چکی ہوں۔ اسپتال سے اپنے گھر تو وہ آج ہی چلی گئی ہے۔ اس کے گم صم ہونے کا سبب یہ سمجھا جارہا ہے کہ وہ ثاقب کی موت کے باعث غم زدہ ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ اصل بات یہ نہیں۔ اس کی پریشانی یہ ہے کہ وہ ثاقب کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔'' سلطانہ بولتی ہی چلی گئی۔ ''اس سے تمہیں باتیں کرنے کا موقع اس طرح مل جائے گا کہ میں اسے کل نہیں تو پرسوں اپنے ساتھ یہاں لے آؤں گی۔ مجھے سب سے یہ کہنا پڑے گا کہ روحی کا اس طرح دھیان بٹے گا کہیں آنے جانے سے۔ سبھی جانتے ہیں کہ میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں اور وہ بھی مجھے چاہتی ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لاؤں گی تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔''

صبور کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ وہ جواب میں کیا کہے۔

سلطانہ بولی۔ ''اس کے یہاں آجانے کے بعد میں ایسا ماحول بھی پیدا کردوں گی کہ تمہیں اس سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل جائے۔''

صبور اب بھی خاموش رہا۔

''پلیز صبور!'' سلطانہ پھر بولی۔ ''میری خاطر تمہیں یہ کرنا ہی ہوگا۔ روحی کے دماغ سے خودکشی کا خیال نکالو اور کوشش کرو کہ وہ زندگی میں دلکشی محسوس کرنے لگے۔''

صبور اب بھی خاموش رہا۔

"تم بول کیوں نہیں رہے ہو؟" سلطانہ کچھ خفگی سے بولی۔ "کیا تم اس کے لیے تیار نہیں ہو؟"

"یہ بات نہیں سلطانہ!" صبور نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "میں تو الجھ رہا ہوں کہ آخر وہ اس پر کیسے آمادہ ہوگئی کہ میں اس معاملے میں اس کے لیے کچھ کروں۔"

"وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میری بات ٹال نہیں سکتی۔"

صبور کی دانست میں یہ سلطانہ کی بچگانا سوچ تھی۔ کوئی بھی لڑکی اس نازک معاملے میں کسی دوسرے مرد کو اپنا راز دار نہیں بنا سکتی۔ روحی کی آمادگی کا سبب کچھ اور تھا جو سلطانہ کے سان گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا۔

"اچھا، خیر!" صبور نے کہا۔ "میں دیکھوں گا کہ میں اس معاملے میں کیا کرسکتا ہوں۔ اب کچھ دیر آنکھیں بند کرکے آرام کرلو تو بہتر ہے۔ کم از کم میں تو بہت تھک گیا ہوں۔"

"میں خود بہت تھکی ہوئی ہوں۔ میں بھی آرام کرنا چاہتی ہوں لیکن اگر تم اس کے لیے تیار نہیں ہوتے تو مجھ سے آرام نہیں کیا جاتا۔"

صبور کے وعدہ کرلینے سے سلطانہ خوش ہوگئی تھی۔

صبور نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ خاصی دیر تک اسی طرح لیٹا رہا۔ اس طرح اس کی جسمانی تکان تو دور ہوگئی لیکن دماغ بوجھل ہی رہا۔ یہ اس کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش تھی کہ وہ روحی سے نہ صرف یہ کہ تنہائی میں ملتا بلکہ اس سے اس معاملے میں بھی بات کرتا جس بارے میں سلطانہ نے اس سے کہا تھا۔

شام پانچ بجے جب وہ اور سلطانہ چائے پی رہے تھے، صبور کے موبائل پر جاوید کی کال آئی۔

"یہ سب کیا ہوا ہے صبور! میں بہت پریشان ہوں۔" وہ چھوٹتے ہی بولا۔

"میری پریشانی بھی کم نہیں ہے جاوید!" صبور نے کہا۔ "لیکن میں حیران ہوں کہ تم نے مجھے اب فون کیا ہے؟"

"میں جن کاموں سے لاہور گیا تھا، ان میں خاصی الجھنیں پیدا ہوگئی تھیں۔ رہی سہی کسر پولیس نے پوری کردی۔ موبائل فون پر ہی انہوں نے ایسے ٹیڑھے سیدھے سوالات کیے تھے جیسے میں نے تمہیں اپنی کار دے کر کوئی بہت بڑا جرم کرڈالا۔ انہی سب باتوں کی وجہ سے میں تمہیں کال نہیں کرسکا۔ میں چاہتا تھا کہ تم سے کچھ سکون سے بات کروں۔ مختصر یہ کہ خوش قسمتی سے یہاں کی الجھنیں بروقت ختم ہوگئیں۔ میرا مطلب ہے کہ واپسی کے لیے میری فلائٹ جس وقت تھی، اسی وقت سب کام ختم ہوگئے اور میں سیدھا ائرپورٹ روانہ ہوگیا۔ میں نے سوچا تھا کہ اب کراچی پہنچ کر ہی تم سے بات کروں گا۔ میں ابھی گھر پہنچا ہوں اور تمہیں کال کی ہے۔ کیا تم اپنے گھر پر ہو؟"

"ہاں۔"

"بس تو میں تمہارے پاس آرہا ہوں۔"

جاوید اتنا پریشان تھا کہ اس نے صبور کی اور کوئی بات سنے بغیر رابطہ منقطع کردیا۔

سلطانہ کی نظریں صبور پر جمی ہوئی تھیں۔

"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"جاوید بہت پریشان ہے۔ ابھی کراچی پہنچا ہے اور اب فوراً ہی مجھ سے ملنے آرہا ہے۔"

"بات ہے ہی پریشانی کی..... کار اس کی تھی۔" سلطانہ نے کہا۔ پھر فوراً ہی بولی۔ "میرا دماغ روحی اور ثاقب کی موت میں اتنا الجھا رہا کہ میں تم سے یہ پوچھنا تو بھول ہی گئی۔ آخر تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی کہ تم نے جاوید کی کار لے لی تھی؟"

صبور خفیف سا مسکرایا۔ "تم جھگڑنے بیٹھ جاتیں۔ تم پسند نہیں کرتی ہو نا کہ کسی سے کوئی چیز عاریتاً لی جائے۔"

"ہاں یہ مجھے بہت برا لگتا ہے۔ تم نے بھی حد کردی۔ کار کے بغیر ایک دن گزارنا کیا قیامت بن جاتا؟ اور پھر تمہیں کار کے بغیر رہنا بھی پڑا۔"

"اب یہ تو معلوم نہیں تھا نا کہ کار چوری ہوجائے گی۔"

"اور چوری کے بعد وہ استعمال بھی ہوئی تو دہشت گردی کے لیے..... اگر بابا کے تعلقات نہ ہوتے تو یہ بالکل ممکن تھا کہ اس وقت تم خاصی پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہوتے اور تمہاری وجہ سے میں بھی ہلکان ہوتی۔"

کچھ دیر بعد جاوید بھی آگیا تو صبور نے اس سے ڈرائنگ روم میں ملاقات کی۔ سلطانہ وہاں نہیں آئی تھی۔

صبور نے جاوید کو تفصیل سے سب کچھ بتایا لیکن جو کچھ پولیس سے چھپایا تھا، وہ جاوید کو بھی نہیں بتایا۔

سب کچھ سننے کے بعد جاوید نے پریشان لہجے میں کہا۔ "تم تو اپنے بابا کی وجہ سے چھوٹ گئے لیکن مجھے پولیس ضرور پریشان کرے گی۔ یہ کوئی چھوٹا موٹا معاملہ تو ہے نہیں۔ میری کار دہشت گردی میں استعمال ہوئی ہے۔"

"کیا پولیس نے تم سے دوبارہ رابطہ کیا ہے؟"

"ابھی پولیس کو معلوم ہی نہیں ہوگا کہ میں کراچی آچکا ہوں۔ اس پولیس آفیسر نے فون پر مجھ سے کہا تھا کہ میں کراچی پہنچتے ہی اس سے رابطہ کروں۔ وہ مجھے کرنا ہی

پڑے گا لیکن میں چاہتا تھا کہ پہلے تم سے مل لوں۔"

"پریشان نہ ہو۔" صبور نے اس کی ڈھارس بندھائی۔ "تم میری وجہ سے اس چکر میں پڑے ہو لیکن اگر اس میں میرا دخل نہ ہوتا تو بھی میں کوشش کرتا کہ پولیس تمہیں کسی معاملے میں پھنسانے کی کوشش نہ کرے۔ تم بالکل پُرسکون رہ کر اس سے رابطہ کرو۔ مجھے صورتِ حال سے آگاہ رکھنا۔ اگر کوئی بات ہوئی تو میں بابا کو اطلاع دے دوں گا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ پولیس تمہیں پریشان نہیں کرے گی۔"

"انہوں نے ابھی میری کار بھی نہیں لوٹائی ہے۔ ڈیڈی سے کہا تھا کہ جب تک اس معاملے کی تفتیش مکمل نہ ہو جائے، کار انہی کی تحویل میں رہے گی۔"

"رہنے دو۔ کیا فرق پڑے گا اس سے۔ تمہارے گھر میں کاروں کی کمی تو نہیں۔" صبور نے یہ جواب دے تو دیا لیکن وہ خود اس خیال سے پریشان ہو گیا کہ پولیس کو کار سے کوئی ایسا سراغ نہ مل جائے جس سے ثابت ہو سکے کہ روحی اور ثاقب کا ایکسیڈنٹ اسی کار سے ہوا تھا۔

پولیس افسر اس بارے میں قیاس آرائی بھی کر چکا تھا لیکن اس قیاس آرائی کے وقت یہ بات سوچی جا رہی تھی کہ ایکسیڈنٹ اس شخص سے ہوا ہو گا جس نے کار چوری کی تھی۔

بات قیاس آرائی سے آگے اس وقت بڑھتی جب ایسا کوئی ثبوت مل جاتا...... اور ایسا ثبوت ملنے کی صورت میں صبور کے لیے اپنا بچاؤ کرنا شاید ممکن ہی نہیں رہتا۔ اس کا باپ صابر شاہ صاف صاف کہہ چکا تھا کہ اگر کوئی غلط بات سامنے آئی تو وہ صبور کے لیے کچھ نہیں کرے گا۔

چند منٹ بعد جاوید چلا گیا۔

آدھے گھنٹے بعد اس کا فون پھر آیا۔ "میں نے پولیس افسر سے رابطہ کیا تھا صبور!" اس نے کہا۔ "مجھے تو اندیشہ تھا کہ وہ مجھے پولیس ہیڈ کوارٹر طلب کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ میرے گھر ہی آ رہا ہے۔ کہا تھا کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر پہنچ جائے گا۔"

"یہ بہت اچھا ہوا کہ تمہیں پولیس ہیڈ کوارٹر نہیں جانا پڑے گا۔"

"میں نے تمہیں بس یہی اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا۔ اگر کوئی خاص بات ہوئی تو دوبارہ فون کروں گا۔"

"خاص بات ہو یا نہ ہو، فون ضرور کرنا۔"

"اچھا۔"

صبور نے رابطہ منقطع کر دیا۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد جاوید کی کال پھر آئی۔

"چلا گیا وہ پوچھ گچھ کر کے۔" اس نے کہا۔ "اس نے مجھ سے زیادہ تر تمہارے بارے میں سوالات کیے۔"

"کیا مطلب؟"

"یعنی تم کیسے مزاج کے مالک ہو۔ کراچی میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران میں تمہارا میل جول کس قسم کے لوگوں سے رہا ہے۔ میں نے اندازہ لگایا ہے صبور کہ وہ تمہارے بابا کی دخل اندازی کی وجہ سے بہت بھنایا ہوا ہے اور تمہارے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

"جو ظاہر ہے کہ اسے نہیں ملے گا۔" صبور نے دھڑکتے دل سے کہا۔ "میں نے کچھ کیا ہوتا تبھی تو ملتا نا اسے کوئی ثبوت!"

"چلو ٹھیک ہے، فی الحال تو سکون ملا۔"

یہ گفتگو سلطانہ نے بھی سنی۔ جب صبور نے موبائل بند کر دیا تو وہ بولی۔ "بات کچھ تشویش کی تو ہے صبور۔ روحی نے پولیس کو جو نمبر بتائے تھے، ان میں سے ایک نمبر ایسا ہے جس میں صرف ایک ہندسے کا فرق ہے جاوید کی کار کے نمبر سے۔"

"فرق تو ہے نا!" صبور نے کہا۔ "یہ اتفاق ہے کہ ایکسیڈنٹ کرنے والی کار کے نمبر اور جاوید کی کار کے نمبروں میں مماثلت پائی گئی۔ دوسری اہم بات یہ کہ روحی نے وہ نمبر یقین سے تو بتائے نہیں تھے۔ حادثے کے وقت وہ اتنی حواس باختہ ہوئی ہو گی کہ اس کار کا نمبر اس کے ذہن میں رہ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"اللہ نے بڑی خیر کی کہ وہ ایکسیڈنٹ تم سے نہیں ہوا۔ ڈرائیونگ تم بھی بہت تیز کرتے ہو۔ یہ عادت چھوڑ دو صبور! اس واقعے سے عبرت حاصل کرو۔"

"میں اپنی اس عادت سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کروں گا۔" صبور خود پر جبر کر کے مسکرایا۔

سلطانہ بھی مسکرا دی۔ صبور اخبار اٹھا کر دہشت گردی کی خبر پڑھنے لگا۔

☆☆☆

اگلے روز اس دہشت گردی کی خبر پھر چھپی۔ اس خبر میں بتایا گیا تھا کہ اس واقعے میں استعمال کی جانے والی کار چوری کی گئی تھی اور اس کار کا مالک ایک انڈسٹریلسٹ کا بیٹا جاوید تھا جس نے لاہور جانے سے پہلے اپنی کار ایک دن کے لیے اپنے دوست صبور کو دے دی تھی۔ خبر میں پولیس کی اس دن کی ساری کارروائی کے بارے میں بھی تفصیل سے لکھا گیا تھا۔

خبر پڑھتے ہوئے صبور کے دماغ میں خیال ابھرا کہ اخبار کو اتنی تفصیلات کا علم اس پولیس افسر ہی کے ذریعے ہوسکتا تھا۔ خبر میں یہ بات بھی تھی کہ صبور کس کالج میں بی اے کے فائنل ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ اس بارے میں جو تفصیل چھپی تھی، اس میں شیما کا ذکر بھی آیا تھا۔ صبور کو غصہ آنے لگا۔ پولیس آفسر نے اخبار کو اتنی تفصیلات دے کر اسے بدنام کرنے کی کوشش کی تھی۔

اخبار کو یہ ساری تفصیل مہیا کرنے کے باوجود وہ ایک معاملے میں محتاط رہا تھا۔ خبر میں صابر شاہ کا نام نہیں آیا تھا۔ صبور کے بارے میں صرف اتنی بات لکھی گئی تھی کہ وہ کسی بڑے آدمی کا بیٹا ہے۔

صبور نے خبر ادھوری ہی چھوڑ کر سلطانہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''تم نے پڑھی یہ خبر؟''

''پوری نہیں پڑھ سکی۔''

اس وقت وہ صبور کے ساتھ ناشتا کر رہی تھی۔ صبور ناشتا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ خبر بھی پڑھ رہا تھا۔

سلطانہ کا جواب سننے کے بعد صبور نے کہا۔ ''آج میرے کالج میں بھی اسی کا چرچا رہے گا۔ مناسب ہوگا کہ دو تین دن کالج نہ جاؤں۔''

''اس سے کیا ہوگا۔ جب بھی جاؤ گے، وہاں تم سے اس بارے میں سبھی بات کریں گے۔''

صبور نے کچھ سوچا، پھر دوبارہ خبر پڑھنے لگا۔ اگرچہ روحی اور ثاقب کے حادثے کی خبر الگ بھی چھپی تھی لیکن اس کا تذکرہ اس خبر میں بھی موجود تھا۔ اس حوالے سے روحی کا نام بھی آیا تھا جس نے پولیس کو کار کے کچھ نمبر بتائے تھے۔ کئی نمبر بتانے کی وجہ یہ تھی کہ بدحواسی کے عالم میں اسے کار کا صحیح نمبر یاد نہیں تھا۔ اس ضمن میں یہ بات بھی تحریر کی گئی تھی کہ ایک نمبر ایسا تھا جو جاوید کی کار کے نمبر سے مماثل تھا۔ اس بارے میں پولیس شبہ کر رہی تھی کہ روحی بدحواسی کے باعث پانچ اور چھ نمبر میں تمیز نہیں کرسکی تھی۔

خبر کے آخر میں لکھا تھا کہ پولیس دہشت گردی کی کارروائی اور ثاقب کے حادثے میں کسی درمیانی کڑی کو خارج از امکان قرار نہیں دے رہی ہے اور اس کڑی کی تلاش میں اس کی تفتیش جاری ہے۔

''کم بخت۔'' صبور نے غصے میں اخبار ایک طرف ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اس انداز میں خبر دے کر اس نے مجھے مشکوک بنانے کی کوشش کی ہے۔''

''کیا لکھا ہے؟''

''تم خود پڑھ لو۔''

اس وقت وہ دونوں ناشتا کر چکے تھے۔ سلطانہ نے باقی خبر بھی پڑھی پھر صبور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ پولیس افسر واقعی کوئی گھٹیا شخص ہے۔ تم نے وہ خبر شاید نہیں پڑھی جو ثاقب کے حادثے کے بارے میں کل ہی آچکی ہے۔''

''ہاں۔'' صبور نے کہا۔ ''کل بھی میں نے صرف دہشت گردی کی خبر پڑھی تھی۔''

''وہ خبر بھی پڑھ لو۔ میں کل کا اخبار لاتی ہوں۔'' سلطانہ اٹھ کر بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔

''ٹی وی لاؤنج میں آنا۔'' صبور بھی کرسی سے اٹھا۔

گزشتہ روز کے اخبار میں اس نے ثاقب کے حادثے کی خبر کی صرف سرخی پڑھی تھی۔ اس کے دل و دماغ پوری خبر پڑھنے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ اس حادثے کا ذمے دار وہ خود تھا۔

ڈائننگ روم سے ٹی وی لاؤنج میں آکر اس نے ٹی وی کھولا۔ وہ خبریں سننا چاہتا تھا۔ خبریں نشر ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ سلطانہ اس سے پہلے ہی گزشتہ روز کا اخبار لے آئی۔ اس نے اخبار موڑ کر صبور کو اس طرح دیا کہ ثاقب کے حادثے کی خبر سامنے ہی نظر آئی۔

صبور وہ خبر نہیں پڑھنا چاہتا تھا لیکن اب سلطانہ کے کہنے کے بعد وہ اس سے گریز کرنے کا کوئی جواز نہیں رکھتا تھا۔ اس نے خبر پڑھی۔ روحی کا بیان اس میں بھی تھا۔ ایک جملہ پڑھ کر وہ چونک گیا۔ روحی نے کار کے جو نمبر بتائے تھے اس کے ساتھ ہی اس نے کار کا ''میک'' بھی بتایا تھا جو جاوید کی کار کا نہیں تھا۔

''اوہ، گاڈ!'' صبور کے منہ سے نکلا پھر اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے پوچھ گچھ کرتے وقت اس پولیس افسر نے مجھے یہ بات نہیں بتائی تھی۔ اس نے سارا زور اس بات پر رکھا تھا کہ روحی کا بتایا ہوا ایک نمبر جاوید کی کار کے نمبر سے مماثل تھا۔''

''اب اس سے کیا ثابت ہوتا ہے۔'' سلطانہ بولی۔

''یہی نا کہ روحی کا سارا بیان بدحواسی کا نتیجہ تھا۔ وہ نہ تو میک صحیح بتا سکی ہوگی اور نہ نمبر۔''

''لیکن وہ۔'' صبور کا اشارہ پولیس افسر کی طرف تھا۔ ''اس کی خواہش یہ ہے کہ وہ مجھے اس معاملے میں پھنسا دے۔''

''کیا اس سے تمہاری کوئی دشمنی ہے؟''

''نہیں، لیکن للہی بغض بھی تو ایک چیز ہوتی ہے۔ اس کے دماغ میں یہ بات بھی ہوسکتی ہے کہ مجھے پھنسا کر اس

پولیس افسر پر اپنی برتری ثابت کرسکے جو ثاقب کے حادثے کی تحقیق کر رہا تھا۔"

"اب تم یہ بوجھ اپنے سر سے اتار دو۔" سلطانہ نے کہا۔ "تم بے قصور ہو لہٰذا تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔"

"وہ تو ہے لیکن اس نے مجھے بدنام تو کیا ہے۔ میں ابھی اس بارے میں بابا سے بات کرتا ہوں۔" صبور نے موبائل نکالا۔

سلطانہ کچھ نہیں بولی۔ صبور اتنا جذباتی ہو گیا تھا کہ اس نے ریموٹ سے ٹی وی بھی بند کر دیا۔ اب اسے خبریں سننے سے زیادہ اپنے باپ سے بات کرنے کی دھن سوار ہو گئی تھی۔

صابر شاہ نے فوراً کال ریسیو کی اور کہا۔ "مجھے خیال تھا کہ تم فون کرو گے۔ تم آج شائع ہونے والی خبر ہی کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہو نا؟"

"جی۔"

"وہ خبر پڑھ کر مجھے بھی غصہ آیا تھا۔ میں نے ابھی ہوم سیکریٹری سے بات کی ہے۔ وہ تو کہہ رہے تھے کہ اس پولیس آفیسر کو معطل کرا دیں گے لیکن غصے کے باوجود میں نے ان سے کہا ہے کہ وہ ایسا ہرگز نہ کریں۔"

"کیوں بابا!"

"تم ابھی جوان ہو، جذباتی ہو لیکن میں غصے کے باوجود سمجھ بوجھ سے بالکل دور نہیں ہو جاتا۔" صابر شاہ نے جواب دیا۔ "پولیس آفیسر معطل کیا جاتا تو یہ خبر بھی اخبار میں آتی اور اخبارات اس قسم کی قیاس آرائیاں بھی کرتے کہ پولیس آفیسر کی تفتیش غالباً درست سمت میں جا رہی تھی لہٰذا کسی بڑی شخصیت کے دباؤ پر اسے معطل کر دیا گیا۔ اس قسم کی خبر شائع ہونا مناسب نہیں ہوتا بیٹے! اس کے بعد اخبار والے خود یہ جاننے کے لیے کوشاں ہو جاتے کہ تم کس کے بیٹے ہو بلکہ اب بھی ممکن ہے کہ اخباری نمائندے تمہارے پیچھے لگیں۔ ان کی طرف سے محتاط رہنا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بابا!" صبور نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس پہلو پر نہیں سوچا تھا۔"

"بس یہی فرق ہوتا ہے، زیادہ عمر کے تجربے اور کم عمری کے تجربے میں۔" صابر شاہ نے کہا۔ "دوسرے مجھے یہ اطمینان بھی ہے کہ جب تم سے کوئی گڑبڑ ہوئی ہی نہیں ہے تو وہ پولیس آفیسر تمہارا کیا بگاڑ لے گا۔"

"ٹھیک ہے بابا! آپ کی ان باتوں سے مجھے اپنے غصے پر قابو پانے میں مدد ملے گی۔"

"پرسکون رہو اور اپنی تعلیم کی طرف دھیان دو۔" صابر شاہ نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

صبور نے موبائل رکھا تو سلطانہ نے پوچھا۔ "کیا کہہ رہے تھے بابا؟"

صبور نے اسے سب کچھ بتا دیا۔

"واقعی۔" سلطانہ بولی۔ "بزرگوں کا تجربہ اہمیت رکھتا ہے۔ اچھا خیر! تم کالج جاؤ گے یا نہیں؟"

"کم از کم آج تو نہیں جاؤں گا۔ ذہن بہت مکدر ہو گیا ہے۔"

"تمہاری مرضی۔ کیا گھر پر ہی رہو گے؟"

"کیوں؟"

"میں سوچ رہی ہوں کہ اگر تم کالج نہیں جا رہے ہو تو روحی کے گھر چلے چلتے ہیں۔"

"میرا ابھی نہیں چاہ رہا ہے کہیں جانے کو۔ تم جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔"

"اچھا تو میں تیاری کرتی ہوں جانے کی۔ مجھے روحی کو یہاں لانے کے لیے بھی تو کوئی چکر چلانا ہوگا۔" روحی نے صبور کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور تیار ہونے کے لیے وہاں سے چلی گئی۔

روحی کا نام آتے ہی صبور کا ذہنی دباؤ اور بڑھ گیا۔ یہ اس کے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ ماضی میں روحی کا معاملہ بہت گمبھیر رہا تھا۔ فرسٹ ایئر سے تھرڈ ایئر تک وہ اور صبور ایک ہی کالج میں پڑھتے رہے تھے۔ ابتدا میں ان کا تعلق دوستانہ ہی رہا تھا لیکن کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد صبور نے یہ بات محسوس کی تھی کہ روحی کے جذبات ایک اور ہی رخ پر بہہ نکلے تھے۔ وہ صبور سے محبت کرنے لگی تھی۔ یہ احساس ہوتے ہی صبور اس سے گریزاں رہنے کی کوشش کرنے لگا۔ اگرچہ روحی کالج کی چند حسین لڑکیوں میں سے ایک تھی لیکن صبور کا مزاج ایسا تھا کہ وہ اس قسم کے معاملات سے الگ تھلگ رہنا ہی پسند کرتا تھا۔

صبور کے گریز کا ردِعمل یہ ہوا کہ روحی نے اس کے قریب ہونے کی کوشش پہلے سے زیادہ کر دی۔ سیکنڈ ایئر کے نصف تک پہنچتے پہنچتے اس کے جذبات اتنے بھڑک چکے تھے کہ اس نے واشگاف الفاظ میں صبور سے اظہارِ عشق کر ڈالا۔ صبور جواباً کوئی سخت رویہ اختیار نہیں کر سکا لیکن اس نے روحی کو سمجھانے کی کوشش ضرور کی کہ ان دونوں کا میل کئی وجوہ سے ممکن نہیں۔

صبور نے جو وجوہ بتائیں انہیں روحی دلائل سے مسترد کرتی رہی اور یہ سلسلہ تھرڈ ایئر میں پہنچتے تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ روحی بالکل مایوس ہو گئی۔ اس نے صبور سے

بات کرنا بھی چھوڑ دی لیکن کالج میں ہر وقت چہکنے والی وہ لڑکی بالکل خاموش طبع ہوگئی۔ کالج میں سبھی اس کی تبدیلی پر حیران تھے۔ صبور نے محسوس کیا تھا کہ روحی افسردہ بھی رہنے لگی تھی لیکن کوشش کرتی تھی کہ اس کی افسردگی ظاہر نہ ہو۔ پھر اچانک اس نے نہ صرف کالج چھوڑ دیا بلکہ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے اس نے کسی دوسرے کالج میں بھی داخلہ نہیں لیا۔

صبور کے دل میں اس کے لیے ہمدردی تھی لیکن وہ اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ جو کچھ روحی چاہتی تھی، وہ اس راہ پر نہیں چل سکتا تھا۔ اس نے اصولی طور پر اپنے دل میں یہ بات طے کرلی تھی کہ اس کی شادی وہیں ہوگی جہاں اس کا باپ چاہے گا اور پھر اچانک ہی اس کی شادی سلطانہ سے ہوگئی۔ صبور کو شادی کے بعد معلوم ہوا تھا کہ روحی، سلطانہ کی چچازاد بہن تھی۔

اب تین ماہ میں بہت کم ایسا ہوا تھا کہ اس کا اور صبور کا آمنا سامنا ہوا ہو اور یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ تنہائی میں ان کی ملاقات ہوتی۔

روحی کی منگنی کی خبر نے صبور کو پُرسکون کیا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ روحی کے جذبات رفتہ رفتہ سرد پڑ گئے ہوں گے اور شادی کے بعد تو وہ یقیناً ماضی کی محبت کو اپنے ذہن کے اندھیروں میں دھکیل دینا چاہے گی۔

مگر اب جو حادثہ ہوا تھا، اس نے صبور کو ایک اور امتحان میں ڈال دیا تھا۔ ایک تو وہ ماضی میں روحی کی محبت قتل کرچکا تھا اور اب اس کی تیز ڈرائیونگ کے باعث روحی کے منگیتر کی ہلاکت ہوئی تھی۔ ان باتوں کی روشنی میں وہ خود کو روحی کا دُہرا مجرم سمجھنے لگا تھا۔

وہ سلطانہ کے جانے کے بعد روحی کے بارے میں بہت کچھ سوچتا رہا۔ وہ اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھا کہ اب آمنا سامنا ہونے پر تنہائی میں روحی کے جذبات کیا ہوں گے۔

دوپہر کو سلطانہ واپس آگئی۔ صبور نے یہ دیکھ کر سکون محسوس کیا تھا کہ روحی اس کے ساتھ نہیں تھی۔ سلطانہ نے اسے بتایا کہ اس روز کسی وجہ سے روحی کا آنا ممکن نہیں تھا لیکن اگلے دن وہ اسے ضرور لے آئے گی۔ گویا صبور کے لیے امتحان کا وقت صرف ایک دن کے لیے ٹلا تھا۔

شام کو صبور کے کالج کا ایک ساتھی اس سے ملنے آیا۔ اس سے صبور کو یہ معلومات حاصل ہوئیں کہ پولیس گزشتہ روز دوپہر کو اس کے کالج پہنچی تھی جہاں اس نے صبور کے کردار اور عادات واطوار کے بارے میں پوچھ گچھ کی تھی۔

کالج میں صبور اچھی شہرت کا مالک تھا اس لیے پولیس آفیسر کو یقیناً مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔

''کم بخت۔'' سب کچھ جاننے کے بعد صبور نے دل ہی دل میں اس پولیس آفیسر کو برا بھلا کہا۔

اوائل رات میں شیبا کی کال آئی۔ ''تم نے فون بھی نہیں کیا صبور!'' اس نے شکایت کی۔

''میں کچھ پریشانیوں میں گھر گیا ہوں شیبا! پلیز، اب تم مجھے فون مت کرنا۔ میں کسی وقت خود تم سے رابطہ کروں گا۔''

''جلدی کرنا۔ تم سے ملاقات کے بعد تو اب میں تمہارے لیے بہت بے چین رہنے لگی ہوں۔''

''اوکے، اوکے۔'' صبور نے کہا اور جلدی سے رابطہ منقطع کردیا۔ اس نے خواب گاہ کی طرف آتی ہوئی سلطانہ کے قدموں کی آہٹ سن لی تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن وہ ہوا جس سے صبور بچنا چاہتا تھا۔ سلطانہ دوپہر کو گئی اور دو گھنٹے بعد روحی کو ساتھ لے آئی۔

''اب یہ دو ایک دن یہیں رہے گی صبور!'' سلطانہ نے کہا۔ ''میں چاہتی ہوں اس کا دھیان بٹانے میں تم بھی میرا ہاتھ بٹاؤ۔''

''یقیناً...... کیوں نہیں۔'' صبور کو کہنا پڑا۔

روحی نظریں جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ وہ تینوں اس وقت ڈرائنگ روم میں تھے اور دو چار باتیں کرکے سلطانہ کسی کام کے بہانے ڈرائنگ روم سے چلی گئی۔ کوئی کام بھی نہیں ہوگا، صبور نے سوچا۔ وہ دانستہ طور پر اسے روحی کے ساتھ تنہا چھوڑ گئی ہے۔

روحی نے صبور کی طرف دیکھا اور پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''میں یہ دیکھ کر ہمیشہ بہت خوش ہوئی ہوں کہ میری پیاری بہن سلطانہ کے ساتھ تم بہت خوش وخرم زندگی گزار رہے ہو۔''

''میں بھی خوش ہوا تھا کہ تمہاری منگنی ہوگئی لیکن جو حادثہ ہوگیا، اس کے لیے میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔''

''مجھے کوئی غم نہیں ہوا اس حادثے کا!''

روحی کا یہ جواب ایسا تھا کہ صبور بھونچکا رہ گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اپنا ردِعمل اپنی زبان پر لاتا، سلطانہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ''روحی ڈیئر! میں ذرا دیر کے لیے پڑوس میں جارہی ہوں۔ مسز شکور ہیں۔ ابھی میرے موبائل پر ان کی کال آئی تھی۔ انہوں نے مجھے کوئی

ضروری بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔ میرا خیال ہے، میں پندرہ بیس منٹ میں لوٹ آؤں گی۔"

روحی نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

سلطانہ پھر بولی۔ "ملازمہ تم دونوں کے لیے چائے لے کر آ رہی ہوگی۔" پھر اس نے صبور کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم روحی سے گپ شپ کرتے رہو۔ اسے بور مت ہونے دینا۔"

"جلدی آنا۔" صبور نے سرسری انداز میں کہہ دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ سلطانہ جلدی نہیں لوٹے گی۔

اس کے جانے کے بعد روحی بولی۔ "وہ جان بوجھ کر بہانے سے ہم دونوں کو اکیلا چھوڑ گئی ہے تا کہ تم سے باتیں کرتے ہوئے مجھے اس کے آنے کا ڈر نہ لگا رہے۔ میں اسے سبھی کچھ بتا دیتی ہوں لیکن بس یہی بات کبھی نہیں بتائی کہ ماضی میں تم سے میرا کیا تعلق رہا ہے۔"

"لیکن ہمیں اکیلا چھوڑنے میں اس کا دراصل جو مقصد ہے، وہ ظاہر ہے کہ تم بھی جانتی ہوگی۔"

"ہاں۔" روحی نے نظریں جھکا لیں۔ "اس نے تمہیں بتا دیا ہوگا کہ میں ثاقب کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ مجھے اپنی زندگی سے نفرت ہوگئی ہے صبور! میں نے سلطانہ سے بھی کہہ دیا تھا کہ مجھے خودکشی کر لینا چاہیے۔ میری اس بات نے اسے بہت پریشان کیا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔ انتہائی محبت میں انسان بہت پاگل پن کی باتیں کر جاتا ہے۔ اس سے بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ مجھ سے کہہ بیٹھی کہ اس معاملے میں وہ تم سے بات کرے گی۔ یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے؟ کوئی بھی لڑکی اس قسم کے معاملے میں اپنی بہن کے شوہر سے بات کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتی۔ سلطانہ یہی سمجھ رہی ہوگی کہ میں نے اس کی محبت میں اس کی بات مان لی ہے لیکن دراصل میں نے صرف یہ سوچا تھا کہ مرنے سے پہلے مجھے تم سے تنہائی میں ملنے کا ایک آدھ موقع مل جائے۔"

"یعنی تم نے خودکشی کا خیال اپنے دماغ سے نہیں نکالا ہے؟"

"کیسے نکال سکتی ہوں۔" روحی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میرے دل سے تو تمہاری محبت بھی اب تک نہیں نکل سکی لیکن میں نے اپنی منگنی کے خلاف زبان نہیں کھولی تھی۔ میں شادی بھی کر لیتی۔ میں سوچا کرتی تھی کہ اب ان باتوں سے فرق کیا پڑتا ہے۔ تم کو نہ پانے کے باعث میں خود کو ایک زندہ لاش سمجھنے لگی تھی صبور!" روحی کی آواز بھرا گئی۔ "میں نے اپنی منگنی کے وقت سوچا تھا کہ اب میری زندہ لاش گدھ نوچ کھائیں، یا یہ جسم کسی بھی انسان کا کھلونا بن جائے، اس سے کیا فرق پڑے گا۔"

روحی کی یہ باتیں ایسی تھیں کہ صبور کانپ گیا۔ محبت میں ناکامی کی اس شدت کا اسے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا۔

روحی نے وہ سب کچھ نظریں جھکائے جھکائے کہا تھا، ان باتوں کے بعد اس نے نظریں اٹھا کر صبور کی طرف دیکھا۔ اس کی پلکیں نم ہو چکی تھیں۔ وہ بولی۔ "سلطانہ نے مجھ سے کہا تھا کہ تم میرے دماغ سے موت کا خیال نکال دو گے اور کچھ ایسا بندوبست بھی کر دو گے کہ میری شادی کسی سے ہو جائے اور میرے ہونے والے بچے کو ایک فرضی باپ کا نام مل جائے لیکن میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ابھی میں نے کہا تھا نا کہ سلطانہ کی بات میں نے صرف اس لیے مان لی تھی کہ مرنے سے پہلے ایک بار تو تم سے مل لوں اور تمہیں بتا دوں کہ روحی کے جذبات تمہارے بہ قول وقتی نہیں تھے۔ کالج میں تم مجھ سے یہی کہا کرتے تھے نا کہ میں ان وقتی جذبات کے دھارے میں نہ بہوں اور تمہیں بھلانے کی کوشش کروں۔" روحی جذباتی انداز میں بولتی ہی چلی گئی۔ "یقین کرو صبور! کالج چھوڑنے کے بعد میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی کہ کیا واقعی تمہاری بات درست ہے؟ یعنی یہ کہ وہ میرے وقتی جذبات تھے اور میں کوشش کر کے تمہیں بھلا سکتی تھی مگر یقین کرو کہ میری کوششیں ناکام ہوتی رہیں۔ میں تمہیں نہیں بھول سکی۔ تم میری رگ رگ میں رچ بس چکے تھے۔" روحی کی آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک گئے۔

صبور کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ روحی کی باتوں نے اسے بھی جذباتی کر دیا تھا۔ یہ بات اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھی کہ روحی نے اسے اتنی شدت سے چاہا تھا۔

اچانک ان دونوں ہی کو اپنے جذبات پر پردہ ڈالنا پڑا کیونکہ ملازمہ چائے لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہی تھی۔ روحی ایک ٹشو پیپر سے اپنی آنکھیں اس طرح مسلنے لگی جیسے آنکھوں میں کچھ پڑ گیا ہو۔ صبور نے اپنا رخ بدل کر ملازمہ سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔

"اور کوئی ضرورت تو نہیں ہے صاحب!" ملازمہ نے چائے رکھ کر پوچھا۔

"نہیں، بس اب جاؤ۔" صبور جھنجلا سا گیا۔ اس وقت ملازمہ کی آمد اسے بے حد گراں گزری تھی حالانکہ اس کا آنا غیر متوقع نہیں تھا۔ سلطانہ بتا کر گئی تھی کہ ملازمہ ان کے لیے چائے لے کر آئے گی۔

ملازمہ کے جانے کے بعد صبور نے روحی سے کہا۔ "ابھی تمہارے منہ سے ایک عجیب جملہ نکلا تھا روحی! تم نے

کہا تھا کہ تمہیں اس حادثے کا بالکل رنج نہیں ہوا۔''

''ہاں۔'' روحی نے سنجیدگی سے کہا۔''میں نے یہ بھی تو کہا تھا کہ میں خود کو زندہ لاش سمجھنے لگی ہوں۔ یہ زندہ لاش ہی میں نے ثاقب کے نام کی تھی۔ میرے دل میں اس کے لیے محبت کا جذبہ کبھی پیدا نہیں ہوا تو اس کی ہلاکت کا رنج کیوں ہوتا۔''

''اس سے محبت نہ ہونے کے باوجود تم اس کے......''

صبور کچھ اور کہتے کہتے چپ ہوگیا۔

''بات پوری کرو صبور!'' روحی نے تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔''یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ اس سے محبت نہ ہونے کے باوجود میں اس کے بچّے کی ماں کیسے بننے والی ہوں؟''

صبور خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''سلطانہ نے تمہیں یقیناً کبھی کچھ بتایا ہوگا۔'' روحی پھر بولی۔''یہ بھی کہ میں اکثر ثاقب سے ملنے تن تنہا چلی جایا کرتی تھی مگر سلطانہ کو یہ نہیں معلوم کہ میں اپنی خوشی سے نہیں جاتی تھی۔ ثاقب فون کرکے تنہائی میں ملنے پر اصرار کیا کرتا تھا تو میں چلی جاتی تھی۔ میرے سوچنے کا انداز یہ تھا کہ کچھ عرصے بعد مجھے مستقل طور پر اس کے پاس جانا ہی ہے تو اس کی بات مان لینے میں کوئی حرج نہیں۔ بس یہی سوچ کر اس سے ملنے چلی جایا کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ مجھے اپنے ایک دوست کے گھر بلایا کرتا تھا۔ وہ دوست اکیلا رہتا ہے۔ وہ ہے تو شادی شدہ لیکن اس کی بیوی تین ماہ سے لندن گئی ہوئی ہے۔ اس کے والدین وہیں رہتے ہیں۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے روحی کہ تم اس سے ملنے چلی جاتی تھیں لیکن یہ جو کچھ ہوا، یہ تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''ہاں۔'' روحی نے ٹھنڈی سانس لی۔''یہ نہیں ہونا چاہیے تھا مگر ہوگیا۔ اس میں میری خواہش یا مرضی کو دخل نہیں تھا۔ میں تمہیں اس بارے میں بتادوں گی۔ حیران مت ہونا کہ میں اتنی بے باک کیوں ہوگئی۔ میں بار بار نہیں کہنا چاہتی کہ میں ایک زندہ لاش ہوں جس کے لیے نہ تو شرم و حیا کی کوئی اہمیت رہ گئی ہے، نہ بے باکی کی۔''

صبور اس کا منہ تکتا رہا۔

''ایک مرتبہ۔'' روحی نظریں جھکاتے ہوئے بولنے لگی۔''بلکہ وہ ہماری پہلی ہی ملاقات تھی۔ ثاقب باتیں کرتے کرتے مجھ سے بہت قریب ہوکر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ میں نے اسے کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔ بس مشینی انداز میں اس کی باتوں کے جواب میں کچھ نہ کچھ بولتی رہی۔ میرے خیالوں میں تو تم چھائے رہتے تھے صبور...... پھر اس کی دست درازی زیادہ بڑھی۔ اس وقت میں نے خود کو اس سے دور کرنا چاہا تو اس نے مجھے اپنی آغوش میں جکڑ لیا۔ اس کے بعد وہ سب کچھ ہوگیا اور میں کہہ چکی ہوں کہ اس میں میری مرضی شامل نہیں تھی۔''

''لیکن وہ سب کچھ زبردستی تو نہیں ہوسکتا روحی!'' صبور نے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن جذبات کی رو میں بہہ کر ایسا ہوگیا۔''

وہ خاموش ہوگئی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔

صبور نے ایک طویل سانس لی۔ چند لمحے خاموش رہا۔ بہت سے خیالات اس کے ذہن میں چکراتے رہے۔ کچھ سکوت کے بعد وہ بولا۔''اس کے بعد؟''

''جو کچھ ہوگیا، وہ مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔'' روحی نے جواب دیا۔''لیکن میرے دماغ میں آنے والا یہ خیال بعد از وقت تھا۔ میں اپنی دوشیزگی کھو چکی تھی۔ ثاقب نے میرے تاثرات بھانپے تو مجھے منانے کی اور سمجھانے کی کوششیں کرنے لگا۔ میں نے بھی سوچا کہ اب میری خفگی کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی۔ میں نے اسے معاف کردیا لیکن یہ بھی کہا کہ اب میں شادی سے پہلے اس سے کبھی نہیں ملوں گی۔ اس نے میری یہ بات رد کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی لیکن دس دن بعد اس کا فون پھر آگیا۔ اس نے پھر ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے مجھ سے اپنی شدید محبت کا اظہار کیا۔ میں نے فون بند کردیا لیکن اس نے پھر فون کیا۔ آخر اس کے شدید اصرار پر میں اس سے ملنے کے لیے صرف اس شرط پر آمادہ ہوئی کہ وہ میرے قریب نہیں بیٹھے گا۔ اس نے میری شرط مان لی۔ پانچ پانچ چھ چھ دن کے وقفے سے ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ثاقب اس بات پر قائم رہا کہ پھر اس نے میرے قریب بیٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے اپنی ندامت کا اظہار بھی کیا کہ پہلی مرتبہ اس سے میرے قریب بیٹھنے کی غلطی ہوگئی تھی۔''

اتنی وضاحت سے جواب دینے کے بعد روحی خاموش ہوگئی۔ اس کی نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔ یہ سب کچھ وہ صبور سے نظریں ملا کر نہیں کہہ سکی تھی حالانکہ اس نے کہا تھا کہ وہ ایک زندہ لاش بن چکی ہے جس کے لیے شرم و حیا اور بے باکی کی کوئی اہمیت نہیں۔

''اسے تم نے یہ بات پرسوں بتائی تھی؟'' صبور نے پوچھا۔

''ہاں۔'' روحی نے کہا۔''اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ

میں نے اسے فون کر کے ملاقات کے لیے کہا تھا۔ میں نے ملاقات ہونے پر اسے بتا دیا کہ کیا ہو چکا ہے۔ میں نے اصرار کیا کہ وہ جلد از جلد شادی کے لیے کوئی جواز تلاش کرے اور نیروبی سے اس کی پھوپی کی آمد تاخیر کا سبب نہ بنے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کوئی تدبیر سوچے گا۔ اس کے بعد ہم گھر سے نکلے تھے۔ ثاقب اپنی کار اس بنگلے سے کچھ دور کھڑی کیا کرتا تھا۔ میں نہیں جانتی کہ اس میں اس کی کیا مصلحت تھی۔ میں نے اس سے کبھی پوچھا بھی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ملاقاتوں میں بس وہی باتیں کیا کرتا تھا۔ میں کوئی بات نہیں کرتی تھی۔ بس جواب دیتی رہتی تھی۔ اگر ثاقب اپنی کار وہاں سے کچھ دور کھڑی نہ کیا کرتا تو اس حادثے میں اس کی موت واقع نہ ہوتی۔ نہ سڑک پار کی جاتی، نہ ایکسیڈنٹ ہوتا۔''

''خیر!'' صبور نے کہا۔ ''جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ خودکشی کا خیال تم اپنے ذہن سے نکال دو۔''

''یہ میرے لیے ممکن نہیں۔ میرے سامنے کوئی متبادل راستہ نہیں۔''

''اسقاط.....''

''دیکھو، یہ سب باتیں سلطانہ سے ہو چکی ہیں۔ اس نے تمہیں ضرور تفصیل سے سب کچھ بتایا ہوگا۔ اب میں وہ باتیں دہرانا نہیں چاہتی۔ میں اب تک خود کو ختم کر چکی ہوتی لیکن بس اس خیال سے رک گئی کہ آخری بار تم سے مل لوں اور تم جان لو کہ اس بدنصیب لڑکی نے تمہیں کس شدت سے چاہا تھا۔''

روحی کے حالات جان کر صبور بھی خاصا افسردہ ہو گیا تھا۔ اب اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ لڑکی زندہ رہے جو اس سے اتنی محبت کرتی تھی۔

روحی بولی۔ ''سلطانہ مجھے کل تک کے لیے یہاں لائی ہے۔ کل میں چلی جاؤں گی۔ کل کے بعد میں تمہیں کبھی نہیں دیکھ سکوں گی۔'' اس نے نظریں اٹھا کر صبور کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اور تم بھی مجھے کبھی نہیں دیکھو گے۔ تمہیں میری موت کی اطلاع ہی ملے گی۔''

''پلیز روحی!'' صبور جذباتی ہو گیا۔ ''ایسا مت کرنا۔ تم اسقاط اس لیے نہیں کرنا چاہتیں کہ ایک بے قصور کو ہلاک کر کے ایک جرم نہیں کرنا چاہتیں لیکن خودکشی کر کے تو تم دو زندگیوں کی ہلاکت کی مجرم بن جاؤ گی..... اپنی قاتل اور اپنے ہونے والے بچے کی قاتل بن جاؤ گی۔''

''صبور!'' روحی نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''کسی قسم کے دلائل مجھے اپنے فیصلے پر عمل کرنے سے نہیں روک سکتے۔ اس قسم کی باتوں کا سلسلہ جاری نہ رکھو لیکن تمہاری اس بات کا جواب میں دیے دیتی ہوں۔ میں مر جاؤں تو سارے احساسات ہی مٹ جائیں گے لیکن اگر اسقاط کرا کے میں زندہ رہی تو مجھے زندگی بھر احساسِ جرم رہے گا۔ میں کبھی پُرسکون نہیں رہ سکوں گی۔''

''اس کا جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ.....''

''صبور!'' روحی نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں ابھی کہہ چکی ہوں کہ اب کسی قسم کے دلائل کا سلسلہ جاری نہ رکھو۔''

''اچھا۔'' صبور نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ روحی کو اس اقدام سے روکنے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔

''سلطانہ ابھی تک نہیں لوٹی۔'' روحی بولی۔ ''میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر تمہیں ایک بات اور بتا دوں۔ میں چاہتی ہوں، تمہیں اندازہ ہو جائے کہ میں نے تمہیں کس شدت سے چاہا تھا اور اب بھی چاہتی ہوں۔''

''مجھے اندازہ ہو چکا ہے روحی!'' صبور کی آواز بھرا گئی۔

''پھر بھی میں ایک بات بتانا چاہتی ہوں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' صبور نے کہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ روحی کی باتوں سے اس کا جذباتی ہیجان بڑھتا رہے۔

''اچھا ایک وعدہ کرو گے مجھ سے؟''

''میں تم سے ہر وعدہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

''تو پھر آئندہ کبھی تیز رفتاری سے ڈرائیونگ نہ کرنا۔''

صبور نے کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اس وقت تمہیں یہ وعدہ لینے کا خیال کیوں آ گیا؟''

''میں نہیں چاہتی کہ تمہاری ڈرائیونگ سے کوئی اور ہلاک ہو جائے اور تم اس جرم کی سزا بھگتو۔ ثاقب کے معاملے میں تو میں نے تمہیں بچا لیا۔''

صبور بری طرح چونک پڑا۔

''ہاں صبور!'' روحی نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں نے تمہیں پہچان لیا تھا۔ کار تم ہی چلا رہے تھے لیکن میں نے پولیس کو یہ بات نہیں بتائی۔''

صبور کا سارا جسم سنسنا اٹھا۔

روحی دھیرے دھیرے کہنے لگی۔ ''ثاقب سے مجھے محبت نہیں تھی۔ اس کی وجہ سے میں تمہیں کسی پریشانی میں کیسے ڈال دیتی۔''

"تم...... تم نے...... میرے لیے......" صبور اتنا جذباتی ہوگیا تھا کہ اپنی بات مکمل نہیں کرسکا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے صبور!" روحی نے کہا۔ "میں تمہارے لیے تو اس سے بھی کہیں زیادہ، کچھ بھی کرسکتی ہوں۔"

"لیکن تم نے...... پولیس کو ایسے کار نمبر بتائے تھے جو......"

"وہ میری بوکھلاہٹ تھی۔" روحی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے جب اچانک یہ سوال ہوا تو میرے منہ سے کچھ نمبر نکل گئے اور میں نے کہا کہ ان میں سے کوئی نمبر ہوسکتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی میں نے کار کا میک دوسرا بتایا، حالانکہ وہ میک بھی میرے ذہن میں تھا جو تم چلا رہے تھے۔"

صبور کچھ ہیجانی سی کیفیت کا شکار ہوگیا۔ اس نے ایسی محبت کرنے والی لڑکی کو نظرانداز کردیا تھا جو شاید اس کے لیے اپنی جان بھی دے سکتی تھی۔

"تمہیں زندہ رہنا ہوگا روحی!" صبور شدید جذباتی انداز میں بولا۔

"یہ ناممکن ہے صبور!"

"میں اسے ممکن بناؤں گا۔ میرے ذہن میں ایک ایسی تدبیر آئی ہے جس سے تم مطمئن ہوسکوگی۔"

"کوئی دلیل مجھے خودکشی کرنے سے نہیں روک سکتی۔" روحی نے اداسی سے کہا۔

"میں تم سے کل دوبارہ بات کروں گا۔"

"کرلینا۔" روحی نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "مگر اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

اسی وقت کال بیل سنائی دی۔ صبور اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔

"میرا خیال ہے، سلطانہ واپس آگئی ہے۔" صبور نے جلدی سے کہا۔ "میں تمہیں کچھ اشارہ دے دیتا لیکن اب کل ہی بات کروں گا۔" صبور کا خیال ٹھیک تھا۔ آنے والی سلطانہ ہی تھی۔

"ارے!" وہ آتے ہی بولی۔ "یہ چائے تو شاید تم نے پی ہی نہیں۔ یہ تو اب بالکل ٹھنڈی ہوچکی ہوگی۔"

"باتوں میں اس کا خیال ہی نہیں رہا۔" صبور نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "تم کہہ کر گئی تھیں کہ روحی کو بور نہ ہونے دوں۔"

روحی بھی پھیکے سے انداز میں مسکرادی۔

سلطانہ نے ملازمہ کو آواز دے کر چائے لانے کی ہدایت کی۔

☆☆☆

اسی رات سلطانہ گنگ ہوکر رہ گئی جب صبور نے اسے وہ ساری باتیں بتائیں جو اس کے اور روحی کے درمیان ہوئی تھیں۔ اس نے سب کچھ سچ سچ بیان کردیا تھا۔ یہ اعتراف بھی کرلیا تھا کہ ایکسیڈنٹ اسی سے ہوا تھا اور یہ بھی کہ روحی حادثے کے وقت اسے دیکھ کر پہچان بھی گئی تھی لیکن اس نے پولیس کو کچھ نہیں بتایا تھا۔

"اتنی محبت کرتی تھی وہ تم سے!" سلطانہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔

"کرتی تھی نہیں، اب بھی کرتی ہے، ورنہ وہ پولیس کو میرے بارے میں بتادیتی۔"

سلطانہ خاموش رہی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ صبور غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ اب روحی کے لیے اس کے جذبات کیا تھے۔

کچھ توقف کے بعد آخر صبور ہی بولا۔ "اب تم روحی کے بارے میں کیا سوچ سکتی ہو سلطانہ!"

"میں اسے ہر صورت میں زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔" سلطانہ نے جذباتی انداز میں کہا۔

"تم اس کے لیے کیا قربانی دے سکتی ہو؟"

سلطانہ عجیب سے انداز میں ہنسی۔ "کیا میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکتی صبور؟"

"کیا مطلب؟"

"تم نے روحی سے کسی ایسی تدبیر کے بارے میں کہا ہے جس سے وہ مطمئن ہوسکتی ہے۔ تم نے اس سے کل تک کی مہلت اس لیے لی کہ اس بارے میں مجھ سے بات کرسکو۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا صبور کہ اس کے بچے کو باپ کا نام مل جائے اور وہ نام تمہارا ہو۔"

صبور نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ "تم یہ برداشت کرلوگی؟"

"برداشت کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔ میں تو خوشی سے قبول کرلوں گی۔ میں اسے سوکن نہیں سمجھوں گی۔ وہ میرے ساتھ میری بہنوں ہی کی طرح رہے گی۔ صبور! وہ مجھے بہت عزیز ہے۔"

"تم غیر معمولی طور پر وسیع القلب ہو سلطانہ!" صبور نے اسے بڑی عقیدت سے دیکھا۔ "عورت کا مزاج یہ نہیں ہوتا۔"

"میں عورت ضرور ہوں لیکن روحی کی بہن بھی ہوں اور روحی بچپن سے ہی مجھے عزیز رہی ہے۔ مشکل اب یہ ہوسکتی ہے صبور کہ وہ بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرتی ہے۔ اس

لیے اس کا تیار ہونا مشکل ہوگا۔"

"اب یہ بات میں نہیں، تم ہی اس سے کرنا۔"

سلطانہ نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے دس بجے تھے۔ وہ بستر سے اٹھ گئی۔ "وہ ابھی سوئی نہیں ہوگی۔ میں اس سے ابھی بات کرتی ہوں۔"

سلطانہ کے جانے کے بعد صبور بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کی زندگی میں ایک ایسا موڑ آ گیا تھا کہ سوچ سوچ کر اسے اپنے اعصاب ٹوٹتے محسوس ہونے لگے تھے۔ وہ اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ روحی اس پر آمادہ ہوسکے گی یا نہیں..... خود سلطانہ کو بھی اس میں شبہ تھا کہ روحی اس کے لیے شاید تیار نہ ہو۔

آدھا گھنٹا گزر گیا۔ سلطانہ واپس نہیں آئی۔ صبور سے اب زیادہ ضبط نہیں ہوسکا۔ وہ کمرے سے نکل کر اس خواب گاہ کی طرف بڑھا جو روحی کو دی گئی تھی۔

اس خواب گاہ کے دروازے پر وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اندر سے روحی کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ صبور نے کشیدہ اعصاب کے ساتھ اپنے کان دروازے سے لگا دیے۔

سلطانہ زور زور سے نہایت جذباتی انداز میں کہہ رہی تھی۔ "اگر تم نے میری بات نہ مانی روحی اور خودکشی کر لی تو میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ خاندان کے لوگ صرف تمہیں ہی نہیں، مجھے بھی روئیں گے۔ اس خاندان سے بہ یک وقت دو جنازے اٹھیں گے اور دوسرا جنازہ میرا ہوگا۔ میں بھی خودکشی کرلوں گی۔"

"نہیں سلطانہ، نہیں!" روحی نے سسکتے ہوئے کہا۔ "تمہیں صبور کے لیے زندہ رہنا ہوگا۔"

"تمہیں بھی صبور کے لیے زندہ رہنا ہوگا۔" سلطانہ نے زور دے کر کہا۔ "اگر تم نے خودکشی کر لی تو صبور ساری زندگی بے کل رہیں گے۔ میں ان کا مزاج جانتی ہوں۔ انہیں یہ احساس بے چین رکھے گا کہ تمہاری موت کے ذمے دار وہی ہیں۔ ثاقب کا خیال انہیں نہیں آئے گا لیکن اس لڑکی کو وہ کبھی نہیں بھول سکتے جس نے انہیں اس طرح ٹوٹ کر چاہا۔"

روحی کچھ نہیں بولی مگر اس کے رونے کی آواز آتی رہی۔

"میں آج رات تمہارے ہی ساتھ سوؤں گی۔" سلطانہ نے کہا۔ "میں ابھی جا کر صبور سے کہہ دیتی ہوں۔"

اس کے قدموں کی آہٹ دروازے کی طرف آنے لگی تو صبور تیزی سے چلتا ہوا اپنی خواب گاہ میں پہنچ گیا۔ وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس نے چھپ کر ان دونوں کی باتیں سنی تھیں۔

سلطانہ کمرے میں آئی تو اس کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بھی روئی تھی۔

"کیا رہا؟" صبور نے بے چینی سے پوچھا۔

"میں نے اسے ہلا تو دیا ہے۔" سلطانہ نے جواب دیا۔ "میں اسے رضامند کر کے رہوں گی۔ میں یہ کہنے کے لیے آئی تھی کہ آج میں اسی کے ساتھ سوؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" صبور نے کہا۔ "اس کی ذہنی حالت ایسی ہے بھی نہیں کہ اسے تنہا چھوڑا جائے۔ ان باتوں کے بعد وہ اور زیادہ جذباتی ہو چکی ہوگی۔ اس کے دماغ پر شدید دباؤ ہوگا۔"

سلطانہ سر ہلا کر تیزی سے واپس چلی گئی۔

اس کے بعد صبور بستر پر لیٹا تو رہا لیکن گزرے ہوئے تین دن کے حالات اس کے دماغ میں چکراتے رہے۔ روحی تو پھر بھی ہی محبت کی ماری ہوئی لیکن سلطانہ کا کردار بھی غیر معمولی طور پر ابھرا تھا۔ ان سب باتوں نے صبور کی نیند اڑا دی۔ وہ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ ایک پل کے لیے بھی نیند نہیں آسکی۔

دوسری صبح اس نے سلطانہ اور روحی کو دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ وہ دونوں بھی نہیں سو سکی تھیں۔ دونوں کی آنکھوں میں سرخی تھی۔ روحی کی آنکھوں سے یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بہت زیادہ روئی تھی۔۔۔ اس کی آنکھیں کسی حد تک سوجی سوجی سی تھیں۔

ناشتے کی میز پر سلطانہ نے صبور سے کہا۔ "یہ شادی ہمارے گھر والوں ہی کے لیے چونکا دینے والی بات ہوگی۔ ابھی مجھے اس کے لیے بھی کچھ کرنا ہوگا۔ میں ابھی روحی کے گھر جا رہی ہوں۔ روحی ابھی یہیں رکے گی۔ مجھے چچی سے بات کرنا ہوگی۔ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ انہیں اعتماد میں لیا جائے اور اس کا طریقہ بھی صرف یہی ہے کہ ان سے کوئی بات نہ چھپائی جائے۔"

صبور نے اثبات میں سر ہلایا۔ روحی کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ افسردہ وہ اب بھی نظر آرہی تھی۔ سلطانہ کی بات سے صبور نے یہ تو سمجھ لیا کہ وہ روحی کو آمادہ کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

روحی کے گھر روانگی سے قبل سلطانہ اور صبور میں کچھ باتیں ہوئیں۔

"وہ بڑی مشکل سے صرف ایک شرط پر تیار ہوئی ہے۔" سلطانہ نے بتایا۔ "وہ چاہتی ہے کہ شادی کے بعد وہ

رہے گی تو ہمارے ساتھ لیکن تم ایک شوہر کی حیثیت سے اس کے قریب نہیں جاؤ گے۔ دراصل وہ اپنے خیال کے مطابق میرے حقوق پر ڈاکا نہیں ڈالنا چاہتی۔ فی الحال میں نے اس کی شرط مان لی ہے لیکن شادی کے بعد میں اسے سمجھا بجھا کر اس پر بھی آمادہ کرلوں گی کہ وہ بیوی ہی کی حیثیت سے اس گھر میں رہے۔ میں نے بابا کو بھی فون کردیا ہے۔ میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ فوراً کراچی آئیں۔ بات تو ان سے بھی کرنا ہوگی نا!''

''انہیں فون کرچکی ہو تم؟''صبور حیرت سے بولا۔''ایسی صورت میں ردِعمل یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ مجھے فون کرتے۔''

سلطانہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔''وہ سمجھے ہوں گے کہ تم نے شیما سے اپنے تعلقات برقرار رکھے ہیں جس پر میں تم سے ناراض ہوں۔ اسی لیے انہوں نے فیصلہ کیا ہوگا کہ تم سے بات کرنے کے بجائے یہاں آکر تمہاری گوشمالی ہی کریں۔''

''وہ کب تک آرہے ہیں؟''

''بتا رہے تھے کہ وہ ضروری کام میں الجھے ہوئے ہیں اس لیے دوپہر کے بعد ہی آسکیں گے۔''

اس گفتگو کے بعد سلطانہ، روحی کے گھر چلی گئی۔ صبور ذرا دیر اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا، پھر باہر نکلا۔ وہ روحی سے بات کرنا چاہتا تھا کہ اسے ملازمہ سے معلوم ہوا کہ روحی خواب گاہ میں چلی گئی ہے۔

صبور نے خواب گاہ کے دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔

''کون؟''اندر سے روحی نے پوچھا۔

''میں ہوں..... صبور۔''

اندر چند لمحے خاموشی رہی پھر روحی کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔''پلیز صبور! اس وقت میں ذہنی طور پر ایسی حالت میں ہوں کہ تم سے کوئی بات نہیں کرسکوں گی۔''

صبور کو خود بھی اندازہ تھا کہ اس وقت روحی کی حالت کیا ہوگی، اس لیے اس نے خاموشی سے واپس لوٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔

اس کے بعد وہ بے چینی سے سلطانہ کا انتظار کرتا رہا۔ وہ لگ بھگ ڈھائی گھنٹے بعد واپس آئی۔ اس نے روحی سے پہلے صبور سے ملنا مناسب سمجھا۔

''ہکا بکا رہ گئی تھیں چچی یہ سن کر۔''سلطانہ نے تمہیدی جملوں کے بعد کہا۔''اور ان کا یہ ردعمل بہرحال فطری تھا۔ کسی بھی ماں کے لیے یہ کوئی اچھی خبر نہیں کہ اس کی بیٹی شادی سے پہلے ہی ماں بننے والی ہے۔ لیکن میں نے سمجھا بجھا کر رام کرلیا۔ اس کے بعد معاملہ تھا چچا کا۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان سے اس سلسلے میں بعد میں بات کریں گی لیکن میں نے اصرار کیا کہ یہ معاملہ ابھی طے ہونا چاہیے، میرے سامنے۔ آخر یہی ہوا۔ چچا تو غضب ناک ہوگئے۔ ایک جملہ تو ان کے منہ سے یہ بھی نکل گیا کہ وہ روحی کو گولی ماردیں گے۔ اس موقع پر میں بھی چچا اور چچی کی گفتگو میں شامل ہوگئی۔ چچی تو انہیں سمجھا بھی نہیں پاتیں کیونکہ وہ خود صدمے کی حالت میں تھیں۔ میں نے ہی چچا کو سمجھایا کہ اس قسم کے انتہاپسندانہ اقدام سے سارے خاندان میں بدنامی ہوجائے گی لہٰذا یہ کڑوا گھونٹ خاموشی سے پی لینا مناسب ہوگا۔''

''کیا تم نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ تم اب روحی کی شادی مجھ سے کرانا چاہتی ہو؟''صبور نے پوچھا۔

''ظاہر ہے۔''سلطانہ نے جواب دیا۔''بنیادی کام تو یہی ہے کہ اس کی شادی جلدازجلد تم سے ہوجائے۔''

''میں بہت حیران ہوں سلطانہ!''صبور نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''قربانی تو مرد سے زیادہ عورت ہی دے سکتی ہے صبور!''سلطانہ کچھ افسردہ نظر آئی لیکن اس نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں روحی سے بہت محبت کرتی ہوں۔ یقین کرو کہ اس کی سوت برداشت کرنا میرے لیے بہت مشکل ہوتا۔''

''شادی کی بات پکی کرلی تم نے؟''

''ہاں۔ وہ تیار ہوگئے ہیں۔ چچی تو مجھے گلے لگا کر رونے لگی تھیں کہ میں روحی کی خاطر یہ قربانی دے رہی ہوں۔ بہرحال اب طے یہ پایا ہے کہ تمہارا اور روحی کا نکاح بہت سادگی سے اور خفیہ طور پر ہوگا۔ خاندان والوں کو یہ بات بعد میں کسی مناسب موقع پر بتادی جائے گی۔ خصوصاً ثاقب کے گھر والوں سے تو یہ چھپانا بہت ضروری ہے ورنہ ان کا اچھا ردِعمل نہیں ہوگا۔ وہ سوچیں گے کہ ان کے بیٹے کی موت کے چار دن بعد ہی روحی کی شادی کردی گئی۔''

''چار دن بعد؟''صبور چونکا۔

''ہاں۔''سلطانہ نے کہا۔''اس کام میں تاخیر مناسب نہیں ہوگی۔ میں چاہتی ہوں کہ کل ہی تم دونوں کا نکاح ہوجائے۔ روحی کو اب میں یہاں سے اس کے گھر بھیجوں گی بھی نہیں۔ فطری بات ہے کہ چچا اب بھی اس پر گرجیں... برسیں گے۔ میں ڈر رہی ہوں کہ اس ڈانٹ پھٹکار سے روحی کے جذبات پھر بھڑک اٹھیں گے۔ وہ نہ جانے کیا کر

بیٹھے۔ میں نے بڑی مشکل سے تو اسے سنبھالا ہے۔ اب کل اسی گھر میں چند افراد کی موجودگی میں اس کا اور تمہارا نکاح ہو جائے گا۔''

صبور اپنی بیوی کا منہ تکتا رہ گیا۔ اسے اب بھی سلطانہ کا یہ انداز غیر فطری سا لگ رہا تھا۔ اپنے اوپر سوکن لانے کے لیے کسی عورت کا خود اس طرح سرگرم ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

''اچھا اب میں روحی کے پاس جا رہی ہوں۔'' سلطانہ نے کہا۔ ''میرے دماغ پر ابھی خاصا بوجھ ہے۔ روحی کو جذباتیت سے دور رکھنا ہے۔ بابا آجائیں گے تو ان سے بھی میں ہی بات کروں گی۔ تم اس وقت سامنے نہیں رہنا۔''

''کیوں؟''

''میں بابا کو یہ تھوڑی بتاؤں گی کہ روحی ماں بننے والی ہے۔ ان سے تو یہ بات چھپانا ہی ہوگی۔ ان کو میں بس یہ بتاؤں گی کہ روحی کالج کے زمانے ہی میں تم سے محبت کرنے لگی تھی لیکن تم نے اسے نظر انداز کیا اور اب اس حادثے کے بعد روحی خبط الحواس سی رہنے لگی ہے۔ ایسی حالت میں اگر تم اسے مل جاؤ تو اس کی حالت ٹھیک ہو سکتی ہے۔''

''وہ بھی حیران رہ جائیں گے کہ تم اپنے شوہر کی دوسری شادی کرانے کے لیے اتنی بے تاب ہو۔''

''حیران تو میرے گھر والے بھی ہوں گے۔ میں ڈیڈی سے بات کرنے رات کو جاؤں گی۔ پہلے تو مجھے بابا سے بات کرنا ہے۔''

صبور خاموش رہا۔ سلطانہ روحی کے پاس چلی گئی۔

تین بجے تھے جب صابر شاہ کراچی پہنچا۔ گھر پر سلطانہ نے اس کا استقبال کیا۔

''کہاں ہے وہ؟'' صابر شاہ نے غصے سے پوچھا۔

''کون بابا؟''

''صبور......''

''بات تو مجھے کرنا ہے آپ سے۔''

''شیما ہی کی بات ہوگی نا؟''

''جی نہیں بابا! بات کچھ اور ہے۔ آپ بلاوجہ غصے میں آرہے ہیں۔''

''اور کیا بات ہے؟'' صابر شاہ نے حیرت سے کہا۔

سلطانہ نے قدرے تذبذب سے وہ سب کچھ بتانا شروع کیا جو اس نے سوچا تھا۔ صابر شاہ کے چہرے پر حیرت کے تاثرات گہرے ہوتے چلے گئے۔ یہ خیال اس کے سان گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ اس کی بہو اس سے اس کے بیٹے کی دوسری شادی کے لیے اجازت مانگے گی۔

☆☆☆

دوسرے دن شام کو روحی سے نکاح کے بعد صبور کچھ دیر تک سکتے کی سی حالت میں رہا۔ سب کچھ ناقابلِ یقین حد تک تیزی سے ہوتا چلا گیا تھا۔ صبور کو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس نے کوئی خواب دیکھا ہو۔ نکاح میں صابر شاہ کے علاوہ صرف روحی کے والدین اور سلطانہ کے والد سرجن عباس شریک ہوئے تھے جو نکاح کے تھوڑی دیر بعد چلے گئے۔

اب گھر میں صرف صبور، سلطانہ، روحی یا گھر کے دو ملازم تھے۔

سلطانہ، روحی کے پاس چلی گئی۔ صبور اپنے کمرے میں لیٹا رہ گیا۔ وہ اب تک بے یقینی کی کیفیت سے نہیں نکلا تھا۔

اندھیرا پھیلنے میں کچھ ہی دیر تھی کہ سلطانہ روحی کے کمرے سے آئی۔ ''اب تک وہ جذباتیت سے باہر نہیں نکلی ہے۔'' سلطانہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''کیا مطلب؟''

''میں نے اسے بڑے چاؤ سے دلہن بنایا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اس کے دل میں دلہن بننے کی حسرت رہ جائے لیکن اس نے سب ختم کر دیا۔ عروسی جوڑا بھی اتار پھینکا۔''

''عروسی جوڑا کہاں سے آگیا تھا؟'' صبور نے حیرت سے پوچھا۔

''میرا رکھا ہوا تھا نا! وہی پہنا دیا تھا میں نے اسے۔ کمرے کی آرائش بھی ختم کر دی جو میں نے ہی کی تھی۔''

''اس کی جذباتیت ختم ہونے میں کچھ دن تو لگیں گے۔'' صبور نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں کچھ دیر کے لیے اس کے پاس ہو آؤں؟ میں اس سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''تمہیں اس کے لیے مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' سلطانہ نے مسکرا کر کہا۔ ''وہ بھی تمہاری بیوی ہے۔ اگرچہ میں نے اس کی یہ شرط مان لی ہے کہ تم بحیثیت شوہر اس کے قریب کبھی نہیں جاؤ گے لیکن آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ انسان کی جذباتی کیفیت ہمیشہ قائم نہیں رہتی۔ مجھے شکایت تم سے صرف اس وقت ہوگی جب تم ہم دونوں میں مساوات نہیں برتو گے۔''

''تو تم نے مجھ سے یہ کیوں نہیں پوچھا کہ میں اس وقت اس کے پاس کیوں جانا چاہتا ہوں؟''

''کچھ باتیں کرنا چاہتے ہوگے اس سے۔'' سلطانہ نے کہا۔ ''میں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں سوچا۔ صبور! تم شاید خود کو اتنا نہیں جانتے جتنا میں تم کو جان چکی ہوں۔''

صبور نے محبت سے سلطانہ کی طرف دیکھا پھر کہا۔
''تم میرے ساتھ چل کر کمرے کا دروازہ تو کھلوا دو۔ میری آواز سن کر تو وہ دروازہ نہیں کھولے گی۔''

سلطانہ نے مسکرا کر کہا۔ ''میں خود ابھی تم سے کہتی کہ ذرا دیر کے لیے اس کے پاس چلے جاؤ۔ اسی لیے میں اس سے کہہ کر آئی ہوں کہ میں ابھی آرہی ہوں اس لیے وہ دروازہ بند نہ کرے۔ دروازہ بند نہیں ہوگا۔ تم دستک بھی نہ دینا۔ بس گھستے چلے جانا۔''

سلطانہ نے غلط نہیں کہا تھا۔ صبور کو روحی کے کمرے میں داخل ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں پیش آئی لیکن اسے دیکھتے ہی روحی جلدی سے کھڑی ہوگئی۔

''تم!'' وہ تیزی سے بولی۔ ''تم یہاں کیوں آئے ہو صبور! سلطانہ کہاں ہے؟''

''وہ کمرے میں ہے، میں اسے بتا کر آیا ہوں۔''

''تو کیا وہ میری شرط بھول گئی؟ میں نے اس سے کہا تھا کہ......''

''مجھے سب معلوم ہے روحی! سکون سے بیٹھو۔ میں تم سے بس چند باتیں کر کے چلا جاؤں گا۔''

''کیا باتیں؟'' روحی نے پوچھا۔

''میں تمہیں بس یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ اپنی جذباتیت ختم کرنے کی کوشش کرو۔ سلطانہ نے یہ قربانی اسی لیے دی ہے کہ وہ تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہے۔ اگر تم خوش نہیں رہیں تو وہ سمجھے گی کہ اس کی قربانی کسی حد تک رائگاں ہی گئی۔''

''خوش رہنا یا رنجیدہ ہونا اپنے اختیار میں تو نہیں ہوتا۔''

''کیا یہ احساس بھی تمہیں خوش نہیں رکھ سکتا کہ میں تمہارا ہوگیا ہوں۔ میں وہی ہوں نا جسے تم نے بہت شدت سے چاہا۔''

''میرے لیے یہی بہت ہے کہ تم میری نظروں کے سامنے رہو گے۔'' روحی کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ ''اس سے زیادہ میں اب کچھ نہیں چاہتی۔ یہ تو میری خود غرضی ہوگی اگر میں سلطانہ کے حقوق پر ڈاکا ڈالوں۔''

''تم یہ خیال بھی اپنے ذہن سے نکالنے کی کوشش کرو۔ سلطانہ نے تمہیں جو کچھ دیا ہے، وہ خوشی سے دیا ہے۔ اس کو تم ڈاکا کیوں سمجھنا چاہتی ہو۔''

''میں دلائل نہیں سننا چاہتی صبور!''

''میں صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ تم خوش رہنے کی کوشش ضرور کرو۔ انسان کوشش کرتا ہے تو کامیاب بھی ہوتا ہے۔ اگر تم خوش نہ رہیں تو سلطانہ پر افسردگی طاری ہوتی چلی جائے گی۔ وہ محسوس کرے گی...... میں اپنی بات دہرا رہا ہوں...... کہ اس کی قربانی کسی حد تک رائگاں ہی گئی۔''

روحی کچھ نہیں بولی۔ صبور کا منہ تکتی رہ گئی۔

''بس! مجھے یہی کہنا تھا۔'' صبور نے کہا اور مڑ کر تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔

''کیا بات کر آئے؟'' سلطانہ نے مسکرا کر پوچھا۔

صبور نے سب کچھ بتا دیا۔

''اچھا کیا تم نے!'' سلطانہ بولی۔ ''تمہاری یہ بات اس کے دماغ میں کھلبلی مچاتی رہے گی۔ مجھے خوش دیکھنے کے لیے شاید وہ مصنوعی طور پر مسکرانے لگے یا خود کو خوش ظاہر کرے لیکن دھیرے دھیرے یہ تصنع ختم ہوجائے گا۔ وہ حقیقتاً خوش رہنے لگے گی اور وقت آنے پر تم شوہر کی حیثیت سے بھی اس کے پاس جاسکو گے۔''

''تم بہت غیر معمولی لڑکی ہو سلطانہ!'' صبور نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ''یہ سب کچھ کہنے کے لیے بہت بڑے کلیجے کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''اور وہ بہت بڑا کلیجا میرے پاس ہے۔'' سلطانہ نے مسکرا کر کہا۔

اس رات کا بہت بڑا حصہ انہوں نے روحی کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے گزارا۔

دوسری صبح ناشتے کی میز پر روحی بھی ان کے ساتھ تھی۔ اس کے چہرے پر نئی نویلی دلہن جیسا کوئی تاثر نہیں تھا۔

''کل سے تم اب کالج جانا شروع کردو۔'' سلطانہ نے صبور سے کہا۔

صبور نے اثبات میں سر ہلایا۔

مگر وقت جتنی تیزی سے پینترے بدلتا رہا تھا، اس تیزی میں ابھی کمی نہیں آئی تھی۔ بس صبور کو اس کا علم نہیں تھا۔ وقت کی وہ تیزی اسی دوپہر کے قریب سامنے آئی جب پولیس ان کے گھر پر آدھمکی۔ پولیس آفیسر وہی تھا جو صبور کو پوچھ گچھ کے لیے ہیڈ کوارٹر لے جاچکا تھا۔

صبور کا دل بہت زور سے دھڑک اٹھا لیکن سلطانہ نے تیز لہجے میں پولیس آفیسر سے کہا۔ ''اب کیا مقصد ہے آپ کے آنے کا؟''

پولیس آفیسر نے اسے جواب دینے کے بجائے روحی کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''آپ کو یہاں دیکھ کر مجھے حیرت نہیں ہوئی ہے محترمہ! میں اس گھر کی نگرانی کرواتا رہا ہوں۔ کل شام یہاں ایک نکاح خواں آیا تھا۔ میں اس کا رجسٹر دیکھ چکا ہوں لیکن یہ ایسا

موقع نہیں کہ میں آپ کو شادی کی مبارک باد دے سکوں۔ میں اس وقت آپ کے شوہر کو گرفتار کرنے آیا ہوں۔''

''کیا بکواس ہے؟''صبور نے بولنے کی جرأت کی۔ ''مجھے کس جرم میں گرفتار کیا جاسکتا ہے؟''

''ثاقب کی موت کے ذمے دار آپ ہیں جاگیردار زادے صاحب!''پولیس آفیسر نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔''مجھے اس کا ثبوت مل چکا ہے۔ جب ثاقب کا پوسٹ مارٹم ہوا تھا تو یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ ثاقب کے کوٹ کی بائیں آستین کا ایک بٹن غائب تھا۔ اس کی جگہ دھاگے الجھے رہ گئے تھے۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ بٹن حادثے کے وقت، کار سے ٹکراؤ کی وجہ سے ٹوٹا ہوگا۔ میں نے جائے حادثہ پر دور دور تک اس بٹن کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں ملا۔ وہ اس کیس میں اہم کلیو تھا۔ کل رات اچانک میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ اس قسم کے حادثوں میں کبھی کبھی ایسا ہوجاتا ہے کہ دھچکا لگنے سے کار کا بونٹ کھل جاتا ہے لہٰذا امکان تھا کہ تمہاری کار کا بونٹ بھی کھل گیا ہو۔ بٹن اسی میں پھنس کر ٹوٹا ہو چنانچہ میں نے رات کو ہی کار کا بونٹ کھول کر اندر کا جائزہ لیا۔ وہ بٹن مجھے وہاں مل گیا۔

صبور کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ سلطانہ بھی دم بخود نظر آنے لگی۔ روحی کا چہرہ سپاٹ رہا۔ وہ پولیس آفیسر کا منہ تکے جارہی تھی۔

پولیس آفیسر پھر بولنے لگا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے وہ صبور کے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت سے محظوظ ہورہا ہو۔ ''پوسٹ مارٹم کے بعد جب ثاقب کی لاش اس کے لواحقین کو دی گئی تھی تو میں نے ثاقب کا لباس ان لوگوں کو نہیں دیا تھا۔ بٹن مل جانے کے بعد میں نے اس کا موازنہ ثاقب کے کوٹ میں لگے ہوئے بٹنوں سے کیا۔ اس کے بعد یقین کرنے میں کوئی کسر ہی نہیں رہ گئی کہ وہ بٹن اسی کوٹ کا تھا۔ اسی وقت میں نے پولیس بھیج کر شیما کو اس کے گھر سے پولیس ہیڈ کوارٹر بلوالیا۔ یہ اس ماڈل گرل کی بدقسمتی ہے کہ وہ جس شخصیت کے بل پر بہت زیادہ اچھلتی تھی، وہ شخصیت کل کسی کام سے بیرون ملک چلی گئی ہے۔ ان حالات میں جب میں نے شیما پر دباؤ ڈالا اور اس سے پوچھا کہ کار کی رپورٹ درج کراتے وقت اس کے گھر میں آپ کی موجودگی کا جو وقت لکھوایا گیا تھا، کیا وہ غلطی واقعی نشے کی وجہ سے ہوئی تھی؟ جواب میں شیما نے گھبرا کر بتادیا کہ وقت کے غلط اندراج کی اصل وجہ کیا تھی لہٰذا اب وہ آپ کے خلاف سرکاری گواہ بھی بن سکتی ہے۔''

''جھوٹ بولا ہوگا اس نے۔''سلطانہ خود پر قابو پاکر غصے سے بولی۔''اور بٹن کا معاملہ بھی آپ کی شرارت ہوسکتی ہے۔''

پولیس آفیسر نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اور صبور کی طرف دیکھ کر بولا۔''آپ کی پہلی اہلیہ جو کچھ کہہ رہی ہیں، یہ آپ بھی کہہ سکتے ہیں لیکن اب یہ سب کچھ آپ کو عدالت کے سامنے کہنا ہوگا۔ فی الحال تو میں آپ کو گرفتار کر رہا ہوں۔ یہ ہے آپ کی گرفتاری کا وارنٹ جو میں نے آج ہی حاصل کیا ہے۔''اس نے وارنٹ صبور کو دکھایا اور پھر ایک کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔

کانسٹیبل ہتھکڑیاں لے کر صبور کی طرف بڑھا۔ وارنٹ دیکھنے کے بعد صبور سکتے کی سی حالت میں کھڑا رہ گیا تھا۔ یہی حالت سلطانہ کی تھی۔

''نہیں۔''روحی اس وقت چیخ پڑی جب صبور کو ہتھکڑیاں لگائی جارہی تھیں...... چیخنے کے بعد وہ تیورا کر گرنے لگی۔

''اسے سنبھالو سلطانہ!''صبور جلدی سے بولا۔

سلطانہ نے روحی کو فرش پر گرنے سے بچالیا مگر اس وقت خود اس کے ہاتھ پاؤں بھی کانپ رہے تھے۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔''صبور نے سلطانہ سے کہا۔''روحی شاید بے ہوش ہوگئی ہے۔ فون کرکے ڈاکٹر کو بلوالو اور بابا کو فون کردو۔''

پولیس آفیسر ہنسا۔''اب تمہارے بابا بھی کچھ نہیں کرسکیں گے۔''

لیکن یہ کہتے وقت شاید پولیس آفیسر کو بھی معلوم ہوگا کہ وہ قتل عمد کا نہیں، ایکسیڈنٹ کا کیس تھا جس میں بہت کچھ کرایا جاسکتا تھا۔

صبور کو وہ دن اور پوری رات تو حوالات میں گزارنا پڑی لیکن دوسری صبح صابر شاہ نے عدالت سے اس کی ضمانت کرالی۔

''اب میں اس پولیس آفیسر کو کسی نہ کسی الزام میں معطل کرواکے ہی دم لوں گا۔''صابر شاہ نے دانت پیس کر کہا۔''میں یہ بھول نہیں سکتا کہ اس نے میرے بیٹے کو ہتھکڑیاں لگائیں جس پر ایکسیڈنٹ کا الزام بھی غلط لگایا گیا ہے۔ یہ میرے بیٹے کا دشمن اس لیے بن گیا تھا کہ اسے میری دخل اندازی گراں گزری تھی۔''

صبور جب گھر پہنچا تو غم زدہ روحی چیخ کر اس سے لپٹ گئی اور بے تحاشا رونے لگی۔ اس وقت سلطانہ کی آنکھوں

میں خوشی کے آنسو آ گئے۔

صبور کی ضمانت تو ہو گئی تھی لیکن اس پر مقدمہ تو بہر حال چلنا تھا۔ وہ جلد ہی زیرِ سماعت آ گیا۔ صبور نے اپنے وکیل کی ہدایت کے مطابق اس کا اعتراف نہیں کیا کہ ثاقب کی موت کا ذمے دار وہی تھا۔ پیشی پر پیشی ہوتی رہی۔ ہر پیشی پر سلطانہ، روحی، صابر شاہ اور سرجن عباس عدالت میں ہوتے تھے۔ سماعت ہوتی رہی اور نہ جانے کیوں روحی کو یوں محسوس ہوتا رہا جیسے صبور کو سزا ہو جائے گی جبکہ صبور کے وکیل کا خیال تھا کہ وہ صبور کو باعزت بری کرانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

ممکن تھا کہ وکیل کی بات درست ثابت ہوتی لیکن بُرا ہو اس محبت کا جو روحی کے دل میں تڑپ رہی تھی۔ جس دن فیصلہ سنایا جانے والا تھا، وہ یکا یک پاگل سی ہو گئی اور اپنی جگہ سے چیختی ہوئی اٹھی۔

”نہیں جج صاحب! اس میں غلطی صبور کی نہیں تھی۔ ثاقب کو میں نے دھکا دے کر صبور کی کار کے آگے کر دیا تھا۔“

اس کی اس بات نے عدالت کو بری طرح چونکا دیا۔ جو لوگ وہاں موجود تھے، وہ بھی حیران رہ گئے۔ ساری عدالت میں بھنبھناہٹ سی ہونے لگی۔ صبور کا وکیل اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اسے یقین تھا کہ فیصلہ صبور کے حق میں ہوتا لیکن روحی کی اس بات کے بعد مقدمے کا نقشہ ہی بدل گیا۔

روحی اس جرم میں گرفتار ہوئی کہ اس نے اپنے منگیتر کو موت کے منہ میں دھکیلا تھا۔ ضمانت تو اس کی بھی ہو گئی لیکن مقدمے کی سماعت از سرِ نو شروع ہوئی۔

اب صبور کے وکیل کو پینترا بدل کر مقدمہ لڑنا پڑا۔ اس نے مقدمے کو یہ رنگ دینے کی کوشش کی کہ جس وقت فیصلہ سنایا جانے والا تھا، اس وقت روحی یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ صبور کو سزا ہو جائے گی اور کیونکہ وہ صبور سے بہت محبت کرتی تھی اس لیے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی اور صبور کو بچانے کے لیے اس نے سب کچھ اپنے سر لے لیا۔

مقدمہ اتنا سنسنی خیز ہو گیا تھا کہ مستقل طور سے اخبارات کی زینت بننے لگا۔ اخباری نمائندوں نے کسی طرح یہ بھی کھوج نکالا کہ روحی اور صبور ایک ہی کالج میں پڑھا کرتے تھے۔ اس بات کو بنیاد بنا کر اخبارات نے کہانیاں بھی بنانا شروع کر دیں۔

ثاقب کے گھر والے بھی ان حالات میں بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ غصے میں آ گئے۔ انہوں نے باور کر لیا کہ روحی نے عدالت میں جو کچھ کہا تھا، وہ صحیح تھا۔ وہ صبور سے محبت کرتی تھی۔ اس نے اپنے والدین کے کہنے پر ثاقب سے منگنی تو کر لی تھی لیکن پھر ایسا منصوبہ بنایا تھا کہ ثاقب کی موت واقع ہو جائے۔ صبور کو وہ اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئی تھی چنانچہ صبور نے اس دن کار اپنے دوست جاوید سے لے لی اور بہانہ یہ بنایا کہ اس کی کار خراب ہو گئی تھی۔

ان لوگوں نے اخبارات کو یہ بیان دیے تو عدالت نے انہیں بھی مقدمے میں شامل کر لیا۔ صبور کے کار مکینک کو بھی طلب کر کے اس کا بیان لیا۔ اس نے اپنے بیان میں کہا کہ کار میں کوئی خرابی نہیں ہوئی تھی۔

صبور اور روحی کے وکیل بہت تجربہ کار تھے۔ انہوں نے مخالفانہ بیانات کے پرخچے اڑانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن روحی کے اعتراف سے یہ بات تو ثابت ہو ہی چکی تھی کہ حادثہ صبور ہی سے ہوا تھا۔

آخر کار عدالت نے ان دونوں ہی کو مجرم قرار دے دیا لیکن مقدمے کے کچھ پہلو ایسے تھے کہ ان دونوں کو کوئی بہت بڑی سزا نہیں دی گئی۔ انہیں صرف دو دو سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔

فیصلہ سننے کے بعد سلطانہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بعد میں اگرچہ صابر شاہ اس پولیس آفیسر کو کسی طرح سسپنڈ کرانے میں کامیاب ہو گیا لیکن تینوں خاندانوں کی بدنامی تو ہو ہی گئی۔

روحی نے جیل میں ہی بچے کو جنم دیا جو اس کی خواہش پر سلطانہ کو بھجوا دیا گیا۔ سلطانہ نے اس بچے کی پرورش اتنی محبت سے کی جیسے وہ اسی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔

دو سال بعد صرف تین تین دن کے وقفے سے روحی اور صبور جیل سے باہر آ گئے۔ خاندان کے لوگ چونکہ یہی سمجھ رہے تھے کہ ان دونوں کو غلط سزا دی گئی تھی اس لیے سبھی نے جیل کے دروازے پر ان کا استقبال کیا۔

جب گھر پر سلطانہ، روحی اور صبور اکیلے رہ گئے تو روحی صبور سے لپٹ گئی۔ اسے اپنے بچے کا خیال نہیں آیا تھا۔

یہ دوسرا موقع تھا جب روحی صبور سے لپٹ کر روئی تھی اور اس موقع پر بھی سلطانہ کی آنکھوں میں خوشی آنسوؤں کی صورت میں جگمگا گئی تھی کہ روحی نے خود ہی صبور کو اپنے شوہر کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔